



ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریرین

**RARE BOOK**  
**DR. FAJR HUSAIN LIBRARY**

JAMIA MILLIA ISLAMIA  
JAMIA NAGAR

NEW DELHI

*Rare*

CALL NO. 321.8 168 K7;8

Accession No. 91755

Rare

Call No. 321.8 168k7;8

Acc. No. 91753

9 MAR 1987

RARE BOOK





سیدنا ابن قتی ادو

منشور

ریاست

از

فلاطون

منشور

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی پیشگی طبعی



## قواعد و ضوابط انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

۱۔ سرپرست ہوں گے جو پانچ ہزار روپے ایک مشت یا پانچ سو روپے سالانہ انجمن کو عطا فرمایا  
 ران کو تمام مطبوعات انجمن نامائیت اعلیٰ قسم کی جلد کے ساتھ پیش کی جائیں گی۔  
 ۲۔ معاون ہوں گے جو ایک ہزار روپے ایک مشت یا سالانہ سو روپے عطا فرمائیں گے (انجمن کی تمام مطبوعات  
 ان کو بلا قیمت دی جائیں گی) (۳۔ رکن بڑی وہ ہونگے جو ڈیڑھ سو روپے ایک مشت عطا فرمائیں گے  
 ان کو تمام مطبوعات انجمن بجز نصف قیمت پر دی جائیں گی) (۴۔ رکن معمولی انجمن کے مطبوعات کے مستقل ہونے  
 ہونگے جو اس بات کی اجازت دینگے کہ انجمن کی مطبوعات طبع ہوتے ہی بغیر دریافت کیے بذریعہ قیمت طلب  
 پارسل ان کی خدمت میں بھیج دی جائیں۔ (ان اصحابوں کو تمام مطبوعات بحسب فیصدی قیمت کم کر کے  
 دی جائیں گی) مطبوعات میں انجمن کے رسالے بھی شامل ہیں۔ (۵۔ انجمن کی شاخیں (کتاب خانے) وہ ہیں  
 جو انجمن کو ایک مشت سو سو روپے یا بارہ روپے سالانہ دیں (انجمن انکو اپنی مطبوعات نصف قیمت پر دیں)۔

## انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

اپنے ان مہربان معاونین کی ایک فہرست مرتب کر رہی ہے جو اس بات کی عام اجازت دیدیں کہ آئندہ جو  
 کتاب انجمن سے شائع ہو وہ بغیر اسے دوبارہ دریافت کیے تیار ہوتے ہی ان کی خدمت میں بذریعہ وی پی  
 روانہ کر دی جایا کرے، یہ اصحاب انجمن کے رکن ہونگے ان کے اسمائے گرامی اس فہرست میں درج کر لینے  
 جائیں اور انجمن سے جو نئی کتاب شائع ہوگی فوراً بغیر دریافت کیے روانہ کر دی جایا کرے۔

ہمیں امید ہے کہ ہمارے وہ معاونین جو اردو کی ترقی کے دل سے بھی خواہ ہیں اس اعانت کے ذریعہ  
 دینے نہ فرمائیں گے۔

ان معاونین کی خدمت میں کل کتابیں جو آئندہ شائع ہوں گی وقتاً فوقتاً جو تھالی قیمت کم کر کے روانہ ہو

## انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)



ریاست

تحقیق و ترمیم

از  
اسلاطون

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کیم اے پی ایچ ڈی

انجمن ترقی اردو اور ملک آباد کلب

جامعہ ملیہ ترقی پسند دہلی نے طبع کی





## مقدمہ

دنیا کے سب سے بڑے مصنف کی سب سے اہم کتاب کو اردو زبان میں پیش کرتے ہوئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں، مترجم سے نہ جانے کتنی جگہ فہم مطالب اور اظہارِ معانی میں غلطیاں ہوئی ہوں گی، جن کے لیے وہ بہ ادب معذرت خواہ ہے۔ لیکن شاید ان غلطیوں کے باوجود اردو بولنے سمجھنے والے اس یونانی فلسفی اور شاعرِ عالم اور مصلح کے ساہا سال کی کاوش ذہنی کی نتائج سے تھوڑی بہت واقفیت حاصل کر سکیں گے، اور یہ بھی کچھ کم نہیں۔ ذیل میں مصنف اور کتاب کے متعلق چند ضروری باتیں لکھی جانی ہیں جن سے شاید کتاب کے سمجھنے میں مدد ملے۔

فلاطون کا سال ولادت یقینی نہیں، لیکن غالب گمان یہ ہے کہ حضرت مسیح سے ۴۲۷ برس قبل پیدا ہوا۔ اس کا خاندان "اتھنس (اٹینہ) میں" بہت ممتاز تھا؛ حسب نسب کے اعتبار سے بھی اور جاہ و دولت کے لحاظ سے بھی۔ وادانے ارستا کلیس نام رکھا تھا، لیکن بچپن ہی سے اس کی صحت بہت اچھی تھی اور جسم چوڑا چکلا، اس لیے ایک استاد نے اس سے عایت سے اس کا نام پلاٹون رکھ دیا جس کے معنی چوٹے چکلے کے ہیں، اسے ہم نے معرب کر کے فلاطون اور افلاطون کر لیا ہے۔ لڑکپن ہی سے جوش اور ولولے کے ساتھ سمجھ بوجھ کے آثار نمایاں تھے، چنانچہ ساری عمر حیاتِ نظری و عملی میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا اور یہ چیز اس کی زندگی کی امتیازی خصوصیت بن گئی۔

یوحشیدا، من چلا، امیرزادہ اپنے عہد کی ساری متاعِ علمی سے بہرہ اندوز، فلسفہ اور ادب میں ماہر

وقت کے سیاسی ہنگاموں سے متاثر ہوا۔ اور کیوں نہ ہوتا؟ اس کا لڑکپن ہی تھا کہ اہل  
 اٹینہ نے سبلی کی فہم شروع کی اور شباب شروع ہوتے ہوئے شہر کی قوت کا تقریباً خاتمہ ہی ہو گیا۔  
 ایک طرف خارجی جنگیں اپنا اثر دکھا رہی تھیں دوسری طرف داخلی مفاسد سہراٹھا رہے تھے۔  
 افلاطون شریف ممول خاندان کا نوجوان تھا، ادھر عوام نے حکومت پر قبضہ کر رکھا تھا، جمہوریت کا  
 دور دورہ تھا، اشراف امر محض بے بس تھے۔ یہ نوجوان دیکھتا تھا کہ جماعتی زندگی کا یہ سب سے  
 دشوار اور سب سے اہم کام حکومت کرنے کے لیے ہر کس و ناکس ہر چھوٹا بڑا، ہر اچھا بُرا، آما وہ  
 بلکہ کوشاں ہے۔ یہ سمجھتا تھا کہ یہ جمہوری ریاست ایک بے ملاح کی ناوہی، کہاں دیکھئے تھے پھر  
 صرف جمہوریت کا یہ سیاسی طوفان بے تیزی ہی اس شریفِ ادہ کے لیے سولہاں روح نہ تھا بلکہ  
 یہ نیک نل منصف مزاج نوجوان جمہوریت کی مادی ترقیوں سے بھی اثر لے رہا تھا۔ یہ دیکھتا تھا  
 کہ عام زندگی میں سکون اور سادگی کی جگہ مسابقت اور تعیش نے لے لی ہے۔ یہ تجارت کے انتظامات  
 دیکھتا اور کاروبار کا فروغ، تجارتی بیڑے اور اچھے اچھے بندرگاہ۔ مگر انہیں بندرگاہوں نہیں  
 تجارتی منڈیوں کی ریل پل میں ننگے بھوکوں کی بستیاں بھی اس کی نظر پڑتی، ممول کے ساتھ  
 افلاس اور محلوں کے قریب جھونپڑیاں بھی دکھائی دیتیں، اور جمہوریت کی سیاسی کمزوریاں بھی  
 نہیں سرمایہ داری کی اجتماعی مضرتیں بھی اس کا دل دکھاتیں اور اسے سوچنے پر مجبور کرتیں۔  
 افلاطون ان سب چیزوں کو دیکھتا اور سوچتا، سوچتا اور دیکھتا۔ لیکن اس نے نتائج پر پہنچنے  
 میں عجلت سے کام نہیں لیا، شاید اس وجہ سے کہ اس کا عہد یونانی تاریخ کا وہ زمانہ ہے جب جماعتی زندگی  
 نے گویا اپنے معراج کمال کو پہنچ کر دوبارہ زوال ہونا شروع ہی کیا تھا اور ان زوال آما وہ اداروں  
 کا بھرم ابھی اچھی طرح کھلا نہ تھا، اس لیے آثار زوال کا احساس بھی نہ بہت قوی تھا اور نہ بہت  
 واضح۔ ابھی علم و فن شاعری اور ناٹک، تعمیرات اور صوت تراشی غرض ذہنی زندگی کے سائے



مظاہر نہایت اچھی شکل میں سامنے موجود تھے، کھلی خوبوں کے سامنے چھپی نرانیوں پر نظر پینچ بھی جائے تو آدمی آسانی سے انہیں درست کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ واقعے کے مقابلے میں خیال اور موجود کے سامنے موہوم کے لیے کوئی عجلت سے آمادہ عمل کیسے ہوا چنانچہ جوتی میں فلاطوں نے علمی سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یہ اٹینہ کی علمی صحبتوں سے مستفید ہوتا رہا۔ اسے ادب اور شعرے شغف تھا اور مستناہی کہ شعر کہتا بھی تھا مگر ابھی اس کے ذہن کی گرہ نہیں کھلی تھی، اس کی روح کی کلی نہیں کھلی تھی۔ سیرت کا ہسولی تشکیل کے لیے مہتاب تھا اور ذہنی زندگی اپنے مرکز کی تلاش میں بقرار۔

انسانی زندگی، ذہنی زندگی، یعنی جماعتی زندگی ہے۔ ساری ذہنی زندگی کا خاصہ ہے کہ وہ اجتماع میں یا کم سے کم دونوں سے پیدا ہوتی ہے۔ حیات انفرادی کا پورا جماعت کی بخشش فضا ہی میں پرورش پاتا ہے۔ من و تو، دونوں یکساں طور پر ذہنی زندگی کے لوازم ہیں بچہ ہی ماں کو ماں بناتا اور اس میں وہ ساری ذہنی خصوصیات پیدا کر دیتا ہے جو عورت میں محض بحیثیت جنین نہیں ہوتیں؛ اور ماں ہی اپنی محبت اور شفقتگی سے بچہ کی ذہنی زندگی کو وہ متاع گراں مایہ دے سکتی ہے جس کا بدل دنیا کی اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اچھا استاد شاگرد سے اور اچھا شاگرد استاد سے، سچا گرو چیلے سے اور سچا چیلہ گرو سے وہ منازل ذہنی و روحانی طر کر دیتا ہے جو اس کے بغیر ناقابل تصور ہوتے۔ جن زندگی کے ساز کو کسی دوسری زندگی کا مضرب نہیں چھڑتا اس کے نغمے خاموش ہی رہتے ہیں جس زندگی کی کلی کو دوسری زندگی کی حیات بخش شبنم نہیں نصیب ہوتی وہ شگفتہ ہونے کی جگہ مرجھا جاتی ہے۔ فلاطوں کی زندگی کی کلی اس وقت کھلی جب اس پر اس انوکھے بوڑھے سقراط کی نظر بہار اثر پڑی۔

ان دونوں میں شروع سے خیالات و رجحانات کی مطابقت تو یوں تھی کہ فلاطوں



اور شرافت میں سے تھا اس لیے جمہوری نظام حکومت سے چنداں لگاؤ نہ رکھتا بلکہ متنفری  
 تھا؛ اور ایک غریب کا بیٹا سقراط، خاندانی اثرات سے نہیں بلکہ عقلاً و اعتقاداً جمہوریت  
 کا مخالف تھا۔ جمہوریت کی مخالفت نے اسے طبقہ شرافت کے نوجوانوں سے جا ملایا۔ انہیں  
 نوجوانوں میں فلاطون بھی تھا جس کی زندگی کی کاپیا اس بوڑھے فلسفی کے فیض صحبت نے  
 بالکل پٹ دی۔ روایت ہے کہ اس نے سقراط سے ملنے کے بعد اپنی شاعری کا سارا دفتر سپرد  
 آتش کر دیا۔ نہ جانے ادب عالم کو اس سے کیا ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہوگا، مگر شاعری کا کیسا  
 نقصان ہوا ہو انسانیت کو ایک انسان مل گیا جس کی ذہنی قوت کے ارتعاشات آج تک  
 نوع انسانی کی حیات ذہنی و عملی دونوں کے لیے توجہ و حرکت کا باعث ہیں۔

حیات بخشی کے اس احسان سے فلاطون نے یوں سبکدوشی حاصل کرنے کی کوشش  
 کی ہے کہ اپنی اکثر تصانیف میں خود اپنے خیالات کو سقراط کی زبان سے ادا کیا ہے؛ اور اس طرح  
 اپنی فکر کے سائے نتائج کو پہنچا ہے۔ استاد ہی کی طرف منسوب کیا ہے۔ کہنے والوں نے کہا ہے کہ  
 جہاں تک نظریات عقلی کا تعلق ہے فلاطون کو سقراط سے بہت کم ورثہ ملا ہے، اس لیے کہ  
 سقراط غریب کے پاس مشکل ہی سے کوئی مثبت نظریہ عقلی تھا۔ بتانے والوں نے یہ بھی  
 بتایا ہے کہ سقراط میں وہ مذہبیت یکسر مفقود تھی جس میں فلاطون کا سارا تخیل ڈوبا ہوا ہے؛  
 اس شریف زادہ کو مذہبی گداز اپنے خاندان کی روایتوں سے ملا تھا، نہ کہ سقراط کے تشکیکی  
 فلسفہ سے کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ سقراط کی تعلیم بے ترتیب تھی فلاطون ایک  
 مکمل نظام فلسفہ کا موجد ہے۔ سب صحیح سب درست لیکن اس قسم کا فرق دیکھنے والے شاید اس  
 حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ سقراط کے فیض نظر نے فلاطون کو محض ایک شاعر، محض ایک فلسفی  
 یا مذہبی رسمیت کے دلدادہ محض بننے سے بچا کر ایک زندگی بخش قوت بنا دیا، اس کی مردہ

رہی اور خاندانی مذہبیت کو اصلاح اجتماعی کے جذبہ سے کس نے آشنا کیا؟ اس کے وقتی جیسا  
 رجحانات کو ایک مستقل اخلاقی مطالبہ کس نے بنایا؟ اشراف ائینہ کے فرقہ وارانہ تعصبات  
 رکھنے والے نوجوان کو کس نے یقین دلایا کہ سہیت اجتماعی کی نجات خود اس کے فرقہ سے  
 بھی ممکن نہیں؟ اور یہ حقیقت کس نے فلاطون کے ذہن نشین کرانی کہ مصائب وقت اور مفا  
 زماں سے بچنے کی راہ کسی عارضی اور جزوی تدبیر سے نہیں نکل سکتی بلکہ صرف اس طرح کسی  
 مخصوص گروہ یا طبقہ کے اغراض پر ریاست کی بنیاد رکھنے کے بجائے اس کی اساس تعلیم  
 اخلاق پر ہونا چاہیے؟ یہ سب کچھ سقراط ہی کا فیض تھا۔ انھیں خیالات سے فلاطون کا دلغ  
 مرتے دم تک معمور رہا اور انھیں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ مدت العمر اپنی تصانیف اپنے  
 دنیا اپنے سیاسی اشغال کے ذریعہ جان توڑ کوشش کرتا رہا۔ اس نے دنیا کے سب سے  
 اہم صنف میں ایک شان اصلاح، اس بے نام معلم پر پاپا۔ تہہ اور اس مفکر اعظم میں شان  
 بیہ ریاض پیدا کر دی۔

سے فلاطون کی کتاب

فلاطون کی زندگی کا یہ سب سے اہم معاملہ یعنی سقراط سے اسکا تعلق ۳۹۹ ق۔ م میں  
 ختم ہو گیا۔ سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ اور چونکہ اس سڑے موت کے اسباب سیاسی تھے اس لیے  
 استاد کی رحلت کے بعد شاگردوں کو بھی ائینہ سے ہجرت کرنی پڑی۔ یہ سب کے سب مکارا میں  
 اقلیدس کے ہاں چلے گئے۔ انھیں میں فلاطون بھی تھا۔ اس کے بعد کے حالات کا تفصیلی پتہ  
 نہیں چلتا۔ قیاس ہے کہ ائینہ واپس آنے سے پہلے فلاطون نے افریقہ کا سفر کیا، قیروان اور مصر  
 میں فلسفہ اور ریاضی کی تحصیل کی اور ائینہ واپس پہنچا پھر ۳۹۰ ق۔ م سے پہلے سلی اور جنوبی  
 اٹلی کا سفر کیا۔ اس سفر میں علمی اغراض کے علاوہ فلاطون کے پیش نظر علمی سیاسی مقاصد بھی تھے



اپنی ریاست کی جمہوریت سے اس کے دل میں جو پزیرائی سی پیدا ہو گئی تھی اور اصلاح حکومت کے جو نئے نئے منصوبے اس کے ذہن میں پیدا ہوتے تھے وہ اس جو شیلے نوجوان کے لیے دعوت عمل کا کام دے رہے تھے۔ اپنی ریاست میں اسے مشکل سے کوئی ہم نوا ملتا تھا۔ خود اس کے خاندان کے بہت سے لوگ، اُمرا و اشراف زمانہ کارنگ دیکھ کر جمہوریت کے قائد بن بیٹھے تھے۔ جب اس نے اپنیوں میں کوئی ساتھی نہ پایا تو باہر کا رخ کیا اور یونانی تمدن کے مغربی علاقوں کی راہ لی۔ اسے توقع تھی کہ وہاں اپنے سیاسی خیالات کو عملی جامہ پہنانے میں متبعین فیثا غورث سے مدد ملے گی۔

یہ جماعت چھٹی صدی ق۔ م میں قائم ہوئی تھی۔ آٹھ دن کے سیاسی تغیرات نے اس جماعت کو کبھی اُبھارا کبھی گرایا۔ اس نے بہت کچھ دہوپ چھاؤں دیکھی۔ ہوتے ہوتے سیاسی اثر میں خاصی کمی بھی ہو گئی، لہذا وہ نکل کر مذہبی اور علمی تسلط برابر بڑھتا گیا اور اسکے ساتھ ساتھ انھوں نے سیاسی مقاصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھا اس لیے یہ لاکھ کروڑوں ان کا تھوڑا بہت سیاسی اقتدار تک باقی تھا۔ ان کے پیش نظر بھی اصلاحی مقاصد تھے۔ یہ عوام کی حکومت کو عقل و دانش کے تفوق اور اخلاقی تعلیم اور مذہبی عقائد کے اثر سے بدلنا چاہتے تھے اور جمہور کے مقابلہ میں ہمیشہ طبقہ امرا کی طرفداری کرتے تھے، اس سیاسی مسلک کے باعث نیز ان علمی اور مذہبی خیالات کی وجہ سے فلاطون کو ان سے لگاؤ پیدا ہوا۔ اور اس نے سوچا کہ سر اکیوز میں اس کے لیے عملی کام کا اچھا موقع ہے۔

اس شہر میں عرصہ سے ایک مطلق العنان حکمران دیونیسیوسی اوس کی حکومت تھی سیاست خارجی میں اس نے کار تہیج اور یونانی ریاستوں سے اپنا معاملہ استوار کر لیا تھا۔ اندرون ملک میں مختلف فرقوں کے باہمی نفاق سے فائدہ اٹھا کر اس نے اپنا اقتدار خوب

جالیا تھا اور اپنے دربار کو علم دوستی اور فن پروری سے چار چاند لگا چکا تھا۔ درباریوں میں طبقہ اشراف کا سرگروہ اور خود اس کا بہنوئی دیون بھی تھا جسے فیثا عورتی جماعت سے تعلق تھا۔ چنانچہ اسی واسطے سے فلاطون کی دربار میں سائی ہوئی۔ پہلے بہت کچھ اوجھٹ کی گئی فلاطون نے بادشاہ پر اپنے خیالات کا بہت کچھ اثر بھی ڈالا، مگر دربار کی سازشوں نے زیادہ دن تک یہ حالت قائم نہ رہنے دی۔ انجام کار وہ دربار کی اشراف پارٹی کی سازشوں میں شرکت کے الزام پر قید کیا گیا اور پھر غلام کی حیثیت سے بیچ دیا گیا، شاہی بے رخی کے بعد کسی قیروانی فلسفی کی علم دوستی اس کے کام آئی کہ اس نے اس قسمی غلام کو خرید کر آزاد کرایا!

عملی سیاست میں فلاطون کی یہ پہلی کوشش ناکام رہی۔ اور جب یہ کوئی ۳۸۸ ق۔م میں اٹینہ لوٹا تو غالباً یہ تہیہ کر کے کہ عملی سیاست کو خیر باد کہے اور اپنے جماعتی و سیاسی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے درس اور عملی تحقیق سے کام لے۔ چنانچہ اس نے اپنی مشہور تعلیم گاہ "اکادمی" قائم کی۔ اس کے اٹھائیس اور عمارتوں کے لیے زمین غالباً اس نے خود اپنے روپیہ سے خریدی کچھ مدد دوستوں نے دی اور اس طرح یہ سب سے قدیم یونیورسٹی وجود میں آئی۔ تعلیم کا کوئی مالی معاہدہ یہاں نہ لیا جاتا تھا۔ ہاں کبھی کوئی طالب علم بھی کوئی ہمدرد روپیہ یا جائداد وقف کر دیتا اسی سے رفتہ رفتہ اکادمی کے پاس خاصی جائداد ہو گئی۔ کتب خانہ بھی اسی طرح عطیوں سے بنا۔ جیسے ہی فلاطون ہی اس علمی جماعت کا صدر رہا۔ اس کے بعد سابق صدی کی وصیت کے مطابق اراکین میں سے ایک شخص صدر بنایا جاتا تھا یہ سلسلہ کوئی ۷۰۰ سال تک چلتا رہا حتیٰ کہ ۲۹ء میں شہنشاہ جینی نے اسے ختم کر دیا۔ مرنے دم تک اس اکادمی میں درس تدریس ہی فلاطون کا مخصوص شغل رہا۔ شاہی اس نے کی نہیں، اس لیے اس کا یہ مدرسہ ہی گویا اس کا خاندان تھا۔ سیاسی زندگی میں شرکت کے دلوے نے بھی یہی شکل اختیار کی کہ اس کے وقتی ہنگاموں سے الگے کرانے والی نسل کو اس تعمیر نو



کے لیے تیار کرے۔

لیکن اس کے دل میں سیاسی اصلاح کے جذبے کی قوت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ساٹھ برس کی عمر میں جب علمی مشاغل کی پرسکون فضا میں ایک مدت گزر چکی ہو (۳۶۸ ق۔م میں) خیر طبعی ہو کہ دیولنس کی وفات کے بعد تخت تاج اس کے بیٹے کو ملا اور اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ تمام سسلی اور جنوبی اٹلی میں فیثاغوری جماعت کا اثر از سر نو پڑھ گیا ہے تو یہ بے مہین ہو جاتا ہے اور جہاں اسے دعوت پہنچتی ہے کہ اگر اپنے مشورہ سے سیاسی تشکیل میں مدد دے تو اس سے نہیں ہاجاتا اور یہ پیرانہ سال معلم حل کھڑا ہوتا ہے۔ وہاں پہنچ کر نوجوان حکمران کے مزاج میں خاصا دخل بھی پالیتا ہے۔ لیکن کچھ دن بعد اس کی سیاسی جماعت کے سرگروہ دیون کو بادشاہ جلاوطن کر رہا ہے تو ناچس فلاتون بھی اٹینیہ واپس چلا آتا ہے! دیون بھی اس کے ساتھ ہی اٹینیہ آتا ہے اور ان کے ہمراہ فیثاغوری جماعت کے اور بہت سے لوگ آکر کاڈمی میں شریک ہوتے ہیں لیکن سیاسی دلچسپی اب بھی ختم نہیں ہوتی۔ ۳۶۳ ق۔م فلاتون ایک مرتبہ اور سسلی کا سفر کرتا ہے، تاکہ اپنے اثر سے دیون اور بادشاہ میں مصاحبت کرادے۔ اس مرتبہ بھی پہلے تو خوب خاطر و مدارات ہوتی ہے لیکن آگے چل کر سیاسی اختلافات خطرناک صورت اختیار کر لیتے ہیں اور حکومت ٹارنٹ کی مداخلت سے جو فیثاغوری جماعت کے زیر اثر تھی فلاتون کی جان بچتی ہے۔

علمی سیاست سے دل برداشتہ ہونے کے لیے اتنی بہیم ناکامیوں اور مایوسیوں کی ضرورت تھی! اس کے بعد فلاتون نے کبھی علمی سیاست میں حصہ نہیں لیا! اور آخر عمر تک کاڈمی میں پڑھانے اور لکھنے کے کام میں مشغول رہا۔ اور جب وہ وقت آیا جو سب کے لیے آتا ہے تو عقیدہ مند شاگردوں اور ہونہار نوجوانوں کے حلقہ میں جان دی۔ سال وفات ۳۴۴ ق۔م بتایا جاتا ہے۔

اس عظیم شان شخصیت کی عملی ناکامیوں کی داستان کیسی عبرت انگیز ہے اور اس کا حال کو بدلنے میں ناکام رہ کر درس و تصنیف سے مستقبل کو متاثر کرنے کا تہیہ کس قدر سبق آموز تاریخ عالم اسی بہت کم شخصیتوں سے آشنا ہر جن میں خیال و فکر کے مراتب اعلیٰ غیر معمولی عملی صلاحیتوں سے تو ام ہوں۔ فلاطوں بھی ان بڑے انسانوں میں تھا جن کے دل میں تشکیل نو کی آگ بھری ہوتی ہے جن کا ذہن اس تشکیل کے مفصل سے مفصل نقشے بنا سکتا ہے۔ مگر انہیں علمی دنیا کی قوتیں ارزانی نہیں ہوتیں۔ چنانچہ اس صفت اول کے مفکر سیاسی کو بھی تدبیر سیاسی کا موقع نہیں ملتا اور یہ ناچار امر و زور سے انہیں بند کر کے فردا کی لو لگاتا ہے اور علمی وقتی و آئی کے بجائے اپنی تصانیف کے ذریعہ عمل جاری کی طرح ڈالتا ہے جس کے اثرات آج تک نیاے فکر اور نیاے عمل میں محسوس ہوتے ہیں اور نہ جانے کب تک محسوس ہوتے رہیں گے۔

فلاطوں کی نظر چونکہ مستقبل پر تھی اس لیے اس نے اپنے تعلیمی کام کو درس ہی تک محدود نہ رکھا۔ ہر چند اس کی زندگی کا بڑا حصہ اسی شغل میں صرف ہوا لیکن اس درس کے نتائج اس نے انیوالی نسلوں کے لیے اپنی متعدد تصانیف میں چھوڑے ہیں اور اس کا درس ہمارے لیے اس شان سے محفوظ ہے کہ کتابوں کو پڑھتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود فلاطوں کے حلقہ تلمذ میں جا بیٹھے۔ مصنف کی حیثیت سے فلاطوں کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ ایک شاعرانہ تخیل رکھنے والے معلم کی کاوش ذہنی و ادبی کا نتیجہ ہیں جن میں سیاسی و مذہبی مقاصد اور علمی افکار کا ایک زندہ مرقع ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ دنیا کی تاریخ ادبی میں مشکل ہی سے یہ بات کہیں اور اس درجہ کمال پر مل سکیگی۔ فلاطوں کی کتابیں ایک طرف تو مجددانہ مقالات ہیں جن میں ایک نئے تصور حیات ایک جدید دستور زندگی کی شروع سے آخر تک حمایت کی گئی ہے؛ دوسری طرف وہ نہایت بلند پایہ علمی تحقیق کی شان رکھتی ہیں، اور پھر اپنے شاعرانہ حسن اور ادبی کمال کی وجہ سے بے مثل ہیں۔



پہلے یہ ہے کہ تصنیف کے میدان میں فلاطون کو وہ مرتبہ ملا جو اور کسی کو حاصل نہیں۔ بقول وینڈل بانڈ  
 ”اس کی شخصیت کے نظری اور عملی پہلو دونوں اگر جالیائی کمال میں مل گئے ہیں مصلح اور مفکر کا  
 تضاد آرٹسٹ کی ذات میں غائب ہو گیا ہے“ فلاطون کا یہ جرم سوانح نگار ایک اور جگہ کیا خوب  
 لکھا ہے کہ وہ اکثر فلسفیوں مثلاً ارسطو، اپینوزا، ہیوم، کانت، ہیگل کو ہم ان کے علمی تعقوت کی  
 داد دیتے ہیں، بعض مثلاً فٹے، کونت کی یہاں اس علمی گہرائی کے ساتھ ایک پیغمبرانہ شان سی نظر  
 آتی ہے؛ اور وہیں مثلاً دیکارت، شینگ، شوپن ہاؤکے یہاں اس کے ساتھ حسن بیان کی آمیزش  
 ہے، لیکن یہ تینوں چیزیں ایک جگہ اگر ملتی ہیں تو بس فلاطون کی تصانیف میں؛ ”اس خوبی کا کما  
 فلاطون کو اپنی آخری تصانیف خصوصاً ”رہایت“ میں حاصل ہوا ہے۔

یہ کتاب جو فلاطون کے شجر علم کا پختہ ثمر ہے ہم تک دو ناموں سے پہنچی ہے؛ ”رہایت“  
 اور تحقیق عدل، ان ناموں سے یہ سمجھ لینا کہ یہ سیاست یا قانون پر ایک تصنیف ہے غلط ہوگا  
 پہلے یہ ہے کہ اس میں انسان کی پوری زندگی پر نظر ڈالی گئی ہے، البتہ زیادہ توجہ انسانی زندگی کے  
 عملی پہلو پر ہے اس لیے کتاب کا زیادہ حصہ اخلاقی اور سیاسی مسائل سے پر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن  
 یہ نہیں ہے کہ فکر و خیال کی دنیا کو ایک قلم نظر انداز کر دیا گیا ہو فلسفہ کی بلندیاں دیکھنی ہوں تو  
 عین خیر میں سب چیزوں کے اتحاد کا جلوہ بھی اس کتاب میں دکھائی دیتا ہے؛ اخلاق کا سبق لینا  
 ہو تو اس میں روح انسانی کے محاسن کی گہری اور لطیف تحقیق موجود ہے؛ تعلیم کے مسائل پر روشنی  
 درکار ہو تو بقول روسو ”فن تعلیم پر آج تک جتنی کتابیں لکھی گئیں ان میں یہ سب سے بہتر ہے“ سیاسی  
 زندگی میں رہنمائی کے لیے یہ ایک جدید ہیئت اجتماعی اور اس کے اداروں کی حقیقی جاگتی تصویر لاکر کھڑا  
 کر دیتی ہے؛ اور انسانی جماعتوں کے تغیر و عروج و زوال، کے اسرار و سرستہ کی کنجی کی تلاش ہو تو  
 فلسفہ تاریخ کے مشکل مسائل بھی اس میں باہنی کر دیے گئے ہیں۔



اس سے شاید یہ خیال پیدا ہو کہ مختلف مسائل کا ایک کتاب میں اس طرح جمع ہو جانا  
 ویسے ہے کہ قدامت کے یہاں علوم کی تقسیم کچھ بہت واضح نہ تھی۔ یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ ریاست کی  
 تیاری میں فلاطون نے دس سال سے زیادہ صرف کیے، شاید مختلف وقتوں میں لکھے ہوئے  
 رسائل کو یکجا کر دیا ہو اور جوڑ پونڈ لگا کر ان میں تسلسل قائم کیا ہو لیکن یہ خیالات صحیح نہیں، فلاطون  
 نے ان مختلف مسائل پر اپنے مرکزی مسئلہ کی خاطر مجبواً بحث کی ہے۔ اور اس کا مرکزی مسئلہ  
 یہ ہے کہ آدمی اچھا آدمی کیسے بنے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے اجتماعیات کے اس مرکزی  
 مسئلہ کا حل ضروری ہے کہ فرد اور جماعت میں تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ فلاطون کے نزدیک انسان  
 محض انفرادی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اپنی تمام صلاحیتوں کو درجہ کمال تک پہنچانے کے لیے کسی  
 جماعت کسی ریاست کی رکنیت کا محتاج ہوتا ہے۔ اچھا آدمی اچھی ریاست ہی میں پیدا ہو سکتا  
 ہے۔ چنانچہ اپنے اہل سوال کے جواب کی خاطر فلاطون کو اچھی ریاست کا خاکہ بنانا پڑا۔ اور فلسفہ اخلاق  
 کا مسئلہ سیاست کا مسئلہ بن گیا۔ اور اس سیاسی مسئلہ پر بحث میں فلاطون کو معاشرہ سیاست  
 کے خلاف جما و باعقل کا موقع بھی ملا۔

فلاطون کے زمانہ میں اقتدار سیاسی شخصی آرزوں کو پورا کرنے کا وسیلہ بن گیا تھا۔ انفرادیت  
 کا بھوت سب کے سر پر سوار تھا۔ اور فلاطون فرد کو جسم اجتماعی کا ایک عضو ماننا تھا۔ اسلئے اس نے  
 اس اخلاقی صفت پر بحث کی جس کی وجہ سے آدمی ہولے نفس کا بندہ بن جانے کے بجائے ضبط نفس  
 سے کام لیتا ہے اور جماعت کی فلاح کے لیے بس ایک کام اختیار کر لیتا ہے یعنی اپنے وظیفہ اہلی کو پورا  
 کرتا ہے۔ اس انفرادیت کے بجائے جو جمہوریت کے پرفے میں پھیلی ہوئی تھی فلاطون اجتماعی و تعالیٰ  
 کا پیام دیتا ہے اور اس کی تکمیل کے لیے تخصیص کار کا اصول پیش کرتا ہے تاکہ ہر فرد اور ہر طبقہ اپنی مرض  
 مفوضہ کو قناعت اور خوشدلی سے انجام دیتا ہے، اپنا دھرم پورا کرتا رہے کہ فلاطون کی نظر میں



یہی اجتماعی زندگی کا سچا اصول یعنی عدل ہے۔ اسی وجہ سے ریاست کا دوسرا نام تحقیق عدل بھی ہے۔

اس تخصیص کار کو کامیاب بنانے کے لیے لازمی ہے کہ ہر فرد اور ہر طبقہ کو اسکے وظائف مخصوص کے لیے تیار کرنے کا انتظام کیا جائے۔ یہ تعلیم کا کام ہے۔ چنانچہ فلاطون اس کتاب میں تعلیم کا نہایت مفصل نظام پیش کرتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ریاست دراصل تعلیمات پر ایک مقالہ ہے۔ پھر حکمرانوں کی تعلیم اعلیٰ کے سلسلے میں علم مطلق یعنی مابعد الطبیعیات کی فلسفیانہ بحثیں آجاتی ہیں۔ اس نظام تعلیم کی تفصیلی بحث کے بعد فلاطون محسوس کرتا ہے کہ اسے کامیابی کے ساتھ عمل میں لانے اور مستقل بنائے کے لیے اجتماعی زندگی کے بہت سے اداروں کو بدلنا ضروری ہے، چنانچہ معیشت کا ایک اشتراکی نظام تجویز کر کے گراہیوں کا سدب کرتا ہے۔ ہم ذیل میں کتاب کے ان ۳ اہم مباحث کا خلاصہ ناظرین کی سہولت کے لیے پیش کرتے ہیں، یعنی (۱) ماہیت عدل - (۲) نظام تعلیم - (۳) نظام معیشت (۱) عدل ریاست میں عدل کے رائج الوقت نظریات نہایت خوبی سے پیش کیے گئے ہیں، اور ان پر بحث کر کے مخصوص سقراطی انداز میں انھیں دیکھا گیا ہے۔ سب سے پہلے عدل کا روایتی نظریہ کنفلیس کی زبان سے پیش ہوتا ہے کہ عدل قرض ادا کرنے یا ماوجب کے پورا کرنے کا نام ہے۔ اٹنا گفتگو ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ عدل کوئی عہارت یا بہتر ہے جس سے دوستوں کو نفع اور دشمنوں کو نقصان پہنچایا جاسکتا ہے۔ فلاطون یہ جتا دیتا ہے کہ عدل کوئی بہتر مندی یا عہارت نہیں بلکہ روح کی ایک صفت اور ذہن کی ایک عادت ہے جس کا حامل بس ایک ہی طریقہ پر عمل پیرا ہو سکتا ہے اور وہ طریقہ ہرگز ایسا نہیں ہوتا جس سے کسی کو چاہے دوست ہو چاہے دشمن نقصان پہنچے یا اس کی ذات میں کسی طرح کا زوال یا نخطا پیدا ہو۔

کنفلیس اور اس کے بیٹے کے بعد مشہور سافسطائی تھریسی میکیں اس روایتی تصور عدل کے



مقابلہ میں انقلابی اور تنقیدی نظریہ پیش کرتا ہے۔ یہ عدل کو قومی تفریق کے اغراض سے تعبیر کرتا ہے جس کی لاشی اس کی بھینس کا اصول نہایت بیباکی اور دیدہ دلیری سے پیش کرتا ہے۔ یہ صاف صاف کہتا ہے کہ ریاست میں حکمران کے اغراض کی پابندی عدل ہے یعنی عدل قومی کے لیے اپنی غرض اور مرکز کے لیے دوسرے کی غرض پورا کرنے کا نام ہے۔ عدل کا یہ نظریہ انفرادیت کی حد ہے جس کے جواب میں فلاطون اس موقع پر اپنا نظریہ جماعت پیش نہیں کرتا کہ افراد اور گروہ کے جذبہ تعلق و بے ربط اغراض ہوتے ہی نہیں بلکہ ہر ایک کی غایت یہ ہے کہ کل کی بھلائی کے لیے اپنے اپنے وظائف مخصوص کرے۔ پورا کرے۔ یہاں تو وہ صرف اپنی بے پناہ سقراطی جرح سے اس نظریہ انفرادی کو ختم کر دیتا ہے۔ اور یہ ثابت کر دیتا ہے کہ اگر حکومت کوئی فن ہے تو ہرن کی طرح اس کا مقصد بھی اپنے موضوع کے نقائص کو رفع کرنا ہوگا۔ اور حکمران کے لیے اگر وہ سچا حکمراں ہے تو غرض اور محکوموں کے مفاد کا ضامن ہونا لازمی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ تھریس سکس سے رفتہ رفتہ یہ بھی منوالیتا ہے کہ عادل شخص ظالم سے زیادہ دانشمند زیادہ قوی اور زیادہ خوشحال ہوتا ہے۔ زیادہ دانشمند اس لیے کہ وہ ہر ایک سے جاویداً مقابلہ و مسابقت میں ضائع نہیں کرتا۔ اس کا مقصد خوبی و کمال حاصل کرنا ہے نہ کہ کسی دوسرے سے بڑھ جانا زیادہ قوی اس لیے کہ غیر عادل یا ظالم لوگوں کے کسی گروہ کو بھی قوت حاصل کرنی ہو تو وہ تاک ایک دوسرے سے عدل و انصاف ہی سے پیش آنے پر مجبور ہوتے ہیں اور نہ ساری قوت منتشر ہو جاتی ہے۔ زیادہ خوشحال یوں کہ ہر چیز کا ایک مخصوص وظیفہ ہوتا ہے جسے بس وہی انجام دے سکتی ہے اور کوئی دوسری چیز اس خوبی سے ادا نہیں کر سکتی۔ ہر چیز کا کمال یہی ہے کہ وہ اپنے مخصوص وظیفہ کو با حسن و جوہ پورا کرے جس طرح آنکھ کا کمال اچھی طرح دیکھنا اور کان کا کمال اچھی طرح سُننا ہے اس طرح روح انسانی کا مخصوص کمال اچھی زندگی حیات طیبہ ہے۔ روح عدل سے محروم ہو کر جو اس کی مخصوص خوبی ہے یہ حیات طیبہ حاصل نہیں کر سکتی اور اس کے بغیر اسے حقیقی مسرت و خوش حالی نصیب نہیں ہوتی۔



۱۲  
 فلاطون کے مقرر طے نہ تھے یہیں مکس کو چپ کر دیا لیکن حاضرین کے دل سے یہ خیال جو بہت عام خیال ہوا نہیں ہٹا کہ عدل اچھی چیز سی مگر ایک غیر فطری سی چیز تو۔ اور آدمی اسپر بس اس لیے عمل کرتا ہے کہ رسم و رواج نے اسپر عمل کرنا سکھایا ہے اور رسم و رواج ہی اس کی پابندی مجبور کرتے ہیں۔ چنانچہ جو تیسرے نظر یہ عدل اس بحث کے سلسلہ میں سامنے آتا ہے وہ یہی ہے کہ عدل ایک مصنوعی رسمی چیز ہے۔ آدمی جب رتی حالت میں رہتا تھا تو بس بھر ظلم کرتا تھا اور سکت بھر ظلم سہتا تھا۔ لیکن بہتوں کے لیے یہ صورت ناقابل برداشت ہو گئی۔ ظلم سہنا زیادہ پڑا اور ظلم کرنے کے موقعے اتنے نہ ملے تو آدمیوں نے باہم معاہدہ کر لیا کہ نہ ظلم کریں گے نہ ظلم سہیں گے۔ اسی معاہدہ کو قانون کی شکل دے کر کچھ معیار عمل مقرر کر دیے۔ رفتہ رفتہ اس قانون کے اثر سے انسانی فطرت اپنی اصلی جبلت سے ہٹ کر ظلم سہنے کے ڈر سے عدل کی خوگر ہو گئی۔ یوں عدل گویا خوف کا آفریدہ ہے۔ یا یوں کہیے کہ بہترین حالت یعنی ظلم کر سکنے اور بدترین حالت یعنی ظلم سہنے پر مجبور ہونے کے درمیان ایک مصالحت کی صورت ہے۔ اگر تھریسی میکس کے نزدیک عدل قوی فریق کے مفاد کا نام تھا تو یہاں عدل سے مراد کمزور کی ضرورت ہے۔

گفتگو میں اس نقطہ پر پہنچ کر فلاطون کو محسوس ہوتا ہے کہ عدل کے جتنے نظریے پیش کیے جاتے ہیں ان میں یہ بات مشترک ہے کہ سب کے سب عدل کو کوئی خارجی چیز سمجھتے ہیں اور فلاطون اسے ثابت کرنا چاہتا ہے، روح کی ایک ذاتی داخلی صفت، اس لیے اب وہ منطقی استدلال اور جرح کو چھوڑ کر نفسیاتی تحلیل سے کام لیتا ہے، لیکن فوراً نفس انسانی (انفرادی) کی تحلیل شروع نہیں کرتا بلکہ ایک بالکل نئی راہ اختیار کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ اگر کسی کتاب کے دو نسخے ہوں ایک بہت جلی لکھا ہوا، دوسرا خفی تو جلی تحریر کے پڑھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اسی طرح کتاب عدل کے بھی دو نسخے ہیں۔ جلی نسخہ تو اجتماعی زندگی میں ملتا ہے اور خفی حیات انفرادی میں۔ پہلے میں یعنی ریاست میں اس کا دیکھنا اور پچا پنا زیادہ سہل ہے۔ اور اگر



یہ ریاست ابھی بن ہی ہو اور اجتماعی زندگی کا ہیولی پہلی مرتبہ متعین سیاسی شکل اختیار کر رہا ہو تو اس وقت عدل کا جلوہ موجودہ تاریخی ریاستوں کی عارضی آلودگیوں سے پاک نظر کے سامنے آجائیگا۔ چنانچہ فلاطون خیال میں ایک ریاست کی بنیاد رکھتا ہے اور اس طرح عدل کی تلاش میں ایک ریاست کا دستور مرتب ہو جاتا ہے۔

دستور ریاست کی ترتیب میں انفرادی نفسیات کی فیتا عوزنی تقسیم سے گانہ فلاطون کے پیش نظر یہی ہے جس طرح انسانی روح تین عناصر سے مرکب ہے یعنی عنصر شہمانی، عنصر تہری، اور عنصر عقلی، اسی طرح ریاست بھی تین طبقوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ فلاطون سب سے پست عنصر یعنی عنصر شہمانی سے شروع کرتا ہے اور بتلاتا ہے کہ انسانی احتیاجات اور ضروریات کی نوعیت اسے تعاون باہمی پر مجبور کرتی ہے، ابتدا ہی سے اس معاشی نظام میں تخصیص کار اور تقسیم عمل نظر آتی ہے۔ پھر انسان اپنی ضروری احتیاجات کی تسکین پر قانع نہیں ہوتا، نفسی اور لطیف چیزیں بھی مانگتا ہے، نقاشی، شعر، موسیقی، سب اس کی ضرورتیں بن جاتے ہیں اور ان کی فراہمی کے لیے خاصی بڑی آبادی درکار ہوتی ہے، اور اس آبادی کے لیے خاصا رقبہ زمین۔ اس قبہ کے حاصل کرنے اور اسے محفوظ رکھنے کے لیے جنگ ریاست کے وظائف میں شامل ہو جاتی ہے اور اس طرح نفس اجتماعی کا عنصر جبری منظم ہو کر ریاست میں فوجی طبقہ کی صورت اختیار کرتا ہے، جو ظاہر ہے کہ پیشہ ور سپاہیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جہلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جوتے کا نٹھنے اور کپڑے سینے کے کام کو تو اتنا اہم سمجھا جائے کہ ایک آدمی ساری عمر بس یہی کرے اور کچھ نہ کرے لیکن ریاست کی حفاظت کا اہم تر کام ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے جنہیں اسکے انجام دینے کی خاص تعلیم نہیں دی گئی۔ یہ کام سپاہیوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے جن کا یہی پیشہ ہو اور کچھ نہ ہو جن اشخاص میں عنصر بصری زیادہ نمایاں ہوا نہیں اس کام کے لیے منتخب کرنا اور انہیں یہ کام خاص اہتمام سے سکھانا چاہیے لیکن ان محافظوں میں صرف عنصر جبری کا ہونا کافی نہیں۔



ن کی مثال محافظوں کی سی ہے جو گھر کے لوگوں سے تو نہیں بولتے لیکن جنسبیوں پر چھپتے ہیں۔  
 یہ محافظ کتے سمجھیں جانتے ہیں ان سے محبت کرتے ہیں اور جن کو نہیں جانتے تھے نفرت۔ یعنی  
 ن کے نزدیک دست دشمن میں وجہ امتیاز علم یا عنصر عقلی ہے! لہذا ریاست کے جنگی طبقہ میں  
 عنصر عقلی ضرور موجود ہونا چاہیے۔ پھر اگر عام محافظوں میں اس عنصر عقلی کا وجود ضروری ہو تو کمال  
 محافظ یا حکمراں میں تو یہ بدرجہ اتم موجود ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس کمال محافظ کے تصور کے ساتھ  
 فلاطون تیسرے عنصر کو پوری طرح ریاست میں داخل کرتا ہے اور محافظوں کی دو قسمیں کر دیتا ہے  
 یعنی فوجی محافظ جنہیں بعد میں مددگار کا لقب دیا گیا ہے اور فلسفی محافظ جن کی خصوصیت امتیازی  
 عنصر عقلی کا کمال ہے اور جو حقیقی معنوں میں ریاست کے حکمراں یا فلسفی بادشاہ ہیں۔

غرض ان تین طبقوں کی ایک ریاست بنا کر فلاطون اس میں عدل کی تلاش کرتا ہے کہ یہی  
 اس ریاست کی وجہ تھی۔ یہ ریاست کے چار محاسن قرار دیتا ہے یعنی حکمت، شجاعت، عفت اور عدل  
 پہلے تین محاسن کو متذکرہ بالا تین طبقوں کے وظیفہ خاص سے تعبیر کر کے یعنی حکمت کو حکمرانوں کا  
 کمال بتلا کر، شجاعت کو مددگار محافظوں کا اور عفت یا ضبط نفس کو دولت آفرین طبقہ کا وہ عدل کے  
 متعلق سوال کرتا ہے کہ آخر یہ کس طبقہ کا مخصوص جوہر ہے اور جواب دیتا ہے کہ عدل کسی مخصوص جزو کا جوہر  
 نہیں بلکہ کل کا جوہر ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ ہر طبقہ اور ہر فرد اپنے مخصوص وظیفہ کو بخوشی انجام دے  
 اور دوسرے کے کام میں دخل نہ دے۔ محافظ کا عدل یہ ہے کہ وہ حکمت کی روشنی میں ریاست کے لیے مفاد  
 متعین کرے اور اس کے وسائل تجویز کر کے ریاست کو اپنے عمل کرانے، مددگار محافظ کا عدل یہ ہے کہ وہ  
 شجاعت و جرات سے ریاست کی حفاظت کرے، دولت آفرین گروہ کا عدل یہ ہے کہ وہ معاشی زندگی  
 کے کل ریزوں کو اعتدال کے ساتھ چلاتا رہے۔ اور چونکہ کسی طبقہ یا کسی فرد میں اس وقت تک اپنا مخصوص  
 جوہر پیدا نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنا مفوضہ کام پورے انہماک سے انجام نہ دے اس لیے عدل کا کام

اخلاق کی شرط اول ہے۔

”ریاست“ کے نسخہ علی میں عدل کی یہ ماہیت معلوم کر کے فلاطون اس کو نفس انفرادی بتلیق کرتا ہے اور بتلاتا ہے کہ اگر ریاست میں عدل مختلف طبقوں کے اپنے اپنے فرائض کو انجام دینے کا نام ہے تو انفرادی زندگی میں یہ اس سے عبارت ہے کہ روح کے اجزاء ثلاثہ اپنا اپنا کام انجام دیں اور عقل جذبات اور شہوات اپنی اپنی حدود میں کار فرما ہوں، اور شخصی زندگی ان میں مناسب ہم آہنگی اور توازن پیدا کرے۔

(۲) تعلیم، اگر عدل کی ماہیت ہی ہے جو فلاطون نے بتلائی ہے تو ظاہر ہے کہ جماعت کے اہم ترین فرائض میں سے تعلیم ہے جو مختلف طبقوں کے لوگوں کو اپنے مخصوص وظائف کے پورا کرنے کے قابل بنا سکے۔ چنانچہ فلاطون نے ریاست کا معتد بہ حصہ ایک نظام تعلیم کے بیان میں صرف کیا ہے۔

فلاطون سے پہلے بھی عام طور پر یونانیوں میں ریاست کو ایک اخلاقی جمعیت مانا جاتا تھا۔ یعنی ایسی جمعیت جو ایک مشترک متاع روحانی و اخلاقی کی مالک ہو۔ اس لیے ریاست کے فرائض لازمی ہیں سے یہ تھا کہ وہ اس مشترک متاع روحانی میں اپنے سب راکین کو حصہ دار بنا کر ہر ایک کو اپنی اپنی تعلیمی ادارہ بنا دے جس میں وہ گریہ شخص اپنی صلاحیتوں کو پوری ترقی دے سکے اور اس مشترک متاع روحانی کے ذریعے دوسرے افراد سے رشتہ اتحاد پیدا کرے۔ اس متاع مشترک سے مراد وہ لکھے اور بے لکھے قوانین تھے جن پر عمل پیرا ہونا جماعت کی فلاح اور حسن اخلاق کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔

فلاطون بھی جماعت کے اس تعلیمی مقصد کا قائل ہے، وہ بھی مانتا ہے کہ ریاست میں حکومت



کا کام تعلیم ہی اور تعلیم کا کام افراد کو جمعیت کے مقاصد سے آشنا کرنا اور انہیں جسم سیاسی کا صحیح عضو بنانا۔ البتہ فلاطون کے نزدیک اس اجتماعی پہلو کے علاوہ تعلیم فی نفسہ بھی ایک قدر ہے، اس کا ایک انفرادی اور شخصی پہلو بھی ہے، یعنی حق مطلق، غیر مطلق کا ادراک۔ اس انفرادی حیثیت سے تو فلاطون کا تصور تعلیم یونانی خصوصاً سوفسطائی تصورات سے مختلف ہے ہی جو تعلیم کو محض اجتماعی کامیابی کا ذریعہ قرار دیتے تھے، لیکن اجتماعی حیثیت سے بھی فلاطون اسکا ہمنوا نہیں ہے اس لیے کہ وہ اجتماعی کامیابی کی جگہ اجتماعی عدل کے حصول کو تعلیم کا مقصد بتاتا ہے۔

تعلیم کو اجتماعی اور انفرادی دونوں حیثیتیں دیکر فلاطون نے دراصل یونان کے دو اہم ترین مذاہب تعلیمی کو یکجا سمونے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سے ایک تو خود فلاطون کے شہر اٹینہ کا مذہب تھا جسے مختصراً مذہب انفرادیت کہہ سکتے ہیں۔ یہاں حکومت کو تعلیم سے سروکار نہ تھا، شہری خود اپنا انتظام کرتے تھے۔ معمولاً ابتدائی تعلیم میں لکھنے پڑھنے کے علاوہ کچھ شعر و موسیقی کی تعلیم ہوتی اور کچھ درش جہانی کی۔ جو لوگ اس سے زیادہ تعلیم کے خواہاں ہوتے وہ سوفسطائی معلموں کے ہاں ام ڈے ڈے کر سیاست اور خطابت کے فنون سیکھتے۔ اس کے بعد اسے ۲۰ سال کی عمر تک حکومت سب شہریوں کو فوجی تعلیم دیتی تھی۔ تعلیم کا بڑا حصہ خاندان کے ذمہ تھا۔ فلاطون کے نزدیک اٹینہ میں جاہل اور نادان لوگوں کے برسرِ اقتدار ہونے کی ذمہ داری اسی تعلیمی آزادی کے سر تھی۔ دوسرے مذاہب تعلیمی اسپارٹا کا تھا۔ یہاں بچہ ۷ سال کی عمر میں اپنے والدین سے جدا کر لیا جاتا، علیحدہ مکانوں میں سرکاری نگرانوں کے زیر نظر اس کی پرورش ہوتی اور اسکی تعلیم کا بیشتر حصہ جہانی ورزش اور فوجی تربیت پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہاں خاندان کو تعلیم میں کوئی دخل نہ تھا، جو کچھ حکومت کرتی، اور افراد کو اپنے فوجی اغراض کے لیے بطور سپاہیوں کے تیار کرتی تھی۔

فلاطون کو اسپارٹا کا طریقہ زیادہ جہاں اس لیے کہ فرد و جماعت کے باہمی تعلق کا تصور یہاں



فلاطون کے نظریے سے زیادہ مطابق تھا۔ اس کے نزدیک بھی فرد کی حیثیت جماعت کے ایک جزو اور خادم کی تھی اور اسپارٹا کے نظام میں بھی۔ لیکن فلاطون پھراٹینہ کا خوش مذاق اور وسیع نظر شہری تھا۔ ادب اور موسیقی سے سیرت کی جو تربیت اور تہذیب ہوتی ہے اس سے فلاطون سے زیادہ اور کون آشنا ہو سکتا تھا۔ یہ بھلا اپنی رایہت میں لوگوں کو محض اظہارِ سپاہی بنانے پر کیے قناعت کر لیتا۔ وہ سمجھ گیا کہ اسپارٹا کے نظامِ تعلیم کا مرکزی خیال اگرچہ صحیح ہے لیکن اس کے عمل میں بہت تنگی ہے جس سے سیرت انسانی کا بس ایک عنصر یعنی عنصرِ حربی نشوونما پاتا ہے اور دوسرے عناصر بالکل نہیں پینے پاتے۔ چنانچہ فلاطون نے اپنے نظامِ تعلیم میں اسپارٹا اور اٹینہ دونوں کی خوبیوں کو یکجا کر دیا۔ اٹینہ کے شہری کی حیثیت سے اس نے تعلیم میں سیرت انسانی کے تمام عناصر ترکیبی کے نشوونما کی بہیل کی؛ بحیثیت اسپارٹا کے معتقد کے اس نے کامل انسان کو جماعت کا خادم بنایا اور اس کی تعلیم کو کلیتہً حکومت کے سپرد کیا۔

”رایہت“ میں جو نظامِ تعلیم تفصیل پیش کیا گیا ہے وہ جنگِ آزماؤں اور حکمرانوں کے لئے دوسرے یعنی دولت آفریں طبقہ کی تعلیم کا ذکر نہیں ہے۔ اس نظام میں تعلیم کے دو حصے کر دیے گئے ہیں۔ پہلے حصہ کی تعلیم تمام جنگِ آزماؤں کے لیے ہے اور اس کا زمانہ لڑکپن اور شباب کا زمانہ ہے دوسرا حصہ صرف حکمرانوں کے لیے ہے اور اس کا زمانہ شباب سے کہولت کی عمر تک ہوتا ہے۔ پہلے حصہ کی تعلیم کا مقصد ہے شہریوں کو رایہت کے تحفظ کے لیے بطور سپاہی کے تیار کرنا، دوسرے کا مقصد ان میں سے چند کو کامل محافظت یا حکمرانی کا اہل بنانا ہے۔ پہلے میں جذبات کی تہذیب سیرت کی تربیت پیش نظر ہے، دوسرے میں فلسفہ و حکمت کی معرفت عقل و خرد کی تعلیم۔ پہلے حصہ میں تمام تر اجتماعی اغراض پیش نظر ہیں، دوسرے میں بالکل نہ سہی پھر بھی بہت کچھ انفرادی تکمیل کے لیے حصہ کا نصاب جو ہر سال کی عمر تک کے لیے ہے اور آخر پر مشتمل ہے، دوسرے میں اور موسیقی بلکہ فنون



خط ذرا وسیع معنی میں استعمال کیے گئے ہیں مثلاً ورزش میں صحیح غذا اور علاج بھی شامل ہے اور موسیقی میں  
ادب اور فنون لطیفہ فلاطون چاہتا ہے کہ ورزش اور موسیقی کے دو گونہ عمل سے سیرت انسانی کی  
ترتیب آہنگ نشوونما کا کام لے۔ اگرچہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ورزش سے جسم اور موسیقی سے ذہن کی تربیت  
مقصود ہوگی مگر دراصل جسم کی تربیت بھی ذہن اور روح ہی کی خاطر ہے کہ اس سے جرات پامری کی  
صفتیں پیدا ہوں طبیعت کے عنصر حری کی صحیح نشوونما ہو جو نوجوانوں کو اچھا سپاہی اور بہادر  
بنائے اور ریاست کا اچھا اور سچا خادم۔ موسیقی سے اس عنصر حری کو عدد مناسب میں رکھنا اور  
عقل کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا مطلوب ہے۔ اس سے ہر چند علم کا حصول ممکن نہیں تاہم صحیح رہا  
کا پیدا کرنا ممکن ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ روح کو جو ابھی جذبات کی منزل سے گزر رہی ہے، اس ثابت کا  
عادی بنا دیا جائے کہ وہ حل طلب مسائل کے متعلق صحیح احساس رکھے اور جب یہ احساس بطور عادت  
رہنم ہو جائے تو روح صحیح راہ عمل اختیار کرے، یہ جانے بغیر کہ اس عمل کی وجہ باہلیت کیا ہے،  
موسیقی ادب اور فنون لطیفہ کو نصاب کا جزو بنایا ہی اس لیے گیا ہے کہ ان کی دلکشی خود بخود  
نوجوانوں کو اپنی جانب کھینچتی ہے؛ شعر کے وزن اور بحر سے چنگ رباب کی سامعہ نوازی  
سے حسین مجسموں کے حسن صورت اور دل فریبی الوان سے روح آپ ہی آپ متاثر ہوتی ہے اور اس طرح  
ان کی اخلاقی تعلیم کو بے جانے بوجھے قبول کرتی جاتی ہے۔

فلاطون فنون لطیفہ کی اس تاثیر کو اخلاقی مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے  
کہ وہ موسیقی، شعر، اور صورت تراشی کے ہر طرز کو نوجوانوں کی تعلیم کا جزو نہیں بننے دیتا بلکہ صرف  
ان طرزوں کو جن سے روح کی صحیح اخلاقی تربیت ہو سکے۔ چنانچہ ”ریاست“ میں نظام تعلیم کے  
ساتھ ادبیات اور موسیقی کے احتساب کا بھی ایک مکمل پروگرام پیش کیا گیا ہے۔ ادب کی صلاح میں



مطالب اور سالیب بیان دونوں کی اصلاح کی تجاویز سامنے آتی ہیں، اور سچ پوچھتے تو فلاطون  
اس سلسلہ میں اصلاح مذہبی اور تنقید ادب کی بنیاد رکھتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یونانی شاعری اپنی  
قوم کے مذہبی معلم ہوتے تھے۔ ان کے کلام میں فلاطون کو جہاں کہیں کوئی ایسی چیز ملتی، وہ جس سے  
معبود پوتاؤں کا ایسا تصدیر سٹنے والے کے ذہن میں پیدا ہو جو صحیح اخلاقی نشوونما کے لیے مضر ہو تو  
وہ بلا تامل اُسے خارج کر دیتا یا بدل دیتا چاہتا ہے۔ اور اس طرح معبودوں کی مروجہ صفات میں  
بنیادی تغیرات تجویز کر کے اور اس کام کو حکومت کی سپردگی میں نہ کر فلاطون ریاست  
کو زندگی کے بہت بڑے اور بہت اہم شعبہ یعنی مذہب اور معتقدات پر بھی مسلط کر دیتا ہے!  
پھر ادب کے اسالیب بیان کے متعلق بھی ریاست ہی مجاز ہے کہ جس اسلوب کو جو انوں  
کے اخلاق کے لیے مفید سمجھے اُس کے استعمال کی اجازت دے جسے مضر جانے اُسے منع کرے۔ مثلاً  
اس ضمن میں ڈراما کی سخت ممانعت کی گئی ہے اس لیے کہ اس صنف ادب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ  
ایک ہی شخص متعدد دروپ بھرتا ہے اور یہ بات ایسی ریاست میں کیسے روارکھی جاسکتی ہے جسکی  
قد راساسی عدل ہو یعنی یہ کہ ایک شخص بس ایک کام کرے اور اپنے مفوضہ و ذمیفہ کی کما حقہ جا آوری  
کو غایت حیات جانے۔ یہاں تو ادب کی شکل بس بیان کی ہو سکتی ہے، جس میں بیان کرنیوالا اپنی  
شخصیت کو کسی اور ذات میں ضم نہیں ہونے دیتا اور اگر کبھی کسی دوسرے کی زبان سے بولتا بھی  
ہو تو صرف اچھے اور نیک لوگوں کی طرف سے بدوں کا روپ یہ کسی حال میں نہیں لے سکتا۔  
اسی طرح موسیقی میں بھی ریاست کا یہ کام ہے کہ مختلف راگ راگنیوں میں بدلے کہ کسی اجازت  
ہو کس کی نہیں، مختلف آلات موسیقی میں سے کن کا استعمال جائز ہے کن کا ناجائز۔ ریاست کا فرض  
ہو کہ تعلیم کے اس ذریعہ کو بھی اس اخلاقی مقصد کا تابع کرے جس کا حصول مطلوب ہے، اور موسیقی کو  
سادہ سے سادہ بنا کر روح کی سادگی اور یگانگت کے قیام و بقا کی سبیل کرے۔ عجب تم ظریفی ہے



کہ دنیا کے اس سب سے بڑے ادیب کے ہاتھوں جس کی ہر ہر سطر سے شہریت شیکتی ہے، جو اپنی تصانیف اور اپنی زندگی میں آرٹ کا منظر معلوم ہوتا ہے، ادب موسیقی اور آرٹ کی آزادی سلب کرنے کی ایسی تجویز تیار ہوں! آرٹ کو آرٹ کی خاطر چاہتے والے حیرت منہ تکے ہیں کہ یہ کیا غضب ہو رہا ہے کہ حکومت کو نہ صرف تعلیم کا سارا نظام سپرد کر دیا گیا، بلکہ اسی سلسلہ میں مذہبی عقائد، افکار و خیالات پر اسی کا تسلط ہو کہ ادب و آرٹ میں بس نہیں چیزوں کی تلقین ہو جنہیں حکومت چاہے اور ستم بالے ستم، انداز تلقین بھی وہی ہو جو حکومت کو بھائے! لیکن نظر غور سے دیکھئے تو واضح ہو جاتا ہے کہ فلاطون ادب و آرٹ کو ان کی ماہیت کے خلاف ریاست کی خدمت پر بردستی مجبو نہیں کرنا چاہتا بلکہ آرٹ کی غایت ہی اس خدمت کو جانتا ہے۔ اس کی نظر میں سچا آرٹ اچھا آرٹ ہی وہی ہے جو جماعت کے مقاصد میں مہذب ہو۔ وہ زندگی میں اصول خیر کی کار فرمائی دیکھتا اور ساری کائنات میں ایک مقصد مضمرا پاتا ہے؛ آرٹ چونکہ زندگی اور کائنات کی تعبیر و ترجمانی کا نام ہے اس لیے اسے بھی اس خیر مطلق کا پر تو ہونا چاہیے جس سے زندگی اور کائنات معمور ہیں۔ وہ آرٹ کو ریاست کا غلام نہیں بنا چاہتا بلکہ اس سے صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے حقیقی مقصد کو پورا کرے۔

فلاطون نے نوجوانوں کی تعلیم کا جو نصاب بنایا ہے اس کا مختصر ذکر تو ہو چکا۔ اس نصاب کے ختم ہونے کے بعد اس نے اعلیٰ تعلیم کا ایک خاکہ بھی ان لوگوں کے لیے پیش کیا ہے جو ریاست کے اعلیٰ حکمراں بننے والے ہیں۔ پہلی منزل میں تعلیم کا خاص ذریعہ ادب و آرٹ تھا، اس اعلیٰ منزل میں ریاضی اور فلسفہ ہے۔ فلاطون کے زمانے میں اعلیٰ تعلیم کا ایک اور نصاب بھی جاری تھا جسے اس نے یکسر بدل دیا۔ اثنینہ میں سوسفٹانی معیار کے مدارس تھے جن میں ۱۸، ۱۶ برس کے نوجوانوں کو ابتدائی تعلیم ختم کر چکنے کے بعد خطابت اور سیاست کا درس دیا جاتا تھا۔ تاکہ اس کی تکمیل کر کے جمہوریت کی سیاسی زندگی میں امتیاز اور کامیابی حاصل کر سکیں۔ فلاطون خطابت کی خرد و فہمی سے بیزار ہے اس لیے اس کے لیے نصاب میں کوئی جگہ نہیں ملتا ہے۔ وہ اپنے نصاب میں



۱) علم الحساب (۲) علم الاسکال (۳) ہیئت (۴) موسیقی (۵) فلسفہ  
 ان میں پہلے (۱) تا (۴) اور بعد میں (۵) یعنی فلسفہ کی تعلیم رکھی ہے اور چونکہ موسیقی میں بھی بہاں تباہ  
 کی باضیاتی بحثیں مقصود ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ فلاطون نے اپنے نصاب میں باضیاتی فلسفہ کی تعلیم  
 کا پیش خیمہ بنایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ریاضیاتی علوم اگر ایک طرف محسوس عملی دنیا میں بھی مفید اور  
 کارآمد ثابت ہوتے ہیں دوسری طرف نیا محسوس پر غور کے بجائے مجرد اور غیر محسوس تصورات پر  
 غور و فکر کی عادت ڈال کر یہ غیر محسوس عالم اعیان تک پہنچنے کا ایک ذریعہ بھی بن جاتے ہیں جن کا پورا  
 پورا علم پھر فلسفے سے حاصل ہوتا ہے۔

ان چاروں مضامین کے مطالعہ کے لیے فلاطون نے ۱۰ سال کا زمانہ تجویز کیا ہے یعنی ۲۰  
 سال سے ۳۰ سال تک کی عمر گویا ۱۰ برس کی عمر میں ابتدائی تعلیم ختم کر کے دو سال خاص حی تعلیم  
 ہو اور اس کے اختتام پر جو لوگ اس اعلیٰ تعلیم کے اہل نظر آئیں انہیں اس نصاب کے مطابق تعلیم دی جائے  
 اس نصاب کی تکمیل کے بعد ۱۰ سال فلسفہ کی تعلیم کے لیے رکھے گئے ہیں۔ فلسفہ کا یہ نصاب صرف ان کے  
 لیے ہے جنہوں نے گذشتہ دس سال میں باضیاتی مضامین کے باہمی ربط و تعلق کا سب سے قوی اور واضح  
 احساس ظاہر کیا ہو۔ اس لیے کہ ریاضی محسوس سے غیر محسوس تک پہنچنے کا وسیلہ ہے اور فلسفہ دنیا فکر و  
 عالم اعیان کے علم اور اس علم سے بالآخر عین خیر تک پہنچنے کا نام ہے۔ فلسفہ حقیقت محض یعنی عین خیر کا علم  
 ہے کہ یہی غایت وجود بھی ہے اور مقصود علم بھی اور فلسفی وہ ہے جو حقیقت اشیاء سے آشنا ہو جائے اور عین خیر  
 کا ادراک رکھتا ہو۔

تجویز یہ ہے کہ فلسفہ کی اس پنج سالہ تعلیم میں امتحانوں اور آزمائشوں کا ایسا سلسلہ رکھا جائے کہ یہی  
 فلسفیانہ طبائع کا پورا پورا پتہ چل جائے جن میں خامی ہو وہ رد کر دیے جائیں جو سب آئے ناشوں میں پورے  
 اثر میں وہ ریاست کے فلسفی حکمران نامی قوت نہیں۔ ۳۰ سے ۴۰ سال کی عمر تک یہ ریاست کی خدمت میں



اور حکومت کے وہ تمام کام انجام دینے زیادہ معمر بزرگوں سے مخصوص نہیں ہیں۔ اس زمانہ خدمت میں بھی برابرنگی آزمائش ہوتی رہی وہ جوان آزمائشوں میں پورے ترین انھیں سب سے بڑے اعزاز اور سب سے زیادہ ذمہ داری کے کام تفویض کیے جائیں۔ اب یہ لوگ اپنا کچھ وقت تو فلسفیانہ غور و فکر میں صرف کریں اور جب ان کی باری آئے تو کچھ وقت باہر کے عملی فرائض انجام دینے میں اور آئے والی منزلوں کو راستگی خدمت اور حفاظت کے لیے تیار کرنے میں۔

ذوق علم اور جوش عمل کی جس کشمکش کا آماجگاہ خود فلاطون کا دل تھا اور جن کا تصفیہ آخر دم تک نہ ہو سکا، اس کا اثر تعلیم کی اس آخری منزل میں بھی رونما ہے۔ اس منزل میں بھی جہاں فلسفی مقصد علم کو پہنچ جاتا ہے اور فحاشیہ وجود کا محرم ہو جاتا ہے فلاطون اسے بالکل فکری دنیا کے لیے نہیں چھوڑتا بلکہ علم و عمل میں ہم آہنگی اور توازن کا مطالبہ یہاں بھی قائم رہتا ہے۔ علم حقیقت کچھ گونگے کا گڑ نہیں جس پر فلسفی اکیلے اکیلے چکھے اور دوسروں کو اس کے منے سے آگاہ نہ کرے۔ فلسفی کا ایک مقصد اگر عین خیر کا علم حاصل کرنا ہے تو دوسرا اس علم کی روشنی میں نوع انسانی کو سدھارنا بھی ہے۔ اگر اس علم سے اپنی ذہنی تکمیل اور سیرت شخصی کی بہترین تشکیل ہوتی ہے تو پھر اس سے ہمیت اجتماعی کے فلاح و بہبود کی سبیل نکالنی چاہیے۔ کمال مفکر کا صاحب عمل ہونا بھی ضروری ہے۔

یہی ارباب علم اور اصحاب عمل فلاطون کی اصطلاح میں فلسفی حکمران فلسفی بادشاہ ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں جاہل اور خود غرض اہل سیاست کا خاتمہ کرنا چاہیے۔ یہی حکمت و خرد مندی سے حکومت کر سکتے ہیں کچھ نظا حقیقت سے بہرہ یاب ہیں یہی بے لوث اور بے لاگ حکومت کر سکتے ہیں کہ ان کے لیے حکومت کی رحمت کوئی شرف نہیں بلکہ ایک فرض ہے اور نئی نوع کی سچی خدمت کا ایک موقع۔ جماعت اجتماعی و انفرادی کے سانسے متعاضدہ ضمنی پر مشتمل ہے اور یہ ان کو پیش نظر رکھ کر حکومت کر سکتے ہیں۔ اس لیے انہیں پھر نہ قانون کی پابندی عائد ہوتی ہے نہ بیجا رسم و رواج کی بندش۔



یہ آخری بات قابلِ ملاحظہ ہے اس لیے کہ فلاطون نے جہاں حکومت کو مذہب اور آداب پر  
 پورا اقتدار دیدیا ہے وہاں ایک چیز میں ریاست کے کام کو بہت کم بھی کر دیا ہے۔ عام طور پر ریاست کے  
 خاص کاموں میں شمار کیا جاتا ہے کہ وہ قانون بنائے اور انھیں نافذ کرنے کے لیے عدالتیں قائم کرے۔ لیکن  
 رکھے۔ لیکن فلاطون کو اپنی صحیح تعلیم کے نتائج پر اس درجہ اعتماد ہے کہ وہ جسم کی نگہداشت کے لیے ڈاکٹر و  
 طبیوں اور معاملات کے تصفیہ کے لیے عدالتوں و کیلوں سے اپنے کو بے نیاز سمجھتا ہے۔ صحیح تعلیم کے  
 بعد نہ امراض جسم کی گنجائش ہے نہ امراض روح کی اور طبیب وکیل نہیں امراض کی علامت ہیں۔  
 فلاطون نہ مرض کو باقی رکھنا چاہتا ہے نہ علامات کا رد و دار ہے۔ اس کے نزدیک ریاست جماعت عامہ ہے  
 جس کا قانون بنانے کی کوئی پابندی نہیں اس جماعت عامہ کا کام دراصل تعلیمی کام ہے اور ریاست ایک تعلیمی ادارہ ہے اور

(۳) معیشت، ریاست کو اساسِ عدل پر قائم رکھنے کے لیے نظامِ تعلیم کے ساتھ ساتھ فلاطون  
 نے معیشت کے ایک مشترک نظام کا خاکہ بھی پیش کیا ہے، لیکن اس کو صرف حکمرانوں اور سپاہیوں تک  
 محدود کر دیا ہے۔ مثلاً املاک کے متعلق فلاطون کی تجویز ہے کہ میسر یعنی محنت و مشقت کرنے والا دولت آفرین  
 طبقہ اپنی پیداوار کا اتنا حصہ حکمرانوں اور جنگ آزمائوں کو دے دیا کرے کہ بس ان کی لاپرواہیوں اور  
 ہوجائیں اور وہ بھی اس طرح نہیں کہ یہ دولت و پیسہ پیر کی شکل میں بطور تنخواہ ان میں تقسیم ہو اور اس کو  
 جس طرح چاہیں صرف کریں بلکہ سب ایک جگہ ایک سا کھانا کھائیں ایک سا کپڑا پہنیں یعنی فلاطون  
 ان طبقوں کو دولت آفرین ہی سے منع نہیں کرتا بلکہ صرف دولت کو بھی اجتماعی شکل دیتا ہے۔

اشتراکِ املاک کے ساتھ ساتھ فلاطون نے اشتراکِ ازواج کی بھی حمایت کی ہے اور اس تجویز پر  
 ریاست میں کافی بحث ہو چکی ہے اور سپاہیوں کے لیے شادی بیاہ کرنا اور لگا لگا کر کھانا منجوع  
 قرار دیا گیا ہے۔ بڑھے تجربہ کار حکمرانوں کا یہ کام ہے کہ مقررہ اوقات پر تندرست نوجوان مرد عورتوں کو یکجا کر دے



اور ان کے اخلاط سے جو اولاد پیدا ہوئے اس کا علم ہی نہ ہو کہ اس کے والدین کون ہیں بچوں کو پیدا ہوتے ہی ریاست ٹاؤں سے لے کر اپنے آغوش میں پرورش دے تاکہ ہر نئی نسل اپنے سے پہلی نسل کو سچ جیسا نکل اپنے ماں باپ سمجھے اور ہر پرانی نسل چھوٹوں سے ایسی ہی محبت رکھے جیسی اپنی اولاد سے۔ فلاطون کی خواہش ہے کہ شخصی خاندان کی خود غرضیوں اور تنگ نظریوں کو مٹا کر ریاست کے اعلیٰ طبقوں کو بس ایک خاندان بنا دے۔ تاکہ یہ محدود خاندانی تعلقات ان طبقتوں کی پگانکت میں نخل نہ ہوں عورتوں کو بھی زندگی کے چھوٹے چھوٹے تفکرات سے نجات ملے اور وہ مہمات امور میں مردوں کے دوش بوش کام کر سکیں۔

اس سلسلہ میں فلاطون نے مرد و عورت کی مساوات پر بڑی دلچسپ بحث کی ہے۔ اس کے معاصرین غالباً اسی تجویز پر سب سے زیادہ بھڑکے ہونگے۔ اس لیے کہ یونان میں عورتوں کی حیثیت وہ تھی جس سے ہم مشرقی ممالک کے لوگ خوب آشنا ہیں۔ یونانی زندگی مردوں کی زندگی تھی جو تہیں گھروں کی چار دیواری میں رہتی تھیں اور گھر کی دیکھ بھال کھانے پکانے اور بچے دینے کا کام کیا کرتی تھیں۔ سیاست میں نہیں بالکل دخل نہ تھا۔ اس مساوات کے اصول کو منوانا منطقی طور پر فلاطون کے لیے ضروری نہ تھا۔ وہ جو ریاست میں ہر ایک کو اپنا وظیفہ مخصوص دینا چاہتا تھا اور جس نے پورے محنت کش طبقہ کے طبقہ کو سوائے دولت افزئی کے اور کسی ذہنی شغل کا اہل نہ جانا وہ آسانی سے عورتوں کے لیے وہی وظیفہ مخصوص کر سکتا تھا جو اس وقت کی سوسائٹی نے انھیں تفویض کر رکھا تھا۔

نظام ہر ایسا نہ کرنے کی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک تو شاید یہ ہو کہ یونان میں دیونیسس مذہب کے فروغ دینے میں عورتوں کا حصہ مردوں سے کم نہیں کچھ زیادہ ہی تھا۔ حال اور جذب میں مذہب کے ساتھ والہانہ شہیتگی میں اور اس کی خاطر جسمانی تکلیفیں دہشت کرنے میں عورتیں مردوں کے آگے ہی تھیں۔ فلاطون جس نے یہ دیکھا تھا کیوں سیاسی زندگی میں بھی انھیں برابر کا موقع دینے نہیں بلکہ ان سے



برابر کا کام لینے کا فیصلہ کرتا، دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ کے ذہنی اور سیاسی ہیجان سے  
 حرم سر کی عزت نشین خواتین یوں بھی متاثر ہو چکی تھیں۔ اس میں اکثر جگہ عورتوں نے خانگی اور سے  
 علاوہ وسیع تر معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا تھا۔ اس زمانے کے ادب میں خود یونان میں بھی عورتوں  
 کو گھر سے باہر نکل کر عام زندگی میں مداخلت کرنے کے تذکرے اور اشارے ملتے ہیں بلکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ عام  
 انتشار و بظلمی میں لوگ یہ سوچنے لگے تھے کہ چلو آخری آزمائش بھی کر دکھیں، مردوں کو دیکھ چکے اب یہی  
 سہی عورتوں کے ہاتھ میں سائست پدیں! اس نئے فلاطوں نے بھی جو بنیادی صلاح کا علم بردار تھا اور  
 نئے اصولوں پر سہیت اجتماعی کی جدید تشکیل چاہتا تھا، عام روایات اور رسم کے خلاف اس مساوات مرد و  
 زن کی حمایت کی جو خاندان اور ممالک شخصی کو ٹھانے کی ہمت رکھتا تھا وہ عورت مرد کے فرق کو کیوں نہ کا لعموم  
 مشترک ممالک مشترک خاندان اور مساوات مرد و زن کی تجویزیں اس قح انقلابی ہیں کہ ”سائست“ کے اکثر  
 پڑھنے والوں کی زیادہ تر توجہ ان کی طرف منعطف ہو جاتی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ اشتراک کے یہ مسائل  
 پیش کرنا ہی اس کتاب کا اصل مقصود ہے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں۔ اس لیے کہ فلاطوں کے نزدیک اس  
 نظام اشتراک کی حیثیت اصولی نہیں بلکہ ذریعہ ہے۔ فلاطوں جانتا تھا، اور ارسطو اور اس کے آئندہ  
 معتقدین کی ایک طرف تنقید اور نکتہ چینی سے پہلے جانتا تھا، کہ سائست ذہن انسانی کی ایک خارجی  
 تشکیل ہے، اس لیے اس کی حقیقی صلاح ذہن ہی کی صلاح سے ممکن ہے۔ گویا ارسطو اور متبعین ارسطو  
 کا اصرار کہ نظام معاشی میں تبدیلی بے سود اور غیر ضروری ہے، سچی صلاح صرف تعلیم کی صلاح سے ہوتی ہے  
 دراصل پڑھے کو پڑھانا اور سیکھے کو سکھانا ہے۔ ہاں مگر فلاطوں یہ بھی جانتا تھا کہ ذہن انسانی اپنے ماحول سے  
 ضرور متاثر ہوتا ہے۔ اور اگر عدل ایک حالی کیفیت، ایک ذہنی عادت سے عبارت ہے جس کی وجہ سے ہر آدمی  
 بس اپنا مخصوص وظیفہ پورا کرنا چاہتا ہے تو اس کیفیت، اس عادت کی کما حقہ سختگی کے لئے ضرور ہے کہ جن  
 حالات میں ذہن پرورش پائے وہ اس کے نشوونما کے لیے مضر اور مخالف نہوں۔ فلاطوں کے نزدیک اس



عادت کے نشوونما پانے اور راسخ ہونے کے لیے سب سے مساعد حالات ایک اشتراکی نظام ہی میں ممکن ہیں اس لیے اس نے یہ نظام پیش کیا ہے جس کا تامل مقصد یہ ہے کہ تعلیمی نظام کو اپنے نتائج حسنہ کے پیدا کرنے میں خارجی ماحول کی مخالفت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

فلاطون کی اشتراکی تجاویز سے ایک غلط فہمی اور پید ہوتی ہے۔ اس وقت چونکہ اکثر ممالک میں معاشی زندگی کا ایک اشتراکی مسکاہ فترتہ رواج پاپا ہے اس لیے فلاطون کی تجاویز کو ذرا سطحی نظر سے دیکھنے والے اس کے نظام معیشت کو جدید اشتراکی نظام سے ملا دیتے ہیں جو صحیح نہیں۔ فلاطون کے اشتراک کو جدید اشتراک سے دور کی نسبت بھی نہیں ہے۔ اشتراک جدید یورپی ہیئت اجتماعی کے لیے ایک تجویز ہے اور فلاطون کا اشتراک مایست کے صرف ایک مخصوص طبقہ کے لیے جدید اشتراک دولت آفرینی کا سارا کام مایست کے سپرد کرنا چاہتا ہے، فلاطون کے نظام میں دولت آفرینی بدستور افراد ہی کے سپرد ہے اور اس مجوزہ نظام کا براہ راست کوئی اثر کسی دکاندار، مزدور یا کسان پر نہیں پڑتا۔ جدید اشتراک ہر ایک سے دولت آفرینی کا کام لے کر دولت کو بڑھانا اور پھر اس دولت کو سب میں برابر تقسیم کرنا چاہتا ہے، فلاطون کے اشتراک میں وہ طبقہ جس کے لیے یہ نظام تجویز کیا گیا ہے دولت آفرینی میں حصہ ہی نہیں لے سکتا۔ جدید اشتراک کے پیش نظر ایک معاشی مسئلہ ہے، فلاطون کے سامنے ایک اخلاقی ہم جدید اشتراک سیاسی اور معاشی قوت کا حامل جمہور کو بنانا چاہتا ہے۔ فلاطون کا اشتراک تزکیہ سیاسی کی خاطر اپنے حکمران طبقہ کو معاشی زندگی سے بالکل بے تعلق کرنا چاہتا ہے۔ جدید اشتراک دولت کا اشتراک ہے، فلاطون کا اشتراک ترک دولت کا اشتراک!

اس مہدی تحریر کو اپنے فضل دوست ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ناظم اردو اکادمی جامعہ ملیہ و علی کا شکر ادا کیے بغیر ختم نہیں کر سکتا جن کے مشورہ اور صلاح سے اس جہد اور مقدمہ کی تیاری میں قدم قدم پر مدد ملی۔ ڈاکٹر حسین



# ریاست

## پہلی کتاب

میں کل ارسلن کے بیٹے گلکان کے ہمراہ پائیریس میں دیوی کی پوجا کے لیے گیا تھا۔ اور چونکہ اس رسم کی ابتدا ہی اس روز سے ہونے والی تھی اس لیے دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ کس طرح ادا کی جاتی ہے۔ اثنینا کے خاص بائبل کے جلوس سے مجھے بہت تفریح حاصل ہوئی گو ٹھریں والوں کا جلوس بھی کچھ کم شاندار نہ تھا۔ اداے فریضہ اور ختم مراسم کے بعد ہم شہر واپس آئے تھے کہ کنفیڈر کے بیٹے پالیا کس نے ہمیں دور سے ہم لوگوں کو دیکھ لیا اور اپنے نوکر کو دوڑایا کہ انہیں ٹھہرا لو۔ نوکر نے پیچھے سے میری عبا کھینچ کر کہا کہ پالیا کس فرماتے ہیں کہ آپ ذرا توقف فرمائیں۔

میں :- (مڑ کر) وہ کہاں ہیں؟

نوکر :- ذرا ٹھہریے۔ وہ یہی آپ کے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔

گلکان :- اچھا۔ ہم ٹھہرتے ہیں۔



چند ہی لمحوں میں پالیما ریس نظر آئے۔ گلاکن کا بھائی اومینٹس اور  
نیاس کا بیٹا نائیرلس اور بعض اور لوگ ان کے ہمراہ تھے۔  
پالیما ریس :- (مجھے مخاطب کر کے) آپ غالباً مع اپنے ہمراہیوں کے  
شہر واپس جا رہے ہیں۔

میں :- ہاں آپ کا قیاس غلط نہیں ہے۔

پالیما ریس :- لیکن آپ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہماری جماعت کتنی بڑی ہے۔  
میں :- ہاں بیشک۔

پالیما ریس :- اب آپ یا تو اپنی جماعت کو قوی تر ثابت کریں یا بس  
یہیں ٹھہر جائیں۔

میں :- نہیں یہ کیوں؟ ایک صورت یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہم ترغیب دیکر  
آپ کو آمادہ کر دیں کہ ہمیں جانے دیا جائے۔  
پالیما ریس :- اور اگر ہم آپ کی سُنیں ہی نہیں تو کیا آپ پھر بھی ہمیں قائل  
کر سکتے ہیں؟

گلاکن :- جہلا یہ کیسے ممکن ہے!

پالیما ریس :- تو پھر آپ مطمئن رہیں۔ ہم آپ کی ایک سُنیں گے  
اتنے میں ایدمینٹس نے اپنے رفیق کے مطالبہ کو تقویت دینے کے لیے یہ تذکرہ  
چھیڑ دیا۔ کیوں کچھ اس کی بھی خبر ہے کہ آج شام کو دیوی کے نام پر گھوڑ دوڑنے

والی ہو جس میں سواروں کے باپس مشعلیں بھول گئی۔

میں :- گھوڑوں پر مشعلیں ؛ یہ تو ایک طرف تماشا ہی۔ کیا سوار دوڑنے میں ایک دوسرے کو مشعلیں دیں گے ؛ یا کچھ اور ؟

پالیما ریس :- جی ہاں۔ اور اس کے علاوہ ایک اور رسم بھی تو ادا ہوگی جو آپ کو ضرور دیکھنی چاہیے رات کا کھانا کھا کر ہم سب کے سب یہ رسم دیکھ کر چلیں گے تو جوانوں کا بڑا مجمع ہوگا اور دلچسپ گفتگو کا موقع ملے گا۔ بس انکار نہ کیجیے ٹھہری جائے۔

گلاکن :- بھائی معلوم ہوتا ہے کہ ٹھہرنا ہی پڑے گا۔

میں :- خیر تو پھر جیسی مرضی ہو۔

چنانچہ ہم سب پالیما ریس کے ہمراہ ان کے مکان پر گئے۔ ان کے دونوں بھائی لیسایس اور یو تھینڈ میس، تھریسمیکس اور کلیٹون وغیرہ وہاں موجود تھے پالیما ریس کے والد کیفیلس سے بھی ملاقات ہوئی۔ ایک مدت بعد میں سنے بغیر دیکھا تھا اس لیے زیادہ مسن معلوم ہوتے تھے۔ ایک آرام گرسی پرتھرف رکتے تھے اور کسی فریضہ قربانی کے ادا کرنے کے سلسلہ میں سر کے چاروں طرف ایک پھولوں کا ہار لپٹا ہوا تھا۔ ارد گرد ایک نیم بیضاوی دائرے میں کچھ کریال بڑی تھیں جن پر ہم لوگ بیٹھ گئے۔ نہایت تپاک سے سلام کر کے انہوں نے مجھے یوں مخاطب کیا۔



آپ سے تو ملاقات کا موقع بہت ہی کم ملتا ہے۔ آپ تشریف ہی نہیں لاتے۔ اگر میں چلنے پھرنے کے قابل ہوتا تو بجائے اس کے کہ آپ سے یہاں آنے کی درخواست کروں خود حاضر خدمت ہو جاتا۔ لیکن ضعف اور بڑھاپے کی وجہ سے میں تو شہر جا نہیں سکتا۔ آپ ہی کبھی قدم رنجہ فرمایا کریں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اگرچہ لڈائڈ حیوانی دن بدن رو بہ انحطاط ہیں لیکن گفٹ شنیدگی و لفریبیاں میرے لیے روز بروز بڑھتی جاتی ہیں۔ اس لیے مجھے اُمید ہے کہ آپ میری ہستہ عاکوہ و نہ فرمائیں گے۔ اور اگر عزیز خانہ کو تشریف آوری سے عزت بخشا کریں گے۔ تاکہ ان نوجوانوں کو آپ کی صحبت سے فیضیاب ہونے کا موقع مل سکے۔ ہمارے دیرینہ تعلقات و مراسم کی وجہ سے تکلف کی تو گنجائش نہیں۔

میں بیسے نزدیک اپنے بزرگوں سے گفتگو کا موقع ملنا عین خوش نصیبی ہے۔ ان کی مثال اس رہ نورد کی سی ہے جو اس راہ پر سفر کر چکا ہے جس پر مجھ کو خود چلنا ہے۔ میرا فرض ہے کہ ان سے دریافت کروں کہ آیا راہ ہموار اور سہل ہے یا ناہموار اور دشوار گزار۔ آپ چونکہ اس مقام پر پہنچ چکے ہیں جس کو شاعر منزل پیری کی آستان سے تعبیر کرتے ہیں اس لیے یہی سوال میں آپ سے بھی پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیئے آپ کا کیا خیال ہے آیا زندگی کے آخری منازل تلخ معلوم ہونے لگتے ہیں یا نہیں؟ کیفیتیں یہ ہیں آپ کو اس معاملہ میں اپنے ذہنی خیالات اور جذبات



بتلاتا ہوں۔ یوں تو میرے ہم عمر لوگ اکثر ملتے رہتے ہیں۔ پرانی مثل ہو گئی  
ہم جنس باہمنس پر واز۔ ان صحبتوں میں لوگ عموماً اپنا اپنا دکھڑا روئے ہیں  
کوئی کہتا ہے کہ اب کھایا نہیں جاتا اور کوئی کہتا ہے کہ پیا نہیں جاتا۔ کوئی گلستان  
شباب کی خزاں رسیدگی پر فوجہ خواں ہے اور کوئی جذبات عشق و محبت کی مرد  
پہ ما تم گار۔ ایام گذشتہ کی یاد ان کو ستاتی ہے اور شباب کے بغیر کے نزدیک  
زندگی زندگی ہی نہیں بعض اپنے اعزاک کی طعنہ زنی کے شاک میں اور بڑھاپے کو  
ان تمام آفات کی وجہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک تو یہ الزام غلط ہے  
کیونکہ اگر ضعیفی اور کبر سن ہی ان تمام باتوں کا سبب ہوتا تو پھر میں یا شرا و  
عمر لوگ ان سے کیوں مامون رہتے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں ان سب بلاؤں  
سے محفوظ ہوں۔

مجھے اکثر اس جادو و گار شاعر سونفا کلینز کا قصہ یاد آ جاتا ہے کہ بڑھاپے میں جب  
کسی نے اس سے سوال کیا کہ کیسے اس عمر میں بھی آپ کو عشق و محبت بھائی ہے اور  
اب بھی اس بارہ میں آپ کے محسوسات وہی ہیں جو کبھی پہلے تھے تو اس نے کیا  
خوب جواب دیا تھا کہ خدا کا شکر ہے میں اب اس بلا سے محفوظ ہوں اور میں اپنی  
آزادی پر اسی قدر مسرور ہوں جیسے کوئی ایک وحشی اور بد مزاج آقا سے علیحدہ ہونے  
پر ہوتا ہے۔ یہ الفاظ مجھے اکثر یاد آتے ہیں اور میں اپنے لیے انھیں آج بھی اتنا ہی  
صحیح خیال کرتا ہوں جتنا کہ وہ واقعہ مذکورہ کے وقت تھے۔ اس میں کون شک



کر سکتا ہے کہ عمر کی زیادتی کے ساتھ ساتھ سکون اور آزادی کا احساس بڑھتا جاتا ہے  
 جذبات شہوانی کا تسلط کم ہو جاتا ہے اور ہم ایک ہی نہیں متعدد وحشی آقاؤں  
 کی اطاعت سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ سچ تو یوں ہے کہ تمام سنج و ملال اور اعزاز کی سکاٹوں  
 کا سبب بس ایک ہی ہے اور وہ خود ان کے عادات و خصائل اور خود ان کی طبیعت  
 نہ کہ کبر سنی۔ جس شخص کی طبیعت میں انبساط و سکون ہے اس کے لیے عمر کی زیادتی  
 کوئی بار نہیں۔ لیکن جن لوگوں کی طبائع کی افتاد اس کے برعکس ہے ان کے لیے  
 زما ہمیشہ بابت بھی ویسا ہی گراں ہے جیسے ایام شیب۔

میں نہایت توجہ کے ساتھ یہ ساری تقریریں سن رہا اور اس ارادہ سے کہ یہ  
 سلسلہ کلام جاری رہے میں نے کہا۔ ”بیشک آپ صحیح فرماتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں  
 کہ آپ اپنے ہم عمر لوگوں کو ان باتوں سے قائل نہ کر سکتے ہوں گے۔ کیونکہ غالباً ان کے  
 نزدیک آپ پر جو عمر کی زیادتی گراں نہیں گذرتی اس کا سبب آپ کی فطرت اور  
 طبیعت کی افتاد نہیں بلکہ آپ کا مول ہے۔ اور ہر شخص جانتا ہے کہ ماں و دولت اطمینان  
 و راحت پیدا کرنے کے لیے قوی ذرائع ہیں۔“

کیفیلیس :- آپ کا خیال صحیح ہے۔ بیشک وہ لوگ قائل نہیں ہوتے۔ اور سچ  
 تو یہ ہے کہ ان کی بات میں بھی کچھ سچائی ضرور ہے لیکن اس قدر نہیں جتنی کہ وہ غلطی سے  
 سمجھتے ہیں۔ میں ایسے موقع پر ان لوگوں کو وہی جواب دیتا ہوں جو تھمسٹو کلیس نے  
 ایک سرسبی۔۔۔۔۔ کو دیا تھا۔ آپ نے غالباً وہ قصہ سنا ہو گا۔ سرسبی



اپنے مخاطب کو ملامت کر رہا تھا اور اس کی شہرت اور اس کے محاسن کو ہاشندہ ایشنا ہونے پر محمول کرتا تھا کہ خود اس کے ذاتی جوہر پر تمسکو لکھیں نے کیا خوب جواب دیا کہ "بیشک میں آپ کے ملک کا رہنے والا ہوتا تو مجھے یہ شہرت نصیب نہ ہوتی۔ لیکن آپ تو ایشنا کے ہاشندہ ہو کر بھی یہ ہتھیاز حاصل نہ کر سکتے اسی قسم کا جواب میں ان لوگوں کو دیتا ہوں جو عزت کی وجہ سے زیادتی عمر کشتاکی ہیں۔ بلاشبہ ممکن ہے کہ ایک مفلس و نادار شخص کو باوجود نیک دلی بڑھاپا گراں گذرے لیکن ساتھ ہی یہ بھی تو یقینی ہے کہ ایک بدطینت شخص کے لیے قول سکو قلب کا باعث نہیں ہو سکتا۔

میں :- ذرا یہ تو بتلائیے کہ آپ کی تمام جاہ و دولت خود آپ کی حاصل کردہ ہے یا وراثتاً آپ کو ملی تھی۔

ک :- میری حاصل کردہ، شاید آپ یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اس کا کس قدر حصہ میرا حاصل کردہ ہے۔ میں امور دنیا داری میں اپنے جدا جدا والد بزرگوار کے بین بین ہوں۔ دادا مرحوم کو جس قدر جائداد ملی تھی اسے انہوں نے اپنی حیات میں دو گنا بلکہ تین گنا کر دیا تھا۔ لیکن والد مرحوم کے زمانہ میں اس کا بہت سا حصہ کم ہو گیا۔ چنانچہ میری موجودہ جائداد سے بھی ان کے زمانہ میں کچھ کم رہ گئی تھی جس کے لیے یہ اطمینان کافی ہے کہ میں اپنے وراثت کے لیے اپنے والد کی جائداد کو بلا تخفیف بلکہ کچھ تھوڑے بہت اضافہ کے ساتھ چھوڑ جاؤں گا۔



میں :- میں بھی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ آپ مال و دولت کی طرف سے  
 کچھ مستغنی سے معلوم ہوتے ہیں اور یہ بات اکثر ان لوگوں میں پائی جاتی ہے جن کو یہ  
 چیزیں بلا ذاتی محنت اور کاوش کے وراثتاً مل جاتی ہیں۔ یوں تو بہ خیال افادہ و منافع  
 مال سے کسے محبت نہیں ہوتی لیکن جو لوگ ذاتی کوشش اور زور بازو سے دولت  
 پیدا کرتے ہیں انہیں اس سے کچھ مزید تعلق سا ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ یہ اسے اپنی محنت کا  
 ثمرہ جانتے ہیں اس لیے انہیں دولت سے ایسی ہی الفت ہو جاتی ہے جیسے شاعر کو  
 اپنے شعر سے یا والدین کو اپنی اولاد سے۔ خدا ایسے لوگوں کی صحبت سے محفوظ رکھے  
 ان بھاپروں کے پاس سونے دولت کی مدح سرائی کے کوئی اور عنوان گفتگو  
 ہوتا ہی نہیں۔

ک :- بیشک آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں۔

میں :- ہاں یہ صحیح سہی لیکن یہ تو فرمائیے کہ آپ نے اپنی دولت سے سب  
 میں بڑا کیا فائدہ حاصل کیا؟

ک :- میں آپ کو بتلاؤں تو ضرور لیکن ہر لوگ میرے قول کو باور کرنے پر  
 آمادہ نہیں ہوتے۔ خیر سنئے۔ جب انسان زندگی کی دلچسپیاں ختم کرنے کے بعد  
 قریب لڑک ہوتا ہے تو مختلف خیالات اور تفکرات اس کے دماغ میں پیدا ہوتے ہیں  
 جن افعال کے ارتکاب کے وقت اس کو کسی قسم کا خیال بھی نہ ہوا تھا۔ اب ان پر مواخذہ کا  
 خوف اس کو ستاتا ہے۔ عقبتی اور آخرت کی روایات جو اب تک محض اقصانہ معلوم



ہوتی تھیں اس لئے ان کی صحت کا امکان اس کو پریشان کرتا ہے۔ اور یا تو ضعف  
 پیری کی وجہ سے یا اس عالم سے دم بدم قریب تر ہونے کے باعث یہ خیالات  
 روز بروز زیادہ قوی ہوتے جاتے ہیں اس کی روح پر خوفناک شبہات مستولی  
 ہو جاتے ہیں اور بالآخر وہ اپنے اعمال کی نیکی اور بدی کا جائزہ لینا شروع کرتا  
 ہے۔ اعمال شنیعہ کی گرا بناری کے احساس کے ساتھ ہی قوت متخیراُس کے سامنے  
 اس کے مستقبل کو تاریک ترین شکل میں پیش کرتی ہے اور وہ حزن و خوف کی  
 زیادتی کے باعث بچوں کی طرح نیند میں ڈر کر چونک چونک پڑتا ہے۔ لیکن اگر وہ  
 اپنے دامنِ عمل کو گردِ عصیاں سے پاک پاتا ہے تو امید جزا اُس کے ایام پیری کو  
 پرسکون بنا دیتی ہے۔ پندار نے کیا خوب کہا ہے ”اُس اور امید ان لوگوں کی روحوں  
 کو پرورش کرتی ہے جو عدل اور تعدد س کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ ان کی تشریح  
 راہ ہوتی ہے اور ایام پیری میں مونہ نہ جان نواز کا کام کرتی ہے۔ انسان کی غیرت  
 اور پریشان روح کو سکون بخشنے کے لیے اس سے قوی تر اور کون طاقت ہے؟“  
 ہر شخص کے لیے تو نہیں لیکن ایک نیک خصلت انسان کے لیے دولت کی جیسے  
 سب میں بڑی برکت ہے کہ اُس سے ارادہ یا بلا ارادہ جمل و فریب سے محفوظ رکھتی ہے  
 اور راہی عدم ہوتے وقت اُس کی روح ان خیالات سے پریشان نہیں ہوتی  
 کہ اس کی گردن پر کسی کے قرض کا بوجھ ہے یا کسی دیوتا کی ستہ بانی واجب الادا  
 رہ گئی ہے۔ دولت اس سکون قلب و راطمینان روح کے حصول میں بڑی حد تک



مدد کرتی ہے اور اگر مقابلہ کیا جائے تو میرے نزدیک دولت کا یہ فائدہ کہ اس سے  
 انسان کو عدل کرنے میں مدد ملتی ہے (دوسرے فوائد سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔  
 میں :- سبحان اللہ! کیا نکتہ بیان فرمایا ہے لیکن آپ نے اس تصور  
 میں عدل کا جو ذکر کیا اس سے کیا مطلب ہے کیا اس کا منشا صرف راستبازی  
 اور ادائیگی تفرض ہے اور کیا اس تعریف میں مستثنیات نہیں؟ مثلاً فرض کیجئے  
 کسی دوست نے بہ ثبات عقل و ہوش میرے پاس کچھ ہتھیار امانت رکھوائے۔  
 کچھ عرصہ بعد اس بیچارہ کا دماغ خراب ہو گیا اور اسی حالت میں اس نے مجھ سے ان  
 ہتھیاروں کا مطالبہ کیا۔ کیا میرا فرض ہے کہ میں یہ امانت واپس کروں؟ غالباً  
 کوئی نہ کہیگا کہ میں ایسا کروں اور اگر میں کروں تو شاید کوئی شخص اسے بظراحتساب  
 نہ دیکھیگا۔ اسی طرح یہ بھی مناسب نہیں کہ متذکرہ بالا کیفیت میں اس شخص سے  
 ہمیشہ راستبازی کی جائے۔

ک :- آپ بجا فرماتے ہیں۔

میں :- یعنی راستبازی اور اعلیٰ قرض عدل کی صحیح تعریف نہیں ہے۔  
 پانچواں کس :- ربات کاٹ کر، کیوں؟ اگر آپ سائمانڈس پر کچھ بھی اعتبار  
 کریں تو پھر ہی صحیح تعریف ہے۔

ک :- ذرا قربانی کا انتظام کرنا ہے اس لیے مجھے تو اجازت دیجئے پانچواں کس  
 اور دیگر حاضرین سلسلہ گفتگو کو قائم رکھیں گے۔

میں :- ہاں کیوں نہیں، یہ حق تو انھیں وراثتاً پہنچتا ہے اور اگر پرنس تو انڈیا پر  
تمام کنند،  
ک :- جی ہاں۔

اور یہ کہہ کر مسکراتے ہوئے رسم قربانی کی ادائیگی کے لیے چلے گئے۔  
میں :- (پاپیما رگس سے) اچھا تو فرمائیے آپ کے سائیمانڈس صاحب کیا  
کہتے ہیں۔

پ :- بقول اس کے ادائے قرض یا واجب الادا اشیاء کی واپسی عدل ہے  
اور میری رائے میں اس کا یہ قول صحیح ہے۔

میں :- سائیمانڈس جیسے فہم اور دانشمند شخص کی رائے سے اختلاف  
کرنا میرے لیے باعث تکلیف ہے۔ لیکن کیا کروں میں اس کا اصلی مفہوم سمجھنے سے  
قاصر ہوں۔ شاید آپ اس کا مطلب سمجھ گئے ہوں۔ کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ اس کے  
نزدیک بھی یہ ہرگز مناسب نہ ہو گا کہ اختلاف و مانع کی صورت میں ہتھیاروں کی  
امانت کسی شخص کو واپس کی جائے۔ لیکن اس سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ  
امانت واجب الادا ہوتی ہے۔

پ :- ہنیک۔

میں :- تو اگر امانت رکھوانے والے کا دماغ صحیح حالت میں نہ ہو تو مجھ پر امانت  
کا واپس کرنا واجب نہیں ہے۔



پ :- ہرگز نہیں۔

میں :- کیا سائیمائڈس نے اپنی تعریف میں یہ مثال شامل نہیں کی تھی اور وہ جو اولے قرض کو عدل سے تعبیر کرتا ہے تو اس کا مفہوم کچھ اور ہے؟  
پ :- بیشک اور ہے کیونکہ اس کے نزدیک دوست کا فرض ہے کہ دوست کے ساتھ ہمیشہ نیکی کرے اور بدی سے باز رہے۔

میں :- تمہاری رائے میں اگر میرے پاس کسی دوست کے زر و جو اہر امانتاً رکھے ہوں اور ان کی واپسی سے اس دوست کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں اس امانت کا واپس کرنا اور اسے قرض نہیں ہے۔ غالباً آپ کے خیال میں سائیمائڈس کا یہی مطلب ہے۔

پ :- جی ہاں۔

میں :- پھر کیا دشمنوں کو ان کی واجب الادا چیز واپس دینی چاہیے یا نہیں؟  
پ :- بیشک دینی چاہیئے۔ لیکن ایسے خیال میں دشمن کے لیے تو برائی ہی واجب الادا یعنی مناسب ہے۔

میں :- گویا سائیمائڈس نے شرار کی طرح عدل کی تعریف اور نیکی بہت صاف الفاظ میں بیان نہیں کی بلکہ اسے ایک چیتاں اور سمہ بنا دیا۔ کیونکہ اس کا مطلب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ فریق ثانی کو وہ چیز دی جائے جو اس کے لیے مناسب ہے اور اس مناسب شے کا نام اسے واجب الادا چیز یا قرض رکھا ہے۔

پ :- غالباً اس کا مطلب یہی ہے جو آپ فرماتے ہیں۔

میں :- لاریب۔ لیکن اگر اس سے کوئی یہ پوچھتا کہ فن طب کو کنسی مناسبت  
پہنچا دیتا ہے اور کسے دیتا ہے تو وہ کیا جواب دیتا۔

پ :- اس کا جواب یقیناً یہ ہوتا کہ فن طب اجسام انسانی کو ادویہ اور  
اغذیہ دیتا ہے۔

میں :- اور فن طب تباخی کیا دیتا ہے اور کسے؟

پ :- غذا کو ذائقہ۔

میں :- تو پھر عدل کیا دیتا ہے اور کسے دیتا ہے؟

پ :- اگر اسی تمثیل کے مطابق جواب دیا جائے تو عدل اس فن کا نام ہے  
جو احباب کو خیر اور فائدہ اور اعدا کو شر اور نقصان دیتا ہے۔

میں :- اچھا تو عدل سے سائینا ندیس کا یہ مطلب ہے؟

پ :- میں تو یہی سمجھتا ہوں۔

میں :- زمانہ علالت میں کون شخص احباب کو فائدہ اور اعدا کو ضرر پہنچا سکتا ہے؟

پ :- طبیب۔

میں :- اور اگر سمندر کے سفر میں کسی خطرہ کا سامنا ہو تو کون؟

پ :- نا خدا۔

میں :- ہاں تو وہ کو کنسی صنف اعمال ہے جس میں ایک عادل و منصف شخص



اپنے دشمنوں کو ضرر اور دوستوں کو فائدہ پہنچانے کے قابل ہوتا ہے۔

پ۔ اول الذکر سے جنگ کرنے میں اور مؤخر الذکر سے روابط اتحاد قائم کرنے میں۔

میں :- اچھا ذرا یہ بھی بتلا دیجیے کہ تندرستی میں تو طبیب کی ضرورت نہیں ہوتی  
پ۔ جی نہیں۔

میں :- اور اگر سمندر کا سفر درپیش نہ ہو تو نا خدا کی ضرورت نہیں پڑتی۔  
پ۔ نہیں۔

میں :- اسی طرح زمانہ امن میں عدل و انصاف کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔  
پ۔ میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔

میں :- تو کیا تمہاری رائے میں عدل و انصاف زمانہ جنگ اور امن میں  
یکساں کارآمد ہے۔

پ۔ جی ہاں۔

میں :- جیسے زمانہ امن میں فراہمی غلہ کے لیے زراعت کا کام؟

پ۔ جی ہاں۔

میں :- یا چوتے فراہم کرنے کے لیے موچی کا کام۔

پ۔ بیشک۔

میں :- اسی طرح یہ بتلائیے کہ زمانہ امن میں عدل کی ضرورت کس چیز کی

فراہمی کے لیے پڑتی ہے؟

پ :- معاہدات کی ترتیب اور تکمیل کے لیے۔

میں :- معاہدات سے غالباً آپ کا مطلب کاروبار میں فراہمی شرکت ہے۔

پ :- جی ہاں۔

میں :- لیکن اگر باہر سے شطرنج کھیلنے میں آپ کو کسی شریک کی ضرورت

ہو تو اس کھیل کا ماہر آپ کے لیے زیادہ مفید ہوگا یا ایک عادل و منصف شخص۔

پ :- یقیناً اس کھیل کا ماہر زیادہ مفید ہوگا۔

میں :- اور اگر تعمیر مکان کے سلسلہ میں یہ ضرورت ہو تو معمار زیادہ کارآمد

ہوگا یا ایک عادل و منصف آدمی۔

پ :- معمار زیادہ مفید ہوگا۔

میں :- جیسے ان تمام معاملات میں ان مختلف کاموں کا ماہر زیادہ مفید ہے

وہی ہے یہ فرمائیے کہ عادل شخص کی شرکت کس امر خاص میں زیادہ کارآمد اور

مفید ثابت ہوگی؟

پ :- روپیہ اور مال کے لین دین کے معاملہ میں۔

میں :- صحیح۔ لیکن غالباً استعمال زر کے معاملہ میں تو ایسے شخص کی شرکت

چنداں مفید نہیں۔ کیونکہ مثلاً اگر ایک گھوڑے کی خرید و فروخت کا مسئلہ درپیش ہو

تو ایسی صورت میں کس کا مشورہ زیادہ مفید ہوگا ایک عادل شخص کا یا ایک



ایسے آدمی کا جو اس معاملہ خاص میں اچھی مہارت رکھتا ہو؛

پ :- بیشک مؤخر الذکر ہی زیادہ مفید ہوگا۔

میں :- اور اگر کوئی جہاز خریدنا ہو تو غالباً ایک صلاح یا ہبازراں زیادہ مفید ہوگا۔

پ :- بیشک۔

میں :- تو وہ کونسا استعمال سیم دزر ہے جس میں ایک عادل شخص زیادہ مفید

ثابت ہوگا؟

پ :- جب آپ کو اپنا روپیہ یا مال حفاظت کے ساتھ رکھوانا ہو۔

میں :- یعنی بہ الفاظ دیگر جب روپیہ بیکار پڑا رہے اور کام میں نہ آئے۔

پ :- جی ہاں۔

میں :- ہاں تو یوں نہ کہئے کہ عدل اُس وقت کارآمد ہوتا ہے جب نقد مال

کو بیکار رکھنا ہو۔

پ :- اور کیا نتیجہ تو یہی نکلتا ہے۔

میں :- اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر آپ ایک آلہ باغبانی کو حفاظت سے

مگر بے کار رکھوانا چاہتے ہیں اُس وقت تو عدل کی ضرورت ہوگی ورنہ اگر استعمال کا

خیال ہو تو ایسی حالت میں فن باغبانی زیادہ مفید اور کارآمد ہوگا۔

پ :- ظاہر ہے۔

میں :- اسی طرح اگر آپ ایک تلوار یا ایک رباب کو بیکار رکھنا چاہیں اُس وقت تو

عدل مفید ہے ورنہ فنون سپہ گری و موسیقی۔

پ: بیشک

میں:- گویا عدل اس وقت مفید ہوتا ہے جب ایشیا بیکار ہوں اور اگر

ان چیزوں کو کارآمد بنا لیتے تو یہ بیکار ہو جاتا ہے۔

پ:- اور کیا۔

میں:- پھر عدل تو کچھ ایسی کارآمد اور مفید چیز نہ ہوئی۔ لیکن ہاں ایک اور

بات تو سنئے۔ اگر کوئی شخص اپنے حریف پر عدلی سے وار کر سکتا ہے تو غالباً وہ

وار بچانے کی قابلیت بھی بدرجہ اتم رکھتا ہوگا؟

پ:- بلاشبہ۔

میں:- اور جو شخص امراض سے محفوظ رہنے اور ان کا علاج کرنیکی قابلیت

رکھتے ہیں وہی امراض پھیلانے کی بھی پوری قابلیت رکھتے ہیں۔

پ:- جی ہاں۔

میں:- جو چوری چھپے سے دشمن کے مکانات پر حملہ کر سکے وہ اپنے مکان

کی خوبی حفاظت بھی کر سکتا ہے۔

پ:- ہاں۔

میں:- یعنی ایک چیز کا عمدہ محافظ اس کا شاطر چور بھی ہوتا ہے۔

پ:- جی ہاں اور کیا؟



میں یعنی جو شخص مال کا اچھا محافظ ہو سکتا ہے اس میں مال چرانے کی بھی صلاحیت ہوتی ہے۔

پ: نتیجہ تو یہی نکلتا ہے۔

میں: تو اس تمام گفتگو کا حاصل یہ نکلا کہ عادل شخص ایک قسم کا چور ہے۔ غالباً آپ نے یہ سبق ہومر سے سیکھا ہے کہ وہ اپنے ایک مدوح (اودسیس کے نانا آوتکلس) کی تعریف کرتے ہوئے فخریہ بیان کرتا ہے کہ وہ چوری اور دروغ خلقی میں اپنے تمام ہم جنسوں میں بے مثل تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہومر اور سائینڈیس کی طرح آپ کی رائے میں بھی عدل ایک قسم کا فن ہے۔ البتہ اسکا مقصد آپ حضرات کے نزدیک احباب کو نفع اور اعدا کو ضرر پہنچانا ہے۔ کیوں آپ کا یہ مطلب تو ہے؟

پ: نہیں میرا ہرگز یہ مطلب نہیں۔ نہ معلوم اثنار گفتگو میں میں کیا کہ گیا۔ بہر حال میں ابھی تک اپنی پہلی تعریف پر قائم ہوں کہ دوست کی مدد کرنا اور دشمن کو ضرر پہنچانا عدل ہے۔

میں: لیکن یہ تو فرمائیے کہ دوست اور دشمن آپ کسے کہتے ہیں؟ آیا وہ لوگ مقصود ہیں جو فی الحقیقت دوست یا دشمن ہیں یا وہ جو بظاہر ایسے معلوم ہوتے ہیں۔

پ: ایک انسان سے یقیناً یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان لوگوں سے

ماتوس ہو جو اس کے نزدیک نیک ہیں اور ان سے نفرت کرے جنہیں وہ بد  
بھتا ہے۔

میں :- لیکن کیا لوگ نیک و بد کی تمیز میں اکثر غلطی نہیں کرتے بہت سے  
آدمی جو حقیقتاً بڑے ہیں بظاہر بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں اور اس کے  
پر غلطی کی شراپے لوگوں پر بدی کا گمان ہوتا ہے۔

پ :- اس میں کیا شک ہے۔

میں :- یہی صورت میں اکثر ایسا ہو گا کہ نیک لوگ ایک شخص کے  
دشمن اور بد لوگ اس کے دوست ہوں۔

پ :- جی ہاں۔

میں :- کیا ایسی حالت میں بدوں کے ساتھ نیکی اور نیکیوں سے بدی  
کرنا جائز ہے۔

پ :- ہاں بظاہر ہی معلوم ہوتا ہے۔

میں :- لیکن نیک لوگ تو عادل ہوتے ہیں اور کوئی غیر منصفانہ بات  
نہیں کرتے۔

پ :- بیشک۔

میں :- تو آپ کی رائے میں ان لوگوں کو ضرر پہنچانا جائز ہے جو غلطی کرتے  
نہیں ہوتے۔



پ :- نہیں۔ نہیں۔ یہ خیال تو اخلاقِ صحیحہ کے بالکل منافی ہے۔  
 میں :- شاید آپ کا مطلب یہ ہے کہ عادل کے ساتھ نیکی اور ظالم کے ساتھ  
 بدی کی جائے۔

پ :- جی ہاں یہ زیادہ مناسب ہے۔  
 میں :- لیکن ذرا اس کے نتائج پر بھی غور کر لیجئے۔ اکثر لوگ فطرتِ انسانی  
 سے ناواقفیت کے باعث ایسے آدمیوں کو دوست رکھتے ہیں جو فی حقیقت  
 برے ہیں۔ کیا ایسی صورت میں ان لوگوں کو چاہیے کہ اپنے احباب کو ضرر پہنچا  
 اسی طرح اکثر نیک لوگوں سے دشمنی بھی ہوتی ہے تو کیا انھیں فائدہ پہنچانے  
 کی کوشش کرنی چاہیے؟ اگر آپ کا جواب اثبات میں ہے تو آپ گویا سائینا ندیا  
 کی تعریف کی مخالفت کرتے ہیں۔

پ :- آپ صحیح فرماتے ہیں۔ لیکن ابتداءً گفتگو میں ہم سے ایک غلطی  
 دوست اور دشمن کے معنی بیان کرنے میں ہو گئی ہے۔ مناسب ہے کہ اس کی تصحیح  
 کر لی جائے۔

میں :- وہ کیا؟

پ :- ہم نے دوست سے مراد وہ شخص لیا تھا جو بظاہر ہمارے نزدیک  
 نیک معلوم ہوتا ہو۔

میں :- اور اب آپ اس غلطی کی تصحیح کیونکر کرنا چاہتے ہیں؟

پ :- میرے خیال میں دوست وہ شخص ہے جو بظاہر ہی نہیں بلکہ حقیقتاً  
 نیک ہو اور اگر وہ فی الحقیقت نیک نہیں تو وہ حقیقی نہیں بلکہ۔ ظاہر ہی دوست  
 ہے۔ اور دشمن کے بارہ میں بھی یوں ہی قیاس کر لیجیے۔

میں :- گویا آپ کے نزدیک صرف نیک لوگ ہمارے دوست اور بد  
 ہمارے دشمن ہیں۔

پ :- جی ہاں۔

میں :- اور اب آپ یہ فرمانے کے بجائے کہ عدل کے معنی دوستوں  
 سے نیکی اور دشمنوں سے بدی کرنا ہیں یہ ترمیم کرنا چاہتے ہیں کہ دوستوں  
 کے ساتھ بشرطیکہ وہ نیک ہوں بھلائی کی جائے اور دشمنوں سے بشرط بدی  
 برائی۔

پ :- جی ہاں۔ یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

میں :- مگر کیا عادل شخص کسی کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے؟

پ :- بیشک۔ اس کا فرض ہے کہ ان دشمنوں کو جو فی الحقیقت بُرے

ہیں ضرور پہنچائے۔

میں :- اچھا ایک بات اور بتلائیے۔ اگر کوئی گھوڑا مجروح ہو جائے تو وہ

ترقی کرے گا یا تنزل؟

پ :- ظاہر ہی تنزل کرے گا۔



میں :- اپنی صفات مخصوصہ میں تنزل کرے گا یا کسی دوسرے اعتبار سے!

پ :- اپنی مخصوص صفات میں تنزل کرے گا۔

میں :- اسی طرح ایک کتاب مخرج ہونے کے بعد اپنی صفات مخصوصہ میں

تنزل کرے گا۔

پ :- جی ہاں۔

میں :- اسی طرح اگر کوئی انسان مجروح ہو یا اُسے ضرر پہنچا یا چاہے تو وہ

ان صفات میں تنزل کرے گا جو انسان کے ساتھ مخصوص ہیں۔

پ :- بیشک۔

میں :- اور کیا انسان کی صفت خصوصی عدل نہیں ہے؟

پ :- یقیناً ہے۔

میں :- مگر یہ تو فرمائیے کہ کوئی ماہر موسیقی اپنے فن سے دوسرے لوگوں کے

طبائع کو غیر موزوں بنا سکتا ہے۔

پ :- یہ کیسے ممکن ہے۔

میں :- اسی طرح ایک شہسوار دوسرے لوگوں کو برا سوار نہیں بنا سکتا۔

پ :- ہرگز نہیں۔

میں :- پھر کیا ایک عادل شخص اپنے عدل کی وجہ سے دوسروں کو غیر

منصف اور ظالم یا ایک نیک شخص اپنی نیکی کے ذریعہ اوروں کو بد بنا سکتا ہے؟

پ :- یقیناً نہیں۔

ہیں :- اور کیا۔ میرے خیال میں تو یہ بات اسی درجہ ناممکن ہے جتنی یہ کہ  
گرمی سے سردی اور خشکی سے تری پیدا ہو۔

پ :- بیشک۔

ہیں :- تو یہ طرہ ہوا کہ نیک آدمی دوسروں کو بد نہیں بنا سکتا۔ اور نیک  
آدمی عادل ہوتا ہے۔

پ :- بیشک۔

ہیں :- گو یاد دست ہو یا کوئی اور عادل شخص کا یہ کام ہرگز نہیں کہ اسے  
ضرر پہنچائے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ تو ظالم اور بے ایمان آدمیوں کا کام ہے۔

پ :- آپ کا خیال بالکل بجا ہے۔

ہیں :- اب غور کیجیے کہ ایک شخص کہتا ہے کہ عدل قرض یا واجب لاد اچیزوں  
کے اوپر کرے گا نام ہی اور اس کے ساتھ یہ تشریح بھی کرتا ہے کہ احباب کے لیے  
واجب لاد اچیز نیکی ہے اور اعدا کے لیے بدی۔ میں تو اس کے قول کو سراسر غلط  
تصور کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ اس میں مجھ سے متفق ہوں گے کیونکہ ہماری  
گفتگو نے طرہ کر دیا ہے کہ کسی کو ضرر پہنچانا عدل کا مرادف نہیں ہو سکتا۔

پ :- میں بیشک آپ سے متفق ہوں۔

ہیں :- تو اب اگر کوئی شخص اس نامعقول قول کو سائماندیں بائیں پتکیں



کی طرف منسوب کرے یا مشاہیر میں سے کسی اور کی طرف تو ہمیں اس کی مخالفت اور تردید کرنی چاہیے۔

پ۔ میں اس حقیقت کے انخساف میں آپ سے بالکل متفق ہوں اور آپ کا ساتھ دینے پر خوشی آمادہ۔

پ۔ میں آپ کو بتلاؤں کہ میرے نزدیک یہ س کا قول ہے؛  
پ۔ فرمائیے۔

پ۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کسی متمول اور باثروت آدمی کا قول ہے جسے اپنی جاہ و دولت پر بہت ناز تھا مثلاً پیری ایندر یا نرکسینز وغیرہ۔  
پ۔ آپ فرماتے تو سچ ہیں۔

پ۔ اچھا یہ تعریف تو غلط ثابت ہوئی۔ اب کیسے عدل کی صحیح تعریف کیا کرے؟  
انہار گفتگو میں تھری میکس بار بار ہماری بات کاٹ کر لو بنا چاہتے تھے لیکن تمام حاضرین مجلس چونکہ ہماری گفتگو کا نتیجہ سننے کے آرزو مند تھے اس لیے انہیں دبا دیا جاتا تھا۔ لیکن جب ہمارا سلسلہ کلام ختم ہوا اور تھوری دیر خاموشی رہی تو تھری میکس چپ نہ رہ سکے اور اپنی تمام قوت مجتمع کر کے مجھ پر حملہ شروع کر ہی تو دیا۔ اور اس شد و مد سے تقریر کی کہ میں سہم سا گیا۔ بہت زور سے چلا چلا کر لگے فرمانے جناب والا۔ یہ آپ کس خط میں پڑے ہیں اور آپ کو آخر یہ کیا حاجت لاحق ہو گئی ہے مگر ماشاء اللہ آپ لوگ ملی کشتی خوب لڑتے ہیں۔ اگر آپ کو فی الواقع عدل انصاف کی ماہیت



دریافت کرنی منظور ہے تو صرف جرح پر اکتفا نہ کیجیے۔ خود بھی تو کچھ فرمائیے کسی کی بات کو رد کر دینا بہت آسان ہے۔ لیکن خود کچھ کہنا مشکل۔ سوال ہر کوئی کر سکتا ہے جواب دینا البتہ سہل نہیں۔ لیکن ہاں یہ پیشے ہی جتنا دونوں کہیں عدل کی کوئی ایسی چلتی ہوئی تعریف نہ کر دیجیے گا کہ یہ کسی جماعت کے اغراض کا نام ہے۔ ایک انسانی فرض ہے یا ایک امرِ مستحسن ہے کثیر المنافع میں ایسی گوں باتوں کو نہیں مانتا۔ میں تو صحتِ صفائی کا طالب ہوں۔“

ان بزرگ نے کچھ ایسے زور شور سے تقریر کی کہ میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی اور اگر آنکھیں نیچی نہ کر لوں تو شاید بالکل جواب دے سکتا مگر جب دیکھا کہ ان کا غصہ تو بڑھتا ہی جاتا ہے تو میں نے مناسب خیال کیا کہ کچھ عرض کروں۔

میں :- جناب من۔ اس درجہ ناراض نہ ہو جیئے۔ ممکن ہے اثنا سے کلام میں مجھ سے یا پاپیہا کس سے کوئی غلطی ہو گئی ہو لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ غلطی ارادۃً نہیں کی گئی۔ سچ فرمائیے اگر ہم دونوں اس وقت ایک سوئے کے ٹکڑے کی تلاش میں مصروف ہوتے تو شاید آپ کو ہمارے ملی کشتی رٹنے کا گمان نہ ہوتا۔ آپ غالباً کبھی یہ نہ خیال فرماتے کہ ایک دوسرے کی خاطر لوگ

لے اشارہ ہو یونانیوں کے عام خیال کی طرف کہ اگر آدمی بھیڑیے سے دوچار ہو جائے اور بھیڑیے کی نگاہ پیلے آدمی پر پڑ جائے اور آنکھ سے آنکھ مل جائے تو آدمی بالکل گونگا ہو جاتا ہے۔



اس قیمتی ٹکڑے کے حصول کے لیے دل و جان سے کوشاں نہیں۔ اگر بیچ کر  
 تو پھر آپ یہ شبہ کیوں کرتے ہیں کہ ہم تلاش حق اور ماہیت عدل کے معلوم کرنے  
 میں ایک دوسرے سے مرثاؤد بجاتے ہیں۔ حالانکہ یہ چیز سولے کے متعدد  
 ٹکڑوں سے بھی بدرجہا زیادہ بیش بہا اور قیمتی ہے۔ برا در عزیزا آپ کا یہ خیال  
 صحیح نہیں کہ ہم تلاش حق میں پوری محنت صرف نہیں کرتے۔ ہم تو سخت کوشا  
 کرنے کو تیار ہیں لیکن کیا کریں اس گنج گرانما یہ کہیں پتہ نہیں چلتا۔ ممکن ہے آپ  
 اس سے واقف ہوں۔ لیکن پھر بھی ہماری لاعلمی پر خفا ہونے کی کیا وجہ  
 آپ کو تو ہم پر افسوس اور حسرت کرنا چاہیے۔

تھریسی میکس :- (حجارت امینز تبسم کے ساتھ) اپنے کس قدر "سقراطیت"  
 فرمائی ہے۔ سبحان اللہ۔ یہی آپ کا مخصوص طرز طعن ہی میں تو پہلے ہی سمجھتا تھا  
 کہ یہ حضرت کسی سوال کا جواب نہ دین گے بلکہ طعن و تشنیع یا کسی اور تدبیر سے اسکو  
 ٹال جائیں گے۔

میں :- آپ تو بڑے دانشمند آدمی ہیں۔ ماشاء اللہ فلسفی بھی ہیں۔ آپ تو  
 خوب سمجھ سکتے ہیں کہ اگر ایک شخص سے پوچھا جائے کہ بارہ کا عدد کیا ظاہر کرتا ہے  
 اور ساتھ ہی اسے منع کر دیا جائے کہ بھائی یہ نہ کہنا کہ بارہ چھ کا دو گنا یا چار کا تین گنا  
 یا دو کا چھ گنا یا تین کا چو گنا ہے۔ تو بچارہ لامحالہ کچھ جواب نہ دے سکیگا۔ اور وہ آپ سے  
 پوچھ سکتا ہے کہ اگر آپ کے سوال کا جواب انھیں میں سے ایک ہو تو پھر میں کیا کروں



کیا بجائے صحیح جواب کے کوئی غلط بات کہوں۔ ایسی صورت میں آپ فرمائیں گے؟  
 ت:۔ آپ تو اس طرح سوال کر رہے ہیں گویا یہ دونوں صورتیں ایک سی ہیں  
 میں:۔ کیا اس میں بھی کچھ شبہ ہے؟ اور اگر بغرض مجال میں تسلیم بھی کروں کہ  
 یہ یکسانیت حقیقی نہیں بلکہ صرف ظاہری ہے تو بھی کیا یہ بیجا بات نہیں کہ آپ ایک  
 شخص کو اپنے حقیقی خیالات کے اظہار سے منع کرتے ہیں۔

ت:۔ کہئے تو آپ کا آخر ارادہ کیا ہے؟ شاید جناب انھیں ممنوع جوابات میں  
 سے کوئی جواب دینا چاہتے ہیں!

میں:۔ کیا عجب ہے۔ ممکن ہے غور کرنے کے بعد میں ایسا ہی کروں۔  
 ت:۔ اور اگر میں ان سب سے بہتر جواب پیش کر دوں تو پھر آپ کی کیا سزا ہوگی  
 میں:۔ سزا؟ میری سزا یا جزا وہی ہوگی جو ہر جاہل بے علم آدمی کی ہوتی  
 ہے۔ یعنی عقلمندوں سے سبق لینا۔

ت:۔ خوب۔ اور کچھ جرمانہ نہ دلوائیگا۔

میں:۔ اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو میں اس کے لیے بھی آمادہ تھا۔  
 گلاکن:۔ آپ روپیہ کا خیال نہ کریں۔ اور تھریسی میکس کو بھی روپیہ کی منکر  
 نہ کرنی چاہیئے۔ سقراط کی طرف سے ہم لوگ روپیہ داکر دیں گے۔

ت:۔ مگر صاحب یہ حضرت تو وہی حرکت کریں گے جو ہمیشہ کیا کرتے ہیں  
 خود جواب دیں گے نہیں اور دوسرے کے جواب کو کسی نہ کسی طرح رو کر دیں گے۔



میں :- عزیز من۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟ وہ غریب کیا جواب دے جو اول تو کچھ جانتا نہیں اور ساتھ ہی اپنے جہل کا احساس بھی رکھتا ہے۔ اور اگر بالفرض وہ کچھ کہنا بھی چاہے تو آپ جیسا قابل شخص اُسے منع کرتا ہے۔ اس لیے مناسب تو یہی ہے کہ وہ شخص جواب دے جو اس معاملہ میں علم کا مدعی ہے اور اپنے خیالات کے اظہار میں آزاد بھی ہے۔ مجھ پر اور جملہ حاضرین پر آپ کی عین عنایت ہوگی اگر آپ عدل کی کوئی تعریف پیش کریں۔

گلا کن اور دیگر حاضرین نے بھی اس درخواست میں میری ہمنوائی کی۔ تھریسی میسز، چونکہ بزعم خود بہت عمدہ تعریف پیش کرنے والے تھے اس لیے دراصل انہما خیال کے لیے تیار ہی بیٹھے تھے لیکن ظاہر داری کے لیے تکلفاً مجھ سے اصرار کرتے رہے۔ لیکن بالآخر جواب دینے پر آمادہ ہو گئے۔

ت :- حضرت سقراط کی عقلمندی تو ملاحظہ کیجئے کہ خود تو کچھ بتاتے نہیں دوسروں سے ہی کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور پھر شکر یہ تک ادا نہیں کرتے۔ میں :- مجھے اس سے ہرگز انکار نہیں کہ میں ہمیشہ دوسروں سے کچھ نہ کچھ سیکھتا ہوں۔ لیکن یہ سراسر غلط ہے کہ میں دوسروں کا احسان نہیں مانتا۔ ہاں میرے پاس چونکہ مال و دولت نہیں ہے اس لیے صرف مرح و تعریف اور اظہارِ شکر پر اکتفا کرتا ہوں۔ اور دور کیوں جائیے میرے بیان کی تصدیق تو ابھی ہوئی جاتی ہے مجھے امید ہے کہ آپ نہایت قابلیت کے ساتھ اپنا جواب پیش کرنا چاہتے ہیں

اور پھر دیکھ لیجئے گا کہ میں جس طرح ہر قابل شخص کی تعریف کرتا ہوں آپ کی داد میں میں بھی مطلق کوتاہی نہ کروں گا۔

ت۔ اچھا تو لیجئے، سنئے۔ عدل فریق قومی کے قائد سے اور منافع اور اس کے اغراض کی پابندی کا نام ہے۔ میرے نزدیک بس یہی عدل کی تعریف ہے، ..... ہاں کچھ فرمائیے نا، اب داد دیجئے تعریف کیجئے۔ مگر آپ کا ہے کو ایسا کرنے لگے۔

میں۔ ایک ذرا ٹھہریئے۔ میں پہلے سمجھ تولوں۔ آخر آپ کا مطلب و مفہوم کیا ہے۔ یہ معنی تو غالباً ہوں گے نہیں کہ چونکہ پائید میں ہم میں سے زیادہ مضبوط اور قوی ہے اور اپنی قوت جسمانی میں اضافہ کے لیے گائے کا گوشت بہ کثرت کھاتا ہے اس لیے ہمارے لیے بھی گائے کا گوشت کھانا مناسب ہے۔

ت۔ آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ الفاظ سے آپ ہمیشہ وہی معنی لیتے ہیں جس سے فریق ثانی کی دلیل مکرور ہو جائے۔

میں۔ آپ کا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ میں آپ کا صرف اصلی مفہوم سمجھنا چاہتا ہوں براہ کرم اپنا مطلب ذرا صاف الفاظ میں بیان کر دیجئے۔

ت۔ بہت اچھا۔ آپ کو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ نظام حکومت کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ کہیں شخصی حکومت ہوتی ہے کہیں طبقہ امراء حکومت کرتا ہے اور کہیں جمہور کی حکمرانی ہوتی ہے۔



میں :- جی ہاں -

ت :- اور آپ غالباً یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ہر ریاست میں حکومت

ی فریق قوی اور طاقت بالادست ہوتی ہے۔

میں :- بیشک -

ت :- یہی نظام حکومت خواہ شخصی ہو، امارتی ہو، یا جمہوری اپنے مختلف اغراض

کا خیال رکھ کر آئین و قوانین کی ترتیب کرتا ہے۔ اور انہیں قوانین کے ذریعہ جو ریاست

کی اغراض کے پابند ہوتے ہیں اپنی رعایا میں عدل و انصاف قائم رکھتا ہے

ان قوانین کی نافرمانی کرنے والوں کو غیر منصف یا ظالم تصور کر کے سزا دیتی

ہے۔ چنانچہ تمام ریاستوں میں ایک ہی اصول عدل و انصاف ہے یعنی حکومت

کی اغراض کا اتباع، اور چونکہ حکومت اور قوت میں چولی دامن کا ساتھ ہوا ایسے

عدل کے معنی صرف فریق قوی کے اغراض کا پاس کرنا ہیں۔

میں :- میں آپ کا مفہوم سمجھ گیا اور اب دیکھتا ہوں کہ جناب کا ارشاد صحیح

ہو یا غلط۔ لیکن ہاں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ابتداء سے گفتگو میں آپ نے

مجھے منع فرمایا تھا کہ عدل کو کسی کی ”غرض“ سے نہ تعبیر کرنا اور اب آپ خود اسے

فریق قوی کے ”اغراض“ کے مرادف قرار دیتے ہیں۔

ت :- میں نے اس لفظ کے ساتھ جو اضافہ کیا ہے کیا وہ آپ کے نزدیک

کچھ اہمیت نہیں رکھتا؟

میں :- خیر اہم ہو یا غیر اہم - یہ تو محض برسبیل تذکرہ تھا - اب تو سوال یہ ہے کہ جناب کا ارشاد صحیح ہی یا نہیں - آپ کے خیال میں عدل عبارت ہے فریق قومی کے اغراض کی پابندی سے - میں اس خیال کا موید نہیں ہوں - اس لیے آئیے ذرا تحقیق کریں -

ت :- بہت اچھا - ضرور -

میں :- عدل و انصاف کا یہ تقاضا ہی یا نہیں کہ رعایا حکام باپنا دست کی اطاعت کرے -

ت :- بلاشبہ ہی

میں :- مگر کیا حکام بالکل معصوم ہوتے ہیں اور ان سے کسی غلطی کا ارتکاب ہو ہی نہیں سکتا -

ت :- نہیں کیوں نہیں - یقیناً ان سے خطا کا احتمال ہے -  
میں :- تو نفاذ قوانین میں بھی ان سے کبھی نہ کبھی ضرور غلطی ہوگی -

ت :- جی ہاں -

میں :- اگر حکومت نے ٹھیک قوانین نافذ کیے تو وہ ضرور ان کے اغراض میں مدد ہوں گے لیکن اگر اس میں غلطی ہوئی تو ان قوانین کا اغراض حکومت کے منافی ہونا بھی ممکن ہے -

ت :- جی ہاں -



میں :- اور یہ آپ فرما ہی چکے ہیں کہ عدل کا تقاضا ہے کہ رعایا تو این جی کو  
کی پابندی کرے۔

ت :- بلاشبہ۔

میں :- یعنی عدل ہمیشہ فریق قوی کے اغراض کے مرادف نہیں بلکہ کبھی  
اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے؟

ت :- یہ آپ کہہ کیا رہے ہیں؟

میں :- کہہ کیا رہا ہوں! آپ کا ہی کہا ڈہرا رہا ہوں۔ ذرا پھر سوچ لیجئے  
کیا آپ نے یہ نہیں تسلیم کیا کہ بعض اوقات ممکن ہے کہ حکومت بالادست غلطی  
سے اپنے اغراض کے منافی قوانین جاری کر دے اور آپ نے یہ بھی تسلیم کیا ہے  
کہ یہ تقاضا سے عدل رعایا کو ہر حکم مجریہ حکومت کی اطاعت کرنا لازم ہے۔ فرمائیے۔  
یہ دونوں باتیں تسلیم کرتے ہیں یا نہیں؟

ت :- جی ہاں کرتا ہوں۔

میں :- اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آپ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اگر نفاذ قوانین  
میں حکومت سے خطا ہو جائے تو ایسی حالت میں عدل فریق قوی کی اغراض کے  
منافی ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر جناب ہی کے ارشاد کے بموجب رعایا پر تمام احکام ریاست  
کی پابندی لازمی ہے تو اس نتیجہ سے کوئی منفر نہیں۔ یہاں تو فریق قوی کمزور جماعت  
سے حکماً ایسے افعال کراتا ہے جو خود اول الذکر کے مفاد کے خلاف ہیں۔

پالیماکس، بیشک۔ یہ تو بالکل صاف بات ہے۔

کلیٹوفن، جی ہاں۔ کیوں نہیں۔ بس آپ ہی کے اعتراف و شہادت کی ضرورت تھی۔

پالیماکس، بھائی اس میں اعتراف یا شہادت کی کیا ضرورت ہے۔

تھریسی میکس نے تو خود تسلیم کیا ہے کہ بعض اوقات حکومت اپنی اغراض کے خلاف قوانین جاری کرتی ہے اور رعایا پر ان کی اطاعت بھی لازم ہے۔

کلیٹوفن، نہیں پالیماکس، تھریسی میکس نے تو یہ کہا تھا کہ حکام کی اطاعت کرنا عدل ہے۔

پ، میں نے مانا لیکن انھوں نے یہ بھی تو کہا تھا کہ عدل طاقتور کے اغراض کا نام ہے۔ اور ان دونوں اصول کے ماننے کے بعد انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ بعض اوقات طاقتور حاکم غلطی سے اپنی کمزور رعایا کے لیے ایسے احکام بھی جاری کر سکتا ہے جو خود حاکم کے لیے مضر ہوں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر کبھی عدل طاقتور کے فائدے کا سبب بنتا ہے تو کبھی اس کے نقصان کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔

کلیٹوفن، لیکن سرین قوی کے اغراض سے تھریسی میکس کا مطلب ان اغراض سے تھا جنہیں سرین خود اپنے لیے باعث نفع تصور کرے۔ کمزور پر ان اغراض کی

پابندی لازمی ہے اور اسی کا نام عدل ہے۔

پالیماکس، تھریسی میکس کے الفاظ سے تو یہ مترشح نہیں ہوتا۔



میں :- خیر یہ تو کوئی ایسی بات نہیں۔ اگر وہ اب بھی اپنی تعریف میں تبدیلی کرنا چاہیں تو میں اُسے قبول کرنے کو تیار ہوں (تقریبی مسکین کو مخاطب کر کے) ہاں تو فرمائیے۔ کیا آپ کا مطلب یہی تھا کہ عدل سے مراد ان اغراض کی پابندی ہے جنہیں طاقتور خود اپنا فائدہ سمجھے خواہ فی الحقیقت وہ فائدہ مند ہوں یا نہوں۔

ت :- نہیں نہیں۔ آپ فرماتے کیا ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ طاقتور فریق سے غلطی ہو جانے کی صورت میں میں اُسے خاص باعتبار اس غلطی کے طاقتور سمجھ سکتا ہوں؟ میں :- میرے نزدیک تو آپ کا یہی خیال ہے۔ اس لیے کہ آپ نے خود ہی تصدیق ہی دیر ہوئی فرمایا تھا کہ حکمراں معصوم نہیں ہوتے اور ان سے غلطی کا ارتکاب ممکن ہے۔

ت :- آپ تو خواہ مخواہ لفظی بحث کرتے ہیں۔ فرمائیے اگر ایک طبیب کسی مریض کے علاج میں غلطی کرے تو کیا یہ عتبار اس سہو یا غلطی کے آپ اُسے طبیب کہہ سکتے ہیں؟ یا اگر کوئی محاسب کسی سوال کے حل کرنے میں غلطی کرے تو کیا باعتبار اس غلطی کے اور اُس غلطی کے ارتکاب کے وقت آپ اس شخص کو محاسب یا رضی دان کہہ سکتے ہیں۔ عام بول چال میں تو اس کو یوں بیان کرتے ہیں کہ فلاں طبیب یا محاسب نے غلطی کی۔ لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ کسی فن کا ماہر جب تک کہ وہ ماہر کے لقب کا مستحق ہے غلطی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ جہاں اس سے غلطی سرزد ہوئی وہ ماہر کہلانے کا اہل نہیں رہتا۔ نظر بریں کوئی ماہر یا عقلمند شخص یا حاکم جب تک وہ ان الفاظ



سے مخاطب کیا جاسکتا ہو غلطی نہیں کر سکتا۔ اور اگر آپ صحت کلام پر اسی درجہ صبر  
ہیں تو میں یہ عرض کرتا ہوں کہ حاکم بہ حیثیت حاکم کے ناقابل سہو و غلطی ہے۔ اور اس لیے  
وہ کبھی اپنے اغراض کے منافی احکام و آئین جاری نہیں کر سکتا۔ بلکہ ہمیشہ ان  
احکام میں اپنی اغراض کا پکس کھتا ہے اور ان احکام کی اطاعت عاید پر لازمی  
ہے۔ چنانچہ میں عدل کی پہلی ہی تعریف پر قائم ہوں کہ یہ قوی ترجاحت کی اغراض  
کی پابندی کا دوسرا نام ہے۔

میں مجھے افسوس ہے کہ آپ کو میری گفتگو عجیب معلوم ہوتی ہے۔ کیسے آپ کا  
یہ خیال تو نہیں ہے کہ میں جو یہ سوالات کرتا ہوں اس کا مقصد آپ کی دلائل کو  
کمزور کرنا ہے۔

ت:- خیال؟ میرا تو یہی یقین ہے۔ بہر حال خدا نے چاہا تو آپ اس طرح مجھ  
شکست دینے میں کامیاب نہ ہوں گے۔

میں:- یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں۔ مگر آئندہ گفتگو میں غلط فہمی  
سے بچنے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہ دریافت کروں کہ آپ لفظ حاکم  
اور قوی کو کن معنوں میں استعمال کرتے ہیں؟ عام مراد جو معنی میں یا اپنے خاص  
بیان کردہ معنی میں۔

ت:- خود اپنے بیان کردہ معنی میں۔ اب چلیے کوئی اور دام پھیلائیے۔  
وہو کا دست بچھے۔ میں آپ سے رعایت کا طالب نہیں۔ نشار اللہ آپ کامیاب رہیں۔



میں :- اگر آپ مجھے اتنا پاگل سمجھتے ہیں کہ میں ایک زندہ شیر کو پکڑ کر اسکی کھال اُتارنے لگوں تو خیر آپ یہ بھی خیال کر سکتے ہیں کہ میں آپ کو دہوکا دینا چاہتا ہوں۔

ت :- خوب۔ اور ابھی ابھی آپ مجھے اپنے دام فریب میں پھانسنے لگے تھے تو اور کیا کرتے تھے؟

میں :- خیر یہ فقرہ بازی بر طرف۔ اب یہ بتلائیے کہ آپ کے بیان کردہ معنی میں حقیقی طبیب کا کام مریضوں کی شفا ہی یا روپیہ کمانا۔ لیکن ذرا اپنے بیان کردہ معنی کا خیال رہے۔

ت :- اس کا کام شفا سے مریض ہر نہ کہ جلب منفعت۔

میں :- ذرا یہ بھی بتلا دیجیے کہ حقیقی ناخدا ملاحوں کا افسر اور حاکم ہوتا ہی یا خود ملاح کا مرتبہ رکھتا ہی؟

ت :- ملاحوں کا حاکم ہوتا ہی۔

میں :- اس بات کا چنداں خیال نہ کرنا چاہیے کہ وہ خود بھی اسی جہاز میں سفر کرتا ہی اور نہ اُسے اس وجہ سے ملاح کہنا چاہیے۔ کیونکہ وہ اس وجہ سے ناخدا نہیں کہلاتا کہ وہ جہاز میں سفر کرتا ہی بلکہ یہ کاٹاپنے ہنر اور باعتبار اس امر کے کہ وہ ملاحوں پر نگرانی رکھتا اور ان کو احکام دیتا ہی۔

ت :- بیشک۔

میں :- آپ کو یہ بھی ضرور معلوم ہو گا کہ ہر فن کسی خاص چیز سے متعلق ہوتا ہے اور اس کی کوئی خاص غرض و غایت ہوتی ہے۔  
ت :- جی ہاں۔

میں :- اور اس غرض کے حصول کے لیے وسائل اور ذرائع فراہم کرنا ہر فن کا مقصد ہوتا ہے؟  
ت :- بجا ہے۔

میں :- اور یہ خیال میں ہر فن کی غرض یہ ہے کہ اپنے سے متعلق چیز کی تکمیل کرے۔

ت :- میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

میں :- اچھا۔ میں اپنا مفہوم ایک تمثیل سے صاف کیے دیتا ہوں۔  
اگر مجھ سے کوئی دریافت کرے کہ انسان کا جسم کانی اور کامل بالذات ہے یا ناقص اور نا کانی تو میں جواب دوں گا کہ انسانی جسم ناقص اور جاہل ہے۔ لیکن ہر اسے کوئی مرض لاحق ہو جائے اور اسے اس سے شفا کی ضرورت پڑے۔ اس کی کمیوں اور نقائص کی تلافی فن طب کرتا ہے اور یہی اس فن کی غایت ہے کہ آپ کی کیا رائے ہے۔

ت :- آپ کا خیال بالکل صحیح ہے۔

میں :- لیکن جس طرح کسی نقص یا عارضہ کی وجہ سے آنکھ کو ضعف بصارت



کی شکایت ہو سکتی ہو یا کان کو ثقل سماعت کی اسی طرح کیا فن طب یا دیگر فن بھی ناقص ہو سکتے ہیں؟ اور کیا کسی فن کو اپنے اغراض کی نگہداشت اور ان کے حصول کے لیے دوسرے فنون کی معاونت درکار ہے؟ یا ہر فن خالصاً اپنی اغراض سے متعلق ہوتا ہے۔ اور چونکہ فن میں خود کسی نقص کی گنجائش نہیں اس لیے دوسرے فنون کی معاونت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جب تک ایک فن حقیقی اور آپ کی بیان کردہ معنی کے اعتبار سے فن ہو اس وقت تک اس میں غلطی یا نقص کا امکان نہ ہونا چاہیے۔

ت۔۔۔ جی ہاں

میں۔۔۔ گویا فن طب کا مقصد خود اپنے (فن طب) کے اغراض کی نگہداشت نہیں بلکہ جسم انسان کی اغراض کی نگرانی ہے۔

ت۔۔۔ جی ہاں۔

میں۔۔۔ اسی طرح فن شہسواری کا مقصد اس فن کی نگہداشت نہیں بلکہ گھوڑوں کی اغراض کا پاس کرنا ہے۔ اور اسی طرح دیگر فنون بھی خود اپنے وجود اور اپنی اغراض کے لیے متفکر نہیں ہوتے کہ ان کو کوئی ضرورت ہوتی ہی نہیں بلکہ ان شہسوار کی بہبودی کو ملحوظ رکھتے ہیں جو ان سے ہمیشہ فن کے متعلق ہیں۔

ت۔۔۔ بیشک۔

میں۔۔۔ لیکن غالباً آپ ضرور تسلیم کریں گے کہ ہر فن اپنے مخصوص موضوع

سے فضل اور سپر حاکم ہوتا ہے۔

تھریسی میکس نے اسے مان تو لیا لیکن بہت ہی تکلف سے۔

میں :- اس گفتگو کا تاثر نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی علم یا فن فریق قوی کے (یعنی خود

پنپنے) اغراض کا خیال نہیں رکھتا بلکہ کمزور فریق (یعنی موضوع متعلقہ) کا۔

تھریسی میکس نے اس کی تردید کی کچھ کوشش کی لیکن بالآخر مان گئے۔

میں :- مجھے امید ہے کہ آپ یہ بھی تسلیم کریں گے کہ ایک طبیب کا فرض

بہ حیثیت حقیقی طبیب کے ہے کہ مریض کی بھلائی کا خیال رکھے نہ کہ اپنے منافع کا۔

طبیب کی حیثیت بادشاہ کی سی ہے اور جسم مریض کی حیثیت رعایا کی۔ اور آپ

تسلیم کر ہی چکے ہیں کہ حقیقی طبیب کو روپیہ کمانے سے کچھ سروکار نہیں۔

ت :- جی ہاں۔

میں :- اسی طرح ناخدا کا کام ہے کہ ایسے احکام دے اور ایسے ذرائع فراہم

کریں کہ ملاحوں کا فائدہ ہو نہ یہ کہ خود اپنے اغراض کا بندہ بن جائے۔

تھریسی میکس نے طوعاً و کرہاً اثبات میں جواب دیا۔

میں :- یعنی کوئی حاکم بہ حیثیت حقیقی حاکم کے کبھی اپنے ذاتی اغراض کا پاس

نہیں کرتا بلکہ اپنے سے متعلق زیر دست جماعت یعنی رعایا کا خیال رکھتا ہے۔ یہی

اس کا مطلقہ نظر ہوتا ہے اور یہی خیال اس کے ہر قول و فعل پر حاوی ہوتا ہے۔

جب سلسلہ گفتگو یہاں تک پہنچ گیا اور ہر شخص پر ظاہر ہو چلا کہ عدل کی جو



تعریف زیر بحث تھی وہ غلط ثابت ہو چکی تو تھر یسی میکس بجائے میرے سوال کا جواب  
 دینے کے کچھ عجیب بے ساختہ پن سے لگے زمانے ”اجی حضرت۔ آپ کی پرورش  
 اور تربیت کے لیے کوئی دایہ بھی ہے۔“

میں :- میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے آپ ایسا بے ربط سا سوال  
 کیوں کر بیٹھے؟

ت :- میں نے یہ اس لیے پوچھا کہ آپ کی دایہ نے شاید آپ کو ناک تک صاف  
 کرنا نہیں سکھایا۔ آپ تو بھیر اور چرواہے میں بھی امتیاز نہیں کر سکتے۔  
 میں :- آپ نے کس وجہ سے یہ نتیجہ نکالا؟

ت :- اس وجہ سے کہ آپ کے نزدیک چرواہا اپنی بھیروں کو کھلا کھلا کر ایڑ  
 موٹا کرتا ہے کہ اُس میں بھیروں کا نفع ہے نہ کہ خود اُس کا۔ اور شاید آپ کے خیال میں  
 حاکم اور محکوم میں پسرواہے اور بھیر کا سا تعلق نہیں ہے۔ اور جناب کا تو یقین معلوم  
 ہوتا ہے کہ حکام دن رات صرف اپنی منفعت کے پھیر میں نہیں پڑے رہتے یہی نہیں  
 بلکہ آپ تو عدل اور ظلم، ایمانداری اور بے ایمانی کے متعلق اس درجہ غلط خیالات  
 رکھتے ہیں کہ آپ کی رائے میں عدل میں حاکم کی غرض مخفی ہی نہیں اور نہ اس میں  
 آپ کے نزدیک رعایا یعنی کمزور جماعت کا کوئی نقصان ہے۔ جناب عالی بے ایمان  
 ہمیشہ بھولے بھالے ایماندار آدمیوں کو دبا رہتا ہے۔ وہ چونکہ قوی اور طاقتور  
 ہوتا ہے اس لیے اس کے زیر دست وہی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جس میں اسکا فائدہ



ہو اور بیچارے بچاے اپنے اس کی تفریح و آرام کا سامان مہیا کرتے ہیں آپ  
 عساف دیکھ سکتے ہیں کہ ایماندار ہمیشہ بے ایمان کے مقابلہ میں نقصان اٹھاتا ہے  
 مثلاً سب سے پہلے ذاتی معاہدوں میں دیکھ لیجئے جب کبھی ایک بے ایمان اور  
 ایک ایماندار میں شہ اکت ہو گئی ہو تو ختم معاہدہ پر بے ایمان کو ہمیشہ ایماندار سے  
 زیادہ فائدہ ہوا ہے۔ نیز دیگر معاملات مثلاً قوانین حکومت کی اطاعت میں  
 بھی وہی نفع میں رہتا ہے۔ مثلاً آمدنی پر جو محصول لگتا ہے اسی کو دیکھ لیجئے مساوی  
 آمدنی ہونے کی صورت میں ایک بے ایمان شخص کو ہمیشہ ایماندار سے کم محصول  
 ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور جب کچھ ملنے والا ہوتا ہے تو بیچارہ ایماندار منہ تکتا رہ جاتا ہے  
 اور بے ایمان سب لے اڑتا ہے۔ مختلف عہدوں پر مامور ہونے کی حالت میں  
 بھی آپ دونوں کا مقابلہ کر لیجئے۔ ایماندار آدمی اپنے فرائض منصبی کی بہ احسن  
 وجہ ادا ایسگی کے خیال سے اپنے خانگی معاملات کی طرف سے توجہ ہٹا لیتا ہے  
 نقصان اٹھاتا ہے اور عامۃ الناس سے کچھ وصول بھی نہیں کرتا۔ اس پر طرفہ یہ کہ  
 اس کے تمام دوست احباب اور اعزاء اس سے ناخوش رہتے ہیں کہ بے ایمانی  
 اور طرفداری کر کے انھیں فائدہ نہیں پہنچاتا برخلاف اس کے بے ایمان آدمی کو  
 اس قسم کی کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ ہاں یہ خیال رہے کہ میں اس بے ایمانی  
 کا ذکر کر رہا ہوں جو بڑے پیمانہ پر ہو اور جس میں جا برو بے ایمان کا نفع بالکل بدی  
 ہو۔ میں آپ کو اس عظیم الشان ظلم اور نا انصافی کی مثال دیتا ہوں جسے حکومت نے



کے نام سے موسوم کرتے ہیں جس میں سب سے بڑا مجرم سب سے زیادہ خوش نصیب  
 انسان ہوتا ہے اور مظلومین کی حالت ناگفتہ بہ جس میں جبر و تعدی جعل و فریب کے  
 دوسروں کی جائزادیں فتنہ رشتہ نہیں بلکہ ایک سخت ضبط کرنی جاتی ہیں۔ اور  
 تمام چیزیں اچھی ہوں یا بُری۔ مقدس ہوں یا نجس، شخصی ملک ہوں یا جماعتی ہب  
 کی سب ایک آدمی کے پاس پہنچ جاتی ہیں۔ اگر کوئی انسان ان افعال میں سے  
 کسی ایک کا مرتکب ہو تو اس کو سخت سے سخت سزا دی جائے اور اس کی  
 سزا تیز لیل ہو۔ لوگ اسے قزاق اور چور، بد معاش اور جھلساڑ کہیں۔ لیکن جب  
 یہی شخص اپنی رعایا کے مال کو غصب کرنے کے علاوہ خود ان کی ذات کو اپنا غلام  
 بنا لیتا ہے تو بجائے بُرا کہنے کے ہر شخص جو اس کے حالات سُنتا ہے حتیٰ کہ خود اس کی  
 مظلوم رعایا تک اسے مبارک ترین انسان تصور کرتی ہے اور یہ صرف اس لیے  
 کہ اس نے ظلم اور بے ایمانی کو آخری درجہ تک پہنچا دیا ہے۔ لوگ جو بے ایمانی کی  
 مذمت کرتے ہیں اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ خود اس سے محفوظ رہیں جو جب  
 سکے وہ اس کے ارتکاب سے پرہیز کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے غالباً یہ بات کافی  
 طور پر واضح کر دی ہے کہ اگر بے ایمانی کافی بڑے پیمانہ پر عمل میں لائی جائے تو وہ  
 عدل سے زیادہ فائدہ مند، طاقتور اور شاندار چیز ہے۔ چنانچہ جیسا کہ میں نے پہلے  
 عرض کیا تھا۔ عدل جماعت قوی کی اغراض کا نام ہے اور بے انصافی اپنے ذاتی  
 فائدہ اور منافع کے مراد ہے۔



انفاظ کی اس طوفان خیز رو کے بعد تھرپسی مکس نے چل ڈینے کا ارادہ کیا مگر حاضرین نے نہ جانے دیا اور اصرار کیا کہ ذرا ٹھہر کر اپنے دعویٰ کا ثبوت دینے جائیں، میں بھی بہت مصر ہوا اور ان سے عرض کیا کہ ”آپ نے اس تقریر میں نہ معلوم کس کس جانب اشارہ کر دیا اور اب یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ آپ بلا اپنے دعوے کا ثبوت دیتے یا اس کا ابطال سننے بغیر یہاں سے تشریف لیجائیں کیا آپ حیات انسانی کے دستور العمل کی ترقیب کو اس قدر غیر اہم کام خیال کرتے ہیں؟

ت۔ میں کب اس کی اہمیت سے انکار کرتا ہوں۔

میں۔ یا پھر آپ کو ہم لوگوں کا کچھ خیال نہیں۔ آپ کو بقول خود ایک ایسی چیز کا علم ہے جس کا علم یا جس سے ہل ہماری زندگی کی تعمیر یا تخریب کا باعث ہو سکتا ہو۔ لیکن آپ غالباً اس کی چنداں پروا نہیں کرتے۔ خدا را اس علم میں اتنے نخل سے کام نہ لیجیے۔ یہاں اس وقت حاضرین کی ایک کافی تعداد ہے اور اگر اس جماعت کو آپ کی ذات سے کچھ فائدہ پہنچ جائے تو آپ کی محنت ٹھکانے لگ جائے گی۔ بہر حال میں ذاتی رائے کا اظہار مناسب سمجھتا ہوں کہ میں نہ اس بات پر عقیدہ رکھتا ہوں نہ میں اس وقت جناب کی تقریر کا قائل ہوا ہوں کہ باوجود انتہائی آزادی کے بھی بے ایمانی میں عدل سے زیادہ منافع ہیں۔ اگر کوئی شخص نہ ہو کہ باڑی یا اپنی طلاق کی وجہ سے پوری سب سے



اور کامل جبر کرنے پر قدرت رکھتا ہے اس حالت میں بھی میں ظلم کو عدل سے زیادہ  
فائدہ مند اور کثیر المنفعت ماننے پر تیار نہیں اور میرا گمان ہے کہ اکثر لوگ اس  
سے میں سے موید ہیں۔ بہت ممکن ہے ہمارا خیال غلط ہو۔ اور اگر آپکی رائے  
میں غلط ہے تو براہ کرم عدل پر ظلم و نا انصافی کی فضیلت ثابت کیجیے۔

ت :- اگر میری گذشتہ تقریر آپ کو قائل نہیں کر سکی تو اب میں اور کیا  
کہہ سکتا ہوں میں کچھ آپ کو ثبوت گھول کر دلا تو دوں گا نہیں۔

میں :- خدا خواستہ میرا یہ مطلب نہیں۔ میں صرف اس قدر درخواست کرتا  
ہوں کہ آپ ذرا اپنی باتوں پر قائم رہیں اور اگر بدلیں تو بلا اعلان بدلیں تاکہ دوسرے  
ناحق غلط نہیں کا شکار نہ ہوں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جب آپ نے طبیب کی تعریف  
کی تھی تو اس کے ایک خاص معنی مقرر کیے تھے، لیکن چرواہے کے معاملہ میں  
آپ اس معنی پر قائم نہ رہے اب آپ کے نزدیک ایک حقیقی چرواہا بھیڑوں کے  
فائدہ کے لیے انکی پرورش نہیں کرتا بلکہ انھیں کسی چوڑے شخص کا لقمہ تر بننے کے  
لیے پالتا ہے یا بحیثیت ایک تاجر کے انھیں بازار میں فروخت کرنے کے لیے موٹا  
کرتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ چرواہے کا کام بحیثیت چرواہے کے صرف اپنے گلے  
کی فلاح و بہبود ہے۔ اس کا فرض ان کی ضروریات کو بدرجہ اتم فراہم کر دینا ہے اور اگر وہ  
بہ تمام ضروریات فراہم کرے تو یہی اس کے فن کی تکمیل کی علامت ہے۔ بعینہ ہی  
بات میں انسانی حکام کے متعلق کہہ رہا تھا۔ میرے نزدیک حاکم کا فرض خصوصی بحیثیت



حاکم کے یہ ہر کہ اپنی رعایا کی فلاح کے تمام ذرائع ہم پہنچاے لیکن اس کے برعکس جناب کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ حاکم اس وجہ سے حاکم بننا اور حاکم رہنا پسند کرتے ہیں کہ ان کو اعزاز اور خستہ کاری حاصل ہوں۔

ت۔۔۔ رائے جناب میرا تو یہ عقیدہ ہے۔

میں۔۔۔ اچھا یہ تو فرمائیے کہ بادشاہ سے نیچے حکومت کے بقدر عہدے میں ان پر لوگ بخوشی و رغبت بلا کسی مشاہرہ کے رہنا کیوں پسند نہیں کرتے؟ شاید ان کے خیال میں حکومت کرنے سے ان کا فائدہ نہیں بلکہ دوسروں کا فائدہ ہی ہے۔ خیر۔ ذرا میرے اس سوال کا جواب دیجیے کہ کیا فنون ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتے باعتبار اس کے کہ ان میں سے ہر ایک کا کام جداگانہ ہوتا ہے۔ مہربانی فرما کر اس بار وہ میں اپنا حقیقی خیال ظاہر فرمائیے تاکہ ہماری تحقیق کچھ آگے بڑھے۔

ت۔۔۔ ہاں ہاں بیشک یہ فرق ہے۔

میں۔۔۔ اور ہر فن سے ایک مخصوص نفع ہوتا ہے۔ مثلاً فن طب سے جسم کی صحت اور تندرستی اور فن جہاز رانی سے سمندر کے سفر میں امن و حفاظت وغیرہ

ت۔۔۔ جی ہاں۔

میں۔۔۔ اسی طرح ایک فن روپیہ یا تنخواہ حاصل کرنے کا ہے۔ لیکن اگر کسی ناخدا کی صحت جسمانی بحری سفر کی وجہ سے اچھی ہو جائے تو اس کی وجہ سے فن جہاز رانی کو فن طب سے مخلوط تھوڑے ہی کر دیں گے۔ بعینہ اسی طرح اس تنخواہ



حاصل کرنے کے فن کو دیگر فنون سے نہ ملانا چاہیے۔

ت۔ ہرگز نہیں۔

میں۔ مثلاً اگر ایک آدمی کو کچھ تتخواہ ملتی ہو اور اس کی صحت بھی اچھی ہو تو اس لیے آپ تتخواہ حاصل کرنے کے فن کو کہیں فن طب سے تو نہ ملا دینگے؟

ت۔ نہیں۔ یہ بھی کوئی بات ہے!

میں۔ یا اگر ایک شخص علاج کرتا ہو اور بطور معاوضہ اجرت لیتا ہے تو اس سے فن طب اور اجرت حاصل کرنے کا فن ایک تو نہ ہو جائے گا۔

ت۔ ہرگز نہیں۔

میں۔ اچھا۔ ہم یہ تو تسلیم کر ہی چکے ہیں کہ کسی فن کا منافع اسی تک محدود رہتا ہے۔

ت۔ جی ہاں۔

میں۔ اس لیے اگر کوئی نفع تمام فنون کے ماہرین میں مشترک ہو تو اس کی وجہ تو کوئی ایسا فن یا کوئی ایسی چیز ہوگی جسے وہ سب کے سب استعمال کرتے ہیں۔

ت۔ اور کیا۔

میں۔ یعنی اگر کسی ماہر فن کو کچھ اجرت یا معاوضہ ملتا ہے تو یہ اس فن مخصوص کے استعمال کی وجہ سے نہیں ہوتا جس کا وہ مدعی ہو بلکہ اس کے علاوہ

اجرت حاصل کرنے کے فن کا بھی استعمال کرتا ہے۔

تھر سی میکس نے کچھ رُک رُک کر اس کو تسلیم کر لیا۔

میں :- گویا اجرت ماہرین کو اپنے فن مخصوص کی وجہ سے نہیں ملتی بلکہ جس

طرح فن طلب کا نتیجہ صحت جسمانی اور فن تعمیر کا نتیجہ تیاری مکان و اسی طرح

اجرت حاصل کرنے کے فن کا نتیجہ حصول اجرت ہے۔ وٹس علی ہذا لیکن اگر کوئی ماہر

اپنے فن کا استعمال کر رہا ہو لیکن اسے کچھ معاوضہ ملے تو اس ماہر کا اس میں کیا

کچھ فائدہ ہے؟

ت :- ظاہر ہے کہ نہیں۔

میں :- لیکن کیا اسپرت یا معاوضہ نہ ملنے کی صورت میں وہ اپنے فن کے

استعمال سے دوسروں کو بھی فائدہ نہیں پہنچاتا۔

ت :- کیوں نہیں۔ ضرور پہنچاتا ہے۔

میں :- تو پھر تھر سی میکس اس بات میں شبہ کی مطلق گنجائش نہیں کہ

حکومت یا فنون کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے اغراض کو پورا کریں بلکہ ہم جیسا

پہلے کہہ چکے ہیں ان کا کام اپنے ماتحت کی ضروریات فراہم کرنا ہے انکا شمار کمزور

کی حفاظت ہے نہ کہ قوی کی طرف داری۔ اور یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص حکومت کے کام

کو از خود ہاتھ میں لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ کسے غرض پڑی ہے کہ بلا معاوضہ ان

خزاہوں کی اصلاح کے لیے اٹھ کھڑا ہو جن سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ کیونکہ فراہم



حکومت کی انجام دہی میں اسے اپنے ذاتی اغراض کا نہیں بلکہ رعایا کا فائدہ  
 مد نظر رکھنا ہوگا۔ چنانچہ حکومت کرنے کی ترغیب دینے کے لیے اجرت یا معاوضہ  
 کے تین طریقے رکھے گئے ہیں۔ اول مال و زر دوسرے عزت اور تیسرے انکار کی  
 صورت میں سزا۔

گلاکن :- آپ کا کیا مطلب ہے؟ میں اول دو طریقوں کو تو سمجھ گیا لیکن تیسرا  
 طریقہ کیا ہے؟ سزا کس طرح معاوضہ کا کام دے سکتی ہے؟  
 میں :- آپ تو اسی چیز کو نہ سمجھے جو قابل ترین اشخاص کو حکومت کرنے  
 پر آمادہ کرتی ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ ان لوگوں کے لیے حرص اور لالچ  
 باعث ننگ ہے؟

گلاکن :- بیشک۔

میں :- اسی وجہ سے مال و زر با عزت کے خاطر تو یہ لوگ اس طرف متوجہ  
 ہوتے نہیں۔ نہ مرہکوں کی طرح یہ روپیہ کے لیے ہات پھیلاتے ہیں۔ اور نہ خزانہ  
 عامہ سے خفیہ طور پر متمتع ہو کر خائن بنا پسند کرتے ہیں۔ اور نہ انھیں عزت کی  
 کچھ زیادہ پروا ہے۔ اس لیے ان کو حکومت کے کام پر لگانے کے لیے بس ایک ہی  
 ذریعہ ہے کہ اس سے گریز کرنے کی صورت میں انھیں سزا کا خوف ہو۔ اور اس سے  
 زیادہ سخت اور کیا سزا ہو سکتی ہے کہ اگر تم خود حکومت نہیں کرتے تو اپنے سے  
 برے اور نالائق آدمیوں کے محکوم بنو۔ یہی خوف ان قابل لوگوں کو حکومت کے

عہدے قبول کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یعنی انھیں ضرورت مجبور کرنی ہے نہ کہ فائدہ اور  
منافع کی خواہش۔ اس ثابت کو باور کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ اگر کسی ملک یا شہر  
میں سب کے سب لوگ نیک و ایماندار ہوں تو وہاں سرکاری عہدوں سے ان لوگ  
رہنے کے لیے اتنا ہی مقابلہ جو ہستنا کہ اس وقت ان کے چاہل کرنے کے لیے ہوتا  
ہے۔ ایسی صورت میں ہم صاف طور پر یہ دیکھ نہیں کہ حاکم اپنے نفع کے لیے نہیں بلکہ  
اپنی رعایا کی بہبودی کے لیے حکومت کرتا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر میں تھریسی مسکیر  
کی تعریف کو غلط خیال کرتا ہوں۔ لیکن خیر۔ اب اس بحث کو چلے دو۔ پھر۔ ان  
حضرت نے ابھی ابھی جو بے ایمانی اور ظلم کی زندگی کو ایمان داری اور عدل کی زندگی  
سے زیادہ فائدہ مند بتلایا تھا اس پر غور کرنا بہت ضروری ہے۔ فرمائیے اس بار  
میں آپ کی کیا رائے ہے۔ آپ کس زندگی کو بہتر سمجھتے ہیں؟

گلاکن :- میرے نزدیک تو عدل و انصاف کی زندگی ہی قابل تحسین ہے  
میں :- کیوں۔ کیا آپ نے وہ فوائد نہیں منے جو تھریسی مسکیر نے نا انصافی  
اور بے ایمانی سے منسوب کیے ہیں؟

گلاکن :- ہاں میں نے تھے ضرور لیکن میں ان سے قائل نہیں ہوا۔  
میں :- تو پھر ہمارا فرض ہے کہ ہم تھریسی مسکیر کو غلطی کا یقین دلا کر انھیں قائل  
کر دیں۔

گلاکن :- بیشک



میں :- لیکن اس کی کیا صورت ہو؟ اگر وہ ایک سبباً تقریر کریں اور میں  
 بھی اس کا ایک لمبا چوڑا جواب دوں تو یہ لازمی ہوگا کہ فریقین اپنے اپنے جوفوں  
 اور منافع پیش کریں ان کا شمار کیا جائے اور اس کے لیے ایک حکم کی ضرورت  
 پیشے گی۔ لیکن اگر ہم بدستور سابق باتوں باتوں میں ایک دوسرے کو قائل  
 کرتے چلیں تو دلیل اور حکم دونوں کا کام ہم خود انجام دے سکتے ہیں۔  
 گلاکن :- بیشک۔

میں :- آپ کس طریقہ کو زیادہ پسند کرتے ہیں؟

گلاکن :- جو آپ مناسب خیال فرمائیں۔

میں :- (تھریسی میکس سے) اچھا تو میں سوال کرتا ہوں آپ جواب دیجئے۔

کیا آپ کے خیال میں کامل ظلم اور نا انصافی پورے عدل اور انصاف سے زیادہ  
 سو بخش ہے؟

ت :- جی ہاں۔ میرا تو یہی خیال ہے اور میں آپ سے اس کے وجوہ بھی عرض

کر چکا ہوں۔

میں :- اور ان دونوں میں سے ایک خیر ہے اور دوسرا شر۔

ت :- بیشک

میں :- یعنی عدل و انصاف خیر ہے اور ظلم و نا انصافی شر؟

ت :- سبحان اللہ! آپ نے کس قدر صحیح اندازہ فرمایا ہے! اے

میں :- کیوں کیا میرا فکس غلط ہے؟ کیا آپ عدل کو شرماتے ہیں؟  
 ت :- نہیں۔ میں اسے انتہائی بھولا پن اور حماقت خیال کرتا ہوں۔  
 میں :- تو ظلم اور نا انصافی کو شاید آپ کیمنہ چالاک کی کہیں گے۔  
 ت :- نہیں بلکہ عاقبت اندیشی۔

میں :- گویا آپ کی رائے میں غیر منصف اور ظالم لوگ نیک اور عقلمند  
 ہوتے ہیں۔

ت :- جی ہاں کم سے کم وہ تو ضرور ہی ہوتے ہیں جن میں کامل بے ابرہہ  
 اور ظلم کی قابلیت ہے۔ یعنی جو ریاستوں اور قوموں کو مطیع کر سکتے ہیں۔ آپ  
 شاید یہ سمجھے کہ میں اچکوں یا گرہ کٹوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ بیشک اگر پکڑے جائیگا  
 اندیشہ نہ ہو تو اس کام میں بھی بہت فائدے ہیں۔ مگر پھر بھی اس کا اس نا انصافی  
 اور ظلم سے کیا موازنہ جس کا ذکر میں نے کیا ہے۔

میں :- میں نے آپ کا مطلب تو سمجھ لیا۔ لیکن مجھے سخت استعجاب اور  
 حیرت ہے کہ آپ ظلم کو عقلمندی اور نیکی سمجھتے ہیں اور عدل کو اس کے برعکس۔  
 ت :- ہاں۔ کیا کیا جائے۔ میرا تو یہی خیال ہے۔

میں :- اب تو آپ کے دلائل کی بنیاد بہت زیادہ قوی ہو گئی اور ان کا  
 جواب دینا تقریباً محال۔ کیونکہ ظلم و نا انصافی کو زیادہ سود مند سمجھنے کے ساتھ ساتھ  
 اگر آپ اسے بدی اور شر بھی خیال کرتے تو اصول موضوعہ کی رو سے آپ کو بائبل



جواب دیا جا سکتا تھا۔ لیکن اب تو آپ ظالم کو قوی و طاقتور اور ساتھ ہی قابل عزت بھی سمجھتے ہیں۔ اور جن صفات سے ہم آج تک ایک عادل اور منصف شخص کو منصف کرتے تھے آپ ان سب کو غالباً ظالم کے ساتھ منسوب کریں گے۔ اور یہ بھلا کیا ہے جب آپ ظلم و نا انصافی کو عقلمندی اور نیکی کہنے ہی سے نہ جھجکے!

ت:- آپ کا خیال صحیح ہے۔ میسر ہی خیالات ہیں۔

میں:- مجھے اس وقت تک اطمینان نہ ہوگا جب تک یہ نہ معلوم ہو جا کہ آپ اپنے اصلی خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ امید تو ہے کہ آپ اپنی صحیح رائے کا اظہار کرتے ہونگے۔ مگر پھر بھی کہیں ہمارا مذاق اڑانا تو منظور نہیں؟

ت:- میں صحیح اظہار خیال کر رہا ہوں یا غلط آپ کو اس سے کیا سڑکا آپ تو میری دلیل کو رد کیجیے۔

میں:- خیر ہی سہی۔ مگر ذرا ایک سوال کا جواب دیجیے۔ کیا ایک عادل شخص کسی دوسرے عادل شخص کے مقابلہ میں خود فائدہ اٹھا لینا جاہتا ہے؟

ت:- خوب! اگر وہ ایسا کرے تو بیچارہ کی حماقت و اہلی کہاں باقی رہی!

میں:- اور کیا وہ کسی منصفانہ طریق عمل سے علیحدہ ہو کر اس کی خلاف ورزی کر سکتا ہے؟

ت:- نہیں۔

میں:- لیکن اگر غیر منصف و ظالم شخص کے خلاف فائدہ حاصل کرنے کی

کوشش ہو تو اس کے متعلق ایک عادل شخص کا کیا خیال ہوگا۔ وہ اس فعل کو منصفانہ سمجھے گا یا نہیں۔  
 ت۔ اس کے نزدیک یہ بات مبنی بر انصاف تو ضرور ہوگی اور ممکن ہو وہ خود اس قسم کا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرے لیکن بیچارہ اس میں کامیاب نہ ہوگا۔

میں۔ کامیابی یا ناکامی کا تو سوال ہی نہیں۔ میں تو صرف دریافت کرتا ہوں کہ جیسے ایک عادل شخص دوسرے عادل شخص کے مقابلہ میں مسابقت سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا کیا اسی طرح ایک ظالم و بے انصاف شخص کے مقابلہ میں بھی فائدہ نہ اٹھانا چاہیگا؟  
 ت۔ کیوں نہیں؟ ضرور چاہیگا۔

میں۔ بر خلاف اس کے ظالم شخص کا کیا طرز عمل ہوگا؟ وہ تو غالباً عادل آدمی کے مقابلہ میں فائدہ بھی اٹھانا چاہیگا اور منصفانہ اعمال کی جلا اور زبرداری پر بھی آمادہ ہوگا؟

ت۔ بیشک غیر منصف تو ہر ایک سے سبقت لیجانے اور زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہی۔

میں۔ حاصل کلام یہ ہوا کہ عادل شخص اپنے مماثل دوسرے عادل شخص سے زیادہ حاصل نہیں کرنا چاہتا لیکن اپنے غیر مثل یعنی غیر منصف شخص سے زیادہ



حاصل کرنے کی ضرورت کو شش کرتا ہے۔ لیکن ظالم اور غیر منصف اپنے مثل اور غیر مثل دونوں سے زیادہ حاصل کرنے کی فکر کرتا ہے۔

ت:- جی ہاں

میں:- اور بقول آپ کے ظالم اور غیر منصف ہی عقلمند اور نیک ہوتا ہے اور عادل اس کے برعکس۔

ت:- بیشک

میں:- یعنی ظالم اور غیر منصف مماثل ہی دانشمند اور نیک کا اور عادل اس کا غیر مثل ہے؟

ت:- بیشک

میں:- اچھا تو ایسے اب فنون سے ایک مثال لیں۔ مثلاً ایک شخص فن موسیقی کا ماہر ہے اور ایک اس سے بالکل نااہل۔

ت:- اچھا۔

میں:- ان میں سے کون دانشمند ہے اور کون نہیں؟

ت:- ماہر موسیقی دانشمند ہے اور دوسرا نہیں۔

میں:- اور ماہر باعتبار علم و دانشمندی کے نیک ہے اور دوسرا باعتبار اہل ہے؟

ت:- بیشک۔

میں:- اور غالباً ہی اسے آپ ایک طبیب کے متعلق رکھتے ہونگے؟

ت :- جی ہاں

میں :- اچھا تو اب یہ بتلائیے کہ جیب ایک ماہر موسیقی اپنے تئار کے  
تاکرستا ہے اور ڈیروم درست کرتا ہے تو کیا ایسی صورت میں وہ کسی دوسرے ماہر  
موسیقی کے بالکل خلاف چلنے کی کوشش یا دعویٰ کرتا ہے؟

ت :- نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتا۔

میں :- مگر وہ ایسے شخص کے خلاف تو چل سکتا ہے جو خود موسیقی کا ماہر نہیں ہے؟

ت :- بیشک۔

میں :- اسی طرح ایک ماہر طبیب دو ایذا کی تجویز میں دوسرے ماہر <sup>طبیب</sup>  
کے مخالف نہیں ہو سکتا۔ اور نہ فن طب کی مخالفت کر سکتا ہے۔

ت :- جی ہاں۔ ہرگز مخالف نہیں ہو سکتا۔

میں :- لیکن وہ ایسے شخص کی مخالفت تو کر سکتا ہے جو خود طبیب نہیں ہے؟

ت :- جی ہاں۔

میں :- اسی طرح عمومی حیثیت سے علم اور جہل کے متعلق غور کیجئے ایک  
حقیقی عالم غالباً کبھی دوسرے عالم سے قول و فعل میں اختلاف نہ کرے گا۔ وہ ہمیشہ  
اپنے مثل سے متفق ہوگا۔

ت :- اس سے کون انکار کر سکتا ہے؟

میں :- ہاں۔ اور جاہل کیا کرے گا؟ وہ تو عالم اور جاہل دونوں کی برابر <sup>لغت</sup>  
مخالفت



کرے گا۔

ت :- بیشک

میں :- اور عالم دانشمند ہوتا ہے۔

ت :- ہاں

میں :- اور دانشمند نیک ہوتا ہے۔

ت :- جی ہاں۔

میں :- گو یاد دانشمند اور نیک آدمی کبھی اپنے مثل سے آگے بڑھنے یا مخالفت کرنے کی آرزو نہیں کرتا۔ ہاں اپنے مخالف وغیر مثل سے بڑھنے کی کوشش ضرور کرے گا

ت :- جی ہاں میری خیال ہے۔

میں :- لیکن بد اور جاہل شخص تو بلا امتیاز مثل اور غیر مثل دونوں سے آگے بڑھنے اور زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ت :- جی ہاں۔

میں :- آپ کو شاید اپنا اقرار یاد ہو کہ ظالم اور غیر منصف شخص اپنے مثل اور غیر مثل دونوں سے مخالفت کر سکتا ہے۔

ت :- جی ہاں۔ میں نے یہ اقرار کیا ہے۔

میں :- آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ عادل شخص اپنے مثل کا مخالف نہیں ہو سکتا البتہ غیر مثل کی مخالفت کر سکتا ہے۔

ت۔۔۔ جی ہاں۔

میں۔۔۔ یعنی عادل تو دشمن اور نیک کا مثل ہوا اور ظالم جاہل اور بدکار۔

ت۔۔۔ بیشک نتیجہ تو یہی نکلتا ہے۔

میں۔۔۔ اس طرح عادل نیک و عاقل ثابت ہوا اور ظالم بد اور جاہل یہ تمام باتیں اس قدر آسانی سے تسلیم نہیں کی گئی تھیں جیسے میں لکھ رہا ہوں۔  
 تقریباً سیسے کی جھت و تکرار کے بعد کوئی بات مانتے تھے۔ گرمی کے دن تھے اور انکا  
 تمام بدن پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ کیا عجب کہ یہ عرق نہ دمت ہو کیونکہ اس سے پہلے میں  
 انھیں نادم ہوتے نہ دیکھا تھا۔ اس مسئلہ کے حل ہو جانے کے بعد کہ عدل خیر ہے اور  
 ظلم شر میں آگے بڑھا۔

میں۔۔۔ اچھا یہ مسئلہ تو حل ہوا۔ لیکن آپ کو یاد ہو گا کہ آپ نے ظلم اور قوت  
 کو باہم وابستہ بتلایا تھا۔

ت۔۔۔ جی ہاں۔ یاد ہے۔ آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ میں آپ کی تمام باتیں  
 مان گیا اور سیکرے پاس کوئی معقول جواب نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اگر میں  
 جواب دیتا ہوں تو آپ فرماتے ہیں کہ تم تو تقریباً سیسے کرنے لگے۔ اس لیے یا تو مجھ  
 ادائے مطلب کی اجازت دیجئے۔ ورنہ بس آپ سوال کرتے رہئے اور میں  
 ہاں میں ہاں ملاتا جاتا ہوں۔ بوڑھیاں جب کہانی کہتی ہیں تو بچے ہونکاری بھرتے  
 جاتے ہیں اسی طرح میں بھی ہاں اور نہیں کہتا رہوں گا۔



میں۔ لیکن ذرا اپنی رائے اور خیال کا پاس ہے۔!  
 ت بہ جی نہیں۔ آپ چلیے بھی۔ میں آپ کی خوشنودی کے لیے جواب  
 دیتا رہوں گا۔ آپ اور کیا چاہتے ہیں؟  
 میں:- میں کیا چاہوں گا! آپ کی اگر یہی رائے ہے تو میں سوال کرتا ہوں  
 آپ جواب دیتے جائیے۔

ت:- بہت اچھا شروع کیجیے۔

میں:- عدل اور ظلم کی اعتباری ماہیت معلوم کرنے کے لیے میں صبر  
 وہی سوال کرتا ہوں جو پہلے کیا تھا۔ آپ نے یہ فرمایا تھا کہ ظلم میں عدل کی نسبت  
 زیادہ قوت ہوتی ہے۔ مگر چونکہ اب عدل دانشمندی اور خیر کے مراد ثابت ہو چکا  
 اس لیے یہ بھی طر شدہ ہے کہ عدل میں ظلم سے زیادہ قوت ہے کیونکہ ظلم عبارت ہے  
 جہل و لاعلمی سے۔ لیکن نہیں میں اس مسئلہ پر دوسری حیثیت سے بحث کرنا  
 چاہتا ہوں۔ فرض کیجیے ایک ظالم ریاست ہے۔ کیا ممکن نہیں کہ یہ دوسری  
 ریاستوں کو مطیع کر رہی ہو اور بعض کو مطیع کر چکی ہو۔

ت:- ہاں کیوں نہیں۔ اور جو ریاست ظلم میں کامل تر ہوگی وہی اس کو  
 بہت اچھی طرح کرے گی۔

میں:- میں آپ کے اس خیال کو تو بخوبی سمجھ گیا ہوں۔ لیکن یہ دریافت کرنا  
 چاہتا ہوں کہ اس فاتح ریاست میں جو قوت ہے اس کے لیے عدل کی ضرورت ہے

یاد بلا عدل کے ممکن ہے۔

ت۔ اگر آپ کے خیال کے بموجب عدل دانشمندی ہے تو پھر اس وقت کے لیے عدل ضروری ہے۔ اور اگر میرا خیال صحیح ہے تو عدل کے بغیر ہی یہ وقت ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔

میں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ محض 'ہاں' اور 'نہیں' پر اکتفا نہیں کر رہے ہیں بلکہ نہایت مقبول جواب ارشاد فرماتے ہیں۔  
ت۔ مجھے تو صرف جناب کی خاطر منظور ہے۔

میں۔ یہ آپ کی نوازش ہے۔ براہ کرم یہ تو فرمائیے کہ اگر کسی ریاست یا فوج یا قزاقوں کے ایک گروہ کے مختلف ارکان باہم غیر منصفانہ برتاؤ کرنے اور ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے لگیں تو پھر ان کی جماعت میں کسی وقت عمل کا وجود رہ سکتا ہے؟

ت۔ ہرگز باقی نہیں رہ سکتا۔

میں۔ ہاں۔ اگر وہ ایک دوسرے کو ضرر پہنچائیں اور آپس میں منصفانہ رویہ رکھیں تو باہم مجتمع ہو کر اپنا کام اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں۔  
ت۔ بیشک۔

میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نا انصافی اور بے ایمانی آپس میں پھوٹ اور تفرقہ نفرت اور جنگ و جدال پیدا کر دیتی ہے۔ اور عدل سے پاہمی بگاڑت اور الفت پیدا



ہوتی ہے۔

ت :- اب میں آپ سے کیا جھگڑوں مانے لیتا ہوں۔

میں :- یہ جناب کی عنایت ہے۔ لیکن یہ تو فرمائیے کہ جب نا انصافی ہر جماعت میں باہمی نفرت پیدا کر دیتی ہے خواہ اس کے ارکان عبد ہوں یا حُر تو کیا یہ نفرت ان میں نفاق پیدا کر کے انھیں ہر عمل مشترک کے ناقابل نہ بنا دیگی؟

ت :- جی ہاں۔

میں :- اور اگر یہ نا انصافی بجائے ایک گروہ کے صرف دو شخصوں میں پائی جائے تو کیا وہ باہم لڑتے نہ رہیں گے۔ اور ایک دوسرے کے نیز عادل شخص کے دشمن نہ ہوں گے؟

ت :- بیشک۔

میں :- اور اگر یہی نا انصافی کسی ایک فرد میں پائی جائے تو اس کی عقل کی فطری قوت میں کمی ہوگی یا زیادتی؟

ت :- میسے خیال میں تو اس کی یہ قوت برقرار رہیگی۔

میں :- لیکن کیا نا انصافی کی طاقت ایسی مؤثر نہیں ہے کہ خواہ وہ کسی شہر میں پائی جائے یا کسی فوج میں۔ کسی خاندان میں ہو یا کسی دوسری جماعت میں تو پراگندگی اور پریشانی پیدا کر کے متحدہ عمل کی گنجائش باقی نہ رکھے گی اور سہرح جہاں انصاف اور دوسری نیک چیز کی مخالف ہوگی وہاں خود اپنی بھی دشمن

ثابت ہوگی۔

ت۔ بیشک۔

میں :- اور اگر یہ کسی فرد واحد میں پائی جائے تو کیا اس کا وجود اسی درجہ  
ہلک نہ ثابت ہوگا۔ اول تو یہ خود اس غریب کی ذات کی وحدت و یگانگت  
کو مٹا کر اسے عمل کے قابل نہ رکھے گی۔ اور دوسرے یہ کہ اسے ہر عادل شخص کا اور  
خود اپنا دشمن بنا دیگی۔ کیوں کیا یہ سچ نہیں ہے؟

ت :- بالکل صحیح ہے۔

میں :- میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے نزدیک دیوتا تو یقیناً عادل ہوں گے۔

ت :- فرض کیجئے کہ ہیں

میں :- اگر ایسا ہی تو عادل دیوتاؤں کے مددگار و معاون ہوں گے اور

ظالم و غیر منصف ان کے دشمن؟

ت :- میں آپ کی بالکل مخالفت نہ کروں گا۔ آپ اور حاضرین مجلس خوب

جی بھر کر خطا اٹھالیں۔

میں :- بہت اچھا تو ذرا جواب دینے چاہئے تاکہ ہم لوگ پورے طور پر

مخلوط ہو سکیں۔ یہ تو ظاہر ہو چکا کہ عادل شخص ظالم کے مقابلہ میں بہتر عقل ترا و

قوی تر ہوتا ہے۔ ہم پر بھی بتلا چکے ہیں کہ ظالم اور غیر منصف لوگوں میں مشترک عمل کی

قوت منقود ہو جاتی ہے۔ بلکہ میرے نزدیک تو یہ بھی ممکن نہیں کہ کچھ بد لوگ مل کر



متحدہ کوئی برائی کریں۔ کیوں کہ اگر وہ اپنی بدی میں کامل ہوتے تو آپس میں ایک دوسرے پر ہاتھ صاف کرنے لگتے۔ یہ تو شاید ان میں کوئی عدل کا شائبہ باقی تھا جس نے انہیں متحد کر دیا اور حقیقتاً وہ اپنی کارروائی میں نیم بد تھے۔ بے ایمانی میں کامل ہونے کے ساتھ ہی وہ عمل کے قابل نہ رہتے۔ میرے خیال میں یہی حقیقت امر ہے۔ ہاں یہ بہتہ دوسرا سوال ہے کہ غیر منصف و ظالم کی نسبت ایک عادل شخص کی زندگی بہتر اور خوشتر ہوتی ہے یا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وجوہ مذکورہ بالا سے یہ بات معلوم ہو گئی ہوگی کہ عادل شخص ہی کی زندگی خوشتر ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی اس کی مزید تحقیق ضروری ہے کہ مسئلہ زیر غور کوئی معمولی مسئلہ نہیں۔ یہ تو انسانی زندگی کا دستور العمل مرتب کرنا ہے۔

ت :- اچھا تو آگے چلیے۔

میں :- میں آپ سے ایک چھوٹا سا سوال پوچھتا ہوں۔ آپ کی رائے میں گھوڑے کا کوئی خاص مقصد یا استعمال ہے؟

ت :- جی ہاں۔

میں :- اور یہ استعمال ایسا ہوگا کہ اسے یا تو دوسری چیزیں بالکل انجام نہ دے سکیں اور یا کم سے کم اس درجہ خوبی اور آسانی سے نہ کر سکیں۔

ت :- میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

میں :- میں بتلاتا ہوں۔ کیا آپ آنکھوں کے بغیر دیکھ سکتے ہیں؟

ت۔ نہیں

میں۔ یا کانوں بغیر سن سکتے ہیں؟

ت۔ ہرگز نہیں۔

میں۔ تو پھر ہی ان اعضاء کا مقصد کیا استعمال ہے۔

ت۔ جی ہاں

میں۔ لیکن اگر آپ کو ایک پوٹے کی ڈالیاں ترشہنی ہوں تو آپ یہ کام

ایک تلوار یا خنجر یا اور بہت سے آلات سے کر سکتے ہیں۔

ت۔ ہاں۔

میں۔ مگر کوئی آلہ اس خوبی سے شاخ کو نہیں تراش سکتا جیسے وہ قلعچی

جو خاص اس کام کے لیے بنائی جاتی ہے۔

ت۔ بیشک۔

میں۔ تو یہی اس قلعچی کا مقصد ہوا۔

ت۔ جی ہاں۔

میں۔ اب غالباً آپ کو اس کے سمجھنے میں چنداں وقت نہ ہوگی کہ کسی

چیز کا مقصد وہ کام ہے جو دوسری چیز یا تو بالکل انجام نہ دیکے یا اس قدر خوبی سے نہ

انجام دے۔

ت۔ میں سمجھ گیا آپ صحیح فرماتے ہیں۔



میں۔ ہر چیز جس کا کوئی مقصد ہوتا ہے اس میں کوئی مخصوص خوبی بھی ہوتی ہے۔ مثلاً آنکھ کا ایک مقصد ہے۔

ت۔۔ جی ہاں ہے۔

میں۔۔ اور اس میں ایک خوبی بھی ہے۔

ت۔۔ ہاں۔

میں۔۔ اسی طرح کان کا ایک مقصد ہے اور اس میں ایک مخصوص خوبی بھی ہے۔

ت۔۔ بیشک۔

میں۔۔ اور اسی طرح تمام چیزوں کا ایک مقصد ہوتا ہے اور ہر ایک میں ایک خوبی ہوتی ہے۔

ت۔۔ بیشک۔

میں۔۔ لیکن کیا انھیں اپنا مقصد پورا کر سکتی ہیں اگر ان میں اپنی مخصوص خوبی کے بجائے کوئی نقص ہو؟

ت۔۔ ہرگز نہیں۔ اگر ان میں بصارت ہی نہ تو کس طرح اپنا مقصد پورا کریں۔

میں۔۔ آپ کا مطلب ہے کہ اگر ان کی مخصوص خوبی یعنی بصارت جاتی رہے

تو وہ اپنا مقصد پورا نہیں کر سکتیں۔ اب میں اس سوال کو ذرا زیادہ وسیع معنی میں

دریافت کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ جو چیزیں اپنے مقصد کی تکمیل کرتی ہیں وہ اسی مخصوص خوبی کی وجہ سے کرتی ہیں یا نہیں۔ اور اگر مقصد میں ناکام رہتی ہیں تو اسی خوبی کی

عدم موجودگی کی وجہ سے۔

ت:- بیشک۔

میں:- یہی اصول قانون پر صادق آتا ہے۔ اگر ان کی مخصوص خوبی جانی ہے تو ان کا مقصد فوت ہو جائے۔

ت:- بلاشبہ۔

میں:- اور اسی اصول کا دیگر اشیا پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔

ت:- جی ہاں۔

میں:- ہاں تو کیا روح کا کوئی خاص مقصد نہیں ہوتا؟ مثلاً اجر لے، حکام غور و فکر اور نگرانی اعمال۔ کیا یہ روح کے مخصوص فرائض نہیں اور کیا انہیں کسی دوسری چیز سے وابستہ کیا جاسکتا ہے؟

ت:- نہیں یہ کسی اور سے متعلق نہیں کیے جاسکتے۔

میں:- اور کیا خود زندگی اور حیات روح کا کام نہیں۔

ت:- بلاشبہ ہے۔

میں:- مگر کیا روح میں کوئی مخصوص خوبی نہیں ہوتی؟

ت:- ضرور ہوتی ہے۔

میں:- کیا اس خوبی سے محروم رہ کر وہ اپنے مقاصد کو پورا کر سکتی ہے؟

ت:- ہرگز نہیں۔



ہیں۔ تو فطرتاً ایک بُری روح بُری حکمراں ہوگی اور ایک صالح روح اچھی حکمراں۔

ت۔ یقیناً۔

میں۔ اور ہم پر قرار کرتی چکے ہیں کہ عدل روح کی خوبی ہے اور ظلم اس کا نقص۔  
ت۔ ہاں ہم یہ مان چکے ہیں۔

میں۔ تو ایک صالح روح اچھی زندگی بسر کرانگی اور ایک بُری روح بُری زندگی۔  
ت۔ آپ کی دلائل سے تو یہی ثابت ہوتا ہے۔

میں۔ اور جو بس کی زندگی اچھی ہو وہی خوش و خرم ہے اور جس کی زندگی بُری  
ہو وہ اُس کا برعکس۔

ت۔ ہاں۔

میں۔ تو عادل اس طرح خوش قسمت اور مسرور ٹھہرا اور ظالم بد نصیب و مغموم  
ت۔ جی ہاں۔

میں۔ اور مسرت ہی فائدہ مند اور سود بخش ہے کہ غم۔

ت۔ بلاشبہ۔

میں۔ تو پھر اسے برا اور عزیز ظلم اور بے انصافی کہی عدل سے زیادہ سود مند  
ثابت نہیں ہو سکتی۔

ت۔ بہت اچھا آپ سمجھ لیجئے کہ اس جشن کے موقع پر یہ سب باتیں تسلیم

کر کے میں نے آپ کی ضیافت کی ہے۔

میں :- میں آپ کا بیحد مشکور ہوں۔ آپ نے خدا کا شکر یہی کہ اب ذرا نرم طریقہ اختیار کیا اور مجھے برا بھلا کہنا چھوڑ دیا۔ مگر سچ پوچھیے تو میری ضیافت پوری نہ ہوئی۔ اور یہ خود میری غلطی تھی۔ جس طرح ایک چٹورا آدمی اپنے سامنے کی ہڑکابی سے تھوڑا تھوڑا کھاتا ہے اور کسی ایک چیز سے پورے طور پر لطف اندوز نہیں ہوتا۔ بعینہ وہی حالت میری تھی کہ میں اپنے اصلی مقصد تحقیق یعنی عدل کی ماہیت دریافت کرنے کے بجائے ایک مضمون سے دوسرے مضمون پر پہنچ جاتا تھا میں نے اصل شاہراہ تحقیق کو ترک کر کے اسپر غور کرنا شروع کر دیا کہ عدل و انصاف خیر ہے یا شر۔ دانشمندی ہے یا بوقوفی۔ اور اس کے بعد جب عدل و ظلم کے فوائد کا مقابلہ کیا پڑا تو میں چپ نہ رہ سکا چنانچہ اس تمام مباحثہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ جب مجھے یہی نہیں معلوم کہ عدل ہے کیا چیز تو میں اس کے خیر و شر ہونیکا یا عادل کے مسرور یا مغموم ہونیکا صحیح اندازہ کس طرح کر سکتا ہوں؟



# دوسری کتاب

میرا گمان تھا کہ اس قدر گفتگو کے بعد میں نے بحث کو ختم کر دیا ہو لیکن یہ انتہا  
 دراصل ابتداء ہی ثابت ہوئی۔ گلاکن تھریسی میس کی اسپانیائی سے کچھ مطمئن نہ تھی  
 اور ان کی دلی خواہش تھی کہ معرکہ فیصلہ کن ہو، یا ادمر یا ادمر۔ چنانچہ مجھ سے فرمانے  
 لگے "جناب سقراط! آخر اس تمام گفتگو سے آپ کا مقصد کیا تھا؟ کیا آپ ہمیں  
 صرف ظاہر اقبال کرنا چاہتے تھے یا دراصل ہم پر اس حقیقت کا انکشاف منظور تھا  
 کہ عادل و منصف شخص ہمیشہ غیر منصف جابر سے بہتر ہوتا ہے!"  
 میں: میری خواہش تو یہی تھی کہ اگر ہو سکے تو آپ لوگوں کو اصل حقیقت

ابھی طرح منوادوں۔

گلاکن: اگر آپ کا مقصد یہ تھا تو آپ ابھی تک اس میں کامیاب نہیں  
 ہوئے ہیں۔ میں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ امور خیر کو کس طرح  
 اصناف و اقسام میں منقسم کریں گے۔ پھرے خیال میں بعض خوبیاں تو ایسی ہیں  
 جنہیں ہم ان کی ذاتی اچھائی کی وجہ سے پسند کرتے ہیں بلا لحاظ ان نتائج اور  
 منافع کے جو ان سے بعد میں حاصل ہوں۔ مثال کے طور پر بے ضرر مسرت و تفریح  
 کو لے لیجئے کہ اس سے ایک وقتی انبساط حاصل ہوتا ہے اور بس اس کا اور کوئی نتیجہ  
 نہیں ہوتا۔

میں۔ جی ہاں۔ میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں کہ خوبوں کی ایک قسم یہ بھی ہوگی۔  
 گ۔ ایک اور دوسری قسم بھی ہو مثلاً علم۔ بصارت تندرستی وغیرہ جو  
 نہ صرف فی نفسہ قابل پسندیدگی ہیں بلکہ اپنے نتائج کی وجہ سے بھی پسند کی جاتی ہیں۔  
 میں۔ بیشک۔ آپ کا یہ خیال بھی صحیح ہے۔

گ۔ اور غالباً آپ ایک تیسری قسم کے وجود کا بھی اقرار کریں گے مثلاً  
 طب و تشریح۔ ورزش جسمانی یا بیماریوں کی خبر گیری وغیرہ نیز دولت کمانے کے  
 مختلف طریقے کہ یہ بذات خود ہر شخص کو غیر مرغوب ہیں اور کوئی بھی بلا خیال ان منافع  
 و مفاد کے جو ان سے حاصل ہوتے ہیں ان میں مشغول نہیں ہونا چاہتا۔

میں۔ جی ہاں۔ یہ تیسری قسم بھی موجود ہے۔ لیکن آپ یہ سوال آخر پوچھ کیوں

رہتے ہیں؟

گ۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ عدل ان میں سے کس قسم سے تعلق رکھتا ہے۔  
 میں۔ میرے نزدیک عدل اقسام متذکرہ میں سے افضل ترین قسم میں شامل ہے جو  
 یعنی وہ ایک ایسا امر خیر ہے جسے مسرت و اطمینان قلب کا ہر طالب اس کی ذاتی  
 خوبی اور نیز اس کے عمدہ نتائج کی وجہ سے پسند کرتا ہے۔

گ۔ لیکن عامۃ الناس اس راسے میں آپ کے مخالف ہیں۔ ان کے نزدیک  
 عدل خوبوں کی اس تکلیف دہ قسم میں شامل ہے جسے لوگ بہ لحاظ منافع و مفاد یا بخیاں  
 شہرت و اعزاز اختیار کرتے ہیں۔ لیکن جو فی نفسہ قابل پسندیدگی بلکہ قابل احترام ہے۔



میں۔ میں عوام کے اس خیال سے بے خبر نہیں ہوں۔ اور اسی دعوے کی بنیاد پر تھریسی میکس ابھی عدل کی ہجو اور نا انصافی کی مدح سرزنی کر رہے تھے لیکن کم سے کم میں تو اس سے قائل ہوا نہیں۔

گ۔ آپ نے جس طرح تھریسی میکس سے اتنی دیر گفتگو فرمائی مجھے اُمید ہے کہ آپ تھوڑی دیر کے لیے میری بات بھی سنیں گے اور مجھے توقع ہے کہ میں آپ کو اپنا ہی خیال بنا لوں گا۔ تھریسی میکس تو آپ کی صدا سے ہوش رہا سے کچھ قبل از وقت مسخ ہو گئے جیسے سانپ مین کی آواز سن کر بچو دہو جاتا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اب تک عدل و انصاف اور جبر و نا انصافی کی اصلیت معلوم نہیں ہو سکی۔ نتائج و مفاد سے قطع نظر کر کے میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ عدل اور نا انصافی کی حقیقی ماہیت کیا ہے۔ اور وہ رُوح انسانی میں کس طرح خموشی کے ساتھ اپنا عمل کرتے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں انہیں

تھریسی میکس کی طرف سے سلسلہ کلام شروع کروں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے میں عدل کی حقیقت اور اس کی ابتدا و اصل کے متعلق عوام کے خیال کا اظہار مناسب سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد میں یہ حقیقت روشن کروں گا کہ جو لوگ عدل پر کار بند ہوتے ہیں اس کی وجہ خود اس طرز عمل کی خوبی نہیں بلکہ ضرورت ہے جو خلاف خواہش ان سے ایسا کرتی ہے۔ تیسرے میں اس خیال کی معقولیت ثابت کروں گا کہ نا انصافی و ظلم کی زندگی بہر حال ہمیشہ مجموعی عدل و انصاف کی زندگی سے بہتر ہے۔ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اپنے ذاتی خیالات کی ترجمانی ہے۔ لیکن کیا کروں جب بار بار تھریسی میکس



اور ان کے دوسرے مہنواؤں کی تقریریں سنتا ہوں تو بڑی پریشانی ہوتی ہے۔  
 خصوصاً اس لیے اور بھی کہ میں نے آج تک نہیں دیکھا کہ کسی نے انکا قابل اطمینان  
 جواب دیا ہو اور ظلم کے مقابلہ میں عدل کی فضیلت صاف طور پر ثابت کر دی ہو۔  
 چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ عدل میں فی نفسہ جو محاسن ہوں صرف وہ بیان کر جائیں  
 اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ ہی اس کام کو احسن و جود انجام دے سکتے ہیں۔ اس لیے  
 پہلے میں نا انصافی و ظلم کے تمام ممکن محاسن آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں تاکہ آپ  
 اس کے جواب میں اور اسی طرز کو مد نظر رکھ کر عدل کے محاسن اور نا انصافی کے معائب  
 بیان فرمائیں۔ غالباً آپ اس طریقہ کو پسند کریں گے۔

میں۔ بلاشبہ۔ بھلا اس سے بہتر اور کونسا مضمون ہو سکتا ہے جس پر ایک  
 معقول شخص خود گفتگو کرنا اور دوسروں کی گفتگو سننا پسند کرے۔  
 گ۔ بہت خوب۔ تو پھر میں پہلے عدل کی ماہیت اور اصل کے متعلق کچھ عرض  
 کرتا ہوں۔

لوگوں کا خیال ہے کہ ظلم و نا انصافی کرنا بذات خود تو اچھی چیز ہے لیکن خود انکا  
 مورد بننا بُرا ہے۔ اور چونکہ یہ بُرائی اچھائی سے بدرجہا زیادہ شدید ہے، اس لیے جب  
 آدمیوں کو نا انصافی کرنے اور نا انصافی سہنے کے دو گونہ تجربے ہوئے اور جب  
 انھیں نا انصافی کرنے کی قابلیت کا ملنا مشکل اور اس سے بچنے کی توقع تقریباً  
 ناممکن نظر آئی تو انھوں نے یہی فیصلہ مناسب سمجھا کہ نہ نا انصافی کی جائے



نہ سہی جائے۔ چنانچہ معاہدات مرتب ہوئے اور قوانین کا نفاذ ہوا، اور ان قوانین  
کی بجائے اور سی کا نام انصاف رکھا گیا۔

ان کے نزدیک تو انصاف کی ابتدائیوں ہوئی۔ بقول ان کے انصاف  
عدل بہترین حالت یعنی ظلم و نا انصافی کرنے اور سزا سے محفوظ رہنے اور بدترین  
کیفیت یعنی ظلم و نا انصافی برداشت کرنے اور انتقام کی قابلیت نہ رکھنے کے  
بین میں ایک راستہ ہے یا ایک درمیانی سمجھوتہ۔ اس کی قدر اس وجہ سے نہیں  
کی جاتی کہ یہ بجائے خود کوئی اچھی چیز ہے بلکہ دو برائیوں میں کمتر درجہ کی برائی  
ہے اس وجہ سے اچھا سمجھا جاتا ہے کہ عام لوگ ظلم کرنے کی قوت اور صلاحیت نہیں  
رکھتے۔ البتہ قوت مدافعت اور قابلیت انتقام ہونے کی صورت میں کوئی انسان  
جو انسان کہلانے کا مستحق ہے اس سمجھوتے کو نہیں مان سکتا اور اگر یہی حالت ہے  
بھی وہ اُسے ماننے تو وہ غریب پاگل ہے۔ جناب عالی، عوام کے نزدیک تو آپ کے  
عدل و انصاف کی اصلی ماہیت یہ ہے۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ عادل و منصف لوگ ارادۃً عدل پر کار فرما نہیں  
ہوتے بلکہ نا انصافی کی طاقت و قابلیت نہیں رکھتے اس لیے مجبور ہوتے  
ہیں۔ اس بیان کی صحت کا اندازہ کرنے کے لیے فرض کیجیے کہ دو شخص ہیں ایک  
منصف اور ایک غیر منصف۔ اور دونوں کو کامل آزادی اور اختیار حاصل ہے کہ  
جو چاہیں کریں۔ پھر دیکھیے ان کی خواہشات انہیں کدھ لے جاتی ہیں۔ آپ کچھ



ہیں گے کہ دونوں بعینہ ایک راستہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ یعنی اپنی اغراض کی  
 پابندی کرتے ہیں کہ ہر شخص اسی میں اپنا بھلا خیال کرتا ہے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا  
 کہ قوانین کی پابندی کی وجہ سے لوگ مجبوراً عدل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ  
 مفروضہ زادی اور اختیاران لوگوں کو یہی حالت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ  
 انہیں بھی وہی چیز نصیب ہو جو مشہور فسانہ میں جائیجیس (Jaijais) کو میسر  
 روایت ہے کہ جائیجیس شاہ لیدیا کی سرکار میں ایک چرواہا تھا۔ ایک دن سخت  
 طوفان اور زلزلہ آیا۔ جس جگہ یہ اپنی بھیریں چراہا تھا زمین شق ہوئی اور ایک  
 بڑا غار ہو گیا۔ تھیر و استعجاب کے عالم میں یہ اُس غار میں اُترا۔ منجملہ دیگر جاننا  
 کے ایک پتیل کا گھوڑا دکھائی دیا جس میں جا بجا وزن بستے تھے۔ ان روزوں  
 سے جھانکا تو ایک لاش دیکھی جو قد میں معمولی انسانوں سے لہنی تھی۔ لاش بالکل  
 برہنہ تھی ابستہ ایک انگلی میں سولے کی انگوٹھی تھی۔ چرواہے نے یہ انگوٹھی  
 اُتار لی اور غار سے نکل آیا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ کچھ روز بعد تمام شاہی چرواہے  
 بدستور سابق ایک جگہ جمع ہوئے تاکہ بادشاہ کی خدمت میں گلہ کے متعلق مانا  
 اطلاع پیش کریں۔ اس مجمع میں یہ چرواہا بھی انگوٹھی پہنے ہوئے آیا۔ یونہی  
 بیٹھے بیٹھے اس نے انگوٹھی کا ناگ جو اندر کی طرف پھیرا تو یکایک تمام مجمع کی نظر  
 سے اوجھل تھا۔ اور سب حاضرین اسے غائب سمجھنے لگے۔ یہ چرواہا خود سخت  
 متعجب تھا کہ جو نہیں انگوٹھی کا ناگ باہر کی طرف پھیرا سب کو دکھائی دینے لگا۔



چنانچہ اس نے چند بار تجربہ کیا اور ہمیشہ ہی نتیجہ نکلا۔ اب کیا تھا۔ کوشش کر کے ان پیامبروں میں شامل ہو گیا جو دربار میں جانے کے لیے منتخب کیے جاتے تھے۔ دربار میں گذر ہونا تھا کہ اس نے ملکہ کو بہکا لیا اور اس کی مدد سے بادشاہ کے خلاف سازش کی اور بالآخر اسے قتل کر کے سلطنت کا مالک بن بیٹھا۔

فرض کیجئے اسی قسم کی دو انگوٹھیاں آج ہمیں مل جائیں اور ہم ایک منصف شخص کو اور دوسری ایک غیر منصف شخص کو پہنا دیں۔ میسر خیال میں تو شاید ہی کوئی اس قدر بگٹی طبیعت کا آدمی ہو کہ اسی حالت میں بھی عدل و انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ کون ہو گا جو اسی صورت میں بازار سے گزرتے ہوئے مختلف ایسی چیزوں پر ہاتھ صاف نہ کر دے جو اُسے پسند ہیں لیکن اس کی ملک نہیں یہ لوگ گھروں اور خلو تخانوں میں گھس کر جس سے چاہیں گے روباہا اختلاط پیدا کریں گے جسے چاہیں گے مار ڈالیں گے اور جسے چاہیں گے قید خانہ سے چھوڑا لائیں گے۔ ان کی حیثیت انسانوں میں دیوتاؤں کی سی ہو جائے گی۔ اور اس صورت میں منصف اور غیر منصف کے اعمال بالکل ایک سے ہو جائیں گے موقوف نہ ہو گا۔ میری رائے میں یہ بات اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ کوئی شخص بھی بخوشی اس لیے منصف نہیں ہوتا کہ وہ اُسے اپنی ذات کے لیے مفید سمجھتا ہے بلکہ لاچار اور ضرورت سے منصف بننے پر مجبور کرتی ہے۔ کیوں کہ جب کوئی شخص آسانی سے بلا خوف انتقام مانا انصافی کر سکتا ہے تو وہ کبھی اس سے دریغ نہیں کرتا اور ہر شخص اپنے دل میں یہ



یقین رکھنا ہی کہ ظلم و نا انصافی کو عدل و انصاف کے نسبت اس کی ذات کے  
 لیے بدرجہا زیادہ سود مند ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ ان کا یہ خیال غلط نہیں۔ اگر آپ کے  
 لیے کسی ایسے وجود کا تشکیل ممکن ہو جو غیر مرنی ہونے کی قابلیت رکھتا ہو اور باوجود  
 اس کے کوئی بڑا کام نہ کرے نہ کسی ٹیسرے کی چیر چھوے تو یقین مانتے ہیں کہ عامۃ الناس  
 لیے آدمی کو انتہائی احمق خیال کریں گے۔ ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ ریاکاری سے  
 یہ لوگ ایک دوسرے کے سامنے اس شخص کی تعریف ہی کریں لیکن یہ صرف اس  
 غرض سے کہ ہمیں ان کے ساتھ نا انصافی روا نہ رکھی جائے۔

اچھا اب اس قصہ کو ختم کریں اور آئیے ایک عادل و منصف اور ایک غیر  
 منصف شخص کی زندگی کی اچھائی اور بُرائی کا صحیح اندازہ کریں۔ اس غرض کے  
 لیے ان دونوں کو الگ الگ بیچے۔ غیر منصف شخص بدرجہہ اتم ظالم اور بے ایمان  
 ہو اور عادل شخص کامل طور پر منصف اور ایماندار۔ دونوں کو اپنے مختلف مقاصد  
 زندگی کے حصول میں کامل آزادی دیجیے۔ یہ بھی التزام ہو کہ غیر منصف شخص دیگر  
 ماہرین فنون مختلفہ کی طرح اپنے کمال کی قوتوں اور تیراؤں کی حدود سے اچھی طرح  
 واقف ہو۔ اور اگر کہیں غلطی ہو جائے تو اس کی تلافی کر سکے۔ یہ سب اس لیے  
 ضروری ہے کہ وہ تمام بے ایمانیاں آسانی سے کرے اور انہیں پوشیدہ بھی رکھ سکے  
 کیوں کہ پکڑا گیا تو پھر کیا بات باقی رہی۔ نا انصافی اور بے ایمانی کا کمال تو یہی ہے  
 کہ اس کا کرنے والا ایماندار سمجھا جائے۔ اور ہم چونکہ نا انصافی کا کامل ترین نمونہ



مقابلہ کے لیے لینا چاہتے ہیں اس لیے وہی شخص مناسب ہو جو باوجود انتہائی بے ایمانیوں کے بہت زیادہ ایماندار مشہور ہو۔ ساتھ ہی اچھا چادو بیان مقرر بھی ہو کہ اگر کوئی راز فاش ہو جائے تو اپنی سحر بانی سے لوگوں کو خاموش کر دے نیز ضرورت کے وقت اپنی قوت اور جرأت۔ دولت اور بہت سے بھی کام لے سکے۔ اس شخص کے مقابلہ میں بیچارے عادل اور ایماندار شخص کو جیسے جیل کا مطلق نظر ایسکلس (Aeschylus) کی طرح یہ ہے کہ نیکی کرے لیکن بظاہر نیک نہ معلوم ہو اسے ظاہر مطلق ایماندار نہ ہونا چاہیے کیونکہ اگر ایسا ہوا تو لوگ اس کی عزت اور عظمت کریں گے اور اس طرح یہ تصریح نہ ہو سکے گی کہ آیا وہ عدل کوئی نفسہ اچھا سمجھتا یا محض عزت کے لالچ سے منصف بنا ہوا ہے۔ اس کی متاع تو خالص انصاف یعنی چاہیے اور پس۔ اور پورا امتحان بھی اسی حالت میں ممکن ہے کہ وہ دراصل بہترین غلام ہو لیکن لوگوں کے نزدیک بدترین انسان سمجھا جائے۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ بدنامی اور اس کے نتائج کا کوئی اثر اسپر مترتب ہوتا ہی نہیں اس حقیقی ایماندار لیکن بظاہر بے ایمان شخص کی یہی حالت آخر دم تک رہنے دیجیے اور جب عادل اور ظالم دونوں بالترتیب اپنے عدل اور بے ایمانی کی انتہا کو پہنچ جائیں اس وقت یہ فیصلہ کیا جائے کہ کون زیادہ خوش رہا کس کی زندگی مسرت اور انبساط سے بڑھی اور کس کی غم اور تکلیف سے۔

میں۔۔ بھائی گلا کن تم نے تو کمال کر دیا۔ اس خوبی سے دونوں کیفیات کا



مرفع پیش کیا کہ آنکھوں میں تصویر سی پھری۔

گ۔ یہ آپ کی ذرہ نوازی ہی۔ خیر۔ مد مقابل فریقین کی کیفیات تو معلوم ہی ہو گئیں۔ اب صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کس قسم کی زندگی بسر کریں گے۔ اور یہ کچھ ایسا مشکل نہیں۔ میں اب اس زندگی کی تصویر پیش کرتا ہوں لیکن چونکہ مکر ہے کہ میرا بیان کچھ بڑا اور رکیک معلوم ہو اس لیے چند لمحوں کے لیے فرض کر لیجئے کہ میرے الفاظ نہیں بلکہ ظلم دانا انصافی کے کسی مداح و قصیدہ خواں کی زبان سے نکل رہے ہیں۔ اس مداح کے خیال میں تو یہ حقیقی ایماندار لیکن بظاہر بے ایمان شخص سخت مصیبت میں مبتلا رہے گا، اس کے کوزے مائے جانیں گے۔ ڈرے بھی پڑینگے۔ قید کیا جائیگا، آنکھیں نکالی جائیں گی اور بالآخر یہ تمام مصائب و آلام برداشت کرنے کے بعد وہ بیچارہ سپرد دار کر دیا جائے گا۔ اس وقت جا کر اس غریب کو خبر ہوگی کہ کام دراصل ایماندار ہونے سے نہیں چلتا بلکہ بظاہر ایماندار معلوم ہونے سے۔ ایکس کے الفاظ سچ پوچھو تو زیادہ صحت کے ساتھ بے ایمان پر چسپان ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ظالم اور غیر منصف ایک حقیقت اور اصلیت کا پیرو ہے وہ صرف ظاہر پرست ہے نہیں اس کا مقصد کوئی الواقع بے ایمان بننا ہے نہ کہ صرف دکھاوے کے لیے۔ اب اس کی حالت سنئے۔ اول تو لوگ اُسے ایماندار سمجھیں گے اور اس طرح وہ حاکم شہر بن جائیگا۔ جس عورت سے چاہیگا عقد کرے گا جس مرد سے چاہیگا اپنی ادا کیونگا عقد کرے گا۔ ہر جگہ تجارت و کاروبار کر سکے گا۔ اور چونکہ کوئی اُسے بے ایمان تو



سمجھتا نہیں اس لیے ہمیشہ فائدہ میں رہے گا۔ ہر مقابلہ میں خواہ خاص ہو یا عام اپنے  
 حریت سے اچھا ثابت ہوگا۔ دوسروں کی دولت سے مالدار بنے گا اور اس مال کو  
 اپنے احباب کے نفع اور اعدا کے ضرر کے لیے صرف کرے گا۔ اس کے علاوہ قربانیاں  
 کر سکے گا اور دل کھول کر دیوتاؤں پر نذرین چڑھائیگا، اگر کسی انسان یا دیوتا کی  
 عزت تو قیر بڑھانا چاہیگا تو ایک یا مڈار شخص سے بدرجہا زیادہ آسانی اور عمدگی سے  
 ایسا کرنے کے قابل ہوگا۔ اور ان وجوہ سے دیوتاؤں کی نظر میں بھی عادل شخص کی  
 نسبت زیادہ عزیز ہوگا۔ چنانچہ انسان اور دیوتاؤں کی متحدہ مساعی اس کی زندگی  
 کو ایک یا مڈار شخص کی زندگی سے زیادہ دلفریب و خوش گوار بنا دینگے۔  
 میں: گلاکن کے جواب میں کچھ کہتا ہی چاہتا تھا کہ ایڈیٹینٹس پیج میں لڑیں  
 اٹھے۔ ”کیا جناب کا خیال ہے کہ اس تعریف میں مزید اضافہ کی گنجائش نہیں؟“  
 میں: کیوں۔ کیا کچھ اور باقی ہے؟

ایڈ: ابھی سب سے زیادہ اہم بات کا تو ذکر ہی نہیں کیا گیا۔

میں: سچ ہی بھائی بھائی کی مدد کرتا ہوں اگر گلاکن سے کوئی بات رہ گئی ہو تو  
 آپ اس کی تکمیل کر دیجیے۔ اگرچہ حقیقت تو یہ ہے کہ گلاکن ہی نے مجھے کافی دشواری  
 میں ڈال دیا ہے اور مجھے کافی طور پر عدل کی حمایت کے ناقابل بنا دیا ہے۔

ایڈ: آپ کا یہ ارشاد تو صحیح نہیں ہے۔ لیکن میں کچھ عرض ضرور کروں گا۔ گلاکن

نے عدل اور ظلم کی جو معرکہ و مذمت کی ہے اس کا ایک پہلو اور بھی ہے اور میرے



نزدیک گلاکن کا مفہوم سمجھنے کے لیے اس پہلو کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔  
 آپ کو معلوم ہو گا کہ والدین اور اساتذہ ہمیشہ اپنی اولاد اور شاگردوں کو ایماندار  
 اور منصف مزاج بننے کی تاکید کرتے ہیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کیوں؟ اس کی وجہ  
 انصاف کی ذاتی خوبی نہیں بلکہ اس سے متعلقہ عزت اور شہرت ہے۔ اور اس تعلق سے  
 مقصد یہ ہے کہ اس شہرت کی وجہ سے ان کی اولاد و یا ان کے شاگرد ملازمت بھتہ  
 اور دیگر امور میں فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ ظاہر ریست طبقہ اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ پوتاؤں  
 کی عنایت و مہربانی کا پلح بھی دیتا ہے۔ آپ کبھی ان لوگوں سے گفتگو کیے۔ ایک گنت  
 تعداد ان برکات سماوی کی پیش کردیں گے جو نیک اور منصف لوگوں پر نازل  
 ہوتی ہیں۔ شعرا بھی اپنے شعر میں اسی قسم کے پلح دلاتے ہیں چنانچہ ہیبیاؤ اور ہور  
 بھی کیا ہے۔ ان کی رستے میں عدل و انصاف سے زمین کی زرخیزی۔ فصلوں کی  
 فراوانی۔ میوؤں کی عمدگی۔ مال و دولت کی زیادتی اور عام مرفہ الحالی و بہتہ ہے۔  
 میوسائیس اور اس کا بیٹا تو اس سے کہیں زیادہ رفیع الشان چیزوں کی توقع دلاتا ہے  
 ان کے خیال میں نیک اور منصف شخص کو بعد مرگ جب عالم بالا میں لیجاتے ہیں تو وہ  
 ایک دعوت میں شریک کیا جاتا ہے جہاں بڑے بڑے برگزیدہ لوگ مسندوں پر  
 بیٹے ہوتے ہیں۔ پھولوں کے تاج سر پر ہیں اور شراب کا دور متواتر جاری ہے۔ گویا ان کے  
 نزدیک تمام نیکیوں کا صلہ شرب و ام اور مخموری ابدی ہے۔  
 بعض اس اجر کی امید کو عادل شخص کی ذات سے ماورا لیجاتے ہیں۔ ان کا



خیال ہو کہ منصف آدمی کی نسل چار پانچ پشت تک ضرور جاری رہتی ہو۔ غرض نئی  
سنگوں سے لوگ عدل و انصاف کی طرح میں رطب اللسان ہوتے ہیں۔

لیکن بدوں کے لیے بالکل دوسری ڈیڑھ ہے۔ یہ بچا پھر قعر جہنم میں ڈال دینے جائینگے۔

مشقت ڈائی یہ ہوگی کہ چھلنی میں پانی بھر بھر کر لائیں۔ غرض اس غریب کو وہ تمام  
سزائیں ملیں گی جو گلاکن نے ابھی ابھی اس منصف شخص سے منسوب کی ہیں جو

بے ایمان مشہور ہو۔ اسکے علاوہ عدل و انصافی کے متعلق ایک اور طریقہ بیان بھی

ہے۔ اور یہ عوام اور شعراء دونوں میں یکساں رائج ہے۔ سب کے سپر ایک بان ہیں

کہ منصف ہونا بڑی قابل تحسین بات ہے لیکن ساتھ ہی سخت دشوار بھی ہے۔ ہر خلافت

اس کے نا انصافی اور بے ایمانی بذات خود نہایت لکھش اور سہل الحصول ہیں لیکن

صرف جمہور کی رسلے اور قوانین کی وجہ سے بڑے سمجھے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے

نزدیک عدل و انصاف میں ظلم و نا انصافی سے کہیں کم فوائد ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ

شریاء و فہم پرورشخاص کو خوش نصیب اور مبارک بتلانے نیز خلوت اور جلوت

ہیں ان کی عزت و توقیر کرنے سے مطلق نہیں شرما تے۔ ہاں یہ شرط ہے کہ ان کے پاس

دولت ہو اور جاہ و ثروت کے دیگر اسباب بھی موجود ہوں۔ نہ یہ شتم برابر اس

نیک شخص کی ہجو اور مذمت کرنے سے محجوب ہوتے ہیں جو تنگی اور افلاس کی کرہا

جمیل رہا ہے۔ اگرچہ خود نہیں مؤخر الذکر کی خوبی اور نیکی کا دلی اعتراف ہی کیوں نہ ہو

لیکن ان تمام باتوں سے زیادہ حیرت خیز تو وہ بیانات ہیں جو خود دیوتاؤں کے متعلق



کیے جاتے ہیں۔ ان تمام بیانات کا مفہوم یہ ہے کہ دیوتا بھی اکثر نیک لوگوں کو  
 زندگی میں تکلیف اور بدوں کو راحت پہنچاتے ہیں۔ ہر جگہ ایسے شیخ و برہمن موجود  
 ہیں جو ثروت جاہ کے آگے سر جھکاتے ہیں اور اس ثابت کا یقین لاتے ہیں کہ اگر  
 قربانیاں کی جائیں۔ بیٹھیں مانی جائیں، کھانا کھلایا جائے تو ان کے پاس ایسی  
 طاقت ہے کہ وہ دیوتاؤں سے ہر گناہ بخشوا سکتے ہیں خواہ وہ خود اپنے سر زد ہو جو  
 پاپوں کے باپ دادا اس کے مرتکب ہوئے ہوں تھوڑے سے خرچ میں بلا امتیاز  
 نیک و بد یہ لوگ ہر شخص کو گنڈے تعویذ سے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ یہ لوگ گنتی  
 ہیں کہ ان کے پاس بعض دم درود اور او و و وظائف ایسے ہیں جن کے اثر سے دیوتاؤں  
 کے کی پابندی کرتے ہیں۔ اور ان تمام دعاوی کی تصدیق میں شعرا کا کلام پیش کیا  
 جاتا ہے جن کے نزدیک ”اگر شر اور بدی کی تلاش ہے تو وہ ہر جگہ مل سکتی ہے کلاسی  
 منزل بہت قریب ہے اور اس کی لہ نہایت آرام دہ ہے۔ لیکن اگر نیکی کے متلاشی  
 ہو تو اس کے متعلق تو فرمودہ آسمانی ہے کہ پشیمانی کا پسینہ اڑی کو لے تب کہیں  
 یہ نصیب ہو کہ اس راہ میں ہر طرح کے مصائب اور صعوبتیں ہیں۔ کہیں اس خیال  
 کی تائید میں کہ دیوتا اپنے ارادے سے ہٹاے جاسکتے ہیں ہومر کی شہادت  
 پیش کی جاتی ہے کہ ”بحاجت وزاری تو یہی چیز ہے کہ دیوتا تک اس سے متا  
 ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب کبھی انسان سے کسی گناہ یا نافرمانی کا ارتکاب ہو جاتا ہے  
 تو وہ غم و حسرت سے بھری ہوئی دعائیں مانگتا ہے قربانیاں چڑھاتا ہے۔ خوشبودا



بخوردیتا اور گھی کے چراغ جلا کر عجز و انکسار سے منتیں کرتا ہے اور بالآخر دپوتاؤں کا عتابِ حم میں مل جاتا ہے۔

اس کے علاوہ میوسیس اور آرفیس کی تصانیف کا ایک نبار ہے جو پیش کیا جاتا ہے۔ ان کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ یہ سیلین اور میوز کی اولاد ہیں چنانچہ انکا کلام اکثر تقریوں اور عام تہواروں کے موقعہ پر پڑھا جاتا ہے اور اس طرح نہ صرف ذرا کو بلکہ پورے پورے شہروں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ بعض تہائیوں اور محاسن عیش و طرب کے انعقاد سے بزمانہ حیات اور نیز بعد مرگ تمام گناہ و معاصی کی تلافی ممکن ہے۔ ان کے عقیدہ کے مطابق ان رسوم کی ادائیگی انسان کو آخرت میں سزا اور جزا سے آزاد کر دیتی ہے اور ان سے غفلت عذاب الیم کا باعث ہوتی ہے۔

جب اس قسم کے خیالات اس طرح پھیلائے جاتے ہیں اور اس قدر مختلف طریقوں سے عامۃ الناس کے روبرو نہیں بار بار دہرا دہرایا جاتا ہے تو اسکا نتیجہ ان نوحیزد ماعوں پر کیا ہوگا جو ہر چیز کو سطحی طور پر سنکر اس میں نتائج کا استخراج کر لیتے ہیں۔ انکے پیش نظر بہترین زندگی کی کیا تصویر ہوتی ہوگی اور راہِ غیر و برکت کا کیا نقشہ سامنے آتا ہوگا جس پر چکر وہ فلاح حاصل کر سکے۔ قدرتا یہ سوال پیدا ہوتا ہوگا کہ آیا عدل و ایمان ہی انھیں ترقی کے اعلیٰ مدارج تک پہنچا سکتی ہے یا معراج کمال تک سائی کے لیے مگنا اور بے ایمانی لازمی ہے۔ کیونکہ آپ ہی غور فرمائیے میں لاکھ ٹیک سہی لیکن اگر مجھو ایمان تسلیم نہیں کیا جاتا تو میری تمام نیکی اور منصف مزاجی بیکار بلکہ باعث نقصان ہے۔



لیکن اگر باوجود ظلم و نا انصافی کے میں کسی طرح نیک اور ایماندار مشہور ہو جاؤں تو پھر کیا کہنا۔ اسی دنیا میں جنت ہو گئی۔ ایک حکیم کا قول ہے کہ جب ظاہر باطن پر غالب آتا ہے تو میں کیوں بظاہر ہی کی پابندی کروں۔ مکان کے ہر چار طرف تقدس اور نیکی، عدل و انصاف کی فضا ہے جاں نواز ہو لیکن مبین ظلم اور بے ایمانی میں فرد ایک تصویر سے اپنے چہرہ کو خوشنما بنا لوں لیکن پیچھے وہی مکار لوٹری کی دم ہو جیسا ذکر آرکی لو کس نے کیا ہے۔ ممکن ہے آپ فرمائیں کہ برائی کا پوشیدہ رکھنا کچھ سہل کام نہیں۔ بیشک یہ صحیح ہے لیکن دنیا میں کوئی بڑا کام سہل نہیں ہوتا یہ بات قطعی ہے کہ اگر دنیا میں آرام و آسائش، مسرت و اطمینان کے آرزو مند ہو تو بس اسی راہ کو اختیار کرو۔ رہا راز کا پوشیدہ رکھنا۔ اس کے لیے خفیہ انجمنیں بناؤ۔ سیاسی جماعتیں قائم کرو۔ اور یہ کیوں؟ ماہرین فن خطابت سے عدالتوں اور مجمعوں کو اپنی بات باور کرانا سیکھو اور اس طرح کچھ تو ترغیب و تبلیغ اور کچھ جبر و تعدی سے بلا خوف سزا اپنی بے ایمانی کے ثمرات حاصل کرو۔ یہاں ممکن ہے کوئی کہے کہ دیوتاؤں کو کس طرح دہوکا دو گے۔ انھیں کس طرح ترغیب و تبلیغ سے قائل کر سکو گے؟ تو اس کا جواب وہ حال سے خالی نہیں۔ اولاً یا تو دیوتاؤں کا وجود ہی نہیں، اگر ایسا ہے تو پھر کیا۔ معاملہ صاف ہے۔ یا یہ کہ دیوتا اعمال انسانی سے بیخبر اور اُن سے غیر متعلق ہیں۔ اگر یہ ہے تو بھی تبلیغ کی چنداں ضرورت نہیں۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ دیوتاؤں کا وجود ہے اور وہ افعال انسانی کی خبر گیری بھی کرتے ہیں۔ ہم نے اسے تسلیم کیا۔ لیکن ہر دیوتاؤں



کے متعلق جو کچھ بھی علم ہے اس کا ذریعہ یا تو روایات ماضی ہیں یا شعر کا کلام۔ اور ان لوگوں کے اقوال کے مطابق تو دیوتاؤں پر بھی اثر ڈالا جاسکتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ دعاؤں، قربانیوں اور منتوں کے ذریعہ نہیں اپنے ارادہ سے ہٹا دیا جائے۔ پھر یا تو ان وایتوں اور شعر کے کلام کو پورا صحیح مانو یا بالکل جھوٹ متصو کرو۔ اگر ان لوگوں کا کہنا سچ ہے تو پھر کیا ہے۔ بے ایمان ہونا ہی سراسر بہتر ہے کھلے بندوں بے ایمانی کرنا بہتر ہے اس بے ایمانی کی کمائی میں سے کچھ قربانیوں اور منتوں میں صرف کر دو۔ کیوں کہ آخر ایمانداری میں دھرا کیا ہے۔ یہی ناکہ غالباً عذاب الہی سے محفوظ رہو گے لیکن ظلم اور نا انصافی کے فوائد سے تو بہرہ اندوز نہ ہو سکو گے۔ برخلاف اس کے بے ایمانی میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ ہر طرح کے جائز و ناجائز فائدے حاصل کرو اور پھر دعاؤں اور قربانیوں کے ذریعہ عذاب الہی سے مامون و محفوظ رہا آخرت کا ڈر سو اس کے لیے بھی مختلف سوم اور شفاعت کرنے والے دیوتا موجود ہیں کم سے کم بڑے بڑے شہروں کا تو یہی عقیدہ ہے اور شعرا اور پیغمبر بھی جو ان دیوتاؤں کی اولاد مانے جاتے ہیں اس امر کے شاہد ہیں۔

اب آپ ہی فرمائیے کہ بھلا کس وجہ سے کوئی شخص عدل و انصاف کو انتہائی ظلم اور بے ایمانی پر ترجیح دے۔ بے ایمانی کے ساتھ تھوڑی سی ظاہری ایمانداری اور چاہیے اور بس انسان اپنی زندگی کو بقید حیات اور بعد الموت دیوتاؤں اور آدمیوں دونوں کے نزدیک نہایت آرام و آسائش سے گزار سکتا ہے۔ اگر کسی شخص کو ذرا سا بھی



و مانگی یا جسمانی امتیاز یا دولت اور مرتبہ میں تھوڑی سی فوقیت حاصل ہو تو وہ کبھی  
ایمانداری کرنے لگا۔ اس کے سامنے تو عدل کی تعریف کی گئی تو ہنسیدگا۔

میں جانتا ہوں کہ دنیا میں ایسے لوگ ہوں گے جو میسکران دلائل کو نہ مانیں  
اور عدل کو ظلم پر ترجیح دینگے۔ لیکن خوب یاد رکھئے یہ لوگ تک بے ایمان کو قابل معافی  
ضرورت سمجھتے ہوں گے، کیونکہ انھیں یقین ہے کہ کوئی شخص بہ رضا اور رغبت ایمان نہیں  
ہوتا سوائے ان لوگوں کے جن کے دلوں کو خدائے عظیم و نا انصافی سے فطرتاً طور پر دیا  
ہو اور جن کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہو چکی ہو۔ ان کے علاوہ دوسرے آدمی تو  
صرف اس وجہ سے ظلم اور بے ایمانی کو برا سمجھتے ہیں کہ وہ خود زیادتی عمر کروری۔ یا  
کم ہمتی کی وجہ سے اس کا ارتکاب نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اس کا معمولی ثبوت یہ ہے کہ  
جب انھیں کچھ قوت اور قدرت حاصل ہو جاتی ہے تو یہ بھی اپنی بساط اور استعداد کے  
مطابق بے ایمانی اور ظلم شروع کر دیتے ہیں۔

اس صورت حالات کی وجہ ہم نے ابتدائے گفتگو ہی میں عرض کی تھی یعنی  
یہ کہ ہمارے لیکر ہمارے زمانہ تک جب قدر لوگ عدل و انصاف کے مدح سرا ہوئے  
ہیں سب کے سب نا انصافی کی مذمت اور عدل کی تعریف اس سے حاصل شدہ آغاز  
و منافع اور شہرت کو مد نظر رکھ کر کرتے ہیں۔ دفاتر نظم و نشر کے اوراق الٹ جائیے آپ  
لہیں نہ پائیں گے کہ کسی شخص نے بھی ان صفات کی حقیقی ماہیت پر بحث کی ہو  
یہ بتلایا ہو کہ انسانی اور خدائی نگاہ سے پوشیدہ رہ کر بھی یہ صفات روح انسانی پر



کیا کیا اثرات پیدا کرتی ہیں۔ یا یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہو کہ عدل روح کی  
 اعلیٰ ترین حسناات اور ظلم بدترین معائب ہو۔ اگر ہمیں بچپن سے ہی سکھایا جاتا تو  
 آج بجائے اسکے کہ کوئی دوسرا شخص بُرائی سے ہمارا محاذ و نکران ہو ہم خود شر و بدی  
 اپنے محافظ ہوتے کہ مبادا ہماری روح میں یہ ارذل ترین بُرائی پیدا ہو جائے۔  
 یہ جو کچھ میں نے عرض کیا سب تھریسی مسکین اور ان کے ساتھیوں کے خیالات کی ترجمانی  
 تھی۔ بلکہ ممکن ہو وہ اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ میں اپنا مفہوم ادا کرتے۔  
 لیکن میں نے جو یہ سب کچھ عرض کیا اس کا مقصد یہ ہے کہ آپ بھی فریق مخالف کے خیالات  
 اسی انداز سے ظاہر فرمائیں۔ صرف ظلم پر عدل کی فوقیت کے اظہار پر اکتفا نہ کیجئے  
 بلکہ یہ بھی فرمائیے کہ ان صفات میں وہ کونسا اثر ہو جو مستصف کو نیک یا بد بنا دیتا ہے  
 البتہ گلاکن کی درخواست کا ذرا خیال رہے کہ شہرت اور عزت کا ذکر بھی نہ آئے  
 پائے بلکہ میں تو یہاں تک عرض کروں گا کہ جب تک آپ حقیقت امر کے بالکل برعکس  
 صفات سے مستصف ہونے کی شہرت فرض نہ کر لیں اس وقت تک یہ نہیں کہا  
 جاسکتا کہ آپ حقیقتاً عدل ہی کی تعریف کر رہے ہیں۔ اور اگر ہم یہ سمجھیں تو چنداں بجا  
 نہ ہوگا کہ آپ صرف مصلحتاً ہم لوگوں کو ظلم و نا انصافی سے محترز رہنے کی تلقین  
 فرما رہے ہیں اور فی الحقیقت آپ کے نزدیک بھی تھریسی مسکین ہی کی رلے صحیح پہلہ  
 انصاف و عدل فریق قوی کی اغراض کی پابندی کا نام ہے اور ظلم و نا انصافی میں  
 صرف کمزور کا نقصان ہے اور قوی کا سراسر فائدہ۔



آپ اس بات کا تو اقرار کر ہی چکے ہیں کہ عدل محاسن کی اس اعلیٰ قسم سے تعلق رکھتا ہے جس کی پابندی صرف عمدہ نتائج کی امید پر نہیں بلکہ اس کی ذاتی خوبی کی وجہ سے بھی کرنا ضروری ہے یعنی اس کی حیثیت بھی وہی ہے جو دوسری ایسی حقیقی دہ کہ رہی، خوبیوں کی ہے جیسے باصرہ، سامعہ، علم، تندرستی وغیرہ۔ آپ جو عدل کی خوبیاں بیان فرمائیں تو اس میں بڑا کرم ذرا ایک بات کا خیال رکھیں یعنی یہ کہ وہ کیا خوبی یا برائی ہے جو اسپر کار بند ہونے یا نہ ہونے سے خود بخود دور و نما ہو جاتی ہے۔ کیونکہ دوسرے لوگ اگر عدل کی تعریف میں اس کے بعض لوازم مثلاً عزت و شہرت سے استدلال کریں تو میں اسے چنداں قابل اعتراض نہ سمجھوں لیکن آپ سے تو مجھے زیادہ بلند و ارفع باتیں سننے کی توقع ہے کہ آپ نے تمام عمر اسی اہم مسئلہ پر غور و فکر میں صرف فرمائی ہے۔ مجھے امید ہے کہ میری توقعات کا خیال کر کے آپ صرف عدل کی فضیلت بیان کرنے پر اکتفا نہ کریں گے بلکہ اس بات پر پوری پوری روشنی ڈالیں گے کہ یہ صفت فی نفسہ بلا لحاظ اس امر کے کہ کوئی دیکھتا اور جانتا ہے یا نہیں بہت صفت کی روحانی حالت کو کیسا بنا دیتی ہے۔

یوں تو میں ہمیشہ سے گلاکن اور ایڈمینٹس کی قابلیت کا معترف تھا اور گفتگو کو سن کر تو میرا دل بہت ہی خوش ہوا اور میں نے کہا۔

”سچ ہے تم قابل باپ کے قابل بیٹے ہو۔ اور گلاکن کی تعریف میں جنگ مگلا میں ممتاز ہونے کے بعد جو بدھیہ الفاظ شاعر نے استعمال کیے تھے وہ بالکل بیان وقوعہ



تھا۔ یقیناً تم پر یہ خدا کا خاص فضل ہے کہ اگرچہ تم نے ابھی ابھی عدل کے خلاف ظلم و  
 نا انصافی کی طرف سے اس قدر عمدہ طریقہ سے پیروی کی تاہم تم خود ان چیزوں کو دیکھ  
 بُرا جانتے ہو، تم ہی بتاؤ کہ اگر کوئی شخص تمہارے عمل اور تمہارے اصلی خیالات سے  
 ناواقف ہو اور پھر تمہاری یہ تقریریں سنے تو اسے کس قدر غلط فہمی ہو۔ لیکن جس وقت  
 قوی مجھے تمہارے صحیح عقیدہ کا یقین ہے اسی قدر قوی اعتراف مجھ اپنی دقتوں کا  
 ہے۔ میں اپنے کو دو گونہ شکل میں بستلا پاتا ہوں۔ ایک طرف تو اپنی بے بضاعتی کا احساس  
 اور یہ اس وجہ سے اور بھی زیادہ ہو گیا ہے کہ آپ لوگ ان دلائل سے مطمئن نہیں ہو  
 جو میں نے تھریسی میکیس کے جواب میں پیش کی تھیں۔ حالانکہ میں نے بزرگ خود انصاف  
 و عدل کی فضیلت کا کامل ثبوت دیا تھا۔ دوسری طرف اسی کے ساتھ ساتھ  
 یہ بھی ممکن نہیں کہ خاموش ہوں کہ جب تک سینہ میں سانس آتا ہے اور زبان تیار  
 پارے گفٹا رہے اس وقت تک یہ محال ہے کہ عدل و انصاف کے خلاف کچھ  
 سوں اور اپنی استعداد کے مطابق اس کی تردید نہ کروں۔ چنانچہ اپنی بساط کے  
 موافق اس وقت بھی عدل کی کچھ نہ کچھ حمایت ضرور کرونگا۔

گلاکن وغیرہ نے بھی اصرار کیا کہ سلسلہ کلام کو ختم نہ ہونے دو اور خواہش  
 ظاہر کی کہ کامل غور و خوض کے بعد عدل و ظلم کی اصلی ماہیت دریافت کی جائے  
 اور پھر ان کے مختلف فوائد اور مضرتیں معلوم کی جائیں۔ چنانچہ میں نے اس طرح  
 سلسلہ کلام شروع کیا۔ ”ہم جس مسئلہ پر اب غور کرنا چاہتے ہیں وہ کوئی معمولی

اور سہل مسئلہ نہیں بلکہ اس کے لیے بہت وقت نظر درکار ہے اور چونکہ اپنی ناقابلیت سے ڈرتا ہوں اس لیے مناسب ہے کہ یہ طریقہ تحقیق اختیار کیا جائے میں ایک مثال سے اپنا مطلب آپ کو سمجھا دوں۔ فرض کیجئے ایک آدمی کی لہجہ کمزور ہے اور آپ اس سے ایک بار ایک خط کی تحریر فاصلہ سے پڑھنا چاہتے ہیں لیکن ہمارے کسی ساتھی کے علم میں وہی تحریر علی قلم میں بھی موجود ہے تو یہ شخص کی خوش قسمتی ہوگی کہ وہ پہلے اس علی قلم عبارت کو پڑھ لے اور پھر اس بار ایک کو دیکھے۔

ایڈمینیٹس۔ اس میں کیا شک ہے۔ لیکن آج اس مثال کو معاملہ زیر غور سے کیا تعلق؟

میں۔ میں ابھی عرض کرتا ہوں۔ دیکھیے جس طرح عدل و انصاف کو افراد سے منسوب کیا جاتا ہے اسی طرح ریاستوں اور حکومتوں سے بھی تو اسے متعلق کرتے ہیں؟ کیوں ٹھیک ہے نا؟

ایڈ۔ جی ہاں۔

میں۔ اور ریاست ایک فرد سے بڑی ہوتی ہے۔

ایڈ۔ بلاشبہ۔

میں۔ تو ممکن ہے اس بڑی چیز میں عدل کی صفت بھی زیادہ مقدار میں پائی جاتی ہو اور اس لیے امکان ہے کہ یہاں آسانی سے اس کا پتہ چل جائے،



لہذا اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو نظام حکومت میں پہلے اس کی تلاش کریں  
اور پھر اسی تحقیق کو افراد پر منطبق کریں۔

ایڈ:- اسے ہی تو نہایت مناسب۔

میں:- میرے خیال میں اگر ہم ایک شہر یا ریاست کے تدریجی نشوونما کا خاکہ  
اپنے ذہن میں کھینچیں تو اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں عدل و ظلم کی تدریجی افاد کا بھی  
پتہ چلتا جائے گا۔

ایڈ:- غالباً۔

میں:- اس طرح ممکن ہے کہ مسئلہ زیر تحقیق کے حل میں آسانی ہو جائے۔  
ایڈ:- جی ہاں۔

میں:- تو پھر آپ کی رائے میں یہ تحقیق شروع کی جائے؟ ..... کام سہل  
نہیں ہے اس لیے پہلے ہی سوچ سمجھ لیجئے۔

ایڈ:- میں خوب سوچ چکا۔ ضرور شروع کیجئے۔

میں:- اچھا تو سنیئے۔ میرے خیال میں شہروں اور بستیوں کے قیام کی اصل  
وجہ یہ ہے کہ ہر فرد کی بہت سی ضروریات ہوتی ہیں اور ان کی تکمیل کے لیے وہ  
دوسرے افراد کا محتاج ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے یہی وجہ ہے یا کچھ اور؟

ایڈ:- نہیں۔ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

میں:- گویا ضروریات کی کثرت اور ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے

دوسرے سے مدد کی احتیاج انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ہر کام میں کسی شریک یا مددگار تلاش کرے۔ اور جب یہ تمام شہکار و معاہدہ میں ایک مقام پر جمع ہو کر بود و باش اختیار کرتے ہیں تو اسی کا نام شہر ہو جاتا ہے۔

ایڈ۔ بیشک۔

میں :- اور یہ لوگ جو ایک دوسرے سے شہکار کا سبب دیکھتے ہیں تو ہمیں ہر فریق کو یقین ہوتا ہے کہ میرا فائدہ ہے۔

ایڈ۔ ہاں اور کیا۔

میں :- اچھا تو اب شہریار مایست کی ایک ذہنی تصویر تیار کریں یہ تو معلوم ہی ہو گیا کہ اس کی اصل اور ابتدائی وجہ ہماری فطری ضروریات اور احتیاجات ہیں۔

ایڈ۔ بیشک۔

میں :- اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ زندگی کو قائم رکھنے اور مہلکت سے محفوظ رہنے کے لیے پہلی احتیاج غذا ہے۔

ایڈ۔ یقیناً۔

میں :- پھر رہنے کے لیے مکان۔ پہننے کے لیے کپڑے و قس علی ہذا۔

ایڈ۔ بے شبہ۔

میں :- اب غور کیجیے کہ اس شہر میں ان ضروریات کی فراہمی کس طرح ہوگی۔ شروع شروع میں ایک کاشتکار ہونا چاہیے اور ایک معمار۔ پھر ایک جولاہے کی بھی



ضرورت ہوگی۔ کیئے تو ایک موچی یا اور کسی ایسے ہی شخص کا اضافہ بھی  
کرلیں۔

ایڈ:- آپ صحیح فرماتے ہیں۔ ان لوگوں کا وجود ازل سے ضروری ہے۔  
میں:- گویا چھوٹے سے چھوٹے شہر میں چار یا پانچ آدمی ضرور ہونگے۔  
ایڈ:- ظاہر ہے۔

میں:- اور یہ تو فرمائیے۔ یہ لوگ کام کس طرح کریں گے؟ کیا اپنی اپنی محنت  
کی پیداوار ایک مقام پر جمع کر دیا کریں گے۔ مثلاً کیا کاشتکار چاروں آدمیوں  
کے لیے غلہ پیدا کریں گے اور اپنی ذات کے لیے غلہ پیدا کرنے میں جتنی محنت کرنی پڑتی  
ہی اس سے چوگنی محنت کر لیا جائے دوسروں سے مطلق سروکار نہ ہوگا اور صرف  
اپنے لیے چوتھائی وقت میں اور چوتھائی محنت سے غلہ پیدا کر لیا اور باقی اوقات  
میں اپنے لیے مکان تعمیر کریں گے۔ کپڑے بنائیں گے جو تاسیے گا۔ تاکہ خود ہی اپنی تمام  
ضروریات کو بلا مدد وغیرے پورا کر لے۔

ایڈ:- میری رائے میں تو غالباً یہ اچھا ہوگا کہ وہ اپنے ذمہ صرف کاشت کا کام  
لے لے اور باقی چیزوں کی تیاری سے سروکار نہ رکھے۔

میں:- ہاں غالباً ہی بہتر طریقہ ہے۔ تمہارے کہنے سے مجھے بھی خیال پیدا ہوا  
کہ کوئی دو آدمی ایک سے نہیں ہوتے کوئی کسی کام کے لیے موزوں ہوتا ہے کوئی کسی  
کے لیے۔ کیوں آپ کا کیا خیال ہے؟

ایڈ۔ میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔

میں :- کام کی عمدگی کا خیال کر کے کونسی صورت زیادہ مناسب معلوم ہوئی ہے؟ آیا ایک دمی ایک ہی کام کرے یا سب کام؟

ایڈ۔ اگر ایک ہی کام کیا جائے تو کام بہتر ہوگا۔

میں :- اور یہ بھی مسلم ہے کہ ہر کام کے لیے ایک مناسب وقت ہوتا ہے۔ اگر اسے ہاتھ سے جلنے دیا تو پھر موقع واپس نہیں آتا۔

ایڈ۔ جی ہاں۔ اس میں کیا کلام ہے۔

میں :- ہاں۔ اس لیے کہ کام تو وقت اور کرنیوالے کی فرصت یا عیدم الفرستی کا خیال نہیں کرتا۔ کام کرنے والے کو بس اس کے پیچھے پڑا رہنا چاہیے تاکہ صحیح وقت پر کام ہو جائے۔

ایڈ۔ بیشک۔

میں :- ان باتوں سے یہ ثابت ہوا کہ کام کی سہولت مقدار اور عمدگی غرض ہر اعتبار سے ہی بہتر ہے کہ ایک شخص مناسب اوقات میں ایک ہی کام کرے اور دیگر مشاغل کو ترک کر دے۔ اور یہ ایک کام وہی ہو جس کے لیے وہ فطرتاً موزوں بنایا گیا ہے۔

ایڈ۔ جی ہاں۔

میں :- یوں تو پھر ہمارے شہر کے لیے چار سے زیادہ آدمیوں کی ضرورت



پڑے گی، ہل یا اور ضروری آلات زراعت کسان خود تو تیار کریں گے نہیں نہ معمار  
اپنے اوزار خود بنا سکیں گے۔ نہ جو لایا یا موچی۔

ایڈ:- اور کیا۔  
میں:- گویا بڑھئی اور لہار بھی ہماری چھوٹی سی خیالی ریاست کے رکن ہونگے  
خدا کا شکر ہے کہ ہمارا شہر رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے۔

ایڈ:- جی ہاں۔  
میں:- اس میں اگر چہ وہاں اور دوسرے مویشی پالنے والوں کا بھی اضافہ  
کر دیا جائے تو کیا بُرائی ہے۔ ہماری ریاست کچھ ایسی زیادہ تو بڑھ نہ جائے گی اور کسانوں  
کے لیے عمدہ مویشیوں کی فراہمی کا انتظام ہو جائیگا۔ نیز جو لایا ہوں کو اُون اور موچیوں  
کو چمڑا آسانی سے ملجایا کریں گے۔

ایڈ:- آپ صحیح فرماتے ہیں۔ ان تمام افراد کی یکجائی کے باوجود اس میں شک  
نہیں کہ ہماری ریاست بہت بڑی تو نہ ہوگی۔ لیکن ہاں اب اسے بہت چھوٹی  
نہیں کہہ سکتے۔

میں:- ہاں ایک بات تو رہ ہی گئی۔ شہر کے لیے کوئی موقع تو تلاش کر دیا  
جگہ ملنا تو تقریباً ناممکن ہے جہاں ہر چیز مہیا ہو اور کسی چیز کی درآمد کی ضرورت نہ پڑے  
ایڈ:- بالکل محال!

میں:- اس لیے ہمارے شہر کے باشندوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہونا چاہئے

جو دوسرے شہروں سے اشیاء ضروری لایا کرے۔

ایڈ۔ بیشک۔

میں :- لیکن اگر یہ لوگ خالی ہاتھ گئے اور اپنے ساتھ وہ چیزیں نہ لے گئے ہوں  
ضرورت اس دوسرے شہر کے باشندوں کو ہونے لازمی نتیجہ یہ ہے کہ خالی ہاتھ لوٹیں گی  
ایڈ :- لازمی طور پر۔

میں :- اس لیے ہمارے شہر کی تیار کردہ اشیاء صرف ہماری ہی ضرورت  
کے لیے کافی نہ ہونی چاہئیں بلکہ مقدار اور عمدگی دونوں کے اعتبار سے لازم ہے  
کہ وہ دوسرے شہروں میں بھی قابل قبول ہوں۔  
ایڈ :- بیشک۔

میں :- اس کے معنی ہیں کہ کچھ اور کسانوں اور کاریگروں کی ضرورت ہوگی  
ایڈ :- اور کیا۔

میں :- نیز درآمد برآمد کا کام کرنے والوں کی بھی ضرورت پڑے گی یعنی  
تاجروں کی۔

ایڈ :- یقیناً۔

میں :- اور اگر سامان تجارت کو سمندر پار لیجانا ہو تو ایک کثیر تعداد ہونی  
الاحوں کی درکار ہوگی۔  
ایڈ :- بیشک۔



میں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ان تمام لوگوں کو بچا کرنے اور ریاست کے ترقی  
 دینے کا مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ باہم اپنی اپنی اشیاء کا مبادلہ کر سکیں۔ یہ مقصد آپ  
 اپنے خیالی شہر میں کس طرح حاصل کریں گے؟

ایڈ۔ ظاہر ہے کہ خرید و فروخت کے ذریعہ سے۔

میں۔ اس کے لیے ایک جگہ مبادلہ یعنی بازار اور ایک ذریعہ مبادلہ  
 یعنی نقد کی ضرورت پڑے گی۔

ایڈ۔ بیشک۔

میں۔ فرض کیجئے کہ ایک کسان مبادلہ کے لیے کوئی چیز لے کر بازار میں آیا  
 لیکن اتفاق سے کوئی شخص اس وقت بازار میں ایسا موجود نہیں جو اس سے مبادلہ  
 کر سکے۔ یہی صورت میں کیا یہ اپنا تمام کام دھندا چھوڑ کر بازار میں بیکار پڑا انتظار  
 کرتا رہے گا؟

ایڈ۔ ہرگز نہیں۔ بازار میں ایسے لوگ موجود ہوں گے جو لوگوں کی ضرورت  
 سے واقف ہوتے ہیں اور خرید و فروخت کا کام اپنے ذمہ لے لیتے ہیں۔ اچھی مایستو  
 میں یہ کام عموماً ان لوگوں کے سپرد ہوتا ہے جو جسمانی حیثیت سے بہت کمزور اور  
 کسی دوسرے کام کے لائق نہیں ہوتے۔ انکا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ بازار میں موجود  
 رہیں۔ اگر کوئی بیچنے والا آئے تو جس نے لے کر اسے نقد دیدیں اور اگر خریدنے والا  
 لے تو نقد لے کر جس فراہم کر دیں۔

ہیں۔ یعنی ہماری ریاست میں ایک طبقہ ان چھوٹے دوکانداروں کا بھی ہوگا۔ اس قسم کے دوکانداروں کو جبکا تمام تر کاروبار اپنے ہی شہر میں محدود ہو غالباً "خوردہ فروش" کہنا مناسب ہوگا بقایا ان لوگوں کے جو مختلف ممالک اور شہروں میں خرید و فروخت کرتے ہیں اور جنہیں ہم نے "باجر" کے نام سے موسوم کیا ہے۔

ایڈ۔ جی ہاں۔ درست۔

میں :- اس کے علاوہ ایک ایسا طبقہ بھی تو ہوتا ہے جس کے افراد واقعی قوتوں کے اعتبار سے دوسرے لوگوں کی ہمسری نہیں کر سکتے لیکن جسمانی حیثیت سے بہت قوی اور توانا ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی محنت فروخت کرتے ہیں اور اجرت لیکر دوسروں کا کام کرتے ہیں۔ اس معاوضہ کا نام مزدوری ہے ایڈ۔ جی ہاں۔

میں :- ان مزدوری پیشہ لوگوں سے بھی ہماری ریاست کی آبادی میں

اضافہ ہوگا؟

ایڈ۔ بیشک۔

میں :- یہ سب تو ہو چکا۔ اب آپ کی رائے میں ہماری ریاست مکمل

ہوگئی یا نہیں؟

ایڈ۔ میرے خیال میں تو ہوگئی۔



میں۔ لیکن اس میں عدل اور انصافی کہاں ہیں؟ آخر یہ چیزیں بھی پیدا ہونگی یا نہیں؟

ایڈیٹر۔ یہ صفات باشندوں کے باہمی لین دین اور کاروباری تعلقات کے سلسلہ میں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ کہاں پیدا ہونگی۔

میں۔ بیشک آپ کا خیال صحیح ہے۔ تو پھر آئیے دیکھیں اور تحقیقات جاری رکھیں۔ ہم نے شہر تو قائم کر ہی لیا اب سب سے پہلے یہ پتہ لگانا چاہیے کہ باشندے طرز بود و ماند کیا ہوں گے۔ یہ لوگ غلہ پیدا کریں گے۔ شراب بنائیں گے۔ جوتے اور کپڑے سنیں گے۔ اور مکانات بھی تعمیر کریں گے۔ جب رہنے سے کا سامان ہو جائیگا تو دوسرے مشاغل میں مصروف ہوں گے۔ محنت مشقت کریں گے۔ گرمیوں میں

عموماً برہنہ ٹن اور ننگے پاؤں رہیں گے، سردی میں کپڑوں جوتوں کا معقول انتظام رکھیں گے۔ جو اور گھسوں کا آٹا گوندھ کر اچھی اچھی روٹیاں پکائیں گے۔ چٹائی یا صاف پتوں کا دسترخواں بنا کر ان پر یہ چیزیں جنیں گے اور بال بچوں کو ساتھ لیکر ان نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ اور شراب خانہ ساز سے لذت خمار حاصل کریں گے۔ میروں

پر بھولوں گے۔ گجرے ہوں گے اور اپنے دیوتاؤں کی تعریف میں گیت گائیں گے اور اس طرح خوش خوش اپنی زندگی گزار دینگے۔ اس امر کا بھی خیال رکھیں گے کہ خاندان میں آدمیوں کی تعداد ذرائع معاش سے بڑھ نہ جائے تاکہ جنگ و فلاکت کی

دستبرد سے محفوظ رہ سکیں۔



گلاکن :- دہات کا ٹکر، بھائی صاحب۔ غذا میں ذرا زبان کے چخارے کا تھیل  
رکھا ہوتا۔

میں :- بیشک۔ معاف فرمائیے۔ میں بھول گیا۔ زبان کے مزے کے لیے  
نمک۔ زیتون کا تیل اور بالائی وغیرہ کافی ہیں۔ یہ لوگ اپنے دیہاتیوں کی طرح ساگ  
اور ترکاریاں اُبال لیا کریں گے۔ اخیر۔ سیمیں اور مٹر بھلوں کا کام دینگے کبھی کسی چیز  
کی گھلیاں بھون لیا کریں گے۔ اور شراب ذرا اعتدال سے پیئیں گے۔ اس قسم  
کی غذا استعمال کر کے میں سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ تندرستی اور آرام کے ساتھ بڑھلے  
کی عمر تک پہنچ جائیں گے اور اپنی اولاد کے لیے بھی اپنی جیسی زندگی ترک نہیں رجاؤں گے  
گلاکن :- خوب جناب خوب، اگر آپ جاہلوں کے ایک شہر کا انتظام کرتے  
تو غالباً وہ بھی ایسا ہی ہوتا۔ حیوانوں کو بھی تو اس سے بُری غذا نہیں دیجاتی۔  
میں :- تو پھر آپ ہی اپنی رائے فرمائیے۔

گ :- رائے کیا۔ کم از کم ان غریبوں کے لیے دنیاوی زندگی کی مہولی آسائش  
تو مہیا ہونی چاہئیں۔ اگر ان کے آرام کا کچھ بھی خیال ہو تو ان کے اٹھنے بیٹھنے کے لیے  
آرام کرسیاں، کھانا کھانے کے لیے میزیں وغیرہ درکار ہیں۔ غذا میں انھیں طرزِ  
کے مطابق چٹنیاں۔ اچار اور مٹھائیاں ملنی چاہئیں۔

میں :- میں اب سمجھا۔ آپ کی رائے میں ہمارے پیش نظر محض ایک راست  
ہے بلکہ ایک آرام طلب اور عیش پسند راست کے نشوونما کا سوال ہی میرا تو



اس میں کچھ ایسا نقصان نہیں۔ کیونکہ غالباً مؤخر الذکر قسم کی ریاست میں زیادہ آسانی سے معلوم ہو سکیگا کہ عدل اور ظلم کیونکر رونما ہوتے ہیں۔ جینے تو اپنے خیال کے مطابق ایک ریاست کا صحیح اور عمدہ نظام زندگی مرتب کر دیا تھا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اکثر لوگ اس سادہ طرز زندگی کو پسند نہیں کرتے اور ان کی راسے میں بھی مینر کرسی اور اور دوسرے سامان آرائش و آسائش کی ضرورت ہوگی۔ اور جب یہی ٹھہرا تو مختلف قسم کے روغنیات و عطریات کی بھی ضرورت پڑیگی اور ہمیں محض ضروریات زندگی (مثلاً گھر، کپڑا، کھانا) سے بہت آگے بڑھنا پڑیگا۔ مصوری، سوزن کاری کے فنون سے کام لینا پڑیگا۔ اور سونے چاندی اور ہاتھی دانت کے زیورات کی فراہمی کا بھی انتظام کرنا ہوگا۔

گ۔ بیشک۔

میں :- تو ہمیں اپنی ریاست کی حدود بڑھانی ہونگی۔ سابقہ رقبہ تو ان نئی ضروریات کے لیے کافی نہ ہوگا۔ اور ہمیں اپنے شہر کو ایسے پیشہ والوں سے بھرنا پڑیگا جن کی ضرورت کسی فطری احتیاج کی وجہ سے نہیں ہوتی مثلاً ایک قبیلہ کا قبیلہ، شکاریوں کا ایک جماعت ناٹک والوں کی جن کا کام زیادہ تر رنگ و پتے سے رہیگا، کچھ مطرب و مغنی ہوں گے اور کچھ شاعر اور ان کے دم چھلے۔ بھاٹ نکلیے اور نقال۔ مختلف چیزوں کی تیاری کے لیے اور خصوصاً عورتوں کے لباس وغیرہ کے لیے کاریگر کی ضرورت پڑیگی ہی نہیں اس کے علاوہ ملازموں کی بھی ضرورت ہوگی مثلاً معیتم

آبائیں، دائیاں، حجام، حلوانی اور باورچی وغیرہ۔ سوروں کے لیے گلہ بانوں کی الگ ضرورت ہوگی جن کی ہماری پہلی رہائش میں حاجت نہ تھی اور اس لیے سابقہ دستور العمل میں انھیں جگہ نہیں دی گئی تھی۔ اور یہ کیا اگر لوگ گوشت کھا گئے تو بہت سے جانوروں کے پالنے کا اہتمام کرنا پڑے گا۔

گ :- یقیناً۔

میں :- اس طرز زندگی میں غالباً بہ نسبت سابق ٹیپوں کی بہت زیادہ ضرورت پڑے گی۔

گ :- بلاشبہ۔

میں :- جو رقبہ زمین سابقہ باشندوں کے لیے کافی تھا اب چھوٹا پڑ گیا گ :- اس میں کیا شک ہے۔

میں :- تو ہمیں اپنے ہمسایہ کی زمین میں سے چراگا ہوں اور جوتے بونے کے لیے تھوڑا بہت ٹکڑا ضرور دینا پڑے گا۔ اور اگر ہمارے ہمسایہ بھی ہماری طرح فطری احتیاج کی حدود سے تجاوز کر کے مال دولت کی ہوس میں گرفتار ہو گئے تو وہ بھی اسی طرح ہماری زمین غصب کرنے کی فکر کریں گے۔

گ :- بیشک۔ اس سے تو کوئی مفتر نہیں۔

میں :- تو کیوں بھائی گلا کن اس کے معنی یہ ہوتے کہ ہمیں جنگ پڑے گی۔

گلا کن :- یقیناً۔



میں :- قطع نظر اس کے کہ جنگ فی نفسہ سود مند ہی یا ضرر رساں ہم نے یہ معلوم کر لیا کہ جنگ کے اسباب بھی وہی ہیں جن سے ریاست کے دوسرے معائب خواہ شخصی ہوں یا اجتماعی پیدا ہوتے ہیں۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- اس مرتبہ بھی ہمیں اپنی ریاست کی مزید توسیع کرنی ہوگی اور ابھی تو ایک پوری فوج کا اضافہ ضروری ہوگا جو باہر جا کر حملہ آور کا مقابلہ کر سکے اور ہمیں اور ہماری مملوکہ اشیاء کو ان کے دستبرد سے محفوظ رکھے۔

گ :- کیوں کیا ہم لوگ خود اپنی حفاظت نہ کر سکیں گے؟

میں :- ہاں اگر وہ اصول جسے ہم نے اپنی ریاست کے دستور کی ترتیب کے وقت تسلیم کیا تھا صحیح ہی تو بیشک ایسا ممکن نہیں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ وہ اصول یہ تھا کہ ایک آدمی بہت سے فنون میں کامیابی کے ساتھ مشغول نہیں ہو سکتا۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- تو کیا جنگ کرنا آپ کی رائے میں کوئی فن نہیں؟

گ :- یقیناً ہے۔

میں :- پھر کیا اس میں اتنی توجہ درکار نہیں ہوتی جتنی جوتنا سنے میں؟

گ :- خوب! کیوں نہیں، ضرور ہوتی ہے۔

میں :- ہم نے مورچی کو کاشتکاری یا معماری کے کام کی اجازت محض

اس لیے نہیں دی تھی کہ ہمارے جوتے اچھے تیار ہوں۔ اور اسپر کیا موقوف ہو  
 ہر شخص کو صرف وہ ایک کام تفویض کیا گیا تھا جس کے لیے وہ نظر تا خاص طور پر  
 موزوں و مناسب ہو یہی کام اسے عمر بھر انجام دینا چاہیے کہ اس کے ہاتھ سے  
 ترقی کے مواقع نہ نکل جائیں اور وہ اپنے فن میں ماہر ہو جائے۔ اب تم ہی بتاؤ  
 کہ ہمارے لیے اس سے زیادہ اور کونسی بات اہم ہوگی کہ سپاہی کا کام خوبی کیسا  
 انجام دیا جائے۔ پھر یہ بھی معلوم ہو کہ جنگ کوئی ایسا آسان فن نہیں کہ آدمی دوسرے  
 مشاغل مثلاً کاشتکاری وغیرہ میں بھی مصروف رہے اور سپاہی کا کام بھی انجام  
 دیتا رہے۔ یوں تفریح ہی تفریح میں تو آدمی تماشے اور شطرنج تک کا ماہر نہیں بن سکتا  
 مہارت کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اوائل عمر ہی سے ایک کام میں مشغول رہے اور  
 کسی دوسری طرف توجہ نہ کرے۔ جس طرح خالی اوزار آدمی کو اہل حرفہ نہیں بنا سکتے  
 اسی طرح صرف ہتھیاروں سے آدمی مدافعت کے قابل نہیں ہو جاتا جب تک اچھی  
 طرح انکا استعمال کرنا نہ جانتا ہو محض آلات حرب سے مسلح ہو کر اور ہاتھ میں ایک سپر  
 لے کر ایک ہی دن میں آدمی جنگ جو سپاہی تو نہیں بن سکتا۔

گ۔۔ بیشک ایسے ہتھیار تو ملتے نہیں کہ آدمی خود بخود انکا استعمال سیکھ لے  
 میں۔ چنانچہ ہمارے محافظوں کے فرائض جس قدر اہم ہوں گے اسی قدر  
 زیادہ وقت اور مہارت۔ توجہ اور محنت کی ضرورت ہوگی۔

گ۔۔ بلاشبہ۔



میں :- ہاں، اور اس کام کے لیے بھی فطری مناسبت ضروری ہے۔  
گ :- بیشک۔

میں :- یعنی ہمیں انتخاب سے کام لینا ہو گا کہ کون طبائع شہر کی حفاظت کے لیے مناسب ہیں اور کون نہیں۔

گ :- یقیناً۔

میں :- یہ انتخاب کچھ آسان نہیں لیکن خیر ہمیں ہمت نہ ہارنی چاہیے۔  
گ :- ہرگز نہیں۔

میں :- حفاظت اور نگرانی کرنے کے معاملہ میں کیا ایک جوان صالح کی مثالی نسلی نکتے کی سی نہیں؟

گ :- میں آپ کا مطلب بالکل نہیں سمجھ سکا۔

میں :- میرا مطلب یہ ہے کہ حفاظت کرنیوالا جوان بھی نکتے کی طرح نگاہ کا تیز ہو اور جب دشمن کو دیکھ لے تو حملہ کرنے میں جستی سے کام لے۔ نیز مضبوط بھی ہو کہ اگر دشمن کو پکڑ لے اور اس سے لڑنا پڑے تو اُس پر غالب آجائے۔

گ :- بیشک یہ تمام صفات نہایت ضروری ہیں۔

میں :- اور جنگ کرنے کے لیے بہادر بھی ہونا لازمی ہے۔

گ :- بیشک۔

میں :- لیکن کیا کوئی جانور، گھوڑا ہو یا کتا بغیر جرأت کے بہادر ہو سکتا ہے۔

تھنے دیکھا ہو گا کہ جراثم پر کسی کو مستح حاصل نہیں ہونی اور اس کی موجودگی روج  
کو نڈرا اور قوی بنا دیتی ہو۔  
گ :- جی ہاں۔

میں :- اب ہمیں صحیح اندازہ ہو گیا کہ محافطوں میں کیا کیا جسمانی صفات  
ہونی چاہئیں۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- اور دماغی صفات کے متعلق بھی یہ اندازہ ہو گیا کہ جراثم کا ہونا ضروری  
گ :- بیشک۔

میں :- لیکن یہ بھی تو احتمال ہے کہ جری لوگ آپس میں اور دوسروں سے  
وحشیانہ برتاؤ کریں گے۔

گ :- بلاشبہ یہ عیب تو بڑی مشکل سے رفع ہو سکتا ہے۔

میں :- حالانکہ چاہئے کہ یہ لوگ دشمنوں سے سختی اور دوستوں سے نرمی  
کا برتاؤ کریں ورنہ یوں تو قبل اس کے کہ کوئی دشمن ان کی تباہی کا باعث ہو  
یہ خود اپنے آپ کو برباد کریں گے۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- لیکن اس کا علاج کیا ہے۔ ہمیں ایسے آدمی کہاں ملیں گے جو  
خوش طبع اور علیم ہوں اور ساتھ ہی جراثم بھی رکھتے ہوں۔ کیونکہ یہ دونوں صفات



ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

گ :- بیشک ایسا تو ہے۔

میں :- مگر بڑی وقت تو یہ ہے کہ جہاں ان صفات میں سے ایک کی بھی کمی ہوئی تو وہ آدمی اچھا محاذ ہو ہی نہیں سکتا۔ اور ان صفات کا یکجا ہونا ناممکن سا معلوم ہوتا ہے۔ یعنی دو سکرافاظ میں یہ معنی ہوئے کہ اچھے محاذ کا ملنا محال ہے۔  
گ :- آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں مجھے بھی یہی اندیشہ ہے۔ اس گفتگو سے میں کچھ پریشان سا ہو گیا اور مجھے سابقہ گفتگو پر تھوڑا سا غور کرنا پڑا۔

میں :- مہربان من ہماری پریشانی بالکل ناگزیر تھی اور مجھے اس پر مطلق تعجب نہیں۔ ہم نے خود ہی اس شکل کو بالکل فراموش کر دیا جو ابتداء میں ہمارے پیش نظر تھی۔

گ :- وہ کیا؟

میں :- میرا مطلب یہ ہے کہ ایسے طبائع بھی موجود ہیں جن میں یہ متضاد صفات یکجا پائی جاتی ہیں۔

گ :- مثلاً۔

میں :- اکثر جانوروں میں آپ کو اس کی مثالیں ملیں گی چنانچہ خود کتا بہت اچھی مثال ہے۔ آپ یہ تو جانتے ہی ہونگے کہ اچھی نسل کے کتے ہمیشہ واقفکاروں سے اچھی طرح پیش آتے ہیں اور اجنبیوں سے بڑی طرح۔

گ :- جی ہاں ۔

میں :- تو پھر ایسے محافظین کا ملنا بھی ناممکن یا قوانین قدرت کے خلاف نہیں ہو سکتا جن میں یہ دونوں صفتیں موجود ہوں ۔

گ :- صحیح ہے ۔

میں :- گویا جو لوگ حفاظت کے کام کے لیے موزوں ہونگے ان میں جرأت کے علاوہ ایک فلسفی کی سی صفات بھی ہونی چاہئیں ۔

گ :- میں جناب کا مفہوم بالکل نہیں سمجھا ۔

میں :- میں جس صفت کی طرف اشارہ کر رہا ہوں وہ کہتے ہیں بھی اپنی جاتی

ہو اور پھر تو یہ ہے کہ ایک جانور میں اسکا وجود بڑی عجیب بات ہے ۔

گ :- آخر وہ صفت ہے کیا ؟ میں تو اب بھی نہیں سمجھا ۔

میں :- بھائی اس میں کونسی دشواری ہے ۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ جب کبھی

کتنی کسی اجنبی شخص کو دیکھتا ہے تو غصہ کرتا ہے اور جب کسی جان پہچان والے کو دیکھتا

ہے تو خوشی کا اظہار کرتا ہے ۔ حالانکہ نہ اول الذکر سے اسے کبھی کوئی نقصان پہنچا ہے

اور نہ مؤخر الذکر سے کوئی فائدہ ۔ تم نے اس عجیب و غریب صفت پر شاید کبھی

غور نہیں کیا ؟

گ :- ہاں تعجب ہے مجھے اس سے پہلے کبھی اس کا خیال نہیں ہوا البتہ آ

محسوس کرتا ہوں کہ آپ کا ارشاد بالکل واقعہ ہے ۔



میں :- سوچو تو سہی کہ کتے کا یہ قدرتی وصف کس قدر عجیب ہے۔ کتا تو یا ایک

حقیقی فلسفی ہے !

گ :- یہ کیوں کر؟

میں :- چونکہ اس کے نزدیک دست اور دشمن کے درمیان وجہ امتیاز علم اور

جہل ہے اور وہ جانور علم کا کیسا شیدائی ہوگا جو جہل کے مقابلہ میں علم کو پسندیدگی کا معیار مقرر کرے۔

گ :- بجا ارشاد ہے۔

میں :- اور علم کی محبت اور عقل و حکمت کی لفت دو نو مراد فہم ہیں۔ اور اسی کو

دوسرے لفظوں میں فلسفہ کہتے ہیں۔

گ :- بیشک۔

میں :- تو پھر کیا ہم یقین کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ انسانوں میں بھی

وہی شخص دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرے گا جو بالطبع عقل اور

علم سے محبت کھتا ہو۔

گ :- کیوں نہیں ہم یقیناً یہ دعویٰ کر سکتے ہیں۔

میں :- لہذا رایست کا بہترین محافظ ہونے کے لیے جہاں جرات و دلیری،

طاقت و حسرتی کی ضرورت تھی وہاں فلسفی ہونا بھی لازمی قرار پایا۔

گ :- بلاشبہ۔

میں اب ہمیں اس بات کا پتہ تو چل گیا کہ محافطوں کے لیے کس قسم کی طبیعت ضروری ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت کا کیا انتظام کیا جائے میرا خیال ہے کہ اس مسئلہ پر غور کرنے سے ہمارے اصل مقصد تحقیق پر بھی کافی روشنی پڑے گی یعنی یہ کہ ریاست میں عدل و ظلم کس طرح پیدا ہو کر نشوونما پاتے ہیں۔ اگر ایسا ہو تو اس سوال پر غور کیا جائے ورنہ بیکار سلسلہ کلام کو طول دینے سے کیا حاصل۔

ایڈ۔ میرے خیال میں اس مسئلہ کی تحقیق سے بہت مفید نتائج برآمد ہونگی امید ہے۔

میں :- اگر یہ بات ہے تو میری رائے میں باوجود خوف طوالت کے اس سلسلہ کو ختم نہ کرنا چاہیے۔

ایڈ :- ہرگز نہیں۔

میں :- تو آؤ سمجھ لیں کہ کچھ وقت خیالی فسانہ گوئی میں ہی صرف ہوا جس کا عنوان ہے ”اپنے محافطوں کی تعلیم و تربیت“

ایڈ :- ضرور۔

میں :- پھر کیسے انھیں کیا تعلیم دینی چاہیے؟ میرے نزدیک تو رسماً جو تعلیم تقسیم کی جاتی ہے وہ بالکل ٹھیک ہے یعنی جسم کے لیے ورزش اور روح و دماغ کے لیے ترقی

ایڈ :- بیشک۔

میں :- اور اس میں کیا کچھ نقصان ہے کہ ہم تعلیم موسیقی سے شروع کریں اور



پھر بعد کو ورزش جسمانی سکھائیں۔

ایڈ:۔ کوئی نقصان نہیں۔

میں:۔ اور موسیقی میں تو علم ادب بھی شامل ہو گا۔

ایڈ:۔ بیشک۔

میں:۔ اور ادب میں سچ بھی ہوتا ہے اور جھوٹ بھی۔

ایڈ:۔ جی ہاں۔

میں:۔ ان دونوں قسموں کی تعلیم دینی ہوگی اور میری رائے میں ابتدا جھوٹے

ادب سے ہونی چاہیے۔

ایڈ:۔ یہ کیسے؟ میں سمجھا نہیں۔

میں:۔ کیوں۔ آپ یہ تو جانتے ہوں گے کہ بچوں کو جو قصے کہا نیاں سنائی

جاتی ہیں وہ اگرچہ حقیقت سے بالکل مبریٰ نہ سہی تاہم اکثر بیشتر محض فسانہ ہی فسانہ

ہوتی ہیں۔ یہ کہانیاں اس وقت سنائی جاتی ہیں جب بچہ ورزش جسمانی کے

لائق نہیں ہوتا۔

ایڈ:۔ جی ہاں۔

میں:۔ ورزش جسمانی سے پہلے موسیقی کی تعلیم دینے کا یہ مطلب تھا۔

ایڈ:۔ بجا ہے۔

میں:۔ اور آپ یہ بھی خوب اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ ہر کام کا آغاز ہی

اس کا سب سے اہم حصہ ہوتا ہے۔ خصوصاً بچوں اور دوسری نازک چیزوں کے معاملہ میں کہ اسی زمانہ میں اخلاق کا نشوونما ہوتا ہے اور مطلوبہ اثرات بہت آسانی سے پیدا کیے جاسکتے ہیں۔

ایڈ۔ بشیک۔

میں :- تو کیا ہم اپنے بچوں کو ہر کس و ناکس کے تصنیف کردہ قصے سُننے دیں گے اور کیا یہ جائز ہے کہ ہم ان کے دماغوں کو بڑے ہوئے پر جن خیالات و جذبات کا جو لانگاہ دیکھنا چاہتے ہیں بچپن میں اس کے بالکل مخالف خیالات کے ذہن نشین ہونے دیں۔

ایڈ۔ :- ہرگز نہیں۔

میں :- اس لیے سب سے پہلی ضرورت تو یہ ہے کہ فسانہ نگاروں کی نگارنی کے لیے ایک محکمہ نظارت قائم کیا جائے۔ ناظر اچھے قصوں کو منظور کر لیں اور بروں کو خارج کر دیا کریں۔ پھر ماؤں اور دایوں کو یہ علم دیدیا جائے کہ بچوں کو ضرورت مند طور شدہ قصے سنائیں اور بس طرح وہ اپنے ہاتوں سے بچوں کے جسم کو سنواریں ہیں اس سے زیادہ شوق و محبت کے ساتھ ان کہانیوں کے ذریعہ ان کے دماغوں کو عزیز کریں۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر اکثر رائج الوقت کہانیاں خارج کر دینی چاہئیں

ایڈ۔ :- جناب کا اشارہ کن کہانیوں کی طرف ہے؟

میں :- آپ کے بڑے بڑے اور مشہور فسانے دراصل ان جھوٹی کہانیوں



کے لیے نمونہ ہیں کیوں کہ یہ سب ایک ہی نوع کی مختلف اقسام ہیں اور ان سب میں خیالات کی یکسانیت پائی جاتی ہے۔

ایڈ۔ بہت ممکن ہے کہ ایسا ہو۔ لیکن میں ہنوز نہیں سمجھا کہ آپ کن قصوں کو مشہور تصور کرتے ہیں۔

میں :- میرا مطلب ہومر، ہیسیاڈ اور ان شعرا کی تصنیف کردہ قصوں سے ہے جو نوع انسانی کے مشہور ترین فسانہ گوئذکے ہیں۔

ایڈ۔ لیکن جس ان لوگوں کے کون سے قصوں کی طرف آپ کا اشارہ ہے۔ اور ان میں آپ کیا معائب پاتے ہیں؟

میں :- سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ ان میں جھوٹے بیانات ہوتے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ جھوٹ بھی بُرے قسم کا جھوٹ۔

ایڈ۔ مثلاً۔

میں :- ان کی مثال وہ غلط بیانیاں ہیں جو دیوتاؤں اور مشاہیر کے متعلق ان قصوں میں کی جاتی ہیں۔ اور اس غلط بیانی کی مثال بالکل اس تصویر کی سی ہے جسے اصل سے مطلق مشابہت نہ ہو۔

ایڈ۔ بیشک۔ یہ بات درحقیقت مستحق مواخذہ ہے۔ لیکن ایسا کوئی قصہ تو بتلائیے۔

میں :- سب سے پہلے تو وہ بڑی اور بُری دروغ گوئی ہے جو شاعر نے

یورانس کے متعلق کی ہر میرا اشارہ ان بیانات کی طرف ہی جو ہیریا ڈنے  
یورانس کے اعمال اور کروٹس کے انتقام کے متعلق کیے ہیں۔ پھر خود کروٹس  
کے افعال اور ان کے بدلے میں اس کے بیٹے نے جو جو نکالیت اپنے باپ کو  
دیں اگر سب سچ بھی ہوں تو بھی بلا سوچے سمجھے کم عمر لوگوں کے سامنے ان کا  
بیان کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ اور میری رائے میں تو ان افسانوں کو ہمیشہ  
کے لیے قعر خاموشی میں مدفون کر دیا جائے۔ لیکن اگر ان واقعات کا بیان کیا  
جانا ایسا ہی ضروری ہو تو کسی قربانی کے موقع پر چند مخصوص اشخاص کے سامنے  
خفیہ طور پر ایسا کیا جاسکتا ہے۔ اور اس موقع کے لیے بجائے ایک معمولی شور  
کی قربانی کے کسی قیمتی اور کیا ب جانور کی قربانی فرض نہ کر دینی چاہیے تاکہ  
سامعین کی تعداد حتی الوسع کم ہو۔

ایڈ۔ آپ کی رائے نہایت مناسب ہے۔ یہ قصے بہت ہی قابل اعتراض ہیں۔  
میں۔ تو پھر ہم اس قسم کے تمام قصوں کو اپنی ریاست میں ممنوع قرار دے دیں۔

۱۔ یورانس یونانی ادب قدیم میں آسمان کے دیوتا کا نام ہے اسکی  
شادی زمین کی دیوی گیا سے ہوئی تھی اور اسکی کثرت سے اولاد تھی  
یورانس اپنی اولاد سے سخت نفرت کرتا تھا اور سب کو قید کر رکھا تھا گیا کو  
اشارہ سے لے کے بیٹے کروٹس نے اس پر حملہ کیا اور تخت سے اتار دیا۔  
کروٹس کے برسر تخت آنے پر اس کے بیٹے ٹریس نے یہی سلوک اس کے  
ساتھ کیا اور اپنے باپ کو سخت اذیت پہنچائی۔



کیونکہ کس اور جوان آدمیوں کے دل میں ہرگز یہ خیال نہ پیدا ہونا چاہیے کہ سخت سے سخت جرم کے ارتکاب میں بھی چنداں زیادہ بُرائی نہیں ہے اور وہ پلٹے پاپے تک کو ہر طریقے سے سزا دینے اور اذیت پہنچانے میں صرف ایک عظیم ترین دیوتا کے طرز عمل کا اتباع کرتے ہیں۔

ایڈ۔۔ میں آپ سے بالکل متفق ہوں اور میری رسلے میں بھی ان قصوں کا کہنا یکسخت بند کر دینا چاہیے۔

میں۔ اس کے علاوہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے محاذ آہن میں لڑنے جھگڑنے کو بدترین عادت متصور کریں تو ہمارا فرض ہے کہ انھیں آسمانی جنگوں کے متعلق ایک حرف بھی نہ سُنانے دیں نہ ان سازشوں اور باہمی تنازعات کا <sup>مطلق</sup> ذکر کرنا چاہیے جو دیوتاؤں کے درمیان تہلوائے جاتے ہیں کیوں کہ یہ تمام کی تمام روایتیں سراسر غلط اور بے بنیاد ہیں۔ نہ ہم کو ان روایات کا ذکر کرنا چاہیے نہیں دیوتاؤں کے باہمی معرکہ آرائیوں کے حالات بیان کیے جاتے ہیں ورنہ کپڑوں ان معرکوں کے کشیدے کاڑھنے کی اجازت دینی چاہیے۔ تیران دیگر بے شمار جھگڑوں کے متعلق بھی ہمیں خاموشی اختیار کرنی چاہیے جو دیوتاؤں اور مشائخ یا ان کے احبار و اقربا میں ہوسے۔ اگر یہ لوگ باور کریں تو ہم تو یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہیں کہ جنگ و جدال سخت ناپاک کام ہے اور آج تک پچھے شہر میں کبھی جھگڑا فساد نہیں ہوا۔ زمانہ طفولیت میں ان بچوں کے سامنے یہ باتیں

ضعیف العمر عورتوں اور عمر لوگوں کو بیان کرنی چاہئیں اور اس کے بعد جب ذرا بڑے ہو جائیں تو شعراء کو ایسے خیالات تعظیم کر کے ان کے سامنے پیش کرنا چاہئے۔ مگر اس قسم کے بیانات کہ ہیفیٹس نے اپنی ماں ہیری کو باندھ کر ڈال دیا یا دوسرے موقع پر نہیں لے لے اسے اس تصور پر مار کر نکال دیا تھا کہ اس نے مار پڑتے وقت اپنی ماں کی طرف داری کی تھی ہم ہرگز اپنی ریاست میں روانہ رکھیں گے خواہ شاہ نے انھیں تم شیلا و استعارتا ہی کیوں نہ استعمال کیا ہو۔ کیونکہ ایک کس آدمی یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ اس سے لفظی معنی مراد ہیں یا محض تشبیل۔ اور اس عمر میں ذہن کی حالت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ جس چیز کا اثر ہو گیا بس پتھر کی لکیر ثابت ہوتی ہے۔ اور اسی لیے یہ بات اور بھی ضروری ہے کہ بچپن میں جو قصے کہانیاں سُنائی جاتی ہیں ان میں اخلاق حسنہ اور پاک خیالات کا نمونہ پیش کیا جائے۔

ایڈ۔ جناب کا یہ فرمانا تو بالکل درست ہے لیکن یہ کہیے کہ اگر کوئی آپ سے پوچھ بیٹھے کہ اس قسم کی کہانیاں ملیں گی کہاں سے تو آپ کے پاس کیا جواب ہے؟ میں۔۔۔ براہ غریب۔ تم اور میں اس وقت ایک شاعر کی حیثیت نہیں رکھتے

لہ ہیفیٹس آگ اور آگ سے متعلق سنون کا دیوتا مانا جاتا تھا۔ ہومر نے دیوتاؤں کے بارے قیام یسنی اولیس سے اس کے اخراج کا مفصل بیان دیا ہے وہ صرف اس تصور پر کہ اس نے کسی وقت اپنی ماں ہیری کو باپ کی زد و کوب سے محفوظ رکھنا چاہا تھا۔

ہیری۔ آسمانوں کی ملکہ تھی۔ زلیں کی بہن بھی تھی اور بیوی بھی!



بلکہ ہم تو ایک یا سب کا نظام اساسی مرتب کر رہے ہیں۔ اور ریاست کے بائیسوں کا کام صرف اس قدر ہے کہ شعراء کو وہ طرز بتلا دیں جن پر قصے لکھنا چاہیے نیز انھیں ان کی حدود سے آگاہ کر دیں، لیکن ان کے ذمہ یہ کام ہرگز عائد نہیں ہوتا کہ وہ خود ہی قصے کہانیاں تصنیف ہی کریں۔

ایڈ۔۔۔ درست۔ لیکن خبر یہ طرز کیا ہونا چاہیے؟

میں۔۔۔ شاعروں کو ہر قسم کی نظم میں اس امر کا خاص التزام رکھنا چاہیے کہ خدا کو بالکل حقیقت کے مطابق ظاہر کریں۔ اس میں مشنوی و غزل یا قصیدہ کی کوئی قید نہیں۔

ایڈ۔۔۔ خوب۔

میں۔۔۔ اور خدائی حقیقت خیر و برکت ہے۔ اس کے اچھے ہونے سے انکار ہو سکتا ہے، اس لیے نظم میں بھی اس کی یہی حقیقت پیش کرنی چاہیے۔

ایڈ۔۔۔ بیشک۔

میں۔۔۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ اچھی چیز نقصان دہ نہیں ہوتی۔

ایڈ۔۔۔ بلاشبہ۔

میں۔۔۔ اور نقصان دہ نہ ہونے کے یہی معنی تو ہیں کہ کسی کو اس سے ضرر

نہیں پہنچتا۔

ایڈ۔۔۔ اور کیا۔

میں :- اور تب چہرے سے کوئی ضرر یا نقصان نہیں پہنچتا وہ بُرائی کا سبب  
کیوں کر ہو سکتی ہے ؟

ایڈ :- جی ہاں۔

میں :- اور آپ غالباً یہ بھی تسلیم کر لینگے کہ اچھی چیز فائدہ رساں یعنی باعث  
فلاح ہوتی ہے۔

ایڈ :- بیشک۔

میں :- اس تمام تقریر کا نتیجہ یہ ہوا کہ خیر اور اچھائی صرف خیر کا سبب ہو سکتی  
ہے۔ اسے آپ ہر چیز کی وجہ نہیں قرار دے سکتے۔

ایڈ :- یقیناً۔

میں :- گویا عوام کے خیال کے خلاف ہماری رائے یہ ہے کہ خدا جو عبارت ہے  
خیر و برکت سے ہر چیز کا خالق نہیں ہو سکتا۔ وہ صرف چند چیزوں کی تخلیق کا سبب  
ضروری لیکن اشرک نہیں۔ اس لیے کہ حیات انسانی بیشتر عیوب و مضرتوں  
سے مملو ہے۔ ان عیوب کی تخلیق کا سبب کہیں اور تلاش کرنا چاہیے کیونکہ خدا کے  
ساتھ تو صرف خیر و برکت کی تخلیق منسوب کی جا سکتی ہے۔

ایڈ :- میری رائے میں بھی جناب کا یہ خیال بالکل بجا ہے۔

میں :- لہذا ہم ہومر اور دوسرے شعرا کے تمام ایسے بیانات کو باور کرنے  
سے انکار کریں گے کہ ”بارگاہِ زمیں کے آستانہ پر دو طرف رکھے ہیں۔ ایک میں



اچھی تقدیریں ہیں، دوسرے میں بُری جس آدمی کو نہیں ان دونوں میں سے  
 کچھ کچھ حصہ دیتا ہے وہ اگر کبھی آرام و مسرت سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں اور کبھی آرام  
 مصائب میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن جن غریبوں کو صرف بُری تقدیر والے  
 طرف سے حصہ ملتا ہے وہ تمام لذائذ دنیا سے محروم، ابدی احتیاج کی زندگی گزار  
 ہیں " نہ ہم تسلیم کریں گے کہ "نہیں ہر خیر و شر کا سبب ہے"۔ یا اگر کوئی شخص اس  
 دروغِ حلفی اور عہد شکنی کو جوئی الواقع پسند اس کی کارستانی تھی آیتھنی  
 اور زینس کی طرف منسوب کرے تو ہم ہرگز اسے نہ مانیں گے۔ نہ ہمارے نزدیک  
 یہ بات قابل قبول ہے کہ تھیس نے دیوتاؤں کو جنگ و جدال پر آمادہ  
 کیا" اسی طرح ہم اپنے نوجوان طبقہ کو ایسکلس کے اس قسم کے اقوال بھی نہ مانیں گے  
 کہ "جب خدا ہی خاندان کو تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے تو اس میں افعالِ قبیحہ کی بنیاد  
 ڈالتا ہے" یا اگر کوئی شاعر نیوبی کے مصائب یا خاندان پیلاپ کی تکالیف

۱۵ (حاشیہ صفحہ ۱۱) زینس یونانیوں کا سب سے بڑا دیوتا تھا۔ جنگ میں سکت  
 فتح، قیام امن۔ اور معیارِ خیر و شر کا مقرر کرنا اور قوانینِ اخلاق کی نگرانی سب  
 اس کے ذمہ تھی۔ اس کی کئی بیویاں تھیں اور نہایت کثیر الاولاد تھا۔

۱۶ تھیس یوریش (صفحہ ۱۱) کی بیٹی اور زینس کی بیوی تھی اسے یونانی زمین کے  
 توازن و تناسب کی دیوی مانتے تھے۔

۱۷ نیوبی آیتھنیس شاہ تھیس کی بیوی تھی۔ اس کے بہت سے بیٹے  
 تھے۔ ماتے غور کے کیسوسے مقابلہ کرنے لگی کہ اس کے صرف دو بیٹے تھے اپولو



یاجنگ تروجن کے حالات منظر کرے تو اسے اس امر کی اجازت نہ ہونی چاہیے۔  
 چاہیے کہ ان واقعات کو ذات باری کی طرف منسوب کرے اور اس نسبت پر  
 اصرار ہی ہو تو اس کی کوئی نہ کوئی تاویل ضرور ہونی چاہیے مثلاً یہ کہ خدا نے یہ سب  
 کچھ حق و انصاف کی حمایت میں کیا تھا اور اسکا اصلی مقصد بدکاروں کی تادیب  
 اصلاح تھا۔ یہ ہرگز نہ کہنا چاہیے کہ یہ سزا انکی تخریب کا باعث ہوئی۔ ہاں شاعر  
 یہ لکھ سکتا ہے کہ بڑے لوگ تکلیف و مصیبت میں اس لیے مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ اپنی  
 بُرائی کی وجہ سے سزا کے مستحق ہیں اس سزا سے ان کی اصلاح ہو جاتی ہے اور اس طرح  
 انھیں کا فائدہ ہوتا ہے لیکن ایک صحیح اصولوں پر مرتبہ بایست میں کوئی مصنف  
 نظم یا نثر میں یہ کہنے کا مجاز نہ ہوگا کہ خدا لوگوں کے ساتھ بُرائی کرتا ہے۔ کیوں کہ  
 اس قسم کے بیانات سخت ناپاک ضرر رساں اور مہلک ثابت ہوتے ہیں۔  
 ایڈ:- میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں اور اس قانون کی تائید کیلئے تیار ہوں۔  
 میں:- گو یا ہمارا ایک اصول یا ہمارے قانون کی ایک دفعہ یہ قرار پائی کہ  
 خدا ہر چیز کا پیدا کرنے والا نہیں بلکہ صرف خیر و نیکی کا خالق ہے اس دفعہ کی اپنی  
 تمام شعرا اور متکلمین پر لازم ہوگی۔

دبقیہ نوٹ صفحہ ۱۱۱ اور آرمس ان دونوں نے نیو بی کے تمام بچوں کو قتل کر ڈالا  
 اور خود چھاپری نیو بی کو زبیں نے پتھر کا کر دیا۔ اس حالت میں بھی یہ بچوں  
 کی موت پر اشک افشانی کرتی رہی!



ایڈ۔ ضرور۔

میں :- اور دوسرے اصول کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟ کیا آپ کے نزدیک خدا ایک جادوگر یا جادوگر ہے کہ کبھی ایک شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی دوسرے روپ میں۔ کیا وہ ہر گھڑی اپنی صورت تبدیل کرتا رہتا ہے اور اس تغیر شکل سے ہمیں دھوکا دیتا ہے۔ یا کہ وہ اپنی مخصوص شکل میں ازل سے اب تک بلا تغیر و تبدیل دائم و قائم ہے!

ایڈ۔ میں بلا غور کہتے ہوئے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔

میں :- لیکن آپ یہ تو بتا سکتے ہیں کہ اگر کسی چیز میں کوئی تغیر و تبدیل پیدا ہو تو یا تو اس تبدیلی کی وجہ خود اس شے کا ذاتی فعل ہوتا ہے یا پھر کسی خارجی سبب سے یہ تبدیلی رونما ہوتی ہے۔

ایڈ۔ جی ہاں۔ دونوں میں سے ایک صورت لازمی ہے۔

میں :- اور غالباً آپ یہ بھی تسلیم کریں گے کہ کوئی چیز جب اپنی بہترین حالت میں ہو تو اس میں تغیر کا بہت کم احتمال ہوتا ہے۔ مثلاً کامل تندرستی اور صحت کے زمانہ میں جسم انسانی خور و نوش سے بہت کم متغیر ہوتا ہے۔ یا اگر کوئی پودا خوب سبز و شاواہ ہو تو آندھریوں اور دھوپ سے مقابلہ بہت کم متاثر ہوگا۔

ایڈ۔ بیشک۔

میں :- اسی طرح عقلمند اور بہادر طبائع اسباب خارجی سے بہت کم پریشان

ہوتی ہیں۔

ایڈ۔ جی ہاں۔

میں۔ یہی اصول میری رائے میں دیگر شیاؤں مثلاً اسباب آرائش مکانات و طبوسات وغیرہ پر بھی عائد ہوتا ہے کہ یہ چیزیں جس قدر عمدہ اور اچھی بنی ہوں گی اسی قدر امتداد زمانہ اور دوسرے اسباب سے کم متاثر ہوں گی۔

ایڈ۔ جی ہاں۔

میں۔ گویا ہر چیز جس قدر اچھی ہوگی اسی قدر اس میں تغیر کا امکان کم ہوتا ہے خواہ یہ چیز انسانی دستکاری کا نتیجہ ہو قدرت کی مصنوعہ ہو یا دونوں کی متحدہ مساعی کا حاصل۔

ایڈ۔ بیشک۔

میں۔ لیکن خدا اور اس کے متعلقہ صفات تو ہر حیثیت سے بہترین اور

کامل ترین ہیں۔

ایڈ۔ بلاشبہ۔

میں۔ لہذا خارجی اثرات تو اُسے شکل تبدیل کرنے پر مجبور کر نہیں سکتے۔

ایڈ۔ ہرگز نہیں۔

میں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ وہ خود اپنی ذات میں یہ تغیرات پیدا کرتا ہو۔

ایڈ۔ جی ہاں اگر یہ مان لیا جائے کہ اس کی شکل میں تبدیلی ہوتی ہے تو



پھر اس کی صرف یہی ایک صورت ہے۔

میں بہت مناسب۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ اگر وہ اپنی شکل تبدیل کرنا ہی تو پہلے سے بہتر اور زیادہ خوبصورت شکل اختیار کرنا ہی یا بری اور بد نما۔ ایڈ۔ اگر تبدیل شکل کا ہونا تسلیم ہی کر لیا جائے تو صرف یہی ایک صورت ممکن ہے کہ وہ پہلے سے بُری شکل اختیار کرے۔ کیونکہ صورت و سیرت کے اعتبار سے اس میں کوئی نقص ٹہکی تو ہی نہیں کہ اسے رفع کر کے بہتر شکل میں دونا ہو سکے۔ میں اس میں آدمی یا خدا کی کچھ تخصیص نہیں کوئی بھی تو اپنے کو بدل نہیں بنا سکتا۔

ایڈ۔ ہاں۔ ہرگز نہیں۔

میں :- تو پھر یہ یا ممکن ہے کہ خدا اپنی شکل متغیر کرے۔ اس سے بہتر اور خوبتر شکل کا خیال تک فہم و ادراک سے باہر ہے اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ خدا اپنی اصلی شکل پر ہمیشہ قائم رہتا ہے۔

ایڈ۔ بیشک یہ تو لازمی بات ہے۔

میں :- لہذا کسی شاعر کو اس بات کی اجازت نہ ہونی چاہیے کہ دیوتاؤں کے اس قسم کے اتہام لگائے کہ ”وہ جنہی باشندوں کا بھیس بدل کر ہائے شہر و ملک ادھر ادھر مائے پھرتے ہیں“ نہ پسر و بیس اور تھیس پر چھوٹے بہتان

لے پروٹیس سمند کا دیوتا تھا۔ یہ مستقبل کا نام حال بنا سکتا تھا۔ لیکن جب بھی یہ

لکھنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ نہ ہمارے لیے اس طرح کے قصوں کی اشاعت جائز ہے کہ ہیری ایک پجارن کا لباس پہن کر دریاے آرگس کی بیٹی آنکس کے لیے در بدر ہیگ مانگتی پھرتی تھی۔ اس قسم کے تمام جھوٹے بیانات کو یکساں مسترد کر دینا چاہیے۔ ہاں۔ یہ بات بھی نظر احسان سے نہیں دیکھی جا سکتی ہے کہ ماہی شہر کے اس قسم کے کلام کو باور کر کے اپنے بچوں کو ڈراموں کی رات کے وقت دیتا مختلف شکلوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ کیونکہ اس سے ایک تو دیوتاؤں کی تحقیر ہوتی ہے اور دوسرے خود بچوں کے دل چھوٹے ہو جاتے ہیں۔

ایڈ۔۔ نفوذ باشد۔ اس قسم کی روایتیں تو سراسر ناجائز ہیں۔

میں :- اچھا اب یہ تو طر ہو گیا کہ خدا تغیر پذیر نہیں لیکن یہ تو ممکن ہے کہ وہ خود جادو ٹونے سے ایسا اثر ڈالے کہ ہمیں اس کی شکلیں مختلف نظر آئیں۔

ایڈ۔۔ جی ہاں۔ یہ تو ممکن ہے۔

میں :- لیکن کیا تم یہ گمان کر سکتے ہو کہ خدا لفظاً یا عملاً جھوٹ بول سکتا ہے؟

ایڈ۔۔ میں اس کا جواب نہیں دیکتا۔

میں :- آخر آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ حقیقی جھوٹ سے خدا کیا انسان

تک نفرت کرتا ہے۔

ایڈ۔۔ آپ کا مطلب کیا ہے؟ میں نہیں سمجھا۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۲۲) کسی کے ہاتھ آجاتا تو پیشینگوئی سے بچنے کے لیے شرح طرح کی شکلیں اختیار کر لیا۔



میں :- میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان دانستہ یہ گورا نہیں کرتا کہ اپنے وجود کے اعلیٰ ترین جزو کو اہم ترین معاملہ کے متعلق دھوکے میں رکھے۔

ایڈ :- میں اب بھی آپ کا مفہوم نہیں سمجھا۔

میں :- نہ سمجھنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے خیال میں میں کوئی باریک بات کہہ رہا ہوں، حالانکہ میرا مطلب تو بالکل صاف ہے۔ دیکھیے انسان کا اہم ترین جزو کیا ہے؟ اس کی روح۔ اور اس کو اہم ترین حقائق سے غیر مطلع یا ان کے متعلق دھوکے میں رکھنا کوئی انسان گورا نہیں کرتا۔ بلکہ ہر شخص اس سے سخت نفرت کرتا ہے۔

ایڈ :- بیشک اس سے زیادہ قابل نفرت بات اور کیا ہو سکتی ہے؟

میں :- اور اسی روح کو دھوکا دینے اور اہل میں رکھنے کو میں نے حقیقی جھوٹ

سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ ظاہر الفاظ میں جو جھوٹ بولا جاتا ہے وہ درحقیقت اسی سقم روحانی کا ایک عکس ہوتا ہے۔

ایڈ :- درست۔

میں :- چنانچہ حقیقی جھوٹ سے ہر ایک نفرت کرتا ہے کیا دیتا کیا انسان۔

ایڈ :- جی ہاں۔

میں :- لیکن نطفی جھوٹ بعض اوقات ناقابل نفرت ہی نہیں بلکہ مفید

ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً دشمنوں کے مقابلہ میں۔ یا فرض کرو کہ اپنا کوئی دوست جنوں کے دورہ میں مبتلا ہے اور اس میں کوئی نقصان کرنا چاہتا ہے تو اس وقت جھوٹ کو

دو اور استعمال کر سکتے ہیں۔ یا جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ جب ہم ازمنہ قدیم کے متعلق افسانے تصنیف کریں اس وقت اس جھوٹ کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیونکہ اس زمانہ کے حقیقی حالات تو معلوم ہوتے نہیں اس لیے جھوٹے واقعات گھڑ کر حتی الوسع حقیقت سے قرب حاصل کرتے اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ایڈ۔ بیشک۔

میں۔۔ مگر کیا اس قسم کی کوئی ضرورت خدا کو بھی پڑ سکتی ہے؟ کیا وہ بھی قدیم واقعات سے ناواقف ہے اور اس لیے مجبوراً جھوٹ بولتا ہے؟

ایڈ۔۔ نفوذ باشد۔ کس قدر متسخر انگیز خیال ہے!

میں۔ یعنی اس شاعرانہ جھوٹ کی تو خدا کو ضرورت نہیں پڑتی۔

ایڈ۔۔ ہرگز نہیں۔

میں۔۔ اور کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے دشمنوں سے ڈر کر جھوٹ بولتا ہے؟

ایڈ۔۔ یہ بھی کہیں خیال میں آنے کی بات ہے؟

میں۔۔ اچھا تو اس کے شاید کچھ پاگل یا دیوانے دوست ہوں اور اتنی خاطر دو اور جھوٹ بولنا پڑتا ہو؟

ایڈ۔۔ پاگل بھی کہیں خدا کے دوست ہو سکتے ہیں!

میں۔۔ تو پھر اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ خدا جھوٹ بولے۔

ایڈ۔۔ بیشک کوئی وجہ نہیں۔



میں۔ یعنی خدا جھوٹ بولنے کی مطلق قابلیت نہیں رکھتا۔

ایڈ۔ بیشک۔

میں۔ گویا ہم نے یہ ثابت کر دیا کہ خدا سادگی اور صداقت کا ایک کامل نمونہ ہے۔ اپنے قول اور فعل میں بالکل سچا ہے۔ مطلق تغیر پذیر نہیں۔ اور اپنے قول یا عمل سے سوتے جاگتے کبھی کسی کو دھوکا اور فریب نہیں دیتا۔

ایڈ۔ میں آپ کی رائے سے حرف بحرف متفق ہوں۔

میں۔ یعنی آپ مجھ سے اتفاق کرتے ہیں کہ تقریر و تحریر کے متعلق دوسرا

اصول یہ ہونا چاہیے کہ دیوتاؤں کو جادو گرا اور بہروپیہ نہ بتلایا جائے۔ نہ اپنے تغیر پذیر ہونے یا انسان کو دھوکا دینے کے اتہامات لگائے جائیں۔

ایڈ۔ مجھے یہ اصول منظور ہے۔

میں۔ اس لیے اگرچہ ہم ہومر کے مداحوں میں سہی لیکن ہم اس جھوٹے

خواب کو ہرگز بہ نظر استحسان نہیں دیکھ سکتے جو ہومر کے بیان کے مطابق زمین

نے آگائمنان کو دکھایا۔ نہ ہم ایسی ککلس کے ان اشعار کی تعریف کر سکتے ہیں

جن میں تھیسٹیس کا یہ بیان نقل ہے کہ ”اپولون نے میری شادی کے موقع پر میری اولاد

کی تعریف و تبریک میں گانا گایا تھا۔ اور وعدہ کیا تھا کہ میری نسل عرصہ تک قائم

اور تمام بیماریوں سے مامون رہے گی۔ اور ہر حیثیت سے مجھے خوش نصیب بنا کر

لے آگائمنان ہیسٹی کا بادشاہ اور ٹرائی کے مقابلہ میں یونانیوں کا سردار تھا۔

باوا زبند میری روح کو تسلی دے تھی۔ میں سمجھتی تھی چونکہ یہ الفاظ ایک دیوتا کی زبان سے نکلے ہیں اس لیے یہ شہین گوئی ہرگز غلط ثابت نہیں ہو سکتی بلکہ ستم پھنی دیکھو کہ اسی دیوتائے جس نے اس دعوت کے موقع پر یہ کچھ کہا تھا آج میرے بیٹے کو قتل کر ڈالا۔

دیوتاؤں کے متعلق ہم جب کبھی اس قسم کی باتیں سنیں تو ہمیں اپنے غصہ اور ناراضی کا اظہار کرنا چاہیے۔ یہ اہتمام کرنا چاہیے کہ ایسے اشعار کبھی عام شاہراہوں پر نہ پڑھے جائیں۔ اساتذہ کو منع کرنا چاہیے کہ ایسے قصوں کو بچوں کی تعلیم میں استعمال نہ کریں۔ اور یہ سب اس لیے کہ ہمارا مقصد اصلی یہ ہے کہ ہمارے محافظ جہاں تک ممکن ہو دیوتاؤں کے سچے پرستار اور ان کے مشابہ و مماثل ہوں۔

ایڈ:۔ میں ان اصولوں سے پورا اتفاق کرتا ہوں اور یہ حیثیت قانونِ نفس تسلیم کرنے پر تیار ہوں۔





# تیسری کتاب

## تعلیم اور سنون

میں نے سلسلہ کلام یوں شروع کیا جو دینیات کے اصول تو ہم گویا طر کر چکے یعنی یہ کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے شاگرد دیوتاؤں اور والدین کی عظمت اور عزت کریں اور آپس میں صلح و دوستی اور محبت و دوستی کی قدر کریں تو اس کے لیے لازم ہے کہ بچپن ہی سے انھیں ایک خاص قسم کے قصے کہانیاں سنائی جائیں اور ان کے علاوہ دوسری قسم کے قصوں کی بھینک بھی ان کے کان تک نہ پہنچے۔

ایڈمنٹس جی ہاں۔ ان اصولوں کی صحت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے؟ میں، لیکن صرف اس قدر تو کافی نہیں۔ اگر ان لوگوں کو دلیر اور باہمت بنانا مقصود ہے تو اس کے علاوہ اور چیزوں کی تعلیم بھی ضروری ہوگی۔ اور یہ تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ ان کے دل سے موت کا خوف بالکل دور ہو جائے کیونکہ جو شخص موت سے خائف ہو وہ بلند ہمت کیسے ہو سکتا ہے؟

ایڈ۔ آپ کا ارشاد بالکل بجا ہے۔



میں :- لیکن وہ شخص موت کے خوف سے کیونکر ربی ہو سکتا اور شکت  
و غلامی پر موت کو کیسے ترجیح دے سکتا ہے جو عالم زیریں کو حقیقی واصل یقین  
کرتا اور اسے سخت مہیب جانتا ہو؟

ایڈ :- بیشک یہ ممکن نہیں۔

میں :- تو ہمیں اس قسم کے قصوں پر بھی ایک محکمہ نظارت قائم کرنا  
ہوگا اور ان کے راویوں سے درخواست کرنی ہوگی کہ اس عالم کی محض برائی  
ہی برائی نہ بیان کیا کریں بلکہ اس کی تعریف کریں کیونکہ ان کے بیانات ایک  
جھوٹ ہیں اور دوسرے ہمارے آئندہ سپاہی بننے والے نوجوانوں کی  
تخریب کا باعث ہوتے ہیں۔

ایڈ :- بلاشبہ۔ ہم پر یہ فرض عائد ہوگا۔

میں :- چنانچہ اس قسم کے بہت سے ضرر رساں قطعات ہمیں اپنے علم  
ادب سے یک قلم خارج کرنے پڑینگے۔ مثلاً وہ قطعہ جس کے شروع میں ہے کہ میں  
ایک غریب اور مفلس آدمی کی زمین پر غلامی کا کام کرنے کو اس پر ترجیح دیتا  
ہوں کہ مردوں پر بادشاہت کروں، ہمیں وہ اشعار بھی قلم ادا کرنے ہونگے  
جن میں پلوٹو کے اس خطرہ کا ذکر ہے کہ ”و کہیں عالم زیریں کے وہ خوفناک  
قصر اور غلیظ اور گندے ایوان جن سے دیوتا تک نفور ہیں دوسری فانی یا





حسن خوبی ہی اسی قدر ان سے ہمارے نوجوانوں کو زیادہ نقصان پہنچنے کا  
احتمال ہے اس لیے کہ ہم انھیں آزاد انسان بنانا چاہتے ہیں جو غلامی سے زیادہ  
خائف ہوں اور موت سے کم۔

ایڈ:- بیشک۔

میں :- یہی نہیں۔ ہمیں تو ان تمام مہیب ناموں کا بھی اخراج کرنا  
ہوگا جن سے عالم زیریں کو موسوم کیا جاتا ہے یا بھوتوں پریتوں کا ذکر جنکے  
نام ہی سے آدمی کے رنگے کھڑے ہوتے ہیں۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا  
کہ ممکن ہے اس قسم کے قصوں سے کوئی مفید نتیجہ بھی مترتب ہو سکے لیکن سب سے  
ہی یہ خوف ہے کہ ہمارے محافظین کی طبائع میں ان سے ڈراور سناٹیت کے  
جذبات زیادہ پیدا ہو جائیں گے۔

ایڈ:- ہاں یہ اندیشہ تو ہے۔  
میں :- تو پھر کیا ان تمام چیزوں کو یکھلم خارج کر دینا چاہیے۔  
ایڈ:- اور کیا؟ یقیناً۔

میں :- اور ان کے بجائے زیادہ مفید اور جوصلہ افزا ترک تصنیف  
کرنے اور ان لوگوں کو سنانے چاہئیں۔

ایڈ:- ضرور۔

میں :- ان نظموں میں جو بڑے بڑے مشاہیر کے رونے پینے اور

واویلا کرنے کا تذکرہ ہی کیا اسے بھی نکال دیا جائے ؟

ایڈ۔ بشیک جو حشر دوسری لغویات کا ہوا ہے وہی انکا ہونا چاہیو۔  
 میں۔ لیکن کیا ہم ایسا کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔۔۔ خوب سوچ  
 سمجھ لو۔ ہمارا خیال تو یہی ہے کہ ایک نیک آدمی کو چاہیے کہ اپنے کسی نیک  
 ہمراہی کی موت کو مصیبت عظیم متصور نہ کرے۔

ایڈ۔ بشیک۔

میں۔ چنانچہ اس دست سے دائمی جدائی پر اظہارِ رنج و افسوس بھی  
 نہ کرنا چاہیے جیسا کہ مصیبت کے وقت کیا جاتا ہے۔  
 ایڈ۔ ہاں۔ ہرگز نہ کرنا چاہیے۔

میں۔ اس کے علاوہ ہمارا یہ بھی تو عقیدہ ہے کہ نیک آدمی اپنی ذات  
 اور اپنی خوشی کے لیے خود کافی ہے اور اس وجہ سے دوسروں کی اعانت  
 کا بہت کم محتاج ہے۔

ایڈ۔ جی ہاں۔

میں۔ چنانچہ دو سکروگوں کے مقابلہ میں اسے کسی بھائی بیٹے  
 کی موت یا کسی قیمتی متاع دنیاوی کے تلف ہوجانے کا بہت کم افسوس ہوگا۔  
 ایڈ۔ بشیک۔

میں۔ اس لیے ان واقعات پر کبھی گریہ و زاری بھی نہ کریگا۔ اور اس



قسم کے جو مصائب بھی پیش آئیں گے انہیں کشادہ پیشانی سے برداشت کرے گا۔  
 ایڈ:- اوروں کے نسبت اسپران چیزوں کا بہت کم اثر ہوگا۔  
 میں:- تو پھر ہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشہور اور برگزیدہ لوگوں  
 کے متعلق جہاں کہیں وہ نے پینے اور پیئے چلانے کی روایتیں ہوں انہیں  
 خارج کر دیں اور ان حرکات کو عورتوں یا بڑی قسم کے مردوں کے ساتھ منسوب  
 کریں تاکہ تحفظ ملک کی تعلیم حاصل کرنے والے اس قسم کے افعال کو ذلت اور  
 حقارت کی نگاہ سے دیکھیں۔

ایڈ:- بالکل درست۔

میں:- گویا ہمیں ایک بار اور ہوسنا اور دوسرے شعراء سے درخواست  
 کرنی ہوگی کہ وہ ایک یوی کے بیٹے یعنی ایچی لیس کے متعلق یہ نہ بیان کریں کہ  
 وہ کبھی بقیاری سے زمین پر لٹتا اور مضطربانہ کروٹیں بدلتا تھا اور کبھی سمندر  
 کے کنارے دوڑا دوڑا پھرتا تھا یا دونوں مٹھیوں میں اکھ بھر بھر کر سر پر ڈالتا تھا۔  
 نہ ایک یوتا کے عزیز پراجیہ کی نسبت یہ روایت کریں کہ وہ خاک پر لٹا لٹا  
 کر اور حاضرین کا نام زور زور سے پکار کر دعائیں اور التجائیں کرتا اور دادی  
 کا طالب ہوتا تھا۔ ہم ہوسنا سے نہایت خلوص کے ساتھ یہ التجا بھی کرتے  
 کہ اپنے کلام میں دیوتاؤں کو تو شکوہ و شکایت کرتا ہوا نہ ظاہر کرے اور اگر



دیوتاؤں کا ذکر کرنا ایسا ہی ضروری ہے تو کم سے کم سب سے بڑے دیوتا کو تو اس قدر سخت غلط بیانی سے معاف رکھے کہ اس کی طرف ذیل کے الفاظ منسوب کیے جائیں "الامان۔ الامان۔ میں اپنی ہی آنکھوں سے دیکھتا ہوں کہ میرے ایک دست کا پچھا کر کے اُسے شہر کے چاروں طرف دوڑایا جا رہا ہے۔ اور میں اس سے کہتا ہوں کہ "یارہ کہ" یا "جیف صد جیف میرے نصیب پر کہ انسانوں میں عزیز ترین انسان کی قسمت ہے کہ میں نے اس کے بیٹے پیٹر وکلس کے ہاتھوں نچا دیکھے۔"

کیونکہ عزیز من! اگر نوجوان لوگ دیوتاؤں کے متعلق اس قسم کی روایتیں سنیں گے تو بجائے اس کے کہ ان کی حماقت پر ہنسیں ان پر بالکل دوسرا اثر مرتب ہوگا۔ وہ سمجھیں گے کہ جب دیوتاؤں کا یہ حال ہے تو پھر انسان کے لیے یہ حرکات کیسے باعث ذلت ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ اگر گریہ و بکا کرنے کی کوئی تحریک ان کی طبیعت میں ہوگی تو وہ ہرگز اُسے دبانے کی کوشش نہ کریں گے۔ اور بجائے اس کے کہ شرم سے کام لیں اور اپنی طبیعت پر قابو حاصل کریں وہ ہر ذرا ذرا سی بات پر ہمیشہ رونے پیتے پھرا کریں گے۔

ایڈ۔ جی ہاں۔ یہ تو بالکل سچ ہے۔

میں۔ لیکن جیسا کہ ہمارے گذشتہ دلائل نے ثابت کر دیا ہے ایسا



ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ اور جب تک ہماری دلیلیں غلط ثابت نہ ہو جائیں  
ہیں ان کے نتائج پر قائم رہنا ضروری ہے۔  
ایڈ۔ بیشک۔

میں۔ اس کے علاوہ میری رائے میں محققین کو زیادہ ہنسنے  
کا بھی عادی نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ قہقہہ لگانے کے بعد تقریباً ہمیشہ عمل  
کے طور پر ایک پرمردگی سی طاری ہو جاتی ہے۔  
ایڈ۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔

میں۔ چنانچہ کسی معزز آدمی کی نسبت ہرگز یہ نہ بیان کرنا چاہیے کہ  
مارے ہنسی کے بے قابو ہو گیا۔ اور جب انسان کے متعلق یہ احتیاط لازمی ہے  
تو پھر دیوتاؤں کی نسبت تو اس کا اور بھی زیادہ اہتمام ہونا چاہیے۔  
ایڈ۔ یقیناً۔ دیوتاؤں کے متعلق تو بقول آپ کے اور بھی شدید احتیاط کارہ  
میں۔ تو ہم دیوتاؤں کے متعلق ہرگز اس قسم کے بیانات نہ روا رکھیں گے  
جیسے کہ ہومر نے کیے ہیں کہ وہی فیسس کو مکان کے گرد گھبراہٹ  
میں چکر لگاتے دیکھ کر دیوتاؤں کی مبارک محفل میں ایک ایسا قہقہہ پڑا کہ ختم  
ہی نہ ہوتا تھا۔

ایڈ۔ ہاں آپ کے خیالات کے بموجب تو ہرگز ایسے بیانات کو  
جائز نہ رکھنا چاہیے۔

میں۔۔۔ خیر بھائی۔ ان خیالات کی ذمہ داری میرے ہی سرسری بہرائے  
 اس میں ذرا شک نہیں کہ اس قسم کے بیانات ہرگز قابل پذیرائی نہیں۔ (خیرات  
 جانے دیجئے) اس کے علاوہ اور اہم امور بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ استبازی و بیچ  
 کی بہت زیادہ وقعت ہونی چاہیے۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اگر جھوٹ  
 دیوتاؤں کے لیے بالکل بیکار اور انسان کے لیے صرف دوائے مفید ہی تو پھر اس  
 دوائے استعمال کو صرف طبیوں تک محدود رکھنا چاہیے عوام کو اس سے  
 کوئی سروکار نہ ہو۔

ایڈ۔۔ ہرگز نہ ہونا چاہیے۔

میں۔۔۔ تو اگر کسی کو جھوٹ بولنے کا منصب حاصل ہو سکتا ہے تو صرف ریاست  
 کے حکمرانوں کو۔ انھیں تو اجازت ہونی چاہیے کہ فلاح عام کے لیے دشمنوں سے  
 یا خود اپنے شہریوں سے جھوٹ بول سکیں۔ لیکن ان کے علاوہ کسی اور شخص کو  
 ایسا ہرگز نہ کرنا چاہیے۔ یہ اختیار بس حکام تک محدود ہی اور کوئی دوسرا شخص  
 جو اب ان حکام سے جھوٹ بولے تو اس کے جرم کی مثال بالکل ایسی بلکہ اس سے  
 بھی زیادہ بُری ہوگی کہ ایک مریض اپنی جسمانی حالت کے متعلق طبی سے بیچ  
 نہ بولے یا یہ کہ ملاح جہاز کی حقیقی کیفیت سے ناخدا کو آگاہ نہ کرے اور مسافروں  
 یا دوسرے ملاحوں کی حالت سے اسے بالکل بخیر رکھے۔

ایڈ۔۔ بالکل بجا۔



میں۔ تو اگر کوئی عالم کسی دوسرے شخص کو خواہ وہ پجاری ہو یا حکیم۔ نجاً  
 ہو یا کوئی اور اہل حرفہ و درایت میں جھوٹ بولتے ہوئے پکڑ لے تو اسے  
 چاہیے کہ اس شخص کو سخت سزا دے کیونکہ اس کی یہ حرکت کشتی حکومت کو  
 غرق کرانے کی ایسی ہی صلاحیت رکھتی ہے جیسی کہ گذشتہ بابا امثال۔  
 ایڈ۔ بیشک ایسا ہی کیا جائیگا بشرطیکہ ہمارے مرتب کردہ نظام پر  
 کبھی عمل کیا جائے اور ہمارے الفاظ تبدیل بہ حقیقت ہو جائیں۔  
 میں۔ خیر۔ دوسری بات یہ ضروری ہے کہ ہمارے نوجوان عقیف  
 اور ضابط نفس ہوں۔

ایڈ۔ بیشک۔

میں۔ اور عفت اور ضبط نفس کے دو ہی خاص اجزا ہیں۔ یعنی حکام کی  
 اطاعت اور لڈانڈ جسمانی کے بارہ میں اپنی طبیعت پر قابو اور ضبط۔  
 ایڈ۔ جی ہاں۔

میں تو ہمیں ان کلمات کی تحسین کرنی چاہیے جو ہومر نے ڈیامیڈ  
 کی زبان سے ادا کیے ہیں کہ ”میرے دوست خاموش بیٹھو اور میرے  
 احکام کی اطاعت کرو، یا اس کے بعد والے جملے کہ ”وہ یونانی جنکے  
 ہر نفس کے ساتھ بہادری اور شجاعت نکلتی تھی اپنے قایدین سے ڈرتے ہوئے“

خاموشی سے بڑھے جاتے تھے، اور اسی قسم کے دوسرے خیالات کی بھی تعریف کرنی چاہیے۔

ایڈ۔ ضرور۔

میں :- اور اس بیان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے کہ حکام کو یونہی بھلا جئے کہ "اے نشہ دہی میں سرمست کئے کی سی نکھیں اور بہن کا سا دل کھنڈنے والے با"، یا اس کے بعد والے الفاظ۔ کیا یہ یا اسی قسم کی گستاخیوں کا ذکر جو شرما نیٹم میں اس طرح ہے گو یا معمولی اشخاص نے حکام کے ساتھ یہ بدکلامیاں کیں آپ کی رائے میں مناسب یا نہیں؟

ایڈ۔ یقیناً نامناسب ہے۔

میں :- ممکن ہے یہ اشعار تفریح طبع کا سامان بہم پہنچاتے ہوں۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ یہ باتیں عفت و ضبط نفس کے تو بالکل منافی ہیں اور اس لیے ہمارے نوجوانوں کو ان سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ غالباً آپ کو مجھ سے اتفاق ہوگا۔

ایڈ۔ بیشک۔

میں :- اور معرزا آدمیوں کی زبان سے یہ الفاظ روایت کیے جائیں کہ وہ دنیا میں اس سے زیادہ شاندار چیز اور کیا ہوگی کہ دسترخوان پر



طرح طرح کے کھانے چسنے ہوں۔ ساتی میٹا سے ساغر میں شراب منتقل کرتا ہوں اور پھر اس کا دور چلے، یا یہ کہ وہ اس عالم میں سب سے زیادہ بد نصیب وہ آدمی ہے جو بھوک کی وجہ سے جان دے، تو اس کا اثر سامعین پر بہ لحاظ عفت و ضبط نفس کے کیا ہوگا؟ اور یہی نہیں ذی اس ہی کا قصہ بیچئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ تمام عالم نحو خواب اور صرف ذی اس بیدار تھا اور مختلف تدابیر پر غور کر رہا تھا کہ ہیدی نظرائی اور وہ اپنی تمام تدابیر غلبہ شہوت کے باعث بھول گیا۔ حتیٰ کہ ہیدی کو اپنے جھوٹے کے اندر تک نہ لے گیا اور وہیں زمین پر اس سے مباشرت کرنا چاہی اور اس سے کہا کہ ہم تم جیب پٹی مرتبہ "اپنے والدین کی لاعلمی میں" ملے تھے اس وقت بھی مجھ پر یہ کیفیت طاری نہ ہوئی تھی۔ یا وہ دوسرا فسانہ جس میں بیان کیا جاتا ہے کہ اسی قسم کے اعمال کی وجہ سے ہی قیس شش نے ادریس اور ایفروداٹ کو زنجیر سے جکڑ دیا تھا۔

ایڈ:- میری رائے میں اس قسم کا کوئی قصہ بھی بیان نہ کرنا چاہیے۔ میں:- لیکن اگر کسی مشہور شخص سے استقلال و باپردی کے کام انجام پلے ہیں یا ہمت کے کلمات اس کی زبان سے نکلے ہیں تو یہ باتیں تو ضرور ان نوجوانوں کو سنانی چاہئیں۔ مثلاً یہ جملے کہ "وہ اپنے سینہ پر ہاتھ

مارا اور اپنے دل کو ملامت کو کے کہا کہ اے دل تو نے اس سے سخت سخت  
باتیں برداشت کی ہیں۔ اسے بھی برداشت کرے!

ایڈ۔۔ بیشک یہ باتیں تو انھیں ضرور سنانی چاہئیں۔

میں :- اس کے بعد ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ یہ لوگ نذریں او

تھخہ تحائف قبول نہ کریں اور ان میں دولت و زر کی ذرا محبت نہ ہو۔

ایڈ۔۔ بیشک۔

میں :- چنانچہ ہمیں ان کے سامنے کبھی یہ نہ کہنا چاہیے کہ نذریں

سے بڑے بڑے دیوتا، اور واجب الاحرام بادشاہ تک ہر کام کے کرنے

کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ نہ ہمیں ایسی لیس کے استاد قتی نکس

کی تحسین کرنی چاہیے کہ اس نے اپنے شاگرد کو یہ نصیحت کی کہ یونانیوں کی نذریا

قبول کر کے ان کی امداد پر طیارہ ہو جائے لیکن جب تک نذر نہ ملے اپنے غصہ

کو ہرگز کم نہ کرے۔ اور نہ ہمیں یہ باور کرنا چاہیے کہ خود ایسی لیس اس قدر

لاچی تھا کہ اس نے ایگامہنات کی نذر قبول کر لی اور روپیہ کی ادائیگی

کے بعد باوجود سابقہ انکار کے ہیکٹر کی نعش واپس کر دی۔

ایڈ۔۔ بیشک۔ اس قسم کے جذبات اور ان کے بیان کو ہرگز نہ نظر سنبھال

نہ دیکھنا چاہیے۔



میں - سچ پوچھو تو مجھے ہو مہر سے ایک طرح کا انس سا ہی۔ لیکن  
 جہاں اس نے ایکی لیس سے اس قسم کے ذمیدہ صفات کو منسوب کیا ہے۔ یا  
 یہ یقین ظاہر کیا ہے کہ یہ صفات فی الحقیقت اس کے ساتھ منسوب کی جاسکتی  
 ہیں تو میرے خیال میں وہ ایک سخت معصیت کا مرتکب ہوا ہے۔ اسی طرح  
 میں ہرگز اس بیان کو بھی قابل پذیرائی نہیں سمجھتا جو بارگاہِ آبولو میں ایکی لیس  
 کے گستاخانہ کلام کے متعلق ہو مہر نے اس طرح نظم کیا ہے کہ "وہ سارے  
 دیوتاؤں میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت دیوتا ایلے دراز دست اور  
 دورانداز! تو نے میرے ساتھ دنیا کی میرے بس میں ہوتا تیرے برابرین کہ  
 دکھلاتا۔" نہ میرے نزدیک یہ بات قابلِ یقین ہے کہ ایکی لیس نے دریائی  
 دیوتا سے سرکشی کی اور اس کی خدائی تک پر دست درازی کا ارادہ کیا۔  
 یا یہ کہ اس نے اپنے بالوں کی نذر پیٹروکلس کی نعش پر چڑبانی حالانکہ پل  
 سے انھیں دریائی دیوتا اسپر کی اس کے نام سے معنون کر چکا تھا۔  
 یا یہ روایت کہ اس نے پیٹروکلس کی قبر کے گرد ہتھکڑی گھسیٹا۔ اور  
 قیدیوں کو زندہ جلا دیا۔ میں تو ان باتوں پر ہرگز یقین نہیں کر سکتا اور  
 نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ ہمارے شہری یہ باور کریں کہ شیران جیسے حکیم کا  
 شاگرد اور ایک دیوی کا بیٹا جس کا باپ پی لی اس اشرف الناس اور



ذی اس کی تیسری پشت میں تھا اس قدر مجنونا کو اس ہو گیا ہو کہ ایک ہی وقت میں اس پر دو بظاہر مخالف جذبات حاوی ہوں یعنی ایک طرف تو لالچ اور طمع سے ملو کیسے پن ہو اور دوسری طرف دیوتاؤں اور انسانوں کی

ایسی انتہائی تختہ۔  
ایڈ۔ بشک آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔

میں۔۔۔ اسی طرح ہم پوسی دان کے بیٹے تھی سی اس یا ذی اس کے بیٹے پیری تھی کے متعلق ارتکاب زنا کی روایات کو ہرگز بیچ نہ مانیں گے اور نہ ہم اجازت دے سکتے ہیں کہ اس قسم کے قصے ہماری ریاست میں بیان کیے جائیں۔ مشاہیر عہد اور دیوتاؤں کے اخلاف کے ساتھ ہرگز اس قسم کے ناپاک اور نفرت انگیز افعال کو منسوب کرنا چاہیے۔ چنانچہ ہم شاعروں کو ہدایت کریں گے کہ یا تو وہ ان افعال قصیدہ کو ان لوگوں سے منسوب نہ کریں یا پھر انھیں دیوتاؤں کی اولاد نہ بتائیں۔ کیوں کہ یہ دونوں باتیں تو ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔ اس کے علاوہ ہم شعراء کو اس عقیدہ کی تلقین کی اجازت بھی نہیں دے سکتے کہ دیوتا ہی برائیوں کے خالق بھی ہوتے ہیں یا مشاہیر اور معمولی انسانوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ خیالات نہ تو مفید ہیں اور نہ صحیح۔ اور یہ ہم پہلے ہی ثابت کر چکے ہیں کہ دیوتا برائی کا باعث نہیں ہو سکتے۔



ایڈ :- بلاشبہ - ہرگز نہیں ہو سکتے۔

میں :- اس کے علاوہ سننے والوں پر ان قصوں کا کتنا برا اثر پڑے گا کیونکہ ہر شخص افعال شنیعہ کے ارتکاب کے بعد یہ عذر پیش کر سکتا ہے کہ اس قسم کے افعال تو دیوتاؤں کی اولاد اور نبیؐ اس اعزاز تک سے سزا دہو رہے ہیں جن کا آباؤی قرباں گاہ جبل ایدہ کی مرتفع چوٹی پر آسمان سے باتیں کرتا ہے اور جن کی رگوں میں اب تک دیوتاؤں کا خون دواں ہے اس لیے سننا یہی ہے کہ ان قصوں کا بالکل خاتمہ کر دیا جائے۔ مبادیہا سے نوجوانوں کی تخریب کا باعث ہوں۔

ایڈ :- ضرور۔

میں :- ہم چونکہ اس وقت اس مسئلہ پر غور کر رہے ہیں کہ کس قسم کے مضامین کے بیان کی اجازت دی جائے اور کون کون ممنوع قرار دیے جائیں اس لیے ذرا پھر سوچ لیجئے کہ کوئی مضمون رہ تو نہیں گیا۔ دیوتا اور ان کی اولاد۔ مشاہیر اور عالم زبیریں کے متعلق تو ہم طر کر چکے۔

ایڈ :- جی ہاں۔

میں :- غالباً اب اس مسئلہ کا صرف ایک حصہ باقی رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ انسانوں کے متعلق کس قسم کے بیانات کی اجازت دینی چاہیے؟

ایڈ :- اور کیا بظاہر تو یہی باقی ہے۔

میں۔۔۔ لیکن غالباً ہم لوگ فی الحال تو اس کا جواب دینے کے اہل نہیں ہیں۔  
ایڈ:- یہ کیوں؟

میں:- اس لیے کہ اس ضمن میں ہمیں لامحالہ یہ کہنا ہو گا کہ شاعروں اور  
فسانہ نگاروں نے انسان کے متعلق انتہائی غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ مثلاً  
یہ کہ شہریر لوگ راحت و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں، ٹریکوں کو ہمیشہ مصائب  
والام سے دست گریبان ہونا پڑتا ہے۔ یا یہ کہ اگر بازرگ نہیں نہ ہو تو جبر و نا انصافی  
میں بہت فائدہ ہے اور عدل و انصاف میں چاہے دوسروں کا فائدہ ہو اپنا  
ذاتی تو نقصان ہی ہے۔ اور ہم لوگ اپنے خیال کے مطابق انہیں یقیناً ایسے  
بیانات سے منع کریں گے بلکہ ان کے برعکس بیان کرنے کا حکم دیں گے۔  
ایڈ:- اور یہی کرنا بھی چاہیے۔

میں:- یہ تو درست ہے۔ لیکن اگر آپ اس کو تسلیم کیے لیتے ہیں تو گویا  
آپ نے اس اصول کو بالواسطہ قبول کر لیا جس پر ہم شروع سے بحث کر رہے ہیں۔  
ایڈ:- ہاں بیشک آپ کا یہ ارشاد تو بالکل سچا ہے۔

میں:- لہذا ہم اس وقت تک اس سوال کا کوئی قطعی جواب نہیں دے سکتے  
جب تک کہ عدل کی حقیقی ماہیت معلوم نہ ہو جائے اور یہ ظاہر نہ ہو کہ عاقل  
شخص کو عدل سے فی نفسہ کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں خواہ وہ بظاہر عادل معلوم  
ہو یا نہ ہو۔



ایڈیٹر۔ بالکل صحیح۔

میں :- اچھا۔ شاعری کے نفس مضمون کے متعلق تو کافی بحث ہو چکی۔  
 آؤ۔ اب ہر اطرز ادا کے متعلق کچھ گفتگو کریں تاکہ اس مسئلہ کے دونوں اجزاء  
 کی تحقیق مکمل ہو جائے۔

ایڈیٹر :- میں صحیح طور پر آپ کا مفہوم نہیں سمجھا۔

میں :- تو میں سمجھاتا ہوں۔ آپ غالباً اس طرح سمجھ لیں۔ یہ تو آپ جانتے  
 ہی ہوں گے کہ تمام کی تمام شاعری اور فسانہ نگاری چند واقعات کے بیان  
 پر مشتمل ہی جو زمانہ دماغی۔ حال یا استقبال میں سے کسی نہ کسی زمانہ سے متعلق ہیں۔  
 ایڈیٹر :- جی ہاں۔

میں :- اچھا۔ اور بیان کی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں یعنی یا تو خالص واقعہ نگاری  
 ہو یا نقل کلام یا ان دونوں کا مرکب۔

ایڈیٹر :- میں پھر آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

میں :- تم جی میں سمجھتا ہوں گے کہ یہ کیسے استناد سے سابقہ پڑا ہی جو اپنا مفہوم  
 بھی ظاہر نہیں کر سکتا۔ اس لیے ایک بڑے مقرر کی طرح میں پورے مضمون  
 پر بحث کرنے سے احتراز کرتا ہوں اور اپنے مفہوم کو صاف کرنے کے لیے بطور  
 تمثیل اس کے ایک جزو کو علیحدہ کیے لیتا ہوں۔ اچھا تو سنو۔ تم نے غالباً  
 ایلیاڈ کے شروع کے شعر تو پڑھے ہوں گے جن میں کرائی اس نے اپنی بیٹی کی

رہائی کے لیے آگامنان سے درخواست کی ہے اور آگامنان غضبناک ہو کر اس سے بگڑ گیا۔ چنانچہ جب کراچی سس اپنے مقصد میں ناکام ہوا تو اس نے دیوتا سے افسیوں پر نزول عذاب کی دعا مانگی ہے۔ ہاں تو اس جملہ تک کہ "اس نے تمام یونانیوں سے عموماً اور اتریدیل سے کے دونوں بیٹوں سے جو قوم کے سردار تھے خصوصاً درخواست کی" شاعر خود اپنی طرف سے واقعہ بیان کر رہا ہے اور کسی دوسری شخصیت میں روپوش نہیں ہونا چاہتا۔ لیکن اس کے بعد وہ کراچی سس کی زبان اختیار کرتا ہے اور یہ یقین دلانا چاہتا ہے کہ مقرر ہومر نہیں بلکہ خود وہ معمر بچاری ہے۔ چنانچہ ٹرای، اور اٹھا کا کے واقعات اور نیزا و دیسی میں وہ یہ دونوں طرق بیان استعمال کرتا ہے۔

ایڈ۔ جی ہاں۔

میں :- دونوں صورتوں میں یعنی خواہ شاعر اپنی زبان سے واقعہ بیان کرے یا وقتاً فوقتاً کسی دوسرے کی تقریر دہرائے نظم کو واقعہ نگاری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

ایڈ۔ بیشک۔

میں :- لیکن جب شاعر دوسرے شخص کا بھیس اختیار کرتا ہے تو لازمی طور پر اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس کا طرز بیان اس شخص سے حتی الوسع مماثل ہو جائے جس کی زبان سے تقریر بیان کی جا رہی ہے۔



ایڈ۔ اور کیا۔

میں۔ اور اپنی شخصیت کو دوسرے شخص میں اس طرح جذب کر دینے کو ہی خواہ یہ باعتبار آواز کے ہو یا بلحاظ حرکات و سکنات، شخص مذکور کی نقل کہتے ہیں۔

ایڈ۔ درت۔

میں۔ شاعر جب اس مقبر کو اختیار کرتا ہے تو اسے تقالی یا نقل کلام کہتے ہیں۔

ایڈ۔ جی۔

میں۔ لیکن اگر شاعر ہر جگہ خود ہی ظاہر ہے اور اپنے کو پوشیدہ کرنے کی کہیں کوشش نہ کرے تو وہ نظم مذکورہ یا خالص بیان ہو جاتی ہے۔ اپنے موضوع کو اور زیادہ واضح کرنے کے لیے تاکہ آپ پھر یہ نہ کہیں کہ ”میں نہیں سمجھا“ میں ان دونوں اقسام میں تفریق کر کے بتلاتا ہوں۔

دیکھئے۔ اگر ہوسرما یہ کہتا کہ کرائی سس اپنے ہاتھ میں زرد فدیہ لیے ہوسے آیا او تمام اہل آنے سے عموماً اور ان کے سرداروں سے خصوصاً اپنی لڑائی کی رہائی کی درخواست نہایت بجا جت کے ساتھ کرنے لگا، اور اس کے بعد اگر شاعر کرائی سس کی زبان سے تقریر ادا کرنے کے بجائے خود ہی بیان کو جاری رکھتا تو پھر نقل کلام نہ ہوتی بلکہ اسے تذکرہ یا خالص بیان کہتے۔ اور نظم کی صورت حسب ذیل ہوتی (چونکہ میں شاعر نہیں ہوں اس لیے قواعد نظم کو بالائے



طاق رکھتا ہوں)۔ پجاری آیا اور اس نے یونانیوں کی طرف دو پوتاؤں کی  
 بارگاہ میں ان کی فسخ اور کامرانی کی دعا مانگی تاکہ وہ مڑائے پر قابض ہو کر  
 صحیح سلامت اپنے گھروں کو واپس جائیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ درخواست بھی کی  
 کہ زردیہ مشبول کر کے اس کی لڑکی کو رہا کر دیا جائے اور پوتا کی تعظیم و تحکم  
 کی جائے۔ اس کلام کو سن کر دوسرے یونانیوں نے تو پجاری کی عزت کی اور  
 اس کی درخواست پر اظہار قبولیت کیا لیکن آگامنان کو اسپر غصہ آیا اور  
 اس نے اس پجاری کو حکم دیا کہ نکل جائے اور پھر کبھی وہاں نہ آئے ورنہ سزا  
 عطا اور جتہ دستار کچھ کام نہ آئے گا۔ آگامنان نے یہ حکم بھی صادر کیا کہ  
 کڑائی سس کی لڑکی رہانہ کی جگہ بلکہ آرگس میں اس کے ہمراہ رہ کر اپنی  
 عمر گزارے۔ اسکے بعد جیسے پجاری کو پھر حکم دیا کہ اگر صحیح سلامت واپس  
 جانا چاہتا ہے تو زیادہ غصہ نہ دلائے اور فوراً چلا جائے۔ پجاری ہارے خوف  
 کے خاموش وہاں سے چلا آیا۔ لیکن شکر سے باہر نکل کر آپولو کو مختلف ناموں  
 سے پکارا اور اپنے تمام وہ اعمال نیک یاد دلائے جو اس کی خوشنودی کیلئے  
 کیے تھے مثلاً قربانیاں، مندروں کی تعمیر وغیرہ۔ اور اس سے اب ان اعمال کا اجر  
 چاہا اور التجا کی کہ اس کے آنسوؤں کا بدلہ آگامنان پر آسمانی تیر بربسا کر لیا جائے  
 وقت علی ہذا۔ اس طرح نظم خالص بیان واقعہ کی صوت خستیار کر لیتی۔  
 ایڈ۔ میں اب سمجھ گیا۔



میں :- اب اس کے بالکل خلاف تصور کرو۔ یعنی یہ کہ تمام درمیانی شعاع کو نکال دو اور صرف مکالمہ رہنے دو۔

ایڈ :- ہاں، میں سمجھا۔ جیسے نائٹک میں ہوتا ہے۔

میں :- تم میرا مفہوم بالکل ٹھیک سمجھے۔ اور میرا خیال ہے کہ جو بات پہلے تمہاری سمجھ میں نہ آتی تھی وہ اب بالکل صاف ہو گئی ہوگی یعنی شاعری اور فسانہ نگاری میں کبھی تو بالکل نقل بیان ہوتی ہے مثلاً نائٹک میں یا پھر اس کے بالکل برعکس یعنی جیسا کہ تمام واقعات خود ہی بیان کرتا ہے جس کی بہترین مثال *Diary* ہے یا پھر ان دونوں اقسام کی آمیزش ہوتی ہے مثلاً *مثنوی* اور دیگر اصناف سخن میں۔

ایڈ :- بیشک۔ اب جا کر میں آپ کا مفہوم سمجھا۔

میں :- ہاں۔ ذرا اس کا خیال ہے کہ ہم لوگ شاعری کے نفس مضمون کے متعلق فیصلہ کر چکے ہیں اس وقت صرف طرز بیان کا مسئلہ درپیش ہے۔

ایڈ :- جی ہاں مجھے اس کا خیال ہے

میں :- اس یاد دہانی سے میرا مطلب یہ تھا کہ ہمیں فنِ نقالی کے متعلق تصفیہ

کرنا ہے کہ آیا شاعروں کو قصوں کے بیان کرنے میں نقل سے کام لینے کی اجازت ہونی

چاہیے یا اس کو مطلق ممنوع قرار دینا چاہیے اور اگر اجازت دیکے تو پوری

آزادی ہو یا صرف جزوی۔ اور پھر اگر جزوی طور پر اجازت ہو تو کن جسٹرائکی

تخصیص کی جائے۔

ایڈ۔۔ آپ شاید یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہماری ریاست میں ٹائٹک کی دونوں قسموں یعنی المیڈ اور فرجیہ دونوں کی اجازت ہونی چاہیے یا نہیں؟ میں :- ہاں میں ہی دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن ممکن ہے کوئی اور بات بھی اس سے ال سے پیدا ہو جائے جس کا مجھے مطلق علم نہیں۔ ہم تو سلسلہ کلام کے ساتھ ساتھ ہیں۔ یہ جہاں بھی پہنچائے۔

ایڈ :- بیشک۔

میں :- تو پھر بتلائیے کہ ہمارے محافظین کو نکال ہونا چاہیے یا نہیں؟ لیکن ہاں۔ ہم تو اس بات کا فیصلہ ابتداء گفتگو میں ہی کر چکے ہیں جب ہم نے یہ طے کیا تھا کہ ایک آدمی صرف ایک کام کر سکتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص بہت سے کام کرنا چاہیگا تو وہ کسی میں بھی شہرت و امتیاز حاصل نہیں کر سکتا۔

ایڈ :- بلاشبہ۔

میں :- یہی اصولِ نقالی پر منطبق ہوتا ہے۔ ایک آدمی ایک ہی چیز کی نقل اچھی طرح کر سکتا ہے۔ بہت سی چیزوں کی نہیں کر سکتا۔

ایڈ :- جی ہاں۔ ہرگز نہیں کر سکتا۔

میں :- تو اسے ایڈی میں لیں! جب خود نقالی کی دو و قریب التعلق اقسام مثلاً المیڈ اور فرجیہ ٹائٹک مین ایک ہی آدمی ہمارے نامہ



نہیں ہم پہنچا سکتا تو پھر تم ہی فیصلہ کرو کہ یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ وہی شخص زندگی کے مہمات امور کو بھی طر کرے اور وہی مختلف دوسری چیزوں کا نقال بھی ہو۔  
 ایڈ:- بیشک ایک آدمی تو دونوں اصناف نقالی پر بھی عبور نہیں کر سکتا۔  
 میں جیسے ایک ہی آدمی اچھا چرخوں اور اچھا مستحرا، دونوں نہیں ہو سکتا۔  
 ایڈ:- بیشک۔

میں: بلے عزیز۔ انسانی فطرت کے نفوذ تو اس سے بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے بنائے گئے ہیں۔ اور جس طرح ایک آدمی بہت سے کام اچھی طرح انجام نہیں دے سکتا اسی طرح بہت سی چیزوں کی نقل بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ نقل کیا ہے؟ ان حقیقی افعال کا ہی تو عکس ہے۔  
 ایڈ:- بیشک۔

میں:- اگر ہم اب تک اپنے ابتدائی خیال پر قائم ہیں کہ مجا فطرت کا کام بس یہ ہے کہ تمام چیزوں سے قطع تعلق کر کے رہا بست میں حریت و آزادی کے قیام کو اپنا مقصد و حید قرار دیں۔ اسی کو اپنا ہنر بنائیں۔ اور کسی ایسے شغل میں نہ پڑیں جو اس مقصد کے حصول میں مدد و معاون نہ ہو تو یہ نتیجہ بالکل بدیہی ہے کہ انہیں کسی دوسری چیز کی نقالی نہ کرنی چاہیے۔ اور اگر وہ کسی کی نقل کریں بھی تو ایسے لوگوں کی جن کے مکارم اخلاق ان کے مقصد زندگی کے لیے موزوں اور اس کے شایاں ہوں۔ مثلاً شجاع۔ متقی۔ مقدس اور حریت پسند افراد کی۔ اور

انہیں کبھی کسی نمبریل یا کمینہ آدمی کی نقل میں ماہر نہ ہونا چاہئے۔ کہ کہیں نقل کرتے کرتے وہ مطابق پہل نہ ہو جائیں۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ اگر کوئی شخص ابتداء زندگی سے کسی چیز کی نقل کرنا شروع کر دیتا ہے اور عرصہ تک اُسے جاری رکھتا ہے تو اُسے اس کی عادت سی پڑ جاتی ہے جو فطرتِ ثانیہ بن کر عوارج۔ آواز۔ دماغ۔ عیب کو متاثر کر دیتی ہے۔

ایڈ۔۔۔ بیشک۔

میں :- ہمارا فرض ہے کہ ان لوگوں کو جو ہمارے زیر تربیت ہیں انہیں نیک انسان بنانا ہمارا مقصد ہے۔ ہرگز کسی عورت کی نقل نہ کرنے دین چاہئے شوہر سے جھگڑتی ہو یا اپنی خوشحالی اور آرام و آسائش کے زعمِ باطل پر دو تیاؤں تک سے مقابلہ اور ان کے روبرو تقاضا پر آمادہ ہو۔ یا کسی مصیبت کے عہت رونی تپتی ہو اور خصوصاً جب کہ بیمار ہو۔ حالتِ زحکی میں ہو یا کسی پریشان ہو گئی ہو۔

ایڈ۔۔۔ بیشک۔ ہرگز اس کی اجازت نہ دینی چاہئے۔

میں :- نہ ان لوگوں کو لونڈیوں غلاموں کا روپ بدلنا چاہئے اور نہ کسی قسم کے غلامانہ افعال کرنے چاہئیں۔

ایڈ۔۔۔ ہرگز نہیں۔

میں :- اور یقیناً انہیں بزدل اور ایسے بد کردار آدمیوں کی نقل بھی نہ کرنی



چاہیے جو ہماری تمام تعلیم کے خلاف عامل ہوں یعنی جو نشہ میں مدہوش ہو کر  
یا بہ ثبات ہوش و حواس ایک دوسرے کی ہنسی اڑائیں یا کوسیں اور گالیوں  
دیں یا جو خود اپنی ذلت یا اپنے ہمسایوں کے خلاف قولاً یا فعلاً گناہ کے مرتکب  
ہوتے ہوں۔ اسی طرح محافظین کو ایسے مردوں اور عورتوں کے اقوال و اعمال  
کی نقل کرنا نہ سکھانا چاہیے جو مبتلا جنون ہوں، کیونکہ بدی اور شر کی طرح  
جنون بھی جاننے پہچاننے کی چیز ہے عمل پیرا ہونے اور نقل کرنے کی چیز نہیں۔  
ایڈ۔ بشک۔

میں :- نہ انھیں سناروں، لوہاروں، ملاحوں یا دیگر اہل حرفہ کی  
نقل کرنی چاہیے۔

ایڈ۔ یقیناً۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ان فنون کی طرف توجہ کرنے کی تو ایسا  
اجازت نہیں ہے۔

میں :- اور اسی طرح گھوڑوں کے ہنہانے، بیلوں کے چلانے، روانی  
دریا کی دھمی آواز، اور سمندر کے متوج کے ہیب شور یا بجلی کی کڑاک یا اسی  
قسم کی اور چیزوں کی نقل بھی ان لوگوں کو نہ کرنی چاہیے۔

ایڈ۔ :- یہ تو مجنونوں کے کام ہیں۔ اور اگر جنون اور پاگل پن ممنوع ہے  
تو یہ بھی ممنوع ہونا چاہئیں۔

میں :- اگر میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں تو غالباً آپ کا مطلب یہ



کہ کسی چیز کے کہنے میں ایک اچھا شخص بس ایک ہی طرز بیان اختیار کر سکتا ہے اور اس طرز کے علاوہ دوسرا طرز صرف وہی لوگ روارکھیں گے جو اس نیک شخص کی بے اعتبار تعلیم و تربیت بالکل ضد ہوں؟

ایڈ۔۔۔ یہ دو طرز کون سے ہیں۔

میں۔۔۔ فرض کرو کہ ایک نیک اور عادل آدمی کوئی چیز بیان کرنے کرتے کسی دوسرے نیک انسان کے عمل یا قول پر پہنچا تو پیر انسان ہے کہ وہ اس کا روپ اختیار کرنا چاہیگا اور اس نقل سے مطلق شرمندہ نہ ہوگا۔ مثلاً جب یہ دوسرا شخص مضبوطی اور عقلمندی سے کوئی کام کر رہا ہے تو یہ قائل نہایت خوشی سے اس کی قائم مقامی کرنا چاہیگا۔ لیکن اگر یہ نیک شخص بیاری عیش میں مبتلا ہے، یا نشہ میں چور، تو یہ قائل ذرا مشکل سے ہی اس کی نقالی پر آمادہ ہوگا، اور اگر کہیں کسی ایسے اخلاق کا ذکر ہے جو اس کے شایان شان نہیں، تو اسے تو وہ مطالعہ تک نہ کرے گا۔ ایسے شخص کو حارت کی نظر سے دیکھے گا اور اگر کبھی اس کی نقل کرے بھی تو صرف ان لمحوں کی جب اس سے کوئی نیک کام ہو رہا ہو۔ ورنہ ان افعال کی نقل سے تو وہ سخت شرمندہ ہوگا۔ جو اس سے کبھی سرزد نہیں ہوے۔ نہ وہ نیچے قسم کے لوگوں کی سی سچ و سچ اختیار کرے گا۔ کہ ان تدابیر کے استعمال سے (الابصورت مزاح) وہ اپنے کو بہت بلند پاتا ہے اور اس کا دماغ ان سے باطنج نفور ہے۔



ایڈ۔ میں بھی ہی سمجھتا ہوں۔

میں۔ گویا وہ ایسا طرز بیان اختیار کر گیا جیسا کہ ہوہر کے کلام سے منہ  
مثلاً پیش کیا تھا یعنی اس کے طریقہ ادا میں خالص بیانی اور نقل دونوں کی  
آئینرش ہوگی۔ اول الذکر زیادہ ہوگا اور مؤخر الذکر کم۔ کیوں آپ متفق ہیں؟  
ایڈ۔ یقیناً۔ یہی نمونہ تو ہی جو ایسے مقرر کو اختیار کرنا چاہیے۔

میں۔ لیکن ایک و قسم کے لوگ بھی تو ہوتے ہیں جو ہر قسم کی چیز بیان  
کر سکتے ہیں۔ یہ جتنے بڑے ہوتے ہیں اتنے ہی بے جھجکا اور بدگام بھی ہوتے  
ہیں۔ ان کے لیے سب کچھ اچھا ہی۔ یہ ہر چیز کی نقل کے لیے تیار ہیں اور صرف  
مزاح میں نہیں بلکہ صدق دل سے۔ اور اسپر طرہ یہ کہ بڑے سے بڑے مجمع کے  
سامنے۔ میں نے جیسے پہلے ذکر کیا تھا اس قسم کا آدمی بجلی کی طرح کرنے کی  
کوشش کر سکتا ہی۔ طوفان آب و باد کا شور، پیوں اور پھر کیوں کی گھڑ گھڑا،  
اور ڈھول، بابشری یا کسی اور آلہ موسیقی کی آواز وغیرہ سب کی نقالی کی  
کوشش اس سے ممکن ہی، وہ کتے کی طرح بھونک سکتا ہی، بھیر کی طرح بھینس  
کر سکتا اور مرغ کی طرح بانگ دے سکتا ہی۔ اس کا نام ترہن آواز و اشارات کی  
نقالی میں صرف ہوتا ہی، اور اس کے طرز ادا میں خالص بیان کو بہت کم جگہ ملتی ہے۔  
ایڈ۔ بیشک ایسے لوگوں کا تو ہی طریقہ ہوگا۔

میں۔ تو گویا دو قسم کے طرز بیان یہ ہوئے؟



ایڈ۔ جی ہاں۔

میں۔ غالباً تم مجھ سے اتفاق کرو گے کہ ان طرز بیان سے بیان میں ایک ساہ  
ہو جس میں زیادہ تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ اور اگر وزن اور بحر بھی اسی ساوگی کا  
محاذ کر کے اختیار کی جائیں تو نتیجہ یہ ہو گا کہ اگر قائل صحیح طور پر اپنا سلسلہ کلام جاری  
رکھے تو اس کے طرز بیان میں کم و بیش یکسانیت قائم رہے گی۔ وہ ایک ہی  
وزن قائم رکھے گا کیونکہ تبدیلیوں کی ضرورت ہی نہیں، اور غالباً بحر بھی  
شروع سے آخر تک ایک ہی استعمال کرے۔

ایڈ۔ بالکل درست۔

میں۔ لیکن دو سکر طرز بیان میں طرح طرح کے اوزان اور مختلف قسم کی  
بحروں کی ضرورت پڑے گی۔ طریقہ بیان میں چونکہ ہر طرح کی تبدیلی ہوتی رہے گی  
اس لیے اگر موسیقی اور طرز بیان میں مطابقت رکھنی ہو تو وزن اور بحر کا بدلنا  
بھی لازمی ہے۔

ایڈ۔۔ یہ بھی بالکل بجا ارشاد ہے۔

میں۔ اور کیا یہ دو طرز بیان یا انکی باہمی آمیزش تمام شعر پر اور الفاظ  
کے ذریعہ اظہار خیال کی تمام شکلوں پر حاوی نہیں؟ جب کبھی بھی کوئی شخص کچھ  
کہتا ہے تو یا تو ان دو طریقوں میں سے کوئی ایک اختیار کرتا ہے یا پھر دونوں کو ملا کر  
اپنا کام نکالتا ہے۔



ایڈ:۔ بیشک یہ سب پر حاوی ہیں۔

میں:۔ تو پھر ہم اپنی ریاست میں یہ تینوں طریقے داخل کر لیں یا دو اصلی طریقوں میں سے صرف ایک منتخب کریں یا اس کے ساتھ دونوں کی آمیزش کریں جو طرز پیدا ہوتا ہے اسے بھی شامل کر لیں۔

ایڈ:۔ میں تو صرف اچھائی اور خوبی کی تقاضی کو جگہ دینا چاہتا ہوں۔ میں:۔ ہاں، لیکن باہمی آمیزش سے جو طرز پیدا ہوتا ہے وہ بھی تو نہایت دلپذیر ہے۔ اور یوں تو وہ طرز بچوں، اُن کے کھلانے والوں، بلکہ عام طور پر تمام دنیا میں سب سے زیادہ مقبول ہے جو تمہارے منتخبہ طرز کی ضد ہے اور جس میں منہ سے کچھ کہے بغیر اشارات و حرکات سے اپنا مطلب ظاہر کیا جاتا ہے۔

ایڈ:۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا۔

میں:۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ تم یہ دلیل دو گے کہ یہ طرز ہماری ریاست کے لیے موزوں نہیں۔ کیوں کہ اس ریاست میں تو فطرت انسانی دورخی یا چندرخی ہوتی ہی نہیں، یہاں تو ایک شخص میں ایک ہی کام کرتا ہے۔

ایڈ:۔ جی ہاں۔ اسی لیے تو یہ طرز نہایت ہی غیر موزوں ہے۔

میں:۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہماری ریاست میں اور صرف ہماری ہی ریاست میں تم چار کو چار ہی پاؤ گے، ناخدائی کرتے نہ دیکھو گے۔ کسان کو کسان کے کام میں ہی مشغول دیکھو گے منصف کا فرض ادا کرتے نہ پاؤ گے۔ سپاہی بس سپاہی



ہوگا، ساتھ ساتھ تاجر نہ ہوگا و قس علیٰ ہذا۔

ایڈ۔ سیج ہر۔

میں :- چنانچہ اگر کبھی ان حضرات میں سے جو ہر چیز کی نقالی کمال ہنرمندی کے ساتھ کرتے ہیں کوئی صاحب ہماری ریاست میں آجائیں گے اور اپنی شاعری اور ہنرمندی کی نمائش کرنا چاہیں گے تو ہم مشک ان کی بڑی تعظیم کریں گے اور بحیثیت ایک دلکش مقدس، اور حیرت انگیز ہستی کے انکی پرستش تک کریں گے، لیکن ساتھ ہی انھیں مطلع بھی کر دیں گے کہ ہماری ریاست میں ان جیسے اشخاص کا وجود ممنوع ہے اور قانون ان کے قیام کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ان کے جسم پر خوشبو دار امیٹن مل کر اور ان کے سر پر اون کا ایک ہار پہنا کر ہم ان بزرگ کو کسی دوسرے شہر کو چلتا کر دیں گے۔ کیونکہ اپنی روح کی صحت کے لیے ہم زیادہ سخت اور نا تراشیدہ شعراء اور افسانہ گو چاہتے ہیں جو صرف نیک لوگوں کی نقل کریں اور صرف انھیں منونوں کی اتباع کریں جن کا ذکر ہم سپاہ کی تعلیم کے ضمن میں کر چکے ہیں۔

ایڈ۔ قدرت شرط ہے۔ انشاء اللہ ضرور ایسا کریں گے۔

میں :- عزیز من، اب سمجھو کہ موسیقی یا ادبی تعلیم کا وہ حصہ جو قصوں اور افسانہ کوئی سے متعلق ہے وہ تو ختم ہوا۔ کیونکہ ان کے نفس مضمون اور طرز بیان دونوں پر ہم بحث کر چکے۔



ایڈ۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔  
میں۔۔۔ اس کے بعد نغمہ اور راگ کا نمبر آتا ہے۔

ایڈ۔۔۔ ظاہر ہے۔

میں۔۔۔ ہم اگر اپنی گزشتہ آراء کے پابند ہوں تو ہر شخص بتلا سکتا ہے کہ اس بارہ میں ہم کیا کہیں گے۔

گلاکن: ہنس کر بولے کہ اس آپ کے ”ہر شخص“ میں تو میں مشکل ہی سے آتا ہوں۔ کیونکہ میں آپ کو فوراً بے سوچے سمجھے نہیں بتلا سکتا کہ ان کے متعلق کیا فیصلہ ہونا چاہیے۔ ہاں کچھ یہ نہیں قیاس و ظن سے کام لے سکتا ہوں۔

میں۔۔۔ خیر۔ آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ گیت یا ترنم میں تین حصے ہوتے ہیں،

الفاظ، اسلوب، اور وزن (ایقاع) یہ تو میں فرض کیے لیتا ہوں کہ آپ کو اتنا علم ہے۔

گ۔۔۔ ہاں۔ اتنا علم تو آپ فرض کر سکتے ہیں۔

میں۔۔۔ جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے تو اس بارہ میں تو ان الفاظ میں جو

موسیقی میں استعمال کیے جائیں اور ان میں جو اس میں مستعمل ہوں یقیناً کوئی

فرق نہ ہونا چاہیے۔ دونوں ایک ہی قانون کے تابع ہوں گے اور یہ قوانین پہلے

متعین کیے جا چکے ہیں۔

گ۔۔۔ جی ہاں۔

میں :- رہے اسلوب اور وزن تو ان کا انحصار الفاظ پر ہی  
گ :- بیشک ۔

میں :- مطالب شعر اور نفس مضمون پر بحث کرتے ہوئے ہم نے کہا تھا  
کہ ہمیں شکوہ شکایت اور غم کے ترانوں کی ضرورت نہیں ہے۔  
گ :- جی ۔

میں :- ہاں تو وہ کوئے اسلوب میں جسے غم ظاہر ہوتا ہے۔ آپ  
موسیقی سے واقف ہیں اس لیے بتلا سکتے ہیں۔

گ :- آپ کا اشارہ جن اسلوبوں کی طرف ہے وہ مخلوط لیدای یا  
کامل لیدای یا ان کے ماثل اسلوب ہیں۔

میں :- تو پھر انھیں اپنے ہاں سے خارج کرنا چاہیے۔ کیونکہ مردوں کا  
تو ذکر ہی کیا یہ اسلوب تو ان عورتوں کے لیے بھی بیکار ہیں جو اپنے ذاتی صفات  
حسنہ کو برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔

گ :- بلاشبہ۔

میں :- اس کے علاوہ مخموری، نرملی، بکستی و کاہلی بھی ہمارے  
حافظین کے اخلاق کے شایاں نہیں۔

گ :- یقیناً۔

میں :- اور نرملی اور مخموری کے اسلوب کوئے نہیں ہے



گ۔ ایوتی اور لیدائی۔ انھیں متغافل و مسترخ بھی کہتے ہیں۔  
 ہیں۔ کیا ان کا کوئی فوجی استعمال نہیں ہو سکتا؟  
 گ۔ جی نہیں۔ یہ تو اس مقصد کے بالکل برعکس ہیں۔ ان اسالیب کو  
 خارج کر دینے کے بعد بس اب دوری اور فریحی اسلوب باقی رہ گئے۔  
 میں۔ میں تو ان اسالیب غیرہ سے بالکل واقف نہیں لیکن ہاں میں  
 ایک جنگی اسلوب ضرور چاہتا ہوں۔ جو اس انداز و لہجہ کی ترجمانی کر سکے جو ایک  
 بہادر انسان سے خطرہ میں غم کرتے وقت ظاہر ہوتا ہے۔ یا اس وقت جب اس کا  
 مقصد فوت ہو رہا ہو اور ناکامی کے آثار نمایاں ہوں، اس کے جسم پر پے پے  
 کاری زخم لگے ہی ہوں، موت کا سامنا ہو یا کوئی اور سخت مصیبت درپیش  
 اور وہ اس طوفان حوادث کے ہر لمحہ موج کو پا مردی اور استقلال کے ساتھ  
 برداشت کرنا چاہے۔ اس کے علاوہ ایک اور اسلوب بھی مجھے درکار ہے جو  
 آزادی اور امن کے وقت آدمی کے کام آسکے جب ضرورت و احتیاج کا دباؤ  
 نہ ہو اور وہ اپنے خدا کو دعا سے راضی کر رہا ہو یا انسانوں کو ترغیب و ترمیمی  
 یا اس کے برعکس جب ترغیب و ترمیمی کے باعث وہ خود کسی بات کے ماننے  
 پر آمادگی ظاہر کرنا ہو۔ یا ایسا اسلوب جو اس حالت کی ترجمانی کر سکے جب ایک  
 شخص دشمنی سے اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے اور اپنی کامیابی سے از خود رشتہ  
 نہیں ہو جاتا بلکہ اسے برداشت کر کے اعتدال و دشمنی کو ہات سے نہیں

جانے دیتا۔ پس آپ سے مجھے ہی دو اسلوب درکار ہیں۔ یعنی ضرورت کا اور  
 آزادی کا، خوش قسمتی کا راگ اور بے نصیبی کا، ہمت و شجاعت کی اور اور عفت  
 و اعتدال کا نغمہ۔ یہ سب لے کر یہ چھوڑ دیجئے۔ باقی بچے درکار نہیں۔

گ۔ اور یہ دو ہیں ہی دوری اور فریبی اسلوب میں جن کا میں  
 ذکر کیا۔

میں۔۔ تو ہمارے نغموں میں بس یہی دو اسلوب مستعمل ہوں گے۔ بعد  
 ہمیں نہ بہت سے مختلف سائپ کی ضرورت پڑے گی نہ ہر اسلوب پیدا کرنے والے  
 آلات کی۔

گ۔ جی ہاں۔ میں سمجھتا ہوں کہ نہ ہوگی۔  
 میں۔۔ گویا ہمیں اس پیچیدہ ٹکونے کا درجہ بجا نیوالوں کی ضرورت  
 نہ پڑے گی اور نہ ہمیں کئی تاروں والے عجیب عجیب آلات موسیقی کے بنانے  
 والے درکار ہوں گے۔

گ۔ ہرگز نہیں۔

میں۔۔ اور مزمار بنانے اور بجانے والوں کے متعلق کیا رائے ہے؟ مختلف  
 مقامات موسیقی کی باہم آمیزش کے اعتبار سے تو مزمار تمام تاروں والے آلات  
 سے بڑا ہے۔ تمام سروں کی مخلوط موسیقی بھی اسی کی تقالی ہے۔ پھر کیا اسے ریاست  
 میں داخل کیا جائیگا؟



گ :- ہرگز نہیں۔

میں :- اس طرح شہر والوں کے لیے بس عود اور ستارہ جاتے ہیں  
گانوں میں چرواہے باسنری رکھ سکتے ہیں۔

گ :- اس دلیل سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے۔

میں :- بہر حال اگر آپ لوگ کے آلہ کو ہر سیاسی کے آلہ پر ترجیح دی  
گئی تو چنداں تعجب کی بات نہیں۔

گ :- ہاں۔ اس میں بھلا کیا تعجب !

میں :- کلب مصری کی قسم تھوڑی دیر پہلے جس بایست کو عیش طلب  
اور آرام پسند کہا تھا اب تک بلا ارادہ ہم سے پاک ہی کرتے رہتے۔

گ :- جی ہاں۔ ہم نے بہت ٹھیک کیا۔

میں :- تو آؤ اس شہتہ کو پورا ہی کر دیں۔ اسالیب کے بعد قدرتا وزن

اور ایقاع کا سوال ہی میری رائے میں تو یہ بھی انھیں قواعد کی پابندیوں کیونکہ

ہر قسم کے مخلوط اوزان کی تلاش بیکار ہے۔ ہمیں وہ اوزان دریافت کر لینے چاہیں

جو ایک ہموار اور شجاع زندگی کی ترجمانی کر سکیں اور جب یہ معلوم ہو گئے تو پھر

تال اور سُر تو الفاظ سے مطابقت کیے جائیں گے نہ کہ الفاظ تال و سُر کے۔ یہ اوزان

کون کون ہوں یہ آپ بتلائیے۔ اسالیب کی طرح ان کا سبق بھی آپ ہی کو

دینا ہوگا۔

گ۔ لیکن سچ یہ ہے کہ میں کچھ نہیں بتلا سکتا۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ جیسے چار اوزاروں سے تمام اسلوب بن جاتے ہیں اسی طرح وزن کے بھی میں نہیں جانتا۔ میں جتنے تمام اوزار ترتیب دیے جاتے ہیں۔ میرا علم بس اس قدر ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ کس کس قسم کی زندگی کی نقل ہیں سو اس کا جواب بیڑے بند قہر ہے میں :- ابھاتو او ڈیمین کو اپنے مشورہ میں شریک کر لیں۔ اس سے پتہ چل جائیگا کہ کون اور ان کم ظرفی، گستاخی، غصہ، یادگیر معائب کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے خلاف محاکمات کے اظہار کیلئے کونسی بھری مناسب ہیں۔ مجھے کچھ یونہی ساد پڑتا ہے اس نے ایک پیچیدہ کمر میٹی بھر کا ذکر کیا ہے اور ایک بہادری کی بھر کا۔ اور ان کو اس نے کچھ خاص ترتیب سے رکھا تھا جو میں نہیں سمجھ سکا۔ بھر کو مصرع کے ٹکڑوں کے آثار چڑھاؤ کے اعتبار سے مساوی کر دیا تھا۔ جس میں طویل کے بعد صغیر اور صغیر کے بعد طویل ٹکڑا آتا تھا اور اگر میں غلط نہیں رہتا ہوں تو اس نے ایک آجیا می اور ایک تروشی بھر کا بھی ذکر کیا تھا اور ان میں صغیر و طویل کی تسعین کر دی تھی۔ اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ اگر بعض جگہ اس نے پوری بھر کی تعریف یا تنقیص کی تھی تو کہیں مختلف ٹکڑوں کی روانی کو بھی اس کا مورد قرار دیا تھا۔

بہر حال بہتر ہے کہ یہ معاملات ڈیمین ہی پر چھوڑ دیے جائیں۔ کیونکہ ہمارے اس مضمون کا تجزیہ بہت ہی دشوار ہے۔



گ۔ بیشک۔

میں۔ لیکن اس بات کے سمجھنے میں تو کوئی دشواری ہی نہیں کہ حسن و خوبی کا وجود یا عدم اچھی یا بُری بجز کا لازمی نتیجہ ہے۔

گ۔ اس میں کیا شبہ ہے۔

میں۔ اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ اچھے اوزان اچھے انداز بیان کے ساتھ کھتے ہیں اور بُرے بُرے انداز کے ساتھ۔ اسی طرح بجز اور اسلوب موسیقی کے حسن و قبح کے بھی تابع ہیں۔ کیونکہ ہم نے یہ تو اصولاً مان ہی لیا ہے کہ بجز اور اسلوب الفاظ کے پابند ہیں نہ کہ الفاظ ان کے۔

گ۔ بیشک۔ انھیں الفاظ کا پابند ہونا چاہیے۔

میں۔ اور کیا الفاظ اور انداز بیان کا انحصار روح کی کیفیت پر نہ ہوگا؟

گ۔ یقیناً۔

میں۔ اور باقی تمام چیزیں انداز بیان پر منحصر ہونگی۔

گ۔ جی ہاں۔

میں۔ گویا انداز بیان اور اسلوب حسن کلام اور خوبی بجز کے سب سادگی پر مبنی ہیں۔ سادگی سے میرا مطلب ایک صحیح طور پر مرتب دماغ اور اخلاق کی حقیقی سادگی سے ہے نہ اس سادگی سے جو یوقونی کا دوسرا نام ہے۔

گ۔ سچ ہے ●

میں :- اگر ہمارے نوجوانوں کو اپنا تحقیقی مقصد زندگی پورا کرنا ہو تو کیا انہیں ہمیشہ اس حسن و تناسب کو اپنا مقصد نہ قرار دینا چاہیے۔  
گ :- بلاشبہ۔ چاہیے۔

میں :- اوپر تو یہ ہے کہ فن مصوری بلکہ تمام دیگر تخلیقی فنون اس سولہ پر ہیں۔ مثلاً فن تعمیر، پارچہ بافی، سوزن کاری اور دوسری تمام چیزوں کی تیاری۔ یہی نہیں بلکہ قدرت کی تمام حیوانی یا نباتی کائنات میں یہ حسن یا اس کا عدم پایا جاتا ہے اور بد صورتی اور عدم تناسب یا حرکات غیر مرتبہ، بڑے الفاظ اور بڑی فطرت سے اسی طرح وابستہ ہیں جیسے حسن و تناسب نیکی اور خوبی کی دو ہمیں ہیں اور ان سے مشابہ۔

گ :- بالکل سچ ہے۔

میں :- اچھا کیا ہماری نگرانی بس یہاں ختم ہو جائے؟ اور کیا ہمارا یہ مطالبہ صرف شعر سے ہو گا کہ وہ اپنے کلام میں صرف نیکی اور خیر کا جلوہ دکھائیں۔ ورنہ بصورت دیگر ہم انہیں ریاست سے خارج کر دینگے؟ یا اس نگرانی کو دیگر ماہرین فنون پر بھی عائد کیا جائے گا اور کیا ان کے لیے بھی سنگتراشی، تعمیر، یا دیگر فنون تخلیقی میں خیر و نیکی کے اضداد و شرابے اعتدالی، عدم عفت، کم ظرفی اور بدقتابی کے اظہار کو ممنوع قرار دیا جائیگا۔ اور اگر انہوں نے اس قاعدہ کی پابندی نہ کی تو ہم انہیں اپنی ریاست میں کام نہ کرنے دینگے۔ مبادا ہمارے شہروں کا مذاق



آلودہ ہو جائے۔ ہم ہرگز معائبِ خَلْق کی فضا میں اپنے محافظین کی نشوونما کے  
 روادار نہیں ہو سکتے کہ اس کی مثال تو ایسی ہی ہوگی کہ ہم نے ان جانداروں کو اپنی  
 زہریلی چسپاں گاہ میں چھوڑ دیا ہے جہاں وہ روزانہ کچھ نہ کچھ مضر اور بھی بوٹیاں کھاتے  
 رہیں اور رفتہ رفتہ اپنی روح کی آلودگی کے لیے گندگی کا کافی موثر ذخیرہ بنا لیں  
 کر لیں۔ ہمارے ماہرین فن تو وہ لوگ ہوئے چاہئیں جو حسن و جمال کی اصلی حقیقت  
 کو دیکھ سکیں اور یہ صورت اسی وقت ممکن ہوگی کہ ہمارے نوجوان صحت و تندرستی  
 کی زمین پر آباد ہوں، دیکھیں تو جمال کا نظارہ کریں، اور سینیں تو کان تک حسن  
 کا ہی ترانہ آئے۔ وہ ہر چیز کی خوبی سے مستمتع ہوں اور حسن و جمال کی فراوانی ان کے  
 سامعہ و باصرہ کو اس طرح متاثر کرے کہ گویا کسی پاک تر عالم سے صحت افزا نسیم  
 کے جھونکے آرہے ہیں تاکہ ابتداءِ عمر سے ہی ایک غیر محسوس طور پر ان کی روح  
 میں حسن معقول کے ساتھ مماثلت اور ہمنائی پیدا ہو جائے۔

گ۔۔ اس سے بہتر اور کونسی تعلیم ہو سکتی ہے!

میں۔۔ یہی وجہ تو ہے کہ موسیقی کی تعلیم دوسری تمام تعلیموں سے زیادہ موثر  
 ہے۔ کیونکہ آپ کی یہ بجز اور اسلوب یہ توازن و تناسب روح کے اندر تک اپنی راہ  
 نکال لیتے ہیں اور سخی کے ساتھ اسپر اپنا تصرف کر لیتے ہیں پھر جس کی تعلیم صحیح ہے  
 اس کی روح کو حسن و جمال کا تھمہ دیتے ہیں، اور جو روح بری تعلیم پاتی ہے بد صورت  
 و مکروہ بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جس شخص کے وجودِ مخفی (روح) کو صحیح تعلیم



نصیب مٹی ہو وہ نہایت دکاوت کے ساتھ کارخانہ قدرت یا فنون کی غلطیوں  
 اور فروگذشتوں کو محسوس کر لے گا۔ اور جہاں ایک طرف اپنے مذاق صحیح  
 کے باعث اپنی روح کو محاسن و مکارم سے بہرہ یاب کر کے اس کی تعریف و تحسین  
 کرے گا اور اس سے لطف اندوز ہوگا تو اس کے ساتھ ساتھ دوسری طرف مفا  
 و مخارب کی مذمت بھی کرے گا اور ان سے نفور ہوگا۔ اور یہ سب کچھ ایسی کم سنی  
 کے عالم میں کہ وہ اس تعریف یا مذمت کے وجود تک نہ بیان کر سکیگا۔ لیکن جب  
 اسے عقل و شعور آئے گا تو اپنے اس دیرینہ دوست کو پہچان کر اس کا خیر مقدم  
 کرے گا جس سے اس کی تعلیم نے اسے عرصہ سے مانوس کر رکھا تھا۔

گ۔ میں آپ سے اس بارہ میں پورا اتفاق کرتا ہوں کہ ہمارے نوجوانوں  
 کو سستی کی تعلیم دینی چاہیے اور انہیں اصول پر جو آپ نے بیان فرمائے۔

میں۔ جب ہم کسی زبان کی عبارت پڑھنا سیکھتے ہیں تو ہمیں اطمینان  
 اسی وقت ہوتا ہے کہ اس کے تمام حروف تہجی سیدھے ہوئے ہیں (واصف  
 ہو جائیں۔ البتہ اس طرح کہ ان کی تمام ممکن شکلوں سے خواہ بڑی ہوں یا چھوٹی  
 اور ان کی تمام مختلف ترتیبوں سے آشنا ہو جائیں۔ اور خواہ یہ حروف کم جگہ گھیرے  
 یا زیادہ ہم انہیں بے اعتنائی سے نہ دیکھیں بلکہ ہر موقع پر ان کے پہچاننے کی کوشش  
 کریں اور عبارت پڑھنے میں اس وقت تک اپنے کو پورا ماہر نہ تصور کریں جب تک  
 کہ ان حروف کو ہر جگہ باسانی نہ پہچان لیا کریں۔



گ۔۔ جی۔

میں۔۔ یا جس طرح ہم پانی یا آئینہ میں حروف کے عکس کو اسی وقت پہچان سکتے ہیں جب پہلے خود حروف سے آشنا ہوں کیونکہ ایک ہی فن اور تعلیم سے ان دونوں کا علم ممکن ہے۔

گ۔۔ جی۔ درست۔

میں۔۔ اسی طرح میرا خیال ہے کہ ان محققین کے طبائع میں جن کی تعلیم ہمارے سپرد ہے کبھی بھی موسیقی اور تناسب پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ عفت و اعتدال، شجاعت، جود و سخا، شان و شوکت وغیرہ اور ان کے اضداد کی ضروری شکلوں سے واقف نہ ہوں۔ اور ان کے پر تو کو ہر جگہ اور ہر ترقیب میں پہچان نہ سکیں۔ اور خواہ یہ بڑی چیزوں میں رونما ہوں یا چھوٹی میں ہم ان کی طرف سے بے اعتنائی نہ کریں بلکہ انھیں ایک فن اور علم کا موضوع بحث خیال کریں۔

گ۔۔ یقیناً۔

میں۔۔ اور جب ایک جمیل روح کی مناسبت ایک حسین جسم کے ساتھ پیدا ہو جائے اور دونوں ایک ہی قالب میں ڈھال دیے جائیں تو صاحب بصیرت کے لیے یہ سب سے زیادہ نظر فریب منظر ہوگا۔

گ۔۔ بیشک۔ اس سے زیادہ خوبصورت اور کیا چیز ہوگی۔

میں :- اور جو حسین تر ہو وہی محبوب تر بھی ہوگا۔

گ :- بیشک۔ آپ یہ فرض کر سکتے ہیں۔

میں :- اور جس شخص کے اندر روح کا تناسب موجود ہو وہ تو محبوب تر پتھر سے ہی سے زیادہ محبت کرے گا۔ ایک غیر مرتب و غیر متناسب روح کو تو وہ ہرگز عزیز نہیں رکھ سکتا۔

گ :- یہ سچ ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ سقم اس کی روح میں پایا جائے ورنہ اگر صرف کوئی جسمانی عیب ہو تو اسے یہ گوارا کر لے گا اور اس کے باوجود ایک چیز کو محبوب کہہ سکتا ہے۔

میں :- میں سمجھا۔ آپ کو شاید اس قسم کا تجربہ ہو۔ اور میں آپ سے متفق ہوں۔ لیکن میں ذرا ایک سوال اور کر لوں یعنی کیا کثرت مسرت و حظ کو عفت و اعتدال سے کوئی تعلق و مناسبت ہے؟

گ :- یہ کیسے ممکن ہے؟ مسرت و شادمانی اسی طرح انسان کو اپنی صلاحیتوں کے استعمال سے قاصر کر دیتی ہے جس طرح غم و کرب۔

میں :- اور کیا اسے عام طور پر نیکی سے کوئی مناسبت ہو سکتی ہے؟

گ :- کچھ نہیں۔

میں :- اور کوئی مناسبت بے اعتدالی اور سفاہت میں ہے؟

گ :- بیشک۔ بہت زیادہ۔



میں :- کیا شہوانی محبت سے زیادہ قوی کوئی اور خط و مسرت ہو؟  
گ :- نہیں۔ نہ اس سے زیادہ مجنونانہ۔

میں :- حالانکہ حقیقی محبت تو حسن اور نظام کی محبت ہے جس میں اعتدال پسند  
وعفت بھی ہو اور باہمی تناسب بھی۔

گ :- بالکل صحیح۔

میں :- لہذا حقیقی محبت کے پاس تو بے عفتی اور جنون کو پھینکنا بھی نہ چاہیے  
گ :- بیشک۔

میں :- چنانچہ عاشق و معشوق دونوں کو جنون و بے عفتی سے کچھ دور رکھا  
نہ ہونا چاہیے اگر ان کی محبت صحیح نوع کی محبت ہے تو طرفین میں سے کسی کو ان جذبات  
سے تعلق نہیں ہو سکتا۔

گ :- بیشک۔ ان جذبات کو تو ان کے پاس بھی نہ آنا چاہیے۔

میں :- لہذا ہم جس شہر کی بنیاد رکھ رہے ہیں تم اس کے لیے یہ قانون مقرر  
کر دو گے کہ ایک دست اپنے محبوب کے ساتھ بس اسی درجہ کی بے تکلفی برتے  
جیسی اپنے بیٹے سے برتاؤ اور یہ بھی نیک نیتی کے ساتھ اور اس کی اجازت سے  
تمام روابط شخصی میں اسے اس قاعدہ کا پابند ہونا چاہیے اور اس سے تجاوز ممنوع۔  
اور اگر وہ کبھی اس سے تجاوز کرے تو بد مذاتی اور ناراحتی کے جرم کا مرتکب متصوہ ہو۔  
گ :- میں آپ سے پورا اتفاق کرتا ہوں۔

میں :- بس۔ موسیقی کے متعلق اس قدر کافی ہے۔ اس بحث کا خاتمہ بھی خوب  
ہوا۔ کیونکہ موسیقی کا مقصد اصلی اگر حسن و جمال کی محبت نہ ہو تو اور کیا ہو؟  
گ :- بیشک میرا صواب ہے۔

میں :- موسیقی کے بعد ورزش جسمانی کا نمبر آتا ہے کہ بچوں کو آپ یہ سکھانی ہے۔  
گ :- جی ہاں۔

میں :- موسیقی کی طرح ورزش جسمانی کی تعلیم بھی اوائل عمر ہی میں شروع ہونی  
چاہیے۔ اس کی تعلیم پر بہت توجہ کی ضرورت ہے اور اسے تمام عمر جاری رکھنا ہے۔ میرا  
تو عقیدہ ہے۔ اور میں اس بارہ میں آپ سے اپنی رائے کی تصدیق چاہتا ہوں، لیکن  
بہر حال میرا عقیدہ ہے کہ جسم اپنی خوبی سے روح کو ترقی نہیں دیتا بلکہ اس کے برعکس  
ایک صالح روح اپنی خوبی سے حتی الامکان جسم کی ترقی کا باعث ہوتی ہے۔ کیوں۔  
آپ کی کیا رائے ہے؟

گ :- جی ہاں۔ میں بھی آپ کا ہم خیال ہوں۔

میں :- چنانچہ دماغ کی کافی تربیت ہو جائے تو ہم جائز طور پر جسم کی نگہداشت  
کا کام اُس پر چھوڑ سکتے ہیں، چنانچہ غیر ضروری تفصیل سے بچنے کے لیے یہاں اس  
موضوع پر ایک جمالی سا خاکہ تیار کرتے ہیں۔

گ :- بہت خوب۔

میں :- یہ تو ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ ان لوگوں کو منشی شیا سے پرہیز کرنا ہوگا



اور ایک محافظہ کے لیے تو انہیں ضروری ہے کہ وہ کبھی شہر میں مدہوش اور دنیا بیاہیا  
سے بے خبر نہ ہو جائے۔

گ۔۔۔ جی ہاں۔ اور کیا۔ اگر خود محافظہ کے لیے ایسا ورنگراں اور محافظہ کی  
ضرورت ہو تو عجیب مضحکہ انگیز بات ہوگی۔

میں۔۔۔ پھر ان کی غذا کے متعلق کیا کہتے ہو؟ یہ خیال رہے کہ یہ لوگ بہت بڑے  
معرکہ کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ کیوں نہ نہ؟  
گ۔۔۔ بیشک۔

میں۔۔۔ کیا ہمارے معمولی ورزش کرنے والوں کی عادات جسمانی ان لوگوں  
کے لیے بھی مناسب ہوں گی؟  
گ۔۔۔ ہاں۔ کیوں نہیں۔

میں۔۔۔ میرے خیال میں تو ان لوگوں کی جسمانی کیفیت کچھ اونگھتی، سوتی،  
اور غالباً صحت کے لیے مضر ہوتی ہو۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ یہ کسرتی لوگ ساری عمریں  
سولے سولے ہی گنوا دیتے ہیں اور جہاں ذرا اپنے معمول سے ادھر ادھر ہٹے کہ شدید  
علاقت اور مرض سے دست گیریاں ہونا پڑتا ہو۔

گ۔۔۔ جی ہاں۔ یہ تو ضرور سچ ہے۔

میں۔۔۔ اس لیے میری رائے میں ہمیں اپنی جنگجو ورزشی لوگوں کے لیے  
اس کبتر تربیت کا انتظام کرنا ہوگا۔ ان لوگوں کی حالت تو ہیشیا رکتوں کی سی ہونی

چاہئے جن کا سامنا اور باصرہ بہت تیز ہو۔ ایام جنگ میں آب و ہوا کی تبدیلی یا غذا کے تغیر کا اُن پر کچھ اثر نہ ہو اور نہ گرمی کی سخت پیش یا سرما کی شدید سردی سے اُن کی تندرستی کو کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

گ۔۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔

میں۔۔ عمدہ ورزش جسمانی سچ پوچھو تو اس سادہ موسیقی کی جڑوان بہن ہے جن کا بیان ہم نے ابھی ابھی کیا تھا۔

گ۔۔ یہ کیسے۔

میں۔۔ یہ اس طرح کہ میسے نزدیک اس موسیقی کی طرح ورزش کی بھی ایک قسم ہے جو نہایت عمدہ اور سادہ ہے۔ خصوصاً فوجی ورزش کی۔

گ۔۔ آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں۔۔ انھیں میسے مفہوم کا پتہ ہو گا۔ دوران جنگ میں وہ اپنے شاہیر کو دعوتوں تک میں سپاہیانہ کھانے کھلاتا ہے۔ مثلاً یہ لوگ *Hellasports* کے کنارہ پر ہیں لیکن ان کے دسترخوان پر مچھلی موجود نہیں انھیں ابلا گوشت تک نہیں ملتا، بس آگ پر ڈاسینک کر کھاتے ہیں۔ اس لیے کہ سپاہیوں کے لیے یہی زیادہ آرام دہ ہے۔ تھوڑی سی آگ جلائی اور کام چلا لیا۔ دیگی اور کڑھائی کا کھڑاگ ساتھ لے پھرنے کی کچھ ضرورت نہیں۔

گ۔۔ سچ ہے۔



میں :- اور غالباً یہ کہنے میں میں غلطی نہیں کرتا کہ مٹی چٹنیوں کا تو ہومر کے کلام میں کہیں ذکر ہی نہیں۔ لیکن انھیں ممنوع قرار دینے میں ہومر کچھ اکیلا نہیں یہ تو تمام پیشہ ور پہلوان خوب جانتے ہیں کہ اگر آدمی اچھی حالت میں رہنا چاہے تو ان چیزوں سے پرہیز لازمی ہے۔

گ :- جب انھیں اس کا علم ہی تو وہ بالکل ٹھیک کرتے ہیں کہ ان چیزوں کا استعمال نہیں کرتے۔

میں :- بالفاظ دیگر آپ سیراکوزہ *Syracuse* کی دعوتوں اور سلی کی لطیف طباطبائی کو نظر استخوان نہیں دیکھتے۔

گ :- جی ہاں میری تو یہی رائے ہے۔

میں :- اور اگر یہ عمدہ جسمانی حالت قائم رکھنی ہے تو غالباً آپ یہ اجازت بھی نہ دینگے کہ یہ کسی حسین کا رنتھی دوشیزہ کو اپنا دوست بنائیں۔

گ :- یقیناً۔ ہرگز نہیں۔

میں :- اور نہ آپ غالباً ایشینا کے حلوائیوں کی نفیس مٹھائیوں کو ہی پسند کریں گے۔

گ :- کبھی نہیں۔

میں :- ان غذاؤں اور اس طریقہ بود و باش کی صحیح مثال اس نغمہ کی سی ہے جو سب کے سب سالیب اور نہایت مختلف بحروں میں مرتب کیا گیا ہو۔

گ :- بالکل۔

میں۔ موسیقی میں تو اس چھپدگی اور آجھاؤ سے بے راہ روی اور بد مذاقی پیدا ہوتی ہے، لیکن ورزش میں مرض پیدا ہوگا۔ اور جس طرح موسیقی کی سادگی سے رشح میں عفت اعتدال کے محاسن پیدا ہوتے ہیں ورزش میں یہ صحت جسمانی کا باعث ہوگی۔

گ۔۔ بجا ہے۔

میں۔ لیکن جب کسی ریاست میں بے عفتی و بے اعتدالی اور امراض جسمانی کی کثرت ہو تو ہمیشہ طب اور انصاف کے بڑے بڑے اہوان تعمیر ہوتے ہیں۔ اور طبیب اور مقنن خوب بڑا بڑا کر اپنے پیشوں کی تعریف کرتے ہیں کہ تو غلام ہی نہیں بلکہ اسرار شہر ہی ان میں گہری دلچسپی لینے لگے۔

گ۔۔ بلاشبہ۔

میں۔ لیکن تم ہی بتاؤ کہ تعلیمی حالت کے بڑے اور شرمناک ہونے کا اس سے قوی اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ صرف معمولی کاریگروں اور بیچ قسم کے لوگوں کو ہی نہیں بلکہ ان لوگوں کو بھی جو تعلیم یافتہ ہونے کے مدعی ہیں عمدہ طبیعوں اور منصفوں کا دست نگر ہونا پڑے۔ کیا یہ عمدہ تربیت اور صحیح پرورش کے فقدان کی روایتیں دلیل اور ایک نہایت شرمناک بات نہیں کہ اسے قانونی یا طبی مشورہ کے لیے باہر جانا پڑے کہ خود اس کے ملک میں یہ چیز نایاب ہے اور اس طرح وہ اپنی کو دوسروں کے ہاتھ میں دیدے اور انھیں معاملات میں حکم اور اپنے اوپر قادر تسلیم کر لے۔



گ۔ بیشک۔ یہ تو سب سے زیادہ ذلت کی بات ہے۔

میں۔ واقعی سب سے زیادہ؟ ذرا سوچو۔ کیا خرابی کی ایک اور منزل اس کے آگے نہیں جس میں آدمی ہی نہیں کہ ساری عمر مقدمہ بازی کرتا رہے اور کبھی مدعی کبھی مدعی علیہ کی حیثیت سے تمام دن عدالتوں میں گنواے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنی بد مذہبی کے باعث اس حرکت پر فخر بھی کرتا ہو۔ ایسا آدمی سمجھتا ہے کہ فن بے ایمانی کا امام ہے۔ برے سے برے طریقے اختیار کرنے میں اسے مطلق عار نہیں، ہر جگہ نکل بیٹھ کر سکتا ہے اور سانپ کے سے پیچ خم کھا کر سرورِ ان سے نکل سکتا ہے اور اپنے کو عدالت کی ضرب سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اور یہ سب کچھ آخر کیوں؟ ایسی چھوٹی چھوٹی اور ذلیل باتوں کے لیے جو قابل اظہار بھی نہیں ہوتیں۔ یہ غریب نہیں جانتا کہ اپنی زندگی اس طرح مرتب کرنا بہت زیادہ ارفع اور اعلیٰ ہے کہ آدمی اونگھتے ہوئے منصفوں کی خدمات سے بالکل مستغنی ہو تم ہی کہو کہ اس شخص کی حالت کیا اور بھی ذلیل نہیں؟

گ۔ بیشک۔ یہ تو اور بھی شرمناک ہے۔

میں۔ اور یہ کون کم شرمناک بات ہے کہ لوگ طب کی اعانت کے طلبگار ہوں۔ اور یہ نہ صرف کسی زخم کے اندمال کی خاطر یا کسی دماغی مرض کے موقع پر بلکہ محض اس لیے کہ خود اپنی کاہلی و سستی اور مذکورہ عادات زندگی کے باعث حیرت اپنے جسم کو رطوبات و ریح سے بھر کر ایک دلدل سا بنا لیتے ہیں۔ اور اسکی پی اس

کی ہوشیار ذریعات کو اس بات کا موقع دیتے ہیں کہ نفع، نزلہ، زکام وغیرہ  
امراض کے نئے نام تراشیں۔

گ۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ یہ لوگ تو امراض کے کچھ عجیب نئے نام رکھتے ہیں۔  
میں۔۔۔ مجھے تو یقین نہیں کہ اسکی پی اس کے زمانہ میں بھی یہ سارے  
امراض تھے۔ اور یہ نتیجہ میں نے اس سے نکالا کہ ہوموں کے کلام میں ذکر ہے  
کہ جب یوری پائیلس زخمی ہوا تو اس نے جو کے سٹوٹلا کر خوب شراب پی  
اور پیئر کھایا۔ یہ پیئر یقیناً حارہیں لیکن اسکی پی اس کے جو متبع اور  
پیرو وہاں جنک ٹروجن میں موجود تھے انہوں نے اس خاتون کو جو شراب کا  
پیالہ لائی تھی کچھ برا بھلا نہ کہا بلکہ اُسے پیئر وکلس معالج کو ملامت کی۔  
گ۔۔۔ خوب۔۔۔ ایسی حالت میں کسی شخص کو یہ پلانا تو عجیب سی بات ہے۔  
میں۔۔۔ نہیں۔۔۔ کچھ ایسی تعجب کی بات نہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ پہلے پہل  
یعنی زمانہ تھیرودڈی گس سے قبل اسکی پی اس کا یہ تھا موجودہ نظام  
طبی عیسیٰ پرانہ تھا۔ کیونکہ سچ پوچھو تو یہ تو اور مرض کی پرورش کرتا ہے لیکن  
تھیرودڈی گس راض تھا اور خود بھی کچھ بوہی ہمارا آدمی تھا چنانچہ ریا  
اور علاج معاہدہ کی باہم آمیزش سے اس نے پہلے تو خود اپنے کو مبتلا مصیبت  
کرنے کا طریقہ ایجاد کیا اور پھر ساری دنیا کو اس میں گرفتار کیا۔  
گ۔۔۔ یہ کیسے؟



میں بسک بسک کر مرنے کا طریقہ ایجاد کر کے! وہ ایک مہلک مرض میں مبتلا تھا اور ہمیشہ اسی کی نگہداشت میں لگا رہتا تھا۔ اس مرض سے نجات کا امکان تو تھا نہیں، بس ساری زندگی خدمتگار کی طرح گزار دی۔ یہی ایک کام تھا کہ اپنی پاسبانی کیا کرے، غذا وغیرہ میں ذرا معمول سے تجاوز کیا اور تکلیف میں مبتلا ہوا۔ غرض اپنے علم کے ذریعہ یونہی مر کر جیسے تھے اپنے بڑھاپے تک پہنچ گیا۔

گ۔ فن میں مہارت کا اچھا انعام ملا!

میں :- ہاں۔ یہ انعام اسی آدمی کا حق تھا جو یہ بھی نہ سمجھ سکا کہ اگر اسکی پی ۲ میں نے اپنے ہنر مندوں کو جسم کی خدمت گزار کی کا یہ فن نہیں سکھایا تو یہ فروگزاشت طلب کے اس شعبہ سے ناواقفیت یا نا تجربہ کاری کی بنا پر نہ تھی بلکہ اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ ایک منظم ریاست میں ہر فرد کے لیے ایک کام ہوتا ہے جس کا انجام دینا اس کے لیے ضروری ہے اور اسے یہ فرصت نصیب نہیں کہ برابر بیمار رہ سکے۔ ہم معمولی کاریگروں کے بارہ میں تو اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہیں، لیکن عجیب بات ہے کہ جہاں ذرا مالدار آدمیوں کا معاملہ ہوتا ہے تو اس سے چشم پوشی کرنے لگتے ہیں۔

گ :- یہ کیسے؟ آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں :- میرا مطلب یہ ہے کہ جب ایک بڑھئی بیمار پڑ جاتا ہے تو وہ طبیعت کوئی

تیز اور زود اثر دوا مانگتا ہے۔ اس کا علاج تو بس یہی ہے کہ جلاب سے لیا یا فصد  
 کھلوالی۔ بدن پر دغ دلوادیا، یا عمل جراحی کرا لیا۔ اور کوئی صاحب اس کے  
 لیے غذا کا ایک پورا نظام تجویز کریں اور ہدایت کریں کہ اپنے سر کو یوں لپیٹا  
 باندھا کر وہ اسی قسم کی اور باتیں بتائیں تو وہ صاف کہہ دیتا ہے کہ مجھے بیمار پر  
 رہنے کی مہلت نہیں اور اسی زندگی سے کیا حاصل جو اپنے معمولی کام پر صرف  
 ہونے کے بجائے اپنے مرض کو پالنے میں گزرتی ہو۔ وہ ایسے طبیب کو خیر باد  
 کہتا ہے اور اپنے معمول پر کار بند ہوتا ہے۔ اور یا تو جھٹ پٹ اچھا ہو کر اپنا کام  
 کرنے لگتا ہے۔ یا اگر اس کا جسم جواب دے چکا ہے تو مر کر اپنی تمام مسیبتوں کو ختم  
 کر دیتا ہے۔

گ۔ اس شخص کے سے حالات میں تو اسی حد تک طب کی بددلیلی چاہیے۔  
 میں :- ہاں۔ دنیا میں اس کا ایک کام اور مقصد ہے۔ اور جب اپنے کام  
 ہی سے محروم رہا تو پھر اسی زندگی سے کیا حاصل!  
 گ :- درست۔

میں :- لیکن مالدار آمیوں کا حال بالکل دوسرا ہے۔ ہم ان کے متعلق گمان  
 ہی نہیں کرتے کہ انھیں زندہ رہ کر دنیا میں کوئی خاص کام بھی انجام دینا ہے۔  
 گ :- ہاں۔ یہ تو عموماً بیکار سمجھے جاتے ہیں۔

میں :- تو شاید تم نے فوسائی لڈیس کا یہ مقولہ نہیں سنا کہ جب آدمی



اپنی معاش کی طرف سے مطمئن ہو جائے تو اس کو طلب خیر اور عمل صالح میں مشغول ہونا چاہیئے۔

گ۔۔۔ جی نہیں۔ میں نے نہیں سنا۔ میری راسے میں تو یہ مشعلہ ذرا اور پہلے شروع ہو تو بہتر ہے۔

میں۔ خیر۔ اس بات پر مناظرہ بیکار ہے۔ ہمارے سامنے اب یہ سوال ہے کہ آیا مالدار آدمی کے لیے نیکی اور خیر پر عمل پیرا ہونا لازمی ہے یا وہ اس کے بغیر بھی اپنی زندگی گزار سکتا ہے؟ اور اگر لازمی ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کھانے پینے کی یہ بے عنوانیاں جو بخاری یا دیگر دستکاریوں میں دماغ کے صحیح طور پر کام کرنے میں حارج تھیں کیا اسی طرح فوسائی لڈیس کے خیال کی تکمیل میں حاصل نہ ہوں گی؟

گ۔۔۔ اس میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ جسم پر توجہ کی اس درجہ زیادتی جب وہ وزرش جسمانی کے قواعد سے متجاوز ہو جائے یقیناً عمل صالح پر بہت بُرا اثر رکھتی ہے۔

میں۔۔۔ ہاں۔ اور اسی طرح یہ بے عنوانیاں، امور خانہ داری، انتظام فوجی، اور ریاست کے کسی عہدہ یا منصب کے ساتھ بھی نہیں نہہ سکتیں۔ اور ان سب سے بڑھ کر مطالعہ، فکر و تدبیر، اور خود شناسی کے ساتھ تو یہ بالکل نہیں کھپتیں۔ لوگ ہمیشہ اس شبہ میں گرفتار رہتے ہیں کہ دروید اور ان سرفلسفہ کے

مطالعہ سے وابستہ ہو سکتا ہے۔ اور اس طرح اعلیٰ معنوں میں خیر پھیل پرا ہونا  
یا اس کی آزمائش کرنا مطلقاً مسدود ہو جاتا ہے۔ آدمی کو مردم یہ خیال لگا  
رہتا ہے کہ میں بیمار ہوں۔ چنانچہ ہمیشہ اپنے جسم کے متعلق ہی متفکر و مترو در رہتا  
گ۔۔۔ بیشک۔ یہ امر بہت قرین قیاس ہے۔

میں۔۔۔ چنانچہ میرا خیال ہے کہ دانشمندانہ سکلی بی اس اپنے ہنر کا اثر  
ان لوگوں پر ظاہر کرتا تھا جو معمولاً صحیح الجتہ ہوں اور جن کی عادات زندگی بھی  
ابھی ہوں لیکن اتفاق سے انہیں کوئی خاص بیماری ہو گئی ہو۔ اس قسم کے امراض کو  
وہ جلاب یا عمل جراحی سے رفع کر کے انہیں حسب معمول زندگی بسر کرنے کا  
مشورہ دیتا تھا۔ اور اس میں اس کے پیش نظر ریاست کی فلاح و بہبود ہوتی  
تھی۔ لیکن وہ کبھی ایسے آدمیوں کا علاج نہ کرتا ہو گا جن کے جسم میں مرض بالکل  
گھس گیا ہے کہ انہیں لیکر ذرا سا مادہ فاسد ادھر سے نکالے ذرا سی دوا او دھرتے  
پہنچائے اور اس کے تدریجی عمل سے انہیں تندرست بنانے کی را حاصل کوشش  
کے۔ وہ ہماری ناکارہ اور بے سود زندگیوں کو طول دینا نہ چاہتا تھا۔ نہ وہ  
اس میں مدد ہونا چاہتا تھا کہ کمزور والدین اپنے سے کمزور اولاد پیدا کریں۔ اگر  
ایک شخص معمولی طریقہ سے زندہ نہیں رہ سکتا تو اس کا تندرست کرنا لا حاصل  
ہو کہ یہ شفا نہ اس کے لیے مفید ہو سکتی ہو نہ ریاست کے لیے۔

گ۔۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس سکلی بی اس کو بڑا مدد تسلیم کرتے ہیں۔



میں اور اس کی صفات کی توضیح اس کے بیٹوں نے کی۔

یہ لوگ زمانہ قدیم کے مشاہیر تھے۔ انھوں نے ان دواؤں کا استعمال کرایا تھا جن کا میں نے ذکر کیا۔ تمہیں یاد ہو گا کہ جب پنڈا اس نے مینی لاس کو زخمی کیا تو ان لوگوں نے ”زخم میں سے خون چوس لیا اور سپر مسکن ڈائریہ لگا دیں“ لیکن انھوں نے مینی لاس یا یوری پاس کے لیے اکل و شرب کی کوئی تجویز پیش نہ کی۔ ان کے خیال میں ایک ایسے انسان کے لیے جو مجروح ہونے سے قبل تندرست تھا اور منضبط عادات رکھتا تھا بس ہی ادویہ کافی تھیں چنانچہ گو مریض نے پرمستی شراب کا ایک جام بھی پی لیا تھا تاہم اچھا ہو گیا ہاں انھیں دائم المریض اور بے احتیاط لوگوں سے مطلق سروکار نہ تھا۔ کیونکہ ان کی زندگیاں نہ خود ان کے لیے مفید تھیں نہ اوروں کے لیے۔ فن طب ایسے لوگوں کے فائدہ کے لیے مرتب نہیں کیا گیا تھا اور چاہے یہ حضرات مال و دولت میں صید اس کے ہمسرہوں اسکی پی اس کے بیٹے ان کے علاج سے صاف انکار کر دیتے۔

گ :- بڑے دانشمند تھے یہ لوگ۔ واہ، واہ سے اسکی پی اس کے بیٹوں میں :- ظاہر ہے۔ لیکن پھر بھی یہ نائک لکھنے والے کہاں مانتے ہیں! جتنے کہ پنڈا نے اگرچہ اسکی پی اس کو اچولو کا بیٹا تسلیم کیا ہے تاہم اس کے متعلق یہ بھی لکھ مارا ہے کہ رشوت دیکر ایک مرتبہ اسے اس بات پر آمادہ کر لیا گیا تھا کہ ایک

قریب المگر مالدار شخص کا علاج کر کے اُسے اچھا کر دے۔ چنانچہ اس کی پادشہ میں  
اُس پر عملی گری۔ لیکن اپنے متذکرہ اصول کی بنا پر ہم تو ان لوگوں کے یہ دونوں متضاد  
بیانات تسلیم نہیں کر سکتے۔ اگر اسکی بی بی اس ایک مقدس دیوتا کی اولاد تھا تو اس  
لاچی اور سر میں نہ ہو گا اور اگر اتنا لاپچی تھا تو دیوتا کا بیٹا نہیں ہو سکتا۔

گ۔ سقراط۔ یہ سب کچھ درست و بجا۔ لیکن میں آپ سے ایک سوال پوچھنا  
چاہتا ہوں۔ یعنی کیا ایک بایست میں اچھے طبیب درکار نہیں؟ اور کیا بہترین  
طبیب وہ نہیں ہوتے جنہوں نے اچھی بری دونوں حالتوں کے زیادہ سے زیادہ  
مریضوں کا علاج کیا ہو۔ اسی طرح کیا بہترین منصف وہی لوگ نہیں ہوتے جو ہر قسم کے  
اعلانی طبائع سے آشنا ہوں؟

میں۔۔۔ بیشک مجھے اچھے طبیب اور اچھے منصف درکار ہیں۔ لیکن یہ بھی جانتے  
ہو کہ میں کس کو اچھا سمجھتا ہوں؟  
گ۔ فرمائیے۔

میں۔۔۔ ہاں۔ اگر بن پڑا تو سمجھاتا ہوں۔ لیکن یہ بتلا دوں کہ آپ نے اس  
سوال میں دو ایسی چیزیں لکھا کر دی ہیں جو ایک سی نہیں۔  
گ۔۔۔ یہ کیسے؟

میں۔۔۔ یہ ایسے کہ آپ نے طبیبوں اور منصفوں کو ملا دیا ہے۔۔۔۔۔ بہترین اور ماہر  
طبیب تو وہ لوگ ہیں جنہیں عہد شباب سے لیکر آگے ہمیشہ اپنے فن کے علم کیساتھ



ساتھ امراض کا زیادہ سے زیادہ تجربہ بھی ہو ہی۔ ممکن ہے کہ خود ان کی تندرستی بہت اچھی نہ ہو اور خود ان کے بدن میں طرح طرح کے امراض جاگزیں ہوں۔ کیونکہ جان تک میں سمجھتا ہوں اصلاح بدن کے لیے انکا آگے خود ان کا بدن نہیں ورنہ اگر ایسا ہوتا تو ہم کبھی یہ روانہ رکھتے کہ یہ بیمار رہیں یا بیمار رہ چکے ہوں۔ لیکن یہ تو بدن کا علاج دماغ سے کرتے ہیں، البتہ اگر دماغ بیمار ہو چکا ہو تو پھر وہ کسی چیز کی اصلاح نہیں کر سکتا۔

گ۔ بالکل درست۔

میں۔ لیکن منصف کا حال بالکل جداگانہ ہی۔ یہ دماغ کا علاج دماغ سے کرتا ہے اس لیے اس کی تربیت ہرگز بڑے اور شرمیر دماغوں کے ساتھ نہ ہونی چاہیے نہ یہ چاہیے کہ عہد شباب سے لیکر وہ آئندہ برابر ایسے بڑے لوگوں سے ملتا رہے اور جرائم کی پوزی نہرست سے بھی اس لیے واقفیت پیدا کرے کہ باسانی دوسروں کے جرم کا پتہ لگالے جس طرح طبیب اپنے ذاتی احساس سے دوسروں کے جسمانی عوارض کا باسانی پتہ چلا سکتا ہے۔ صحیح فیصلہ اور محاکمہ کے لیے جس شرف دماغ کی ضرورت ہے اسے عہد شباب میں کبھی نہ تو جرم کا تجربہ ہونا چاہیے نہ خود جرائم سے آلودگی ہی وجہ ہے زمانہ شباب میں اکثر نیک لوگ بھولے بھالے معلوم ہوتے ہیں اور بے ایمان لوگوں کو انھیں تختہ مشق بنا لیا اسی لیے موقع ہوتا ہے کہ خود ان کی روح میں شر اور برائی کی کوئی مثال موجود نہیں ہوتی۔

گ۔۔۔ جی ہاں۔ ان لوگوں کو نہایت آسانی سے فریب دیا جاسکتا ہے۔  
 میں۔۔۔ اسی وجہ سے تو منصف کو جوان نہ ہونا چاہیے۔ منصف کو شرکی  
 پہچان آجانی چاہیے، لیکن خود اپنی ذات اور روح سے نہیں بلکہ دوسروں میں  
 کثرت سے اس کی ماہیت کا مشاہدہ کر کے۔ اس کا رہنا علم ہونہ کہ ذاتی تجربہ۔  
 گ۔۔۔ بیشک۔ منصف کی بہترین شکل تو یہی ہے۔

میں۔۔۔ (اور آپ نے پوچھا تھا کہ میں کسے اچھا سمجھتا ہوں، تو عزیز من)  
 میں تو ایسے آدمی کو اچھا جانتا ہوں۔ اس لیے کہ اچھا وہی ہے جس کی روح اچھی ہے  
 لیکن وہ مکار اور شبہ کر نیوالی طبیعت کا شخص جس کا ذکر تم نے ابھی کیا تھا، جس  
 خود متعدد جرائم کا ارتکاب ہو چکا ہے اور جو اپنے کو شہادت کا استاد تصور کرتا ہے اسکا  
 تو یہ حال ہے کہ جب کبھی اپنے ہمجنسوں کے مجمع میں ہوگا، تو اس کی احتیاط اور اس کی  
 چالاکی حیرت انگیز ہوگی کیونکہ یہ سب کو اپنے معیار سے جانچتا ہے۔ لیکن جب یہ شخص  
 معمر اور تجربہ کار نیک آدمیوں کی صحبت میں جاتا ہے تو پھر اپنے بجا شبہات کے  
 باعث بیوقوف معلوم ہوتا ہے۔ یہ غریب ایماندار آدمی کو پہچان ہی نہیں سکتا  
 کہ خود اس کی ذات میں ایمانداروں کا کوئی نمونہ موجود نہیں۔ لیکن چونکہ دنیا میں  
 بروں کی تعداد اچھوں سے زیادہ ہے اور اسے اکثر بروں سے ہی سروکار رہتا ہے  
 اس لیے وہ خود اور نیردوسرے لوگ اسے عقلمند ہی سمجھتے ہیں کوئی اسے بیوقوف  
 نہیں جانتا۔



گ :- آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔

میں :- الغرض ایسا شخص اس دانشمند اور نیک منصف کا کام نہیں دیکھتا جس کی ہمیں تلاش ہے۔ بڑائی کبھی اچھائی کو نہیں پہچان سکتی۔ بہتہ ایک صلاح طبیعت جسے زمانہ نے تعلیم دی ہو، نیکی اور بدی دونوں کا علم حاصل کر سکتی ہے میری رائے میں عقل و عرفان نیکوں کا حصہ ہے بدوں کا نہیں۔

گ :- میری بھی یہی رائے ہے۔

میں :- لہذا ہم جس قانون یا جس طلب کی اجازت اپنی ریاست میں دینگے وہ یہ ہے۔ یسنون عمدہ اور صلاح طلبانہ کی کارفرمائی کریں گے اور صحت روحانی اور جسمانی کی فراہمی ان کے ذمہ ہوگی۔ لیکن جن لوگوں کے جسم مریض ہیں یہ انھیں چھوڑ دینگے کہ خود مر جائیں اور ناپاک اور ناقابل اصلاح روجوں کو ختم کر دینگے۔

گ :- مریض اور ریاست دونوں کے لیے یہی بہتر صورت ہے۔

میں :- چنانچہ ہمارے نوجوان جنکی تعلیم عفت خیر اور اعتدال آموز موسیقی کے ذریعہ ہوئی ہے، قانونی چارہ جوئی کرنے میں نہایت تردد کریں گے۔

گ :- ظاہر ہے۔

میں :- اس طرح موسیقی داں جو اسی راستہ پر چل کر معمولی اور نہایت سادہ درخش جسمانی کرے گا اسے بھی سوائے بعض اشد ضروری حالتوں کے طب سے کچھ سروکار نہ ہوگا۔

گ :- یقیناً۔

میں :- یہ موسیقی وال جو ورزش کرتے گا اس کا مقصد اپنی طبیعت کے عنصر شجاع کو تحریک دینا ہے نہ کہ طاقت بڑھانا۔ وہ عام پہلوانوں کی طرح ورزش اور غذا کو محض اپنے رگ پٹھے درست کرنے کا ذریعہ نہیں بناتا۔

گ :- درست۔

میں :- اور جیسا کہ لوگ اکثر سمجھتے ہیں موسیقی اور ورزش جسمانی کے دو فنون کی غایت جدا جدا تربیت روح اور ترقی جسم نہیں۔

گ :- پھر آخراں کی اصلی غرض کیا ہے؟

میں :- میں تو سمجھتا ہوں کہ دونوں فنون کے سکھانے والوں کے پیش نظر

تربیت روح ہی ہوتی ہے۔

گ :- یہ کیسے؟

میں :- کیا آپ نے کبھی نہیں دیکھا کہ صرف ورزش جسمانی پر تامل تو جہ صرف کرنے سے دماغ پر کیا اثر پڑتا ہے یا محض موسیقی پر توجہ کرنے سے جسم پر؟

گ :- یہ اثر کیونکر ظاہر ہوتا ہے؟

میں :- اس طرح کہ ایک سے طبیعت میں سختی اور درشتی پیدا ہوتی ہے اور

دوسرے سے نرمی اور نساہت۔

گ :- جی ہاں۔ میں اتنا تو جانتا ہوں کہ محض ورزش جس کو نیا لاپہلوان بہت کچھ



وحشی ہو جاتا ہے اور صرف موسیقی پر توجہ کرنے والا نرمی اور رقت قلب میں حدتاً  
سے تجاوز کر جاتا ہے۔

میں۔ لیکن دراصل یہ سختی اور درشتی طبیعت کی اس کیفیت سے پیدا ہوتی  
ہے جس کی اگر صحیح تربیت ہو تو شجاعت اور جرأت پیدا ہوں۔ لیکن جب اس پر ضرورت  
سے زیادہ زور دیدیا جاتا ہے تو یہی سختی و وحشت پیدا کرتی ہے۔  
گ۔ میں سمجھتا ہوں۔

میں۔ اس کے برعکس فلسفی میں نرمی کی صفت ہوگی۔ لیکن اس میں بھی  
اگر غلو ہو گیا تو یہی نرمی ضرورت سے زیادہ بڑھ جائیگی۔ اور اگر صحیح تعلیم ہو  
تو معتدل نرمی پیدا ہوگی۔  
گ۔ بجا۔

میں۔ اور ہماری رائے میں محافطین میں یہ دونوں صفات ہونی چاہئیں؟  
گ۔ لازماً۔

میں۔ اور ان دونوں میں ایک تناسب بھی ضروری ہے؟  
گ۔ بلاشبہ۔

میں۔ اسی متناسب اور مرتب روح میں عفت و اعتدال بھی ہونگے  
اور جرأت و شجاعت بھی؟  
گ۔ جی ہاں۔

میں۔ برخلاف اس کے غیر متناسب روح بزدل اور ناترکس ہوگی۔  
گ۔ بیشک۔

میں۔ اور اسی طرح جب انسان اپنے کو موسیقی سے متاثر ہونے اور کانوں کے ذریعہ اپنی روح میں ان شیریں و نرم یا المٹناک ترانوں کو داخل ہونے دے جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں اور جب اسکی ساری زندگی نعمہ سزائی اور انبساط موسیقی میں صرف ہو تو اس عمل کے ابتدائی مداخلج میں تو اس کی طبیعت میں لوہے کا سا لوح پیدا ہو جائیگا اور بجائے زود شکن اور بیکار ہونے کے وہ نہایت مفید و کارآمد بن جائیگا، لیکن اگر نرم کرنے کا یہ عمل ذرا زیادہ جاری رہا تو دوسری منزل پھر گلنے اور ضائع ہونے کی ہر حتی کہ یہ سارا جذبہ فنا اور روح کی ساری قوت زائل ہو کر وہ جنگ آزمائی کے معیار کے مطابق نہایت کمزور انسان رہ جائیگا۔

گ۔ بائیکل درست۔

میں۔ یہ جذبہ اگر اس میں فطرتاً کمزور ہی تو یہ تبدیلی جلد رونما ہو جاتی ہے اور اگر قوی ہے تو موسیقی کی قوت اسے کمزور کر کے اس کی طبیعت کو چرچرا بنا دیتی ہے وہ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا ہے اور پھر فوراً ٹھنڈا بھی پڑ جاتا ہے۔ اس جذبہ کے بجائے وہ اب نہایت ذکی ہے اور مغلوب الغضب ہو جاتا ہے اور قوت عمل اس سے بالکل سلب ہو جاتی ہے۔

گ۔ بجا۔



میں یہی حال ورزش جسمانی کا ہے۔ اگر کوئی شخص سخت ورزش کرے تو بہت کھانیاں والا بھی ہو۔ یعنی موسیقی اور فلسفہ کے دلدادہ کا بالکل عکس تو اس کے جسم کی خوبی پہلے اس میں کچھ غور اور یہی مذکورہ جذبہ جرات پیدا کرتی ہے اور وہ اپنے میں پہلے سے دو چند مردانگی محسوس کرنے لگتا ہے۔

گ۔۔۔ جی۔

میں۔۔۔ لیکن پھر کیا ہوتا ہے؟ اگر وہ یہی کرتا رہے اور کسی دوسری طرف توجہ نہ کرے، علمی مشاغل سے کوئی سروکار نہ رکھے تو تعلیم و تحقیق، تخیل و تہذیب سے کوئی لگاؤ نہ ہونے کے باعث جو تھوڑی بہت ذہانت و کاوت اس میں رہتی وہ کمزور، کند، اور اعمیٰ ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ نہ کبھی پیدا ہونے پاتا ہے نہ نشوونما حاصل کرتا ہے اور نہ اس کے جو اس کا گرد و غبار ہی صاف ہونے پاتا ہے۔

گ۔۔۔ صحیح ہے۔

میں۔۔۔ بالآخر غیر مہذب اور فلسفہ سے نفور ہو جاتا ہے۔ ترغیب کا آئینہ کبھی استعمال ہی نہیں کرتا۔ اس کی حالت ایک وحشی درندہ کی سی ہوتی ہے۔ ہمت و تشدد و خونخواری، کہ اسے معاملہ کا کوئی دوسرا طریقہ آتا ہی نہیں۔ اور سلیقہ مند و حسن عمل سے یکفلم نابلد، کامل جہالت اور برائی میں اپنی زندگی گزارتا ہے۔

گ۔۔۔ بالکل درست۔

میں۔۔۔ اور چونکہ فطرت انسانی دو اصول سے مرکب ہے یعنی جبری اور نفسیاتی

اس لیے میں تو کہوں گا کہ کسی دیوتا نے ان دونوں اصول کے مقابلے اور بالواسطہ جسم کی مطابقت سے، انسان کو دو فن عظیم کیسے ہیں تاکہ ان دو اصولوں کو آلات موسیقی کے تاروں کی طرح ڈھیلا کر کے اور کس کر ضروری تناسب پیدا کرے۔  
گ۔ ہاں معلوم تو یہی ہوتا ہے۔

میں :- توجہ شخص موسیقی اور ورزش جسمانی کو بہترین تناسب کے ساتھ ملانا اور بہترین طریقہ سے روح کے ساتھ ان کی مطابقت کرنا، وہ دراصل تار سے نغمہ نکالنے والوں کی نسبت بہتر معنوں میں ماہر موسیقی کہلانے کا مستحق ہے۔  
گ۔ آپ کا ارشاد بالکل بجا ہے۔

میں :- اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری ریاست کی حکومت ہمیشہ قائم رہے تو سڑاری کے لیے ایک ایسے غیر معمولی شخص کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔  
گ۔ بیشک۔ اس کا وجود تو ازل سے ناگزیر ہے۔

میں :- اچھا تو تربیت جسمانی اور تعلیم (ذہنی) کے لیے ہمارے اصول یہ ہیں۔ اب شہریوں کے رقص، سیر و شکار، ورزش اور گھوڑ دوڑ، اور کسرتی مقابلوں کے متعلق زیادہ تفصیلی بحث کرنے سے کیا حاصل ہے یہ سب تو عام اصول کے پابند ہیں اور جب یہ اصول معلوم ہو گیا تو انکا فیصلہ کرنے میں چنداں دشواری نہیں۔

گ۔ یقیناً اس میں کوئی مشکل نہ ہوگی۔

میں :- اب اور کونسا سوال باقی رہا؟ اب یہ دریافت کرنا چاہیے کہ کون کون



ہوگا اور کون محکوم۔

گ۔ بیشک۔

میں :- اس میں تو کچھ شبہ کی گنجائش نہیں کہ زیادہ عمر والے کم عمر لوگوں پر

حکومت کریں۔

گ :- ظاہر ہے۔

میں :- اور ان میں سے بھی وہی حکومت کریں جو بہترین ہوں۔

گ :- یہ بات بھی بالکل صاف ہے۔

میں :- اچھا اب بتلاؤ کہ بہترین کاشتکار تو وہی ہوتا ہے جو کاشتکاری میں

سب سے زیادہ منہمک رہے؟

گ :- جی ہاں۔

میں :- اور چونکہ ہمیں اپنے شہر کے لیے بہترین محافظ درکار ہیں تو کیا یہی وہ

لوگ نہ ہوں گے جن میں محافظ بننے کے صفات سب سے زیادہ موجود ہیں۔

گ :- بیشک۔

میں :- اس عرض کے لیے ضروری ہے کہ وہ دانشمند اور مستعد ہوں اور ریاست کا

خاص خیال رکھیں۔

گ :- بیشک۔

میں :- اور انسان ایسی چیز کا سب سے زیادہ خیال رکھے گا جس سے اسے محبت ہو۔

گ۔ یقیناً۔

میں :- اور غالباً اسی چیز سے محبت زیادہ ہوگی جس کے اغراض و مقاصد خود اس کے سے ہوں اور اس کے خیال میں جس چیز کی اچھائی یا برائی سے خود اپنے سے زیادہ اثر پڑتا ہو۔

گ۔ بالکل درست۔

میں :- چنانچہ اس کے لیے انتخاب ضروری ہو۔ ہم مخالفین میں سے اُن لوگوں کو دیکھیں جنہوں نے اپنی ساری زندگی میں ملک کی بہبود کے لیے سب سے زیادہ اشتیاق ظاہر کیا ہے اور اغراض ملکی کے خلاف کوئی کام کرنے سے ہمیشہ سے زیادہ نفور ہے ہیں۔

گ۔ ہاں یہی ٹھیک آدمی ہوں گے۔

میں :- پھر ہر عمر میں اپنے نظر رکھنی ہوگی تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے عزم قائم ہیں یا نہیں۔ اور کہیں کبھی جبر و تشدد یا ترغیب و نظر فریبی سے یہ راست کے متعلق اپنے فرض کے احساس کو فراموش یا پس پشت تو نہیں ڈال دیتے۔

گ۔ پس پشت کیسے ڈالنا!

میں :- میں سمجھاتا ہوں۔ آدمی کے دماغ سے کسی عزم کے نکل جانے کی دو صورتیں ہیں۔ یا تو ایسا خود اس کے ارادہ سے ہو یا خلاف ارادہ۔ خود اپنے ارادہ سے تو اس وقت جب وہ کسی کذب سے نجات پاتا اور بہتر علم حاصل کرتا ہے اور خلاف



ارادہ اسوقت جب کہ کسی حق و صداقت سے محروم ہوتا ہے۔

گ۔ غم کا بالا ارادہ نکل جانا تو میں سمجھ گیا لیکن بلا ارادہ کا صحیح مفہوم سمجھنا ابھی باقی ہے۔

میں :- کیوں کیا آپ یہ نہیں سمجھتے کہ انسان اچھائی اور خیر سے تو خلاف ارادہ محروم کیا جاتا ہے اور بُرائی اور شر سے بہ خوشی؟ کیا کسی صداقت کو کھو دینا بُرا اور کسی صداقت کا حاصل کر لینا اچھا نہیں؟ اور آپ غالباً مجھ سے اتفاق کریں گے کہ ہشیار کو اس طرح جاننا جیسی کہ وہ ہیں صداقت کا حاصل کرنا ہے۔

گ۔ جی۔ میں اس پر متفق ہوں کہ انسان حق و صداقت سے خلاف مرضی محروم کیا جاتا ہے۔

میں :- اور بلا ارادہ محرومی کیا سرقہ، جبر یا نظر فریبی سے عمل میں نہیں لائی جاتی گ۔ میں ابھی تک آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

میں :- سب مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں میں المیہ نائک لکھنے والوں کی طرح گنجلک اور تاریک گفتگو تو نہیں کر رہا ہوں۔ میرا مطلب بس اتنا ہے کہ بعض لوگوں میں تنغیب سے تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور بعض میں بھول سے۔ اول الذکر کے عقائد کو دلیل چرچائی ہے اور مؤخر الذکر کے عقائد کو زمانہ چنانچہ ان دونوں حالتوں کو میں نے سرقہ سے تعبیر کیا۔ اب تو آپ سمجھے؟

گ۔ جی ہاں۔

میں۔۔۔ رہا جبر۔ توجہ سے ان لوگوں میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے جنہیں کسی کرب یا رنج کی شدت اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور کرے۔

گ۔۔۔ میں اب سمجھ گیا۔ آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں۔

میں۔۔۔ اور نظر فریبی ان کی ہوتی ہے جن کے خیالات عیش و مسرت کے نرم یا حزن و خوف کے سخت اثر سے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ آپ غائباً سے بھی تسلیم کر لیں گے۔۔۔ بیشک۔ جس چیز سے دھوکا ہو اُسے نظر فریب کہہ سکتے ہیں۔

میں۔۔۔ اس لیے جیسا کہ میں ابھی ابھی کہہ رہا تھا ہمیں ان لوگوں کو ڈھونڈنا چاہیے جو خود اپنے اس عقیدہ کے بہترین محافظ ہوں کہ جو کچھ ان کے نزدیک یا ست کے اغراض کے مطابق ہو وہی ان کی زندگی کا طرز عمل ہوگا۔ ہمیں مانہ شباب سے برابر اپنے نظر رکھنی چاہیے اور ان سے ایسے کام کرانے چاہئیں جن میں اس عقیدہ کو بھول جانے یا اس میں دھوکہ کھا جانے کا بہت احتمال ہو۔ اور جو پھر بھی اسے نہ بھولے نہ دھوکہ کھائے اُسے منتخب کر لینا چاہیے، اور جو اس آزمائش میں ناکام رہا انہیں خارج کر دینا چاہیے۔ کیوں یہی بہترین طریقہ ہے نا؟

گ۔۔۔ جی ہاں۔

میں۔۔۔ ان لوگوں کے لیے کچھ محنت مشقت کچھ تکلیف اور مقابلے بھی تجویز کرنے چاہئیں تاکہ یہ اپنی ان صفات کا مزید ثبوت دے سکیں۔

گ۔۔۔ بہت صحیح۔



ہیں :- اس کے بعد انھیں نظر فریبی سے آزمانا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ اس امتحان میں ان کا کیا رویہ رہتا ہے۔ یہ گویا تیسری آزمائش ہے جس طرح لوگ پھیروں کو شورا اور گورنر میں دیکھنے لیجاتے ہیں کہ کہیں بڑے توتھیں، اسی طرح ہمیں بھی ان نوجوانوں کو مختلف قسم کے خطرات سے گزارنا چاہیے، اس کے بعد مسرتوں سے جسے بھٹی میں سونے کی جانچ ہوتی ہے اس سے بھی زیادہ تکمیل کے ساتھ ہمیں ان کی جانچ پرکھ کرنی چاہیے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آیا یہ تمام نظر فریبیوں کے خلاف مسلح ہمیشہ نیک کردار اور خود اپنے اور اس موہتی کے جوانوں نے حاصل کی ہے یا نہیں۔ اور آیا طرح طرح کے حالات میں ایسی متوازن و متناسب طبیعت قائم رکھ سکتے ہیں یا نہیں جو فرد اور ریاست دونوں کے لیے مفید اور کارآمد ہو۔ جو شخص لڑکپن، جوانی اور بڑی عمر پر پہنچنے کے بعد الغرض ہر عمر میں اس آزمائش سے کامیاب اور کھرا نکلا ہو اسے ریاست کا حکمراں اور محافظ مقرر کرنا چاہیے۔ زندگی بھر اس کی عزت ہو اور بعد موت بھی۔ اس کے لیے مقبرہ اور بڑی سے بڑی عزت بڑی باید گاریں تمیز ہوں۔ مگر جو اس امتحان میں ناکام رہیں انھیں لازماً خارج کر دینا چاہیے۔ میری رائے میں تو محافظین و حکام کے انتخاب و تقرر کا یہ طریقہ ہے۔ میں نے جو کچھ کہا یہ ایک عام بیان ہے اور میں اس کے مطلق صحیح ہونے کا مدعی نہیں۔

گ۔ جی۔ اس عام بیان سے میں بھی متفق ہوں۔

میں :- اور غالباً صحیح معنوں میں لفظ محافظ کا اطلاق اسی طبقہ اعلیٰ پر

ہونا چاہیے جو ہمیں خارجی دشمنوں سے بچائیں اور شہریوں میں داخلی امن برقرار رکھیں، تاکہ مؤخر الذکر میں ہمیں نقصان پہنچانے کی خواہش اور اول الذکر میں اس کی قوت نہ رہے۔ جن نوجوانوں کو ہم نے پہلے محاذ کا لقب یا تھامنا سب ہی کہ نہیں اب ان حکام کے اصولوں کا مددگار و معاون کہا جائے۔

گ۔ میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔

میں: تو ہم پھر کس طرح وہ دروغ مصلحت آمیز تراشیں جس کا ہم ابھی تھوڑی دیر ہوئی ذکر کر رہے تھے، یعنی وہ شاندار جھوٹ جو ممکن ہو تو حکام کو بھی دھوکا دے سکے یا کم سے کم باقی تمام شہر کو!

گ: یہ جھوٹ کیسا؟

میں: نہیں کوئی نئی بات نہیں۔ بس ایک قدیم فونٹقی افسانہ چاہیے جس میں ایسی چیزوں کا ذکر ہو جو کسی دوسری جگہ اور ہمارے زمانہ سے قبل واقع ہوئی ہیں جیسے شاعر اکثر کہتے اور لوگوں کو یاد کر دیتے ہیں، نہ معلوم پھر کبھی ایسا ہو ممکن ہو یا نہیں اور اگر ایسا واقع بھی ہو تو قابل یقین سمجھا جائے یا نہیں۔

گ: کیوں کیوں آپ کے الفاظ منہ سے نکلتے نکلتے رکتے کیوں ہیں؟

میں: آپ جب میرا مافی الضمیر سن لینگے تو غالباً اس جھجک پر متعجب نہ ہونگے

گ: تو ڈر کا ہیکا ہی۔ فرمائیے۔

میں: اچھا۔ عرض کرتا ہوں۔ اگرچہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ سے کس طرح انجمن



چار کروں اور کن الفاظ میں اس بے جھپک اور دلیرانہ جھوٹ کا اظہار کروں جسے میں  
 رفتہ رفتہ پہلے حکام تک بعد سپاہ کو اور سب سے آخر میں عوام کو پہنچانا چاہتا  
 ہوں۔ سنئے ان سے کہا جائیگا کہ ان کا زمانہ شباب ایک خواب تھا اور جو تعلیم و تربیت  
 انہوں نے ہم سے حاصل کی محض ایک ظاہری شکل بنو تھی۔ دراصل اس زمانہ میں  
 ماوراءرض کے رحم کے اندران کی تشکیل اور انکا تغذیہ ہو رہا تھا۔ وہیں یہ خود بھی  
 بنائے گئے اور ان کے آلات و اسلحہ بھی۔ جہاں سب کی تکمیل ہو چکی تو انکی  
 ماں 'زمین' نے انہیں اوپر بھیجا۔ چنانچہ ان کا ملک ان کی ماں اور زمین انکی  
 دانی ہے۔ اس کی فلاح چاہنا ان کا فرض اور اسے حملوں سے بچانا انپر لازم  
 ہے۔ انہیں چاہیے کہ اس کے شہریوں کو اسی بھومی کے بچے اور اپنا بھائی جانی  
 گ۔ پتہ ہے، اس کذب کے اظہار میں آپکا تذبذب بجا تھا۔

میں، جی۔ ابھی تو اور بانی ہے۔ میں نے صرف نصف بیان کیا ہے۔  
 ہم اس قصہ میں کہیں گے کہ لے شہریو! تم آہیں میں بھائی بھائی ہو، لیکن خدا  
 نے تمہیں مختلف طریقہ پر بنایا ہے۔ تم میں سے بعض میں حکمرانی کی قوت ہے اور انکے  
 اجزائے ترکیبی میں خدانے سونے کی آمیزش کی ہے۔ اسی وجہ سے انکی عزت  
 بھی سب سے زیادہ ہے، بعض دوسرے چاندی سے بنے ہیں اور یہ مددگار ہیں  
 جنہیں کسان اور کاریگر بننا ہوا ان کی ترکیب میں پتیل اور لوہا شامل کیا ہے۔  
 اور یہ خصائص نوعی عموماً ان کی اولاد میں بھی قائم رہینگے۔ مگر چونکہ اصل سبکی

ایک ہر اس لیے کبھی کبھی ایسا بھی ہو گا کہ سولنے والے والدین کے سیمین پبلیک  
 یا سیمین والدین کے زریں اولاد ہو۔ خدا تمام حکام کے سامنے چہریت اصول  
 اول اس کا اعلان کرتا ہے کہ اور تمام چیزوں کے مقابلہ میں انھیں نجابت  
 کی سب سے زیادہ حفاظت کرنی چاہیے۔ ہمیشہ انھیں اس بات پر نظر  
 رکھنی چاہیے کہ اولاد میں کن اجزاء کی آمیزش ہوتی ہے کیونکہ اگر زریں یا سیمین  
 طبقہ کی اولاد میں پتیل یا لوہے کا میل ہو تو قانون قدرت تبدیل مراتب کا  
 طالب ہوتا ہے۔ حاکم کو اس بات پر ذرا ترس نہ آنا چاہیے کہ اس کا بچہ تنزل  
 کر کے گسان یا دستکار ہو رہا ہے۔ اسی طرح اگر دستکاروں کی اولاد میں سونے  
 یا چاندی کی آمیزش ہو تو ان کا اعزاز بڑھتا اور وہ محافظ شہر یا بدو گاروں کے  
 زمرہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کاہن کا قول ہے کہ جس مایست کا محافظ  
 پتیل یا لوہے والا آدمی ہو وہ تباہ ہو جائیگی۔ تو جناب من وہ قصہ یہ ہے۔ کیونکہ  
 اس افسانہ کو باور کرانیکا بھی کچھ امکان ہے؟

گ۔۔ ایک پشت میں تو ممکن نہیں۔ موجودہ نسل کو یہ باور کرانیکی تو کوئی  
 تدبیر میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بہت سے لوگوں کی اولاد یا ان کی اولاد کی اولاد  
 کو یہ افسانہ باور کرایا جاسکتا ہے۔ اور ہمیں سلسل۔

میں۔۔ ہاں۔ میں اس وقت کو خود محسوس کرتا ہوں۔ تاہم اس نسیم کا عینہ  
 ان لوگوں کو شہر کے اور نیز باہم ایک دوسرے کے متعلق غور و فکر کرنے پر آمادہ



کریگا۔ خیر۔ افسانہ کے متعلق بس اس قدر کافی ہے۔ اب یہ خود بخود افواہ کے پروں پر اڑ کر تمام میں پھیلتا رہے گا۔ او۔ ہم اپنے گیتی نژاد سوراؤں کو مسلح کریں اور انہیں حکام کے زیر سیادت آگے بڑھائیں۔ یہ لوگ ادھر ادھر دیکھ بھال کر ایک ایسی جگہ تلاش کریں کہ اگر اندرون ملک میں کوئی شورش برپا ہو تو یہ اس بغاوت کو باسانی دبا سکیں۔ سیزان دشمنوں سے اپنے کو مامون رکھ سکیں جو بھیڑیوں کی طرح باہر سے گلہ پر چھاپہ مارتے ہیں۔ جگہ کا انتخاب کر کے یہ لوگ وہاں اپنے ڈپٹے والیں، متعلقہ دیوتاؤں پر قربانی چڑھائیں اور اپنی جائے قیام کی تعمیر میں مصروف ہو جائیں۔

گ۔۔۔ بالکل درست۔

میں۔۔۔ یہ قیام گاہ ایسی ہونی چاہیے کہ گرمیوں میں گرمی اور سردیوں میں سردی سے ان کی حفاظت کر سکے۔

گ۔۔۔ آپ کا مطلب غالباً ان کے مکانوں سے ہے۔

میں۔۔۔ جی۔ لیکن سپاہیوں کے مکان ہوں دکانداروں کے نہیں۔

گ۔۔۔ کیوں۔ ان میں کیا فرق ہے؟

میں۔۔۔ میں ابھی عرض کرتا ہوں۔ سنیے، اگر کوئی گڈریہ ایسے محافظ کتے پالے

جو عدم تربیت بھوک، یا کسی بڑی عادت کی وجہ سے بھیڑیوں پر منہ ڈالیں اور انہیں تنگ کریں اور حفاظت کے بجائے خود بھیڑیے کا کام دیں تو یہ کیسی لغواؤ

بری حرکت ہوگی

گ۔ بیشک، یہ بہت بری بات ہے۔

میں۔۔ چنانچہ ہمیں بھی ہر ممکن اہتمام کرنا چاہیے کہ ہمارے مددگار محافظ  
عوام شہریوں سے زیادہ قومی ہوں گے کہیں ضرورت سے زیادہ قومی نہ ہو جائیں  
اور بجائے یارو مددگار کے ایک وحشی ظالم کا کام نہ کریں۔

گ۔ جی ہاں۔ اس بارہ میں بڑے احتیاط کی ضرورت ہے۔

میں۔ اور کیا ایک حقیقی عمدہ تعلیم بہترین احتیاط نہیں؟

گ۔ ان کی عمدہ تعلیم تو ہو ہی چکی ہے۔

میں۔ نہیں۔ مجھے تو اس درجہ اعتماد نہیں۔ ہاں میرا عقیدہ ہے کہ انھیں عمدہ

تعلیم یافتہ ہونا ضرور چاہیے کہ صحیح تعلیم ہی خواہ اس کی نوعیت کچھ ہو انھیں مہذب  
اور متحضر بنانے اور ان کے تعلقات باہمی و وزیر دستوں سے ان کے برتاؤ کو

انسانیت کا رویہ بنانے میں سب سے قوی مؤثر قوت ثابت ہوگی۔

گ۔ بجا۔

میں۔ اور صرف تعلیم ہی نہیں ان کی ترقی قائم گاہیں اور ان کی تمام املاک اسی

قسم کی ہونی چاہیے کہ نہ چینیٹ محافظان کے محاسن کو کم کرے اور نہ انھیں دوسرے

شہریوں پر دست درازی کرنے کی ترغیب دلا سکے۔ غالباً ہر سمجھدار شخص مجھ سے

اتفاق کرے گا۔



گ۔۔ لازماً۔

میں :- اچھا تو اگر انھیں ہمارے خیال کے مطابق پورا اترنا ہی تو دیکھیں انکا  
 طرز معاشرت کیا ہونا چاہیے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ سوائے اشد و مطلق  
 ضروری اشیاء کے کسی کے پاس اپنی کوئی ذاتی ملک نہ ہوگی، نہ ان کے پاس کوئی  
 اپنا بیج کا مکان ہوگا نہ گو دام جس میں کوئی دوسرا آنا چاہے اور نہ آسکے، ان کی  
 غذا میں صرف ایسی چیزیں شامل ہوں گی جن کی ضرورت ترمیم یافتہ اور صاحب  
 برأت و عفت جنگ آزماؤں کو ہوتی ہے۔ انھیں شہریوں سے ایک مقررہ شرح  
 تنخواہ کے وصول کرنے کا معاہدہ کرانا چاہیے تاکہ ان کے سالانہ اخراجات کی  
 کفالت ہو سکے، بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ سب کے سب ایک جگہ رہیں اور  
 ایک جگہ کھانا کھائیں، جس طرح لشکر میں سپاہی کرتے ہیں۔ ہم انھیں بستلاینگے  
 کہ یہ کم و زور تو انھیں خدا کی طرف سے عطا ہو چکا ہے، جب وہ اعلیٰ دھات خود کھائے  
 اندر موجود ہے تو پھر اس میل کی تمھیں کیا ضرورت جو انسانوں میں رائج ہے، ہم ہرگز  
 اس عطیہ سماوی کو اس آمیزش ارضی سے آلودہ اور ناپاک نہ کرو کہ یہ رائج اور عام  
 دھات بہت سے ناپاک اعمال کی وجہ ثابت ہوتی ہے، اور خاص اور اعلیٰ دھات  
 تمہارے قبضہ میں ہے وہ بالکل پاک ہے۔ چنانچہ سارے شہر میں بس انھیں لوگوں کو سونا  
 چاندی نہ چھونا چاہیے۔ یہ لوگ نہ تو سونا چاندی پہنیں نہ لٹکے برتنوں سے کچھ پہنیں،  
 نہ اس چھت کے تلے رہیں جہاں سونا چاندی موجود ہے۔ ان کی نجات اسی میں ہے

اور اسی طرح یہ رہائش کی نجات کرا سکتے ہیں۔ اور اگر کہیں ان کے پاس اپنے  
ذاتی مکانات یا زمینیں یا اپنا ذاتی زر و مال ہو تو یہ بیشک اچھے تاجر اور کسٹ  
ٹوین جائیں گے لیکن محافظانہ رہیں گے۔ بجائے معین و مددگار ہونے کے یہ  
دشمن اور ظالم ہو جائیں گے۔ یہ دوسروں سے نفرت کریں گے، دوسرے ان سے  
یہ اوروں کے خلاف سازش کریں گے، اور ان کے خلاف، خارجی دشمنوں سے  
زیادہ اندرونی مخالفتوں کے خوف میں ان کی زندگی گزریگی اور خود ان کی اور نیز  
رہائش کی تباہی کا وقت قریب آجائے گا۔ ان وجود کی بنا پر کیا ہم یہ سمجھنے میں  
حق بجانب نہیں کہ ہماری رہائش کا ایسا ہی نظام ہونا چاہیے اور محافظین کے  
مکانات اور نیز دیگر امور کے متعلق بھی یہی ضوابط مقرر کرنا چاہئیں۔  
گ۔۔ بیشک۔





# چوتھی کتاب

سلسلہ کلام یہاں تک پہنچا تھا کہ ایڈمیشن نے بات کاٹ کر یہ سوال کیا ”یہ تو فرمائیے کہ اگر کوئی شخص یہ شکایت کرے کہ آپ نے اس طبقہ کے لوگوں کی خوشی اور آرام کا کوئی خاص خیال نہ رکھا تو آپ کیا جواب دیں گے۔ اور سچ تو یوں ہی کہ یہ خود انھیں لوگوں کی غلطی ہوگی کہ ان کے آرام و آسائش کا سامان مہیا نہ ہو۔ سارا کا سارا شہر دراصل انکا ہی اور یہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ دوسرے زمین خرید سکتے ہیں اُسپر عالیشان اور آراستہ محلات تعمیر کرا سکتے ہیں دیوتاؤں کے نام پر بیچ کی قربانیاں بھی چڑھا سکتے ہیں، انھیں اجازت ہی کہ اپنے دوستوں کی دعوتیں کریں، سیم و زر اور عیش و آسائش کے تمام ضروریات کے ذخائر انکے پاس موجود ہوں، لیکن یہ غریب ہیں کہ شہر میں کرایہ کی فوج کی طرح تعینات ہیں اور بس اپنے فوجی فرائض کی انجام دہی میں ہمہ تن مصروف!“

میں۔۔ ہاں، بیشک آپ صحیح فرماتے ہیں اور دیکھئے اس خدمت کے صلے میں انھیں محض کھانا دیا جاتا ہے، تنخواہ یا معاوضہ کچھ نہیں۔ چنانچہ اگر یہ سیریا



سفر کو جانا چاہیں تو اپنے طور پر نہیں جاسکتے، نہ اپنی محبوبہ عورتوں کو  
تخلف سے سکتے ہیں اور نہ اوروں کی طرح جو خوشحال سمجھے جاتے ہیں۔  
دوسری خواہشات کے پورا کرنے کے لیے دام صرف کر سکتے ہیں۔ آپ نے  
شکایات میں یہ اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں شامل نہیں کیں۔

ایڈ۔۔ اچھا تو اب انھیں بھی شامل سمجھیے۔

میں۔۔ تو آپ پوچھتے یہ ہیں کہ ہم اس اعتراض کا کیا جواب دے سکیں  
ایڈ۔۔ جی ہاں۔

میں۔۔ اسی پرانی ترکیب پر عمل کرنے سے ہمیں اس مسئلہ کا حل بھی  
ہو جائے گا۔ اور ہمارا جواب مختصراً یہ ہو گا کہ اگرچہ ان حالات میں بھی یہ کچھ  
بعید از قیاس اور تعجب کی بات نہ ہوگی کہ یہ لوگ اپنے کو آسودہ اور خوش  
پائیں، تاہم اگر ایسا نہ بھی ہو تو ہمارا مقصد اس ریاست کی ترتیب اور اس  
نظام کی تدوین میں خاص طور پر کسی ایک طبقہ کی خوشحالی کو ملحوظ رکھنا  
بلکہ جہاں تک ہو سکے پوری ریاست کو خوشحال بنانا ہی۔ کیونکہ ہمارا کہ  
کہ اسی قسم کی ریاست میں عدل و انصاف کے ملنے کی سب سے زیادہ  
کی جاسکتی ہے؛ برخلاف اس کے کسی غیر منظم ریاست میں نا انصافی کا  
قرین قیاس ہی چنانچہ ان دونوں قسم کی ریاستوں کو دیکھنے کے بعد ہم  
کے متعلق کوئی فیصلہ کر سکیں گے جس کی تحقیق میں ہم مشغول ہیں (یعنی)



انصاف کی ماہیت، فی الحال ہم خوشحال ریاست کی تنظیم کر رہے ہیں اور یہی کسی خاص طبیعت یا بعض ارکان کی خوشحالی کا خیال کر کے نہیں بلکہ تمام ریاست کو حیثیت مجموعی خوشحال بنا کر تھوڑی دیر میں ہم اسکے باکل متضاد نظام پر مشتمل ڈالیں گے۔ اچھا آپ ہی غور کیجئے کہ اگر ہم کسی صورت کو رنگ سے ہوں اور کوئی شخص ہمارے پاس لائے اور لگے ہمیں لزوم دینے کہ تم سب کو بصورت حصہ پر سب خوشنارنگ نہیں لگاتے چنانچہ دیکھو آنکھیں ہم کا حسین ترین حصہ ہیں لیکن تم نے بجائے خوشنارغوانی رنگ کے انھیں کالا رنگ دیا ہے تو کیا ایسے آدمی کے لیے یہ جواب کافی نہ ہوگا، کہ بھائی ہم آنکھوں کو اتنا خوبصورت نہیں بنانا چاہتی کہ وہ پھر آنکھیں نہ رہیں، نہ دوسرے اعضا کو اتنا خوشنما بنا سکتے ہیں کہ ان کی کھلی حیثیت ہی باقی نہ رہے۔ ہاں تم یہ دیکھو کہ ہر حصہ کو اس کا اصلی اور حقیقی رنگ دیکر ہم پورے مجسمہ کو خوبصورت بناتے ہیں یا نہیں، بعینہ اسی طرح آپ معاملہ زیر غور میں بھی ہمیں اس بات پر مجبور نہ کیجئے کہ ہم طبقہ محافظین کو اس قدر خوش حال بنا دیں کہ پھر وہ محافظ ہی باقی نہ رہیں، ورنہ پھر اسی اصول پر ہم سے یہ مطالبہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہمارے کسان لباس فاخرہ زیب تن کریں، ان کے سروں پر چھوٹے چھوٹے تاج ہوں، یہ جب چاہیں زمین جو تیں جب چاہیں نہ جو تیں ہمارے کھار آرام کر سیوں پر چین سے لیٹے مزے کریں، سانسے آگ جلتی ہو شہر کی بوتلیں رکھی ہوں اور ہاں ایک طرف چاک بھی پڑا ہو کہ جب ذرا جی چاہے اور



جتنی دیر ناگوار خاطر نہ ہو اس سے بھی ذرا مشغول کر لیا کریں۔ اور اسی قسم کے  
 آسائش ہم تمام دوسرے طبقوں کے لیے بھی فراہم کریں تاکہ اس طرح سے  
 کا شہر نہایت خوشحال ہو جائے۔ لیکن براہ نواز شش ہیں تو اس قسم کے  
 سے معاف ہی رکھے کیونکہ آپ کی نصیحت پر عمل کرنے کی صورت میں تو  
 کسان ہر گناہ کھار کھار اور نہ دوسرے پیشے والے جن کے مجموعے سے  
 عبارت ہے اپنی صحیح حالت قائم رکھ سکیں گے۔ اور پھر دوسرے پیشوں میں  
 چنداں ایسا نقصان بھی نہیں، مثلاً اگر جو تے بنانے والا اپنے کام میں ہوش  
 نہیں نا اہل ہو اور جس فن سے واقف نہیں اس کا مدعی ہو تو یہ ریاست کے  
 کوئی زیادہ خطرہ کی بات نہیں۔ لیکن اگر قانون اور ریاست کے محافظ صرف  
 میں محافظ ہوں اور حقیقت کچھ نہ ہو تو یہ تو سرے سے پوری کی پوری ریاست  
 کی تباہی کا باعث ہونگے، کیونکہ ہی لوگ تو ریاست میں عام مرفہ اچالی  
 پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ جہاں ہمارا مقصد حقیقی محافظین کا  
 طبقہ پیدا کرنا ہے جن میں ریاست کو نقصان پہنچانے کی کم سے کم صلاحیت  
 وہاں ہمارے فرضی معترض کے پیش نظر ہتقانوں کا ایک مجمع ہو جو کسی تعطل  
 سلسلہ میں خوشی سے جشن منارہے ہیں نہ کہ ایک ریاست کے شہری۔ ہمیں  
 دیکھنا چاہیے کہ طبقہ محافظین کی ترتیب میں ہمارا مقصد ان کے لیے زیادہ  
 زیادہ آرام و آسائش مہیا کرنا ہے، یا ہمارا فرض یہ ہے کہ یہ آرام و آسائش کل

کو بہ حیثیت مجموعی میسر ہو اور ہم محاطین اور ان کے مددگاروں کو اس امر کی ترغیب دیں یا ایسے مجبور کریں کہ وہ اپنے فرائض کو بہترین طریقے سے انجام دینے کے وسائل پر غور و فکر کرتے رہیں اور اسی طرح دوسرے پیشہ والوں کو بھی ترغیب دیں یا مجبور کریں تاکہ پورا شہر مردہ الحال اور منتظم ہو جائے اور پھر اس خوشحالی سے ہر طبقہ حسب مراتب اور قدر امکان فائدہ اٹھائے۔

ایڈ۔ میرے خیال میں آپ جو کچھ فرماتے ہیں بالکل صحیح ہے۔

میں :- نہ معلوم آپ اسی سے متعلق ایک دوسرے بیان کو بھی قابل پذیرائی سمجھیں گے یا نہیں؟

ایڈ۔ وہ کیا؟

میں :- ذرا یہ تو سوچئے کہ دو سکراہل حرفہ بھی ان چیزوں سے کیا اسی طرح متاثر ہوں گے؟

ایڈ۔ کن چیزوں سے؟

میں :- میرا مطلب وقت اور فلاس سے ہے۔

ایڈ۔ کس طرح؟

میں :- سنیئے بیوں۔ کیا آپ کے خیال میں مٹوں ہو جانے کے بعد کچھ اپنے

پر پہلی سی توجہ کرے گا؟

ایڈ۔ ہرگز نہیں۔



میں۔ پہلے سے زیادہ کاہل اور بڑا پروا ہو جائیگا؛

ایڈ۔۔ یقیناً۔

میں۔ یعنی بحیثیت مکھا رہنے سے بڑا ہو جائیگا؟

ایڈ۔۔ بہت بُرا۔

میں۔ برخلاف اس کے اگر غربت اور افلاس کے باعث وہ اپنے کام کے لیے آلات اور پیشہ کی دوسری ضروریات فراہم نہیں کر سکتا تو لازمی ہے کہ وہ اس کے درجہ کے برتن بنائے اور اس کے لڑکے اور دکان پر دوسرے کام کرنے والے پیشہ کی عمدہ تعلیم حاصل نہ کر سکیں۔

ایڈ۔۔ بلاشبہ

میں۔ یعنی یہ دونوں چیزیں دولت اور افلاس خود کار میکر اور اس کے مالک

بڑا بناتے ہیں۔

ایڈ۔۔ اور کیا۔

میں۔ گویا ہمیں پسند اور ایسی چیزوں کا علم ہو گیا جن پر ہمارے محافظوں کو غور و نظر نہ تھا۔ چاہیے تاکہ وہ نظر بچا کر کہیں ہمارے شہر میں داخل نہ ہوں۔

ایڈ۔۔ وہ کیا چیزیں ہیں؟

میں۔ یہی دولت اور افلاس۔ کیونکہ اگر اول الذکر سے تعیش کاہلی اور بے

سدا ہوتے ہر تو مؤخر الذکر بھی حکم ظانی، کمینہ بن، ہمنہ میں نقص اور تغیر کا باعث

ایڈیٹر بشک یہ درست ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ذرا یہ بھی تو سوچئے کہ  
 اگر ہمیں میدان جنگ میں کسی دوسرے شہر سے اور خصوصاً کسی مالدار اور زیادہ  
 آباد شہر سے مقابلہ کرنا پڑا تو دولت بغیر ہم کیا کر سکیں گے؟  
 میں :- ہاں، اگر اس قسم کا مخالف شہر ایک ہو تو تو البتہ اس سے جنگ کرنا  
 دشوار ہوگا لیکن اگر دو ہوئے تو پھر تو آسانی ہو جائیگی۔

ایڈیٹر :- یہ کیسے؟

میں :- سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر بالفرض ہمیں جنگ کرنی پڑی ہے  
 ہمارے مخالف مالدار لوگ ہوں گے وہاں ہماری امتیازی خصوصیت سپر ہوگی۔  
 ایڈیٹر :- یہاں تک تو بات بیشک صحیح ہے۔

میں :- تو پھر ایڈیٹر معین، کیا تمہیں اس بات کا یقین نہیں ہے کہ ایک شخص  
 جس نے گھونسا چلانے کی خوب تعلیم پائی ہو وہ نہایت آسانی کے ساتھ دو ایسے  
 موٹے اور مالدار آدمیوں سے لڑ سکتا ہے جو اس ہنر سے مکمل نااہل ہوں۔  
 ایڈیٹر :- دونوں سے ایک ہی وقت میں تو شاید مشکل ہو۔

میں :- کیوں؟ اگر وہ پہلے کچھ پالی دے اور جیسے ہی مخالفوں میں سے ایک  
 دوسرے سے ذرا آگے بڑھے اسے بس اس پر وار کرے اور اسے ریل سے اور اسی طرح  
 پچھلانی دھوپ میں چند مرتبہ کرے تو میں تو سمجھتا ہوں کہ دو کیا دو سے زیادہ مخالفوں  
 کو زیر کر لے گا۔



ایڈ۔ ہاں، اگر ایسا کر لے تو چنداں تعجب کی بات تو نہ ہوگی۔  
میں۔ اور فن حرب کے مقابلہ میں تو اُمرا، گھونسنہ بازی کے اصولوں  
اور اپنے عمل کرنے کے طریقوں سے پھر بھی زیادہ واقف ہوتے ہیں۔  
ایڈ۔ جی ہاں۔

میں۔ تو ظن غالب ہے کہ ہمارے سکھائے ہوئے سپاہیوں کو اپنے سے  
دو گنی یا تگنی تعداد کا مقابلہ کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوگی۔  
ایڈ۔ ہاں، میں مان گیا۔ آپ ہی صحیح فرماتے ہیں۔

میں۔ لیکن اس سے قطع نظر، فرض کرو کہ ہم ان دو حریفوں میں سے ایک  
کے پاس یہ سچا پیام کسی سفیر کے ہاتھ بھیجیں کہ ہم تو سیم و زر کا استعمال کرتے نہیں  
اور نہ اس کی ہمارے شہر میں اجازت ہے۔ ہاں آپ کہہ سکتے ہیں البتہ یہ جائز ہے اس لیے  
آپ اپنی افواج کو ہم سے لا ملائیے اور مخالفین کا تمام مال و ملک آپ کا ہو جائیگا  
تو آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اس اطلاع کے بعد کوئی شخص پسند کرے گا کہ وہ دُشمن اور خوفناک  
کتوں کے مخالف جنگ کرے اور ان کتوں کے ساتھ ہو کر موتی لیکن تازک بھیرو  
کا شکار نہ کرے؟

ایڈ۔ کوئی کیوں ایسا کرنے لگا۔ لیکن کیا فریق مخالف کی تمام دولت کا ایک  
شہر میں چلا جانا اس شہر کے لیے خطرہ کا باعث نہ ہوگا جو مالدار نہیں ہے؟  
میں۔ خوب! سبحان اللہ! میں جناب کو اس خیال پر مبارک باد دیتا ہوں

کہ آپ کسی ایسی چیز کو بھی ”شہر“ کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں جو ہمارے مرتبہ  
نظام کا پابند نہ ہو۔

ایڈ۔۔ کیوں، تو آپ پھر اسے کیا کہیں گے؟

میں :- اس کے لیے تو بھائی کوئی اور بڑا شاندار سا نام ہونا چاہیے کہ ان میں  
ہر ایک کئی شہروں کا مجموعہ ہی ایک شہر کہاں! ان میں کم سے کم دو شہر تو ضرور ہیں  
جو ایک دوسرے سے متخاصم ہیں یعنی ایک غریبوں کا شہر اور ایک امیروں کا۔ اور  
پھر ان میں بھی اور کئی کئی شہر ہیں۔ اگر آپ انہیں ایک شہر سمجھیں تو سخت غلطی ہوگی  
انہیں بالکل جدا جدا شہر تصور کر کے اگر آپ ایک طبقہ کو دوسرے کا مال متاع  
دیں گے تو ہمیشہ آپ کے دوست زیادہ ہونگے اور دشمن کم۔ اور میں تو خیال کرتا  
ہوں کہ جب تک آپ کے شہر میں سلیقہ کے ساتھ انہیں اصولوں پر حکومت ہوگی  
جو ہم نے ابھی مرتب کیے ہیں تو فی الحقیقت یہ بہت بڑا شہر ہوگا۔ میرا مقصد یہ ہے  
نہیں کہ یہ بڑے شہر کی حیثیت سے مشہور بھی ہوگا البتہ واقعاً بہت بڑا ہوگا چاہے  
اسکی فوج ہزار آدمیوں سے زیادہ پر مشتمل نہ ہو۔ کیونکہ آپ کو اتنا بڑا شہر نہ یونان  
میں ملیگا نہ اس کے باہر غیر تمدن مالک میں۔ اگرچہ اسے شہر ہی نہ کہیں گے جو بظاہر  
اس سے چند گونہ بڑے معلوم ہوتے ہوں۔ آپ اس معاملہ میں مجھ سے اختلاف  
تو نہیں کرتے؟

ایڈ۔۔ نہیں، مطلق نہیں۔



میں۔ اور یہی ہمارے حکمرانوں کے لیے رہایت کی وسعت کو متعین کرنا  
 معیار ہوگا۔ جس کے مطابق وہ رہایت کے لیے ایک مناسب قبضہ زمین مقرر  
 کرینگے اور اس کے باہر کسی اور چیز سے سروکار نہ رکھیں گے۔

ایڈ۔۔ وہ معیار کیا ہے؟

میں۔۔ یہی کہ جہاں تک شہر کی توسیع اُس کی وحدت یا اُسکے ایک شہر  
 میں شامل نہ ہو وہاں تک اُسے بڑھنے دیا جائے اُسکے آگے ہرگز نہیں۔

ایڈ۔۔ بیشک یہ قاعدہ ہی تو خوب۔

میں۔۔ تو پھر ہم اپنے محفظین پر یہ فرض اور عائد کریں گے کہ وہ اس امر کا  
 خیال رکھیں کہ شہر نہ تو بہت چھوٹا ہونہ دیکھنے میں بہت بڑا۔ بلکہ اس کی مقیاری  
 خصوصیت اسکی وحدت اور اسکا کافی بالذات ہونا ہو۔

ایڈ۔۔ یہ تو ایک معمولی سا فرض ہے جو اُنکے سپرد کیا جاسکتا ہے۔

میں۔۔ اسپر ہم ایک دوسرے اس سے بھی معمولی فرض کا اضافہ کریں گے جس کا  
 سرسری سا تذکرہ ہم اس وقت کر چکے ہیں جب اشنا گفتگو میں ہم نے کہا تھا کہ یہ مناسب  
 ہوگا کہ اگر طبقہ محفظین میں کوئی بچہ ادنیٰ قسم کا پیدا ہو تو اسے نیچے کسی دوسرے طبقہ میں بھیجا  
 جائے اور نیچے کے طبقوں میں اگر کوئی غیر معمولی خوبی کا بچہ پیدا ہو تو اُسے طبقہ محفظین  
 میں جگہ دیجائے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے شہروں کو بھی اس کام پر لگانا چاہیے  
 جسکے لیے قدرت نے انھیں بنایا ہے؛ یعنی ہر شہری کو کوئی ایک کام دیا جاتا کہ ہر ایک

پنے مخصوص کام کو انجام دے اور اس طرح ایک انسان بنے نہ کہ چند اور پھران کی  
 مجموعی مساعی سے جو شہر پیدا ہو وہ ایک شہر ہو نہ کہ کئی شہروں کا مجموعہ۔

ایڈ:- ہاں، یہ پہلے سے بھی زیادہ معمولی فرض ہے۔

میں:- بیشک، ہماری ان ہدایات و احکام پر عمل کرنا کوئی دشوار کام نہیں،  
 جیسا ممکن ہے کہ بعض لوگ خیال کریں۔ بلکہ اگر ہمارے محافظین ایک اہم بات کو ہر  
 وقت پیش نظر رکھیں تو یہ تو نہایت معمولی باتیں ہو جائیں گی۔

ایڈ:- وہ بات کیا ہے؟

میں:- تعلیم اور تربیت۔ کیونکہ اگر اچھی تعلیم دیکرائیں سمجھدار انسان بنا دیا  
 جائے تو پھر وہ آسانی سے ان تمام مسائل کا حل معلوم کر سکیں گے جنکا ہم نے تذکرہ  
 کیا ہے یا جنہیں ہم نے فی الحال نظر انداز کر دیا ہے؛ مثلاً مرد اور عورت کے تعلقات،  
 ازدواج، اور والد و تناسل، جن سب میں حتی الوسع اس مقولہ کا خیال رکھنا چاہیے  
 کہ ”دوستوں میں تمام چیزیں مشترک ہوتی ہیں۔“

ایڈ:- جی ہاں، یہ سب سے بہتر تدبیر ہے۔

میں:- اور سچ یہ ہے کہ جب مایست کی ابتدا ایک مرتبہ صحیح طریقہ پر ہو گئی تو پھر  
 یہ جیسے جیسے بڑھتی ہے اس سے ایک نئی دوار کا ظور ہوتا ہے۔ تعلیم و تربیت کے طریقہ  
 حسنہ پر عامل ہونے سے اچھی طبائع پیدا ہوتی ہیں اور اچھی طبائع اس عمدہ تعلیم کی مدد  
 سے اور بھی بہتر بن جاتی ہیں اور دوسرے حیوانوں کی طرح منجملہ اور صفات کے صفت



توالد میں بھی ترقی ہوتی ہے۔

ایڈ۔ بشیک، یہ تو قدرتی بات ہے۔

میں۔ چنانچہ مختصر آریاست کے نگراؤں کا ذہن ہو گا کہ وہ اس اصول کی سختی سے پابندی کریں اور بلا اپنے علم کے اس میں کوئی تبدیلی نہ ہونے دیں، بلکہ ہر دوسری چیز کے مقابلہ میں اس کی حفاظت کریں اور وہ اصول یہ ہے کہ تعلیم کی ہر دو اصناف و ریشہ اور موسیقی کے موجودہ مقرر کردہ نظام میں کوئی تجدید یا ترمیم روانہ نہیں بلکہ اسی پر سختی سے کار بند رہیں۔ لہذا جب یہ کہا جائے کہ لوگ اس گیت پر سب سے زیادہ توجہ کرتے ہیں جو بالکل نیا ہو اور جس کی موسیقی معنی پر چھا جاتی ہو تو اندیشہ ہے کہ لوگ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ شاعر کا مفہوم صرف نئے گیتوں سے ہی نہیں بلکہ جدید طریقہ موسیقی سے بھی ہے اور اس میں بھی جدت قابل تعریف بات ہے۔ حالانکہ اس میں جدت ہرگز قابل تحسین نہیں اور نہ ان الفاظ کا یہ مفہوم ہے۔ موسیقی کے نئے طریقوں کے اجراء سے تو سخت پرہیز کرنا چاہیے کہ اس سے ریاست کا وجود ہی معرض خطر میں آجاتا ہے، کیونکہ اس میں تجدید و تبدل ہم ترین سیاسی نظامات کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ کم سے کم ”ڈیمون“ کا یہی خیال ہے اور میں اس پر یقین کرتا ہوں۔

ایڈ۔ میرا شمار بھی اس خیال کے مؤیدین میں کیجئے۔

میں۔ جہاں تک میں دیکھ سکتا ہوں، یہ موسیقی ہی وہ نقطہ ہے جہاں ہمارے محافظین کو اپنے حفاظت غائیہ کی تعمیر کرنی چاہیے۔

ایڈ :- ہاں، کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں سے بے آئینی خاموش اور غیر محسوس طریقے سے داخل ہوتی ہے۔

میں :- ہاں، شروفساڈ کا گمان بھی نہیں ہوتا اور یہ تفریح کے جلسے میں آجاتا ہے۔

ایڈ :- اور شروفساڈ بیا بھی کیا کرتی ہے! صرف یہ کہ جہاں ذرا قدم جمایا کہ بس لگی رفتہ رفتہ خاموشی سے لوگوں کے رسوم و اطوار پر اثر ڈالنے اور اس طرح قوت پکڑ کر باہمی معاہدوں میں اپنا ظہور کرنے۔ پھر کیا ہے، اب تو اسکا حملہ قانون ملکی و اساسی پر اس حد یہ دلیری سے شروع ہوتا ہے کہ انجام کار ہر چیز خواہ جماعتی ہو خواہ شخصی ایک مرتبہ درہم برہم ہو جاتی ہے۔

میں :- سچ کہتے ہو، یہ ایسی ہی چیز ہے۔

ایڈ :- میں تو یہی سمجھتا ہوں۔

میں :- لہذا کیا ہمیں اس امر کا انتظام بھی نہ کرنا چاہیے کہ شروع ہی سے ہمارے بچوں کی تفریح جائز حدود سے باہر نہ ہونے پائے کیونکہ جہاں ایک مرتبہ بچوں کو ناجائز تفریحوں کا لپکا پڑ گیا بس پھر ناممکن ہو جاتا ہے کہ یہ بڑے ہو کر نیک اور وفادار آدمی بن سکیں۔

ایڈ :- بلاشبہ۔

میں :- اور اگر شروع ہی سے موسیقی کے ذریعہ بچوں کے دماغ میں وفاداری کے خیالات جاگزیں ہو جائیں تو نتیجہ اس کے بالکل برعکس ہوگا۔ یہ وفاداری انکی



ترقی کا باعث ہوگی، اُس کا ظہور اُن کے بر عمل میں ہوگا اور اگر ریاست کے نظامات میں سے کوئی بضر محال ضائع بھی ہو جائے تو انکا یہ جذبہ اُسے از سر نو پیدا کر دے گا۔

ایڈ۔ بیشک یہ بالکل سچ ہے۔

میں :- اور ان لوگوں کی نظر ان چھوٹے چھوٹے اخلاق و آداب بھی ضرور رہیگی جنہیں دوسروں نے جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں پس پشت ڈال دیا ہے۔  
ایڈ :- آپ کا مطلب کن آداب سے ہے؟

میں :- مثلاً بزرگوں کی موجودگی میں خوردوں کا متانت اور خاموشی سے بٹھینا، جب وہ اُٹھ کر اُن کی تعظیم کرنا، جھک کر آداب بجالانا، والدین کا ہر طرح خیال رکھنا، یا مثلاً سر کے بال ٹھیک بنانا، جوئے پکڑے اور ذاتی آرائش کا مناسب خیال کرنا وغیرہ۔ کیوں بھائی، ٹھیک ہے نا؟

ایڈ :- جی ہاں۔

میں :- لیکن ان باتوں کے متعلق قانون بنانا تو احمقانہ سی بات ہوگی، میں تو جانتا ہوں کہ ایسا ہوتا نہیں اور نہ میرے خیال میں ان اُمور کی بابت کوئی قانون کچھ پائدا ثابت ہو سکتا ہے۔

ایڈ :- بیشک ایسے ہو سکتا ہے؟

میں :- البتہ تعلیم کے ذریعہ جو رجحان پیدا کر دیا جائے وہ ان تمام چیزوں پر

موت ہو تا ہی، کیونکہ اچھی چیز اچھی کو اور بُری بُری کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔  
ایڈ۔ یقیناً۔

میں۔ چنانچہ میرے خیال میں ہمیں توقع کرنی چاہیے کہ جو نظام ہم نے  
مرتب کیا ہے اس سے کوئی کمال اور مہتمم با نشان نتیجہ ضرور مترب ہوگا، خواہ یہ نتیجہ  
اچھا ہو یا بُرا۔

ایڈ۔ بیشک۔

میں۔ اسی وجہ سے میں متذکرہ امور کے متعلق قوانین کی ترقیب ضروری  
نہیں سمجھتا۔

ایڈ۔ اور یہی قرین عقل ہے۔

میں۔ لیکن کچھ اور معاملات بھی تو ہیں انکے متعلق کیا رائے ہے؟ مثلاً  
بازار میں لوگوں کی باتیں، لین دین، یا اہل حرفہ کے باہمی معاہدات کسی پر اہتمام  
نکلنے یا حملہ کر دینے کے متعلق قانونی چارہ جوئی یا فہرست و کلاں کی تدوین، یا  
مجال سرکاری کا مسئلہ، یا بازار یا بندرگاہ پر جنگی لینے کا سوال اور بازار پویا  
اور جنگی وغیرہ کے تمام قواعد و ضوابط۔ کیا ہمیں ان سارے معاملوں کے متعلق  
بھی قانون تیار کرنا چاہیے؟

ایڈ۔ نہیں۔ میرے خیال میں تو نیک اور تعلیم یافتہ آدمیوں کو ان امور  
کے متعلق ہدایات دینا محض تضرع وقت ہے، کیونکہ اکثر و بیشتر ان لوگوں کو صحیح قانون



کے خود معلوم کر لینے میں کوئی دقت نہ پڑے گی۔

میں :- ہاں۔ بشرطیکہ خدا ان کو ان قوانین کی پابندی کی توفیق عطا فرمائے جو ہم بنا چکے ہیں۔

ایڈ :- ورنہ بصورت دیگر تکمیل قانون کے لیے یہ لوگ اپنی ساری عمر جدید قوانین نافذ کرنے اور ان میں نئی نئی ترمیمیں کرنے میں صرف کر دیں گے۔

میں :- آپ کے خیال میں ان کی مثال ان لوگوں کی سی ہوگی جو اگرچہ بیمار ہیں لیکن اپنے نفس پر قابو نہ رکھنے کے باعث ایک مضر صحت طریقہ زندگی کو ترک نہیں کر سکتے۔

ایڈ :- جی، انکی مثال بس بعینہ ہی ہے۔

میں :- اور سبحان اللہ، یہ لوگ زندگی بھی کیا خوب بسر کرتے ہیں، ہمیشہ طبیعوں کے تختہ مشق ہیں، لیکن فائدہ کا تو ذکر ہی کیا اپنے امراض کو اور زیادہ شدید اور پیچیدہ بنا لیتے ہیں، البتہ یہ اس ہمیشہ لگی رہتی ہے کہ کوئی تو کبھی ایسی دوا بتا ہی دے گا جس سے شفا رکلی حاصل ہو جائے گی۔

ایڈ :- جی ہاں، ان مریضوں کی تو یہی حالت ہوتی ہے۔

میں :- اور لطف یہ کہ یہ لوگ ہر اس شخص کو اپنا دشمن جانتے ہیں جو انھیں حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا اور انھیں یقین دلاتا ہے کہ جب تک آپ اپنی شراب خواری عیاشی، پرخوری، اور کاہلی نہ چھوڑیں گے اس وقت تک نہ کوئی دوا کام لے سکتی ہے، نہ

نہ تیزابوں کا استعمال اور جراحی اور نہ چھاڑ پھونکا اور گنڈے ٹھونڈے سے کام چسکتا ہے۔

ایڈ۔ اس میں کیا لطف ہے کہ ایک آدمی تو آپ کو بھی نصیحت کر رہا ہے اور آپ ہیں کہ خفا ہوئے جاتے ہیں!

میں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایسے لوگوں کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے؟  
ایڈ۔ نہیں، ہرگز نہیں دیکھتا۔

میں۔ لہذا اگر سارا شہر کا شہرا نہیں لوگوں کی طرح کاربند ہو تو یہ بھی آپ پسند نہ کریں گے، اور کیا افراد کی طرح ریاستیں بھی اس مرض میں مبتلا نہیں ہوتیں کہ باوجود اپنے قانون اساسی کی خرابی اور اس کے نقائص کے یہ اپنی رعایا کو ایسے چھیننے اور تبدیل کرنے سے روکتی ہیں، اور اگر کوئی ایسی کوشش کرے تو اسے سزا موت دیجانی ہے۔ ہاں، وہ شخص بہت نہایت اچھا، عقلمند اور قابل عزت احترام سمجھا جاتا ہے جو موجود نظام کے ماتحت وہ کرانکی خدمت انجام دے، اور خوشامد درآمد اور ذلیل طریقوں سے انکی خوشنودی حاصل کرے، انکی خواہشوں کو پہلے سے مٹا لے اور انھیں پورا کرنے کی قابلیت بھی رکھتا ہو۔

ایڈ۔ بیشک میں تو ان دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں دیکھتا اور نہ اس طرز عمل کو قابل پسندیدگی سمجھتا ہوں۔

میں۔ اور کیا ان لوگوں کی ہمت اور ہوشیاری قابل داد نہیں جو اپنی



ریاستوں کی خدمت کے لیے آمادہ بلکہ اسکے متمنی رہتے ہیں۔

ایڈ۔ ہاں، ہوگی۔ لیکن ان لوگوں کی نہیں جو بہت سے آدمیوں سے اپنی تعریف سنکر خود اس دھوکہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ یہ واقعاً نہایت عقلمند مڈبر ہیں۔ ارے کیوں، بھائی تم کیا کہتے ہو۔ ان بیچاروں پر ظلم نہ کرو۔ تمہارے خیال میں اگر ایک شخص جو پمپائش کے متعلق ایک حرف نہیں جانتا اور اسی جیسے بہت سے جاہل لوگ اس سے کہتے ہیں کہ تم دو گز اوپٹے ہو تو کیسے ممکن ہے کہ وہ انپریٹین نہ کرے۔

ایڈ۔ جی ہاں، یہ تو ممکن نہیں۔

میں۔ تو پھر ان غریبوں سے کیوں خفا ہوتے ہو؟ یہ تو بڑے دلچسپ لوگ ہیں؛ جو اس خیال میں مگن ہیں کہ اُمور مذکورہ کے متعلق اپنی دائمی قانون سازی اور ترمیموں سے یہ ان بے ایمانیوں کا سبب کر سکیں گے جو معاہدوں میں آئے دن کیجاتی ہیں، اور ان دوسری شکلوں کا حال بھی معلوم کر لینگے جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ یہ بیچارے یہ نہیں سوچتے کہ فی الحقیقت ایک ہزار روپے والے جانور کے سر کاٹنے کی سعی لاحاصل میں مشغول ہیں۔

ایڈ۔ بیشک، انکا مشغل اس سے زیادہ نتیجہ خیز نہیں۔

میں۔ اور میں تو ایک حقیقی قانون ساز کا خواہ وہ بُری ریاست میں ہو یا اچھی میں ہرگز یہ فرض نہیں سمجھتا کہ وہ قانون و حکومت کے شعبوں کے متعلق

پہنا سہر کھپاے، کیونکہ اول الذکر صورت میں تو یہ سارے صواب اور سہرا سہرے سوہنے  
اور مؤخر الذکر حالت میں ہر شخص بعض قواعد خود معلوم کر لے گا اور بعض خود بخود نیا  
تعلیم کی وجہ سے مشکف ہو جائیں گے۔

ایڈ۔۔ تو اب بحیثیت قانون ساز کے ہمارے لیے کیا کام باقی رہا؟  
میں۔۔ ہمارے لیے تو کچھ باقی نہیں رہا۔ لیکن "یعنی اپلو کے لیے قانون  
سازی کا سب سے اہم اور سب سے عمدہ اور سب سے زیادہ متم با نشان کام باقی ہے۔  
ایڈ۔۔ وہ کیا ہے؟

میں۔۔ عبادت گاہوں کی تعمیر، قربانیوں اور دیوتاؤں اور مشاہیر کے  
متعلق دیگر رسم کا تعین، مردوں کے جلائے کے طریقہ، اور ان تمام رسوم کے  
متعلق ہدایات جن کا اختیار کرنا ساکنان عالم بالاک کی خوشنودی کے لیے ضروری  
ہے۔ یہ سب ایسی باتیں ہیں کہ ہم ان کے متعلق کچھ نہیں جانتے اور اپنے نظام حکومت  
کی ترقیب میں ان معاملات کی بابت ہمیں سولے اپنے قدیم قومی ترجمان کے اور  
کسی کی نصیحت یا مشورہ پر کاربند نہ ہونا چاہیے؛ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ  
دیوتا ہی جو مرکز ارضی سے اپنے آدمفلوس کے پر جلال تخت پر بیٹھا ہوا تمام  
اس قسم کے معاملات پر ہماری قوم کے تمام افراد کے فرائض کی ترجمانی کرتا ہے۔  
ایڈ۔۔ آپ بالکل صحیح ارشاد فرماتے ہیں بیشک یہی کرنا چاہیے۔  
میں۔۔ اچھا تو، ابن ارسطو، اب ہماری رہایت کی تنظیم مکمل ہو گئی،



چنانچہ تمہارا دوسرا فرض اب یہ ہے کہ ڈور و بصیرت کا کچھ سرمایہ ساتھ لیکر، اور اپنی بھانجی اور پالیما آرکس وغیرہ کی مدد سے اس جستجو میں لگ جاؤ کہ اس ریاست میں عدل و انصاف کہاں ہے اور ظلم و نا انصافی کہاں؛ تاکہ دونوں کا فرق معلوم ہو جائے اور یہ ظاہر ہو سکے کہ اگر کوئی آدمی خوشی و رسترت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے ان میں سے کس چیز کی ضرورت ہوگی اور یہ کہ آیا اس حقیقت سے تمام دیوتا اور انسان آگاہ بھی ہیں؟

گلاکن :- جی نہیں، یوں کام نہیں چلیگا۔ یہ جستجو تو آپ نے اپنے ذمہ لی تھی اور یہ فرمایا تھا کہ اگر میں نے عدل و انصاف کی حتی الوسع مدد نہ کی تو میں ایک گناہ کا مرتکب ہوں گا۔

میں :- ہاں، سچ ہے۔ مجھے یاد ہے میں نے یہ کہا تھا اور میں اس کے لیے تیار ہوں۔ ہاں، ذرا آپ لوگ بھی مدد فرمائیں۔

گ :- ہاں، حاضر ہیں۔

میں :- پھر تو مجھے امید ہے کہ ہم جس چیز کی تلاش میں ہیں اس کا پتہ ضرور لگا لیں گے۔ اچھا، سنیے۔ چونکہ ہم نے اپنی ریاست کی بالکل صحیح تنظیم کی ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ یہ درجہ اتم ایک عمدہ ریاست ہوگی۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

گ :- ہونا تو چاہیے۔

میں :- یعنی بہ الفاظ دیگر یہ ریاست ذی عقل و حکیم، باہمت و شجاع،

ضابطہ نفس و عیفت اور منصف و عامل ہوگی (کہ اچھائی انہیں چار صفات سے

عبارت ہے)

گ :- بیشک ۔

میں :- چنانچہ ان چار صفات میں اگر ہم چند کا پتہ ریاست میں لگالیں  
تو باقی ماندہ دوسری صفات پر مشتمل ہوگا۔

گ :- یقیناً ۔

میں :- فرض کیجئے کہ کوئی اور چیز چار شیا پر مشتمل ہوتی اور ہم ان میں  
کسی ایک کے متلاشی ہوتے، تو اس وقت دو صورتیں ممکن تھیں؛ یعنی یا تو یہ چیز  
ہمیں دوسرے تین اجزاء سے پہلے معلوم ہو جاتی اور ہم مطمئن ہو جاتے، یا پھر ہم ان  
تین کو پہلے معلوم کر لیتے تو شے مطلوبہ بخود بخود معلوم ہو جاتی، اس لیے کہ وہ سوا  
باقی ماندہ کے اور کیا ہو سکتی ہے؟

گ :- آپ صحیح فرماتے ہیں۔

میں :- تو پھر معاملہ زیر تحقیق میں کہ اس میں بھی چار صفات زیر بحث ہیں،  
ہم کیوں یہی طریقہ اختیار کریں؟

گ :- ضرور کرنا چاہئے۔

میں :- اچھا، تو شروع کیجئے۔ پہلی صفت تو آسانی سے دکھائی دیتی ہے،

لیکن اسی سلسلہ میں ایک عجیب بات پیش نظر آتی ہے۔



گ :- وہ کیا ہے

میں :- دیکھیے، ہماری ریاست اسی حد تک یا اسی لیے تو عقلمند و حکیم ہے،

کہ وہ محتاط اور دور اندیش ہے۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- اور یہ دور اندیشی اور احتیاط کی صفت بجائے خود ایک قسم کا علم ہے،

کیونکہ لوگ جہل سے ارادۂ محتاط اور دور اندیش نہیں بنتے بلکہ علم سے۔

گ :- ظاہر ہے۔

میں :- لیکن ہماری ریاست میں تو بہت سے مختلف اقسام کے علم ہیں۔

گ :- بیشک۔

میں :- تو کیا ہماری ریاست اپنے نجاروں کے علم کی وجہ سے عقلمند یا دور

اندیش و محتاط کہلا سکی۔

گ :- ہرگز نہیں۔ کیونکہ اس علم کی وجہ سے تو یہ فن نجاری کے اعتبار سے

عمدہ خیال کی جاے گی۔

میں :- ہاں، تو پھر کیا لکڑی کی جہاز سازی کے متعلق جس علم سے کام لیا جاتا

ہی اس کا وجود ہماری ریاست کو عقلمند کے لقب کا مستحق کر دے گا۔

گ :- ہرگز نہیں۔

میں :- تو شاید آہنی جہازوں کی تعمیر کا علم یا اسی قسم کی اور کوئی چیز یہ ہتھیار

بخشدے گی؟

گ۔۔ نہ یہ بخش سکتی ہونہ وہ۔

میں۔۔ اسی طرح فنِ زراعت کا علم ہمیں اسکا مستحق کر دینا چاہئے کہ ہم اپنی ریاست کو ایک عمدہ زراعتی ریاست کہہ سکیں لیکن اسے اس بنا پر عقلمند نہیں کہہ سکیں گے کہ ہمیشہ۔

میں۔۔ تو پھر بتائیے کہ ہماری اس نئی ریاست میں کوئی اصنافِ علم ایسی بھی ہے جو شہریوں کے ایسے طبقہ میں پائی جاتی ہو جو ریاست کے کسی جزو تک اپنی کارروائی محدود نہ رکھتا ہو بلکہ اس کے پیش نظر ریاست من حیث الریاست ہو اور اس نکل کے داخلی اور خارجی تعلقات با حسن و جوہ ترتیب دیتا ہو۔

گ۔۔ بیشک ہے۔

میں۔۔ وہ علم کون سا ہے اور کن لوگوں میں پایا جاتا ہے۔  
گ۔۔ وہ علم ہے ہمارا علم تحفظِ ذاتی، اور وہ اس حکمران جماعت میں پایا جاتا ہے جسے ہم نے جماعتِ محافظین کے نام سے موسوم کیا ہے۔  
میں۔۔ اس علم کے وجود کی وجہ سے آپ ریاست کو کیا کہتے ہیں۔  
گ۔۔ میں اسے محتاط، دوراندیش اور عقلمند کہتا ہوں۔

میں۔۔ اچھا اب فرمائیے کہ ہماری ریاست میں یہ طبقہ زیادہ تعداد میں

ہوگا یا گھٹیرے؟



گ۔ ٹھٹیرے کہیں زیادہ ہوں گے۔

میں :- تو کیا اور سب طبقوں کے مقابلہ میں جو دیگر علوم و فنون کے چاننے کی وجہ سے مختلف ناموں سے موسوم ہوتے ہیں یہ محافظین کا طبقہ تعداد میں کم ہوگا؟

گ :- ہاں، یہ سب سے قلیل التعداد ہوگا۔

میں :- یعنی وہ سب سے چھوٹے گروہ یعنی طبقہ حکمران کا علم ہوتا ہے جو کسی ریاست کو جو مطابق فطرت مرتب کی گئی ہو مجموعی حیثیت سے عقلمند کہلائے جائیگا مستحق بناتا ہے اور وہ جماعتِ ریاست میں سب سے قلیل التعداد و جماعت ہے جس کا حق اور فرض اس علم سے کام لینا ہے جو تمام دوسرے علوم کے مقابلہ میں حقیقی عقلمندی کہلایا جاسکتا ہے۔

گ :- بیشک۔

میں :- اچھا تو ہم نے کسی نہ کسی طرح بمخملہ چار کے ایک صفت کا پتہ تو

لگا لیا اور نیز اس جزو ریاست کا جہاں یہ جاگزیں ہے۔

گ :- میرے خیال میں تو ٹھیک پتہ چلا لیا ہے۔

میں :- یہی طرح یقیناً ہمت اور شجاعت کی صفت کا پتہ لگانا بھی چنداں

مشکل نہ ہوگا، جس کی موجودگی ریاست کو شجاع و بہادر کہلانے کا مستحق کرتی ہے

اور نہ ریاست کے اس حصہ کے معلوم کرنے میں کچھ دشواری ہوگی جس میں یہ صفت

پائی جاتی ہے۔

گ :- یہ کیسے؟

میں :- کسی شہر کی بزدلی یا بہادری پر رائے دیشکے لیے سوچو اس طبقے کے جو اسکی حفاظت کے لیے جنگ کرتا اور اُس کی جانب سے میدان میں آتا ہے اور کسی طبقہ کو کوئی کیوں دیکھنے لگا۔

گ :- بیشک۔

میں :- اور اسی وجہ سے میں خیال کرتا ہوں کہ ریاست کی بزدلی یا بہادری دو کے طبقوں کے ساتھ لازماً وابستہ نہیں۔

گ :- جی ہاں، نہیں ہے۔

میں :- لہذا کسی شہر کی شجاعت اور بہادری عقلمندی کی طرح اُس کے ایک حصہ کی صفات پر مبنی ہے، کیونکہ اس حصہ میں ایسی قوت ہے کہ لوگوں میں ان چیزوں کے متعلق صحیح خیالات کو ہمیشہ بے خلل قائم و محفوظ رکھتا ہے جسے لوگوں کو ڈرنا چاہیے اور لوگوں کو اس امر کی تعلیم بھی دیتا ہے کہ یہ چیزیں دراصل ویسی ہی ہیں جیسی کہ مجوزہ نظام تعلیم میں قانون ساز جماعت نے ظاہر کیا ہے۔ اور کیا ہی کام بہادری و شجاعت نہیں؟

گ :- میں ٹھیک سمجھا نہیں، ذرا مرہابی فرما کر دوہرا دیجئے۔

میں :- میں کہتا ہوں کہ بہادری ایک طرح کی حفاظت ہے۔



گ۔ کس قسم کی حفاظت؟

میں۔ اس خیال کی حفاظت جو قانون نے تعلیم کے ذریعہ اشیاء کے قابل خوف یا ناقابل خوف ہونے کے متعلق پیدا کیا ہے۔ اور جب میں نے اس خیال کے بلا خلل اور بالنتوا ترقیام کا ذکر کیا تو میرا مقصد یہ تھا کہ یہ خیال راحت و اطمینان، آرزو اور خوف کی متخالف کیفیتوں میں برابر پورے طور پر قائم رہے اور اسے کبھی ہاتھ سے نہ دیا جائے۔ آپ چاہیں تو میں اسے ایک بر محل تمثیل سے زیادہ واضح کر دوں؟

گ۔ ضرور۔

میں۔ آپ جانتے ہیں کہ جب نگر نگرانوں کو ارغوانی رنگنا چاہتا ہے تو ان کی بہت سی قسموں میں سے ایک قسم یعنی سفیدن لیتا ہے، اور پھر بہت سے ابتدائی مراحل طر کرتا ہے تاکہ اسپر رنگ چوٹھا چڑھے۔ اس سب عمل کے بعد اسے رنگنا شروع کرتا ہے اور جب اس طرح اون رنگا جائے تو اس کا رنگ پختہ ہوتا ہے اور چاہے بلا صابون کے دھوئے چاہے صابون سے رگڑیے اس رنگ کی چمک کم نہیں ہوتی، اور ایسا نہیں کیا جاتا تو نتیجہ ظاہر ہے۔

گ۔ ہاں، ورنہ رنگ کچھ عجیب بڑی طرح اتر جاتا ہے۔

میں۔ اس سے آپ سمجھ گئے ہونگے کہ ہم اپنے سپاہیوں کے انتخاب اور انہیں ورزش اور موسیقی کی تعلیم دینے میں اس قدر محنت و جانفشانی کیوں کر رہے ہیں؟

ہم چاہتے تھے کہ ان پر قوانین کا رنگ چڑھائیں تاکہ فطری جوہر قابل اور عمدہ تعلیم سے قابل خوف اشیاء و نیز دیگر معاملات کے متعلق ان کے خیالات نچوڑے اور اہمیت ہو جائیں اور یہ رنگ استراحت، آرام، الم و تکلیف، خوف و آرزو جیسی رنگ کاٹنے والی چیزوں سے بھی نہ بڑھل سکے کہ یہ چیزیں اس امر میں اچھے سے اچھے کھارا اور صابون سے زیادہ موثر ہوتی ہیں۔ میں اسی وقت کو جو قابل خوف اور ناقابل خوف اشیاء کے متعلق صحیح اور آئینی خیالات کو محفوظ رکھتی ہی ہمت اور جرأت سے تعبیر کرتا ہوں اور آپ معترض نہ ہوں تو اسی نام سے اسے موسوم کروں۔

گ۔۔ نہیں، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان معاملات کے متعلق صحیح رائے اگر بلا تعلیم کے قائم بھی ہو جائے جیسے حیوانوں اور غلاموں میں تو آپ اسے جائز متصور نہ فرمائیں گے اور اس کے لیے کوئی اور نام تجویز کریں گے۔ میں :- بلاشبہ۔

گ۔۔ تو پھر میں ہمت اور جرأت کی یہ تعریف قبول کرتا ہوں۔ میں :- کم سے کم شہریوں کی شجاعت و ہمت کی تعریف تو اسی کو سمجھئے کسی آئندہ موقع پر اس معاملہ پر اور تفصیل سے گفتگو کریں گے، اس وقت تو ہمارا اصلی مقصد انصاف کی ماہیت دریافت کرنا ہے اور اس غرض کے لیے ہم نے بس شجاعت و ہمت کی کافی تحقیق کر لی۔



گ :- بیشک آپ کا ارشاد بجا ہے۔

میں :- اب دو چیزیں باقی رہیں جن کا سراغ رہا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ انصاف اور انصافیت کا سبب ہے۔  
گ :- جی ہاں۔

میں :- اگر ہم عفت کے متعلق پریشان نہ ہوں تو کیا طریقہ ہے کہ انصاف کی حقیقت معلوم کر لیں؟

گ :- میرے علم میں تو کوئی ایسا طریقہ ہی نہیں اور نہ میں چاہتا ہوں کہ بلا عفت کی حقیقت معلوم کیے انصاف کی ماہیت کا انکشاف ہو جائے۔ لہذا اگر آپ مجھے ممنون کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اسی کو لیجئے۔

میں :- کیوں نہیں مجھے آپ کی خاطر ضرور منظور ہے۔

گ :- اچھا تو شروع کیجئے۔

میں :- بہت مناسب۔ میرے خیال میں عفت میں بہت ساری صفات کے تناسب توازن کی شکل زیادہ پائی جاتی ہے۔

گ :- کیسے؟

میں :- عرف عام میں عفت شہوات و خواہشات نفسانی پر قابو اور غلبہ کا نام ہے۔ مثلاً لوگ عام بول چال میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص کو اپنے اوپر کیسا قابو ہے اور اسی قسم کے دوسرے محاوروں میں اس خیال کا اثر چھلکتا ہے۔

گ۔ بیشک۔

میں۔ لیکن یہ محاورہ ”اپنے اوپر قابو ہونا“ کیسا تسخرا نگیز ہے۔ جس شخص کو اپنے پر قابو ہو وہ اگر اپنا آقا ہے تو خود ہی غلام بھی ہے اور پھر غلام ہی آقا ہے کیونکہ ان تمام صفتوں کا مورد تو اسی کی ذات ہے۔  
گ۔ اور کیا۔

میں۔ میرے خیال میں اس کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود انسان میں یعنی اس کی روح میں مختلف اجزاء ہیں، ایک اچھا اور ایک برا اور جب یہ فطری جزو خیر جزو سود پر غالب ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ انسان کو اپنے اوپر قابو ہے اور ایسا کہنے سے گویا اس شخص کی تعریف مقصود ہوتی ہے، لیکن جب ناقص تعلیم یا بری صحبت کے باعث اس جزو خیر کی قوت اجزاء سود کے کثیر التغدد ہونے کی وجہ سے مغلوب ہو جاتی ہے تو ایسے آدمی کو برائی اور ملامت کے الفاظ سے یاد کرتے اور اسے آوارہ اور نفس کا غلام کہتے ہیں۔

گ۔ ہاں، بات تو قرین قیاس ہے۔

میں۔ اب اپنی نظر اس نئی رہایت پر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ مذکورہ دو صورتوں میں سے ایک اس میں بھی پائی جاتی ہے اور اگر عفت و رافت دار علی نفس کے معنی ہی ہیں کہ اچھا جزو برے پر غالب اور حاکم ہو تو یقیناً ہماری رہایت کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ اسے اپنے نفس پر قابو ہے۔



گ۔۔ جی، میں نے نظر ڈال لی اور آپ کے بیان کی تصدیق کرتا ہوں۔  
 میں۔۔ آپ غالباً یہ بھی مان لیں گے کہ یہ شہوات و آلام اور آرزوئیں  
 جو نت نئی شکل اختیار کرتی ہیں عموماً بچوں، عورتوں، نوکروں، اور برائے  
 نام آزا و شخصوں میں سے باکل غیر تعلیم یافتہ اور ناتراشیدہ لوگوں میں پائی  
 جائیں گی۔

گ۔۔ بیشک۔

میں۔۔ برخلاف اسکے وہ سادہ اور معتدل خواہشیں جو عقل سلیم اور خیالات  
 صحیحہ کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں و جن کی رہنمائی براہ عقل کرتی رہتی ہے عموماً  
 اس قلیل تعداد گروہ میں پائی جاتی ہیں جنہیں قدرت کی طرف سے بھی تہذیب  
 جو ہر ودیعت ہو اور پھر عمدہ تعلیم اس سونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہے۔  
 گ۔۔ بیشک۔

میں۔۔ کیا اسی کے مماثل کیفیت ہمارے ریاست میں موجود نہیں جہاں  
 کثیر التعداد عوام کی خواہشات پر قلیل التعداد تعلیم یافتہ جماعت کی خواہشیں  
 اور ان کی عقل غالب ہے۔  
 گ۔۔ جی، موجود ہے۔

میں۔۔ پس اگر کسی ریاست کی بابت کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے نفس، اپنی  
 شہوات و خواہشات پر قابو رکھتی ہے تو یقیناً ہماری ریاست اس حکم کی مستحق ہے۔

گ :- یقیناً۔

ہیں :- یعنی ہم اسے عقیف کہہ سکتے ہیں۔

گ :- بیشک۔

میں :- اسی طرح اگر کوئی ریاست ایسی ہو سکتی ہے جس میں حاکم و محکوم آپ  
معاملہ میں ہم آہنگ و ہم نوا ہوں کہ کے حکومت کرنی چاہیے تو وہ یقیناً ہماری  
ریاست ہے۔ کیوں، آپ کی کیا رائے ہے؟

گ :- بلاشبہ، آپ کا خیال صحیح ہے۔

میں :- اچھا اب یہ بتائیے کہ یہ عفت کی صفت کس طبقہ میں موجود ہوگی؛

حاکم میں یا محکوم میں؟

گ :- میں سمجھتا ہوں و نون میں ہوگی۔

میں :- تم نے دیکھا کہ ہم نے اس پیشگوئی میں چنداں غلطی نہ کی تھی کہ عفت  
ایک قسم کی ہم آہنگی (ایک طرح کا توازن) و تناسب ہے۔  
گ :- یہ کیسے؟

میں :- ایسے کہ جس طرح عقل اور شجاعت ریاست کے مخصوص حصوں میں

رہ کر کے عقلمند اور بہادر بناتے ہیں، وہ حال عفت کا نہیں۔ یہ تو تمام ریاست  
میں جاری و ساری ہے اور آپ کوئی معیار مقرر کیجیے خواہ عقل و دانش، قوت جسمانی،  
کثرت تعداد یا کثرت مال یا اور کوئی بھی معیار یہ ہر لحاظ سے قومی، ضعیف اور مرطوب



طبقوں میں اتحاد عمل کی ضامن ہوتی ہے۔ لہذا ہم بالکل حق بجانب ہوں گے  
 اگر عفت کی تعریف وہ ہمنوائی کریں جسے ہم نے ریاست یا افراد میں حق حکومت  
 کے متعلق اعلیٰ اور اعلیٰ طبقہ کی باہمی یک آہنگی اور اتحاد سے تعبیر کیا ہے۔  
 گ۔ میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔

میں۔ بظاہر ہم نے اپنی ریاست میں منجملہ چار کے تین اصول دریافت  
 کر لیے ہیں۔ کم از کم میں تو یہی سمجھتا ہوں۔ اب وہ چوتھی چیز کیا ہے جو ریاست کی نیکی  
 کو مکمل کر دیتی۔ گمان تو یہ ہے کہ غالباً یہ انصاف ہی ہو۔  
 گ۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے۔

میں۔ اچھا تو گلا کن ذرا ہوشیار ہو جاؤ اور آشکاروں کی طرح گھیسرا  
 ڈال لیں اور دیکھتے رہیں کہ کہیں انصاف نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔  
 کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ چیز ہی ہمیں کہیں بس تاک میں رہو، ممکن ہے تم ہی پہلے  
 دیکھ لو تو پھر مجھے بھی خبر دینا۔

گ۔ خدا کرے ایسا ہی ہو، لیکن میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ مجھے  
 اپنے نقش قدم پر چلنے والا متصور فرمائیں، جو آپ کے پیچھے پیچھے آ رہا ہے اور  
 جو کچھ اُسے دکھایا جائے اُسے دیکھ لیتا ہے۔

میں۔ اچھا بھائی، تو پھر دعائیں میرے شریک ہو اور پیچھے پیچھے چلے آؤ۔  
 گ۔ ہاں ہاں، آپ ہمنوائی کیجئے، میں چل رہا ہوں۔

میں۔۔۔ راہ نہایت دشوار گزار رہی اور ایک دشت ناپیدا کنارے میں  
 پہاڑوں کی غلطی ہو اور منزل سخت کٹھن، لیکن بہر حال قدم بڑھائے چلنا چاہئے  
 گ۔۔۔ بیشک

میں۔۔۔ دیکھو دیکھو، گلا گن، وہ دیکھو، مجھے یہاں کچھ راستہ کا نشان سا  
 معلوم ہوتا ہے؛ اب خدا نے چاہا تو سکار بچکر نہ جائیگا۔  
 گ۔۔۔ مبارک ہو۔

میں۔۔۔ واللہ، ہم لوگ سخت حماقت میں مبتلا ہیں  
 گ۔۔۔ یعنی۔

میں۔۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم جس چیز کی تلاش میں سرگرداں ہیں تو خود  
 ہمارے پیروں پر پڑی لوٹ رہی ہے، لیکن ہماری نظر اسپر نہیں پڑتی۔ جیسے اگر  
 لوگ کسی گم شدہ چیز کی تلاش میں پھرتے ہیں حالانکہ یہ چیز خود ان کے ہاتھ میں  
 موجود ہوتی ہے، اسی طرح ہم نے بھی اصلی چیز کو دیکھنے کے بجائے اپنی نظر کہاں  
 کہاں دوڑا رہی اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہماری جستجو اب تک بے سود رہی۔  
 گ۔۔۔ آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں۔۔۔ مطلب کیا ہے، یہ کہ ہم ابھی ابھی اسی چیز کے متعلق باہم گفتگو کر رہے  
 تھے اور بلا سمجھے اور بلا جانے ہم نے خود اس کی تعریف بھی کی۔  
 گ۔۔۔ بس خدا کے لیے اس مہیہ کو ختم کیجیے، میں آپ کی توضیح سننے کے لیے



بتیاب ہوں۔

میں :- اچھا تو سنئے اور فرمائیے کہ میں ٹھیک کہتا ہوں کہ نہیں۔ شروع ہی میں ریاست کی بنیاد رکھتے وقت ہم نے جو عام اصول کار تجویز کیا تھا وہی خود یا تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ انصاف کی حقیقت ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ہم نے یہ طے کیا تھا اور بار بار اس کی تکرار بھی کی تھی کہ ہماری ریاست میں ہر فرد کا کوئی ایک کام ہونا چاہیے جس کے لیے اٹھیں قدرتا بہترین صلاحیت ہو۔

گ :- بیشک، یہ طے کیا تھا۔

میں :- اور ہم نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے بھی سنا ہے خود اپنے کام سے کام رکھنا اور دوسروں کے معاملات میں مداخلت نہ کرنا انصاف ہے، بلکہ خود ہم نے یہی بات بار بار کہی ہے۔

گ :- جی، کئی تو ضرور ہے۔

میں :- گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی شکل سے خود اپنا کام کرنا انصاف ہے۔ آپ سمجھئے کہ میں نے اس نتیجہ کا کہاں سے استخراج کیا؟

گ :- نہیں، میں نہیں سمجھا۔ مہربانی کر کے بتا دیجئے۔

میں :- اپنی ریاست کی تجزی کرتے ہوئے جب ہم نے ان تین صفات یعنی حکمت، شجاعت اور عفت کو علیحدہ کر دیا تو میرے خیال میں چوتھی صفت وہ ہونی چاہیے تھی جس نے ان تینوں صفات کا ریاست میں پیدا ہونا اور ان کا قائم رہنا ممکن

بنایا۔ اور یہ ہم طرہی کر چکے ہیں کہ اس چوتھی صفت کا نام عدل و انصاف ہوگا۔  
گ۔۔ بیشک۔

میں۔۔ اب اگر یہ تصفیہ کرنا ہو کہ ان چاروں صفات میں سے کون سی صفت ریاست کی خوبی کی تکمیل میں سب سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے تو بڑی دشواری کا منہ ہوگا۔ کیا سب سے اہم چیز عالم و محکوم کے خیالات کی باہمی یک آہنگی ہے یا اس سے زیادہ اہمیت سپاہ کے وفاداری کے ساتھ اس زمین پر قائم رہنے کو حاصل ہے جو مختلف چیزوں کے قابل خوف یا ناقابل خوف ہونے کے متعلق ہیں پیدا کیا گیا ہے؟ یا حکمراں طبقہ میں عقل و حکمت کا وجود؟ یا پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کہیں ریاست کی تمام تر خوبی اس چوتھے اصول کی زمین منت تو نہیں جسکی وجہ سے ہرزند مرد، چھوٹا بڑا، عبد و حر، حاکم و محکوم، یا کارگیر غرض ہر ایک بس اپنی مفوضہ کام میں مشغول رہتا ہے اور دوسری چیزوں میں بجا مداخلت نہیں کرتا۔

گ۔۔ اس سوال کا جواب تو واقعاً نہایت دشوار ہے۔

میں۔۔ یعنی کم سے کم یہ چوتھا اصول جس کی وجہ سے ہر شخص کا عمل اپنے مفوضہ کام تک محدود رہتا ہے اہمیت کے لحاظ سے باقی تین صفات کی ہمسر کر سکتا ہے،  
گ۔۔ بلاشبہ۔

میں۔۔ اگر ایسا ہے تو پھر کیوں نہ اسی کو عدل سے تعبیر کریں؟

گ۔۔ ہاں، ضرور کرنا چاہیے۔



ہیں۔ اچھا، اسی مسئلہ پر دوسری طرح غور کرو۔ پھر دیکھیں کہ یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہی یا نہیں؟ اچھا، فرمائیے کہ آپ حکام ریاست کو مقدمات قانونی کا فیصلہ کرنا تفویض کریں گے؟  
گ۔۔ بیشک۔

میں۔ اور اس فیصلہ کرنے میں انھیں سب سے زیادہ اس امر کا خیال رکھنا ہوگا کہ کوئی شخص دوسرے کی ملک پر متصرف نہ ہو سکے اور نہ اپنی ذاتی ملک سے محروم کیا جائے۔

گ۔۔ بلاشبہ، یہی تو انکا مخصوص فرض ہوگا۔

میں۔ اسی لیے ناکہ یہ طرز عمل عا دلانہ اور منصفانہ ہے۔

گ۔۔ بیشک۔

میں۔ لہذا اس خیال کے بموجب بھی اپنی مخصوص ذاتی ملک پر تصرف اور اپنے مخصوص مفوضہ فرض کو انجام دینا انصاف کا مرادف ہے۔  
گ۔۔ جی ہاں۔

میں۔ سب ذرا غور کیجئے کہ آپ اور میں متفق الہے ہیں یا نہیں؟ اگر ایک برصغری چار کا کام کرنے لگے یا ایک چار برصغری کا، اور یہ آپس میں ایک دوسرے سے اوزار بدل لیں اور دوسری خصوصیات بھی ایک دوسرے کی اختیار کر لیں، یا پو ہو کہ ایک ہی شخص دونوں کام کرنے لگے تو کیا اس سے ریاست کا کچھ بہت نقصان

ہو جائے گا۔

گ۔ کچھ ایسا شدید نقصان تو نہ ہوگا۔

ہیں۔ لیکن اگر کوئی کارگر یا اہل حرفہ میں سے کوئی شخص اپنی دولت، تعلقات، جسمانی طاقت یا کسی اور وجہ سے اس درجہ ابھر جائے کہ لگے سپاہ کے کام میں دخل دینے، یا کوئی سپاہی محافظین ریاست کے کام میں دخل دینے لگے اور خالی لیکہ اس کی ذر بھی صلاحیت نہیں رکھتا، اور پھر یہ لوگ مثال مذکورہ صدر کی طرح اپنے آلات اور خصوصیات تبدیل کر لیں؟ یا اگر ایک ہی شخص ایک ہی وقت میں کئی اہم فرائض ادا کرنے کی کوشش کرے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ تبدیلی اور مداخلت بیجا ریاست کے لیے سخت تباہی کا باعث ہوگی۔

گ۔ ہاں، یقیناً ہوگی۔

میں۔ لہذا چونکہ ان تین طبقوں میں باہم مداخلت یا ایک سے دوسرے میں تبدیلی سلسلہ ریاست کے نقصان کا باعث ہے اس لیے ہم بجا طور پر اسے بالفاظ صریح ایک عمل قبیح سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

گ۔ بیشک۔

میں۔ اور آپ اس بات کو یقیناً تسلیم کرینگے کہ اپنی ریاست کے ساتھ ایسی سخت بُرائی کرنا بڑی ناانصافی ہے۔

گ۔ بلاشک۔



میں۔ اچھا یہ تو نا انصافی ہوئی۔ اس کے برعکس اہل حرفہ، سپاہ، اور محافل میں مایست کا اپنے اپنے مفوضہ فرائض پر قائم رہنا اور صرف اسی کو انجام دینا انصاف ہے اور یہی چیز مایست میں بھی انصاف کی صفت پیدا کرتی ہے۔

گ۔۔ میں اس خیال میں آپ سے حرفِ بحر متفق ہوں۔

میں۔۔ نہیں نہیں، ابھی اس قدر قطعی رائے نہ دینی چاہیے۔ ہاں اگر اس خیال کا تطابق انفرادی حالت سے کیا جائے اور وہاں بھی انصاف کی مابہیت ہی معلوم ہو تو البتہ ہم اس پر صاف کر سکتے ہیں؛ اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر از سر نو تحقیقات کریں گے۔ فی الحال اسی تحقیق کو جاری رکھنا چاہیے کیونکہ یہ شروع ہی اس خیال سے کی گئی تھی کہ اگر ہم پہلے کسی بڑی چیز میں اس انصاف کی صفت کو معلوم کر لیں تو پھر آسانی سے افراد میں بھی اس کا پتہ لگ سکیگا۔ وہ بڑی چیز مایست قرار دینی چنانچہ ہم نے بہتر سے بہتر مایست ترتیب دی کہ اس میں عدل و انصاف ضرور پایا جائیں گے۔ اس طرح جس حقیقت کا نشان ملا ہے اسے اب فرود پر عائد کیجئے۔ اگر مطابقت ہوگی تو کیا کہنا، اور اگر فرود کچھ مختلف ہو تو پھر مایست کی طرف رجوع کرنے اور اس نظریہ کو دوبارہ آزمائیں گے۔ ان دونوں کے تصادم سے ممکن ہے وہ رستی پیدا ہو جس میں عدل چمک اٹھے اور اس وقت جو نظارہ ہمارے پیش نظر ہوگا اسے ہم اپنی روح میں پیوست کر لینگے۔

گ۔۔ ہاں، یہ تو پھر ہوگا ہی؛ آپ جو کچھ فرماتے ہیں ضرور کیجئے۔

میں۔ اچھا، دو چیزیں ہیں، ایک بڑی ایک چھوٹی۔ دونوں کو ایک نام سے پکارتے ہیں، تو بہا ننگان کے ایک نام سے موسوم ہونے کا تعلق ہر دو مماثل ہیں یا نہیں؟

گ۔۔ ہیں۔

میں۔ تو اگر صرف عدل کا تصور پیش نظر رکھا جائے تو عادل انسان، ایک عادل رعایت کا مثل ہوگا۔

گ۔۔ جی ہاں، ہوگا۔

میں۔ اور رعایت کو عادل ہم نے اس وقت قرار دیا تھا جب اس کے تینوں طبقے علیحدہ علیحدہ اپنے مفروضہ کام میں مشغول ہوں اور رعایت کا شجاع حکیم اور عقیف ہونا انھیں تین طبقوں کی دیگر صفات و خواص پر منحصر قرار پایا تھا۔

گ۔۔ درست۔

میں۔ یہی حال فرد کا بھی ہے۔ ہم فرض کر سکتے ہیں کہ اس کی روح میں بھی وہی تین اصول ہیں جو رعایت میں پائے جاتے ہیں اور چونکہ یہ فرد بھی ان سے اسی طرح متاثر ہوتا ہے اس لیے اسے بھی جائز طور پر انھیں الفاظ سے بیان کر سکتے ہیں۔

گ۔۔ بیشک۔

میں۔ اور لیجئے، پھر ایک آسان سا سوال آن بیٹھا، کہ آیا روح میں یہ تین

اصول ہوتے ہیں یا نہیں؟



گ۔ آسان سوال ہوا نہیں، یہاں بھی وہ ضرب المثل سچ اُترتی ہو کہ اچھی چیز ہمیشہ دشوار بھی ہوتی ہے۔

میں۔ بالکل سچ ہے؛ اور میں نہیں سمجھتا کہ ہم جو طریقہ استعمال کر رہے ہیں، وہ اس سوال کے صحیح حل کے لیے کافی بھی ہے۔ صحیح طریقہ دوسرا ہے اور اس سے زیادہ طویل۔ تاہم اس سے بھی ہم غالباً ایسے نتیجہ پر تو پہنچ ہی جائیں گے جو سابقہ تحقیق کی سطح سے بہت نہ ہوگا۔

گ۔ تو کیا یہ کافی نہیں؛ بحالت موجودہ میں تو اسپر قانع ہوں۔

میں۔ ہاں ہاں، میں بھی مطمئن ہو جاؤنگا۔

گ۔ تو پھر اس خیال کے تعاقب میں کمزوری نہ پیدا ہو۔

میں۔ کیا ہمیں یہ نہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ وہ اصول اور عادات جو ریاست

میں ہوتی ہیں ہی ہم سب میں بھی پائی جائیں گی۔ اور فرد ہی سے یہ چیزیں ریاست میں پہنچتی ہیں۔ اور نہ اور کون ذریعہ ہو سکتا ہے؛ مثلاً غصہ یا شجاعت کی صفت لیجئے

یہ خیال کس درجہ تسخیر انگیز ہوگا کہ یہ صفت جب ریاست میں پائی جاتی ہے تو ان افراد

سے حاصل نہیں ہوتی جنہیں یہ واقعاً موجود ہے۔ مثال کے لیے اہل تھرین اہل سیتھیا

یا بالعموم تمام شمالی اقوام کو دیکھ سکتے ہیں؛ یہی حال جت علم کا ہے جو ہمارے ملک کا

خاص شیوہ ہے؛ جت زر کا ہوا اہل مصر و فونیقیہ کے ساتھ وابستہ کی جاتی ہے۔

گ۔ بالکل درست۔

میں۔ اس کے سمجھنے میں تو کوئی دقت نہیں۔

گ۔ مطلق نہیں۔

میں۔ لیکن جب سوال یہ ہو کہ یہ اصول تین ہی ہیں یا صرف ایک تو مسئلہ اس قدر آسان نہیں رہتا، یعنی کیا ہم اپنی طبیعت کے ایک حصہ سے علم حاصل کرتے ایک سے غصہ اور خفگی کرتے، اور تیسرے سے اپنی شہوات طبعی کی تسکین کے آرزو مند ہوتے ہیں؟ یا ہر قسم کے کام میں پوری روح عمل کرتی ہے؟ اصل مشکل تو اس بات کے فیصلہ میں ہے۔

گ۔ بیشک، مشکل تو یہی ہے۔

میں۔ اچھا تو کوشش کر کے اب یہ معلوم کریں کہ یہ اصول ایک ہی ہے یا مختلف

گ۔ یہ معلوم کیسے ہو؟

میں۔ ایسے۔ ظاہر ہے کہ کوئی چیز اپنے ایک ہی حصہ میں ایک وقت، اور ایک ہی چیز کے تعلق میں دو متضاد طریقوں سے عامل یا معمول نہیں ہو سکتی چنانچہ جب کبھی ان چیزوں میں یہ تضاد واقع ہوتا ہے جو بظاہر ایک معلوم ہوتے ہیں تو ہم جان لیتے ہیں کہ یہ دراصل ایک نہیں مختلف چیزیں ہیں۔

گ۔ درست۔

میں۔ مثلاً کیا کوئی چیز ایک وقت اور اپنے ایک ہی حصہ میں ساکن اور متحرک

دونوں ہو سکتی ہے؟



گ۔ ناممکن۔

میں۔۔ پھر بھی اچھا ہی ہے کہ ان الفاظ کے معنی کو زیادہ متعین کر لیا جائے،  
مبادی ہم بعد کو جھٹک جائیں۔ ایک ایسے آدمی کا تصور کہ جو کھڑا ہے اور ساتھی  
اپنا سر اور اپنے ہاتھ ہلار رہا ہے۔ ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ ایک ہی آدمی ایک وقت  
میں ساکن بھی ہو متحرک بھی۔ اس کا جواب ہم یہ دیں گے کہ اس کا ایک حصہ متحرک  
ہو اور ایک حصہ ساکن۔

گ۔ بہت بجا۔

میں۔۔ معترض اگر اور موٹو گانی کرے اور کہے کہ جب لٹو اپنی کیل پر چکر کرتا  
ہو تو تو اس کا کوئی حصہ ہی نہیں بلکہ پورا کا پورا لٹو ایک ہی وقت میں ساکن بھی  
ہوتا ہے اور متحرک بھی (اور وہ یہی بات ہر اس چیز کے متعلق کہہ سکتا ہے جو ایک نقطہ  
پر گردش کرتی ہو) تو ہم اس اعتراض کو بھی تسلیم نہ کریں گے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ ان صورتوں  
میں حرکت اور سکون دونوں اس چیز کے ایک ہی حصہ میں نہیں پائے جاتے ہیں  
ان چیزوں میں ایک محور ہوتا ہے ایک قطر۔ محور تو ساکن کھڑا رہتا ہے اس لیے کہ وہ  
اپنے زاویہ قائمہ سے انحراف نہیں کرتا اور قطر چکر کا ٹٹا ہے، اور اگر گردش میں محور بھی  
دائیں بائیں، آگے پیچھے جھک جائے تو پھر کسی عہدہ سے اس جسم میں سکون باقی  
نہیں رہتا۔

گ۔ جی ہاں، ان مختلف کیفیات کے بیان کرنیکا یہی صحیح طریقہ ہے۔

میں :- تو ہم ان اعتراضوں سے پریشان نہ ہوں گے، اس ثابت کو باور کریں کہ کسی چیز کا ایک ہی حصہ ایک ہی وقت میں اور ایک ہی چیز کے تعلق میں متضاد طریقوں سے عامل یا معمول ہو سکتا ہے۔

گ :- میرے خیال کے مطابق تو یقیناً نہیں ہو سکتا۔

میں :- پھر بھی اس خیال سے کہ ہمیں ہم اس قسم کے اعتراضات کی تحقیق پر مجبور نہ ہوں اور طول طویل مفصل بحث کے بعد انکا ابطال کریں ہم انکا عمل ہونا فرض کیے لیتے ہیں اور اس باہمی سمجھوتے پر آگے چلتے ہیں کہ اگر کہیں یہ مفروضہ بالآخر غلط ثابت ہو گیا تو ہم تمام ان نتائج کو جو اس سے منبج ہوئے ہیں واپس لے لیں گے۔

گ :- جی ہاں، یہ بہترین صورت ہے۔

میں :- اچھا، کیا قبول ورد، خواہش و تنفر، جذب و دفاع سب کے سب متضاد نہیں، خواہ معروف حیثیت سے لویا مجہول، کہ اس سے انکے متضاد ہونے پر تو کوئی اثر پڑتا نہیں۔

گ :- جی ہاں، یہ سب متضاد ہیں۔

میں :- اچھا تو بھوک، پیاس اور عام طور پر تمام خواہشات، نیز ارادہ و آرزو ان سب کو نہ کو رہے بالاکیفیات کی قسم اول ہی سے تو متعلق کریں گے۔ کیوں ہی کہیں گے نا کہ روح شے مطلوب کی متلاشی ہوتی ہے، یا جس چیز کی تملیک کی آ خواہش ہے، اسے اپنی طرف کھینچنا چاہتی، یا جب کوئی شخص چاہتا ہے کہ یہ چیز مجھے



دی جائے۔ تو اس کی روح اس خواہش کو پورا کرنے کی آرزو میں اپنی خواہش کا اظہار اپنے سر کو حرکت دے دیکر اس طرح کرتی ہو گی یا اس سے کوئی سوال کیا گیا تھا اور اسے اسے قبول کیا۔  
گ۔ بہت ٹھیک۔

میں۔ اور نارضا مندی، تنفر اور فقدان خواہش کے متعلق کیا کہیگا، کیا انھیں رو و دفاع کی متضاد تقسیم میں نہ رکھیگا؟  
گ۔ بیشک۔

میں۔ عام طور پر تو خواہشات کے متعلق اس بیان کو صحیح تسلیم کریں اور آؤ اس بیان خواہشوں کی ایک خاص تقسیم کریں اور ان میں بھوک اور پیاس کو لیں کہ یہ سب سے زیادہ ظاہر اور معروف خواہشیں ہیں۔  
گ۔ اچھا، انھیں کو لیجئے۔

میں۔ ایک کا مقصد کھانا ہے، دوسرے کا پینا۔  
گ۔ جی۔

میں۔ اور ہیں ایک نکتہ پیدا ہوتا ہے۔ یعنی کیا پیاس روح کی پیسے کی اور محض پیسے کی آرزو کا نام نہیں۔ یعنی پیسے کے ساتھ کوئی اور صفت نہیں لگی ہے، مثلاً گرم یا سرد، زیادہ یا کم، یعنی کسی خاص قسم کا پینا۔ اگر پیاس کے ساتھ گرمی شامل ہو تو خواہش سرد چیز پیسے کی ہوگی، اور سردی شامل ہو تو گرم چیز کی۔ اگر

پیاس شدید تو زیادہ پینے کی اور شدید نہیں تو کم کی۔ لیکن خالص پیاس میں تو محض پینے کی خواہش ہوگی اور کچھ نہیں۔ کہ اسی سے پیاس کی قدرتی تسکین ہوتی ہے جس طرح کھلے ٹٹے سے بھوک کی۔

گ۔۔ سادہ خواہش تو سادہ چیز کی ہوتی ہے، اور اگر خواہش کسی صفت سے متصف ہو تو جس چیز کی خواہش ہو وہ بھی متصف ہوگی۔

میں۔۔ لیکن اس جگہ ذرا پر اگندگی پیدا ہو سکتی ہے اس مخالفت کے مقابلہ میں بھی تو بحث کرنی ہے جو ابھی کھڑا ہو کر کہنے لگے کہ کوئی انسان صرف پینا، نہیں چاہتا بلکہ اچھی چیز پینا چاہتا ہے۔ کوئی بھی محض غذا نہیں چاہتا بلکہ عمدہ غذا۔ کیونکہ خوبی و عمدگی تو خواہش و طلب کا مورد عام ہے اور پیاس چونکہ ایک خواہش و طلب ہے اس لئے لازماً اچھی چیز کے پینے کی خواہش ہوگی۔ یہی حال اور تمام خواہشات کا ہے۔ گ۔۔ ہاں، مخالفت کو کچھ کہنے کی گنجائش تو ضرور ہے۔

میں۔۔ تاہم میں اس بات پر قائم ہوں کہ جہاں دو چیزیں باہم اعتباراً و اضافاً متعلق ہوں تو بعض وقت تو اس علاقہ کے دونوں حصوں کے ساتھ کوئی صفت لگی ہوتی ہے اور بعض میں دونوں سادہ اور بلا کسی صفت کے ہوتے ہیں۔

گ۔۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

میں۔۔ آپ یہ تو جانتے ہیں کہ بڑا، اعتباراً و اضافاً متعلق ہی چھوٹے سے؟

گ۔۔ جی ہاں۔



میں۔ اور ”بہت زیادہ“ ”بہت کم“ سے ہے

گ۔ جی۔

میں۔ اور جو بھی بڑا تھا ”جو بھی چھوٹا تھا“ سے اسی طرح آئندہ بڑا ہونوالا

”آئندہ چھوٹا ہونوالے“ سے۔

گ۔ بیشک۔

میں۔ یہی حال زیادہ اور کم اور دوسرے نسبتاً اور لازم و ملزوم کلمات کا ہے، مثلاً دو چنڈا اور نصف، بھاری اور ہلکا، تیز اور سُست، گرم اور سرد، یا اور کوئی اسی قسم کے الفاظ۔ کیوں کہ یہ بیان ان سب کے متعلق صحیح نہیں آتا؟

گ۔ جی ہاں آتا ہے۔

میں۔ اور کیا یہی اصول حکمیات پر عائد نہیں ہوتا؟ حکمت کا مقصد ہر علم (اگر اسے صحیح تعریف فرض کر لیں، لیکن کسی خاص حکمت کا مقصد کسی خاص قسم کا علم ہے۔ مثلاً مکانات بنانے کی حکمت ایک ایسا علم ہے جو دوسرے اقسام علم سے علیحدہ اور ممتاز ہے۔ اور اس لیے اسے تعمیرات کہتے ہیں۔

گ۔ بیشک۔

میں۔ اس لیے کہ اس میں ایک خاص صفت ہے جو دوسرے علوم میں نہیں۔

گ۔ جی ہاں۔

میں۔ اور یہ مخصوص صفت اس میں اس لیے ہے کہ اسکا ایک خاص مقصد اور

ایک خاص موضوع ہے۔ یہی بات دوسرے علوم و فنون کے متعلق بھی سچ ہے۔  
گ۔ جی ہاں۔

میں۔ اگرچہ اپنے مفہوم کو واضح کر دیا ہے تو اب آپ میرے اصلی مطلب کو  
سمجھ لیں گے کہ میں نے نسبتاً لازم و ملزوم کلمات کے متعلق کیا کہا تھا میرا مطلب  
یہ تھا کہ اگر ایسے کسی علاقہ کے ایک لفظ کو تنہا اور سادہ رکھو تو دوسرا بھی تنہا اور سادہ  
ہوگا۔ اگر ایک کے ساتھ کوئی صفت ہو دوسرے کے ساتھ بھی کوئی صفت ہوگی،  
میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ لازم و ملزوم کی صفت ایک ہی ہو یعنی تندرستی کا علم تندرست  
اور مرض کا علم لازماً مرض ہے، یا خیر و شر کے علوم اسی وجہ سے اچھے اور بُرے ہیں۔  
میرا مقصد صرف اس قدر ہے کہ جب لفظ "حکمت" یا علم بجائے خود مطلقاً استعمال نہ کیا  
جائے بلکہ اس کے موضوع کے ساتھ کوئی صفت لگی ہو مثلاً اس جگہ ماہیت صحت و  
مرض تو اس سے وہ حکمت متعین و معترف ہو جاتی ہے اور اسے صرف علم و حکمت نہیں  
کہتے بلکہ علم طب کہتے ہیں۔

گ۔ میں اب اچھی طرح سمجھ گیا اور میں آپ کا بخیاں ہوں۔

میں۔ تو کیا پیاس اصلاً اسی قسم کا اضافی و اعتباری لفظ نہیں جکا بین علاقہ۔

گ۔ ہاں، پیاس کا علاقہ پینے کے ساتھ ہے۔

میں۔ کسی خاص قسم کی پیاس خاص قسم کے پینے سے علاقہ رکھتی ہے لیکن اگر محض

پیاس کو لیں تو وہ نہ زیادہ ہے نہ کم، نہ اچھی ہے نہ بُری، نہ کسی خاص قسم کی چیز پینے کی بلکہ محض



پینے کی۔

گ۔ بیشک۔

میں۔ پیاسے کی روح، جہاں تک پیاس کا تعلق ہو، صرف پینا چاہتی ہے، اسی کی متلاشی ہوتی اور اسی کے حصول کی کوشش کرتی ہو۔

گ۔ ظاہر ہو۔

میں۔ اب کوئی ایسی چیز فرض کیجئے جو پیاسی روح کو پیئے سے دور پہنچتی ہو، تو یہ چیز اس پیاس سے مختلف ہوگی جو اسے جانور کی طرح پینے کی طرف کھینچ رہی ہو کیونکہ جیسے ہم کہہ چکے ہیں کوئی چیز ایک ہی وقت میں اپنے اسی حصہ سے اسی چیز پر دو متضاد طریقوں سے عمل نہیں کر سکتی۔

گ۔ ہاں، یہ تو ناممکن ہو۔

میں۔ جیسے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ تیرا انداز کے دو نو ہاتھ ایک ہی وقت میں کمان کو اپنی طرف بھی کھینچتے ہیں اور اپنے سے دور بھی کرتے ہیں۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک ہاتھ سے کمان کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور دوسرے سے اُسے دور کرتا ہے۔

گ۔ بالکل درست۔

میں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آدمی پیاسا ہو اور پھر بھی پینا نہ چاہے؟

گ۔ ہاں، اکثر ایسا ہوتا ہے۔

میں۔ تو ایسی حالت میں پھر آپ کیا کہیں گے؟ یہی ناکہ روح میں ایک چیز ہو جو

پینے کا حکم دیتی ہے، اور ایک دوسری چیز ہے جو اس سے منع کرتی ہے، اور یہ دوسری  
 قوت ترغیب شرب نیت والی ہے مختلف اور قوی تر ہے؟  
 گ۔۔۔ جی ہاں، یہی کہو گا۔

میں۔۔۔ منع کرنے والی قوت عقل سے مشق ہے اور رغبت لانے والی طاقت  
 جذبہ اور مرض سے پیدا ہوتی ہے۔  
 گ۔۔۔ ظاہر ہے۔

میں یعنی ہم بجا طور پر فرض کر سکتے ہیں کہ یہاں دو مختلف قوتیں ہیں جس سے  
 انسان تعیل و توجیہ کرتا ہے اسے روح کا اصول عقلی کہتے ہیں، دوسرے کو جس سے  
 آدمی محبت کرتا، بھوکا پیاسا ہوتا، یا کسی دوسری خواہش کی تحریک محسوس کرتا ہے  
 غیر عقلی یا اشتہائی اصول کہہ سکتے ہیں اور مؤخر الذکر مختلف لذات اور انکی تکمیل  
 و تسکین کا معاون ہوتا ہے۔

گ۔۔۔ جی ہاں، ہم جائز طور پر انہیں مختلف قرار دے سکتے ہیں۔  
 میں۔۔۔ اچھا تو پھر قطعی طور پر تسلیم کر لیں کہ روح میں دو اصول (قوتیں)  
 ہوتے ہیں اور ہاں جذبہ اور غصہ؟ کیا یہ کوئی تیسرا اصول ہے، یا انہیں مذکورہ  
 اصول میں کسی سے ملتا جلتا ہے؟

گ۔۔۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ خواہشات سے ملتا جلتا ہے۔  
 میں۔۔۔ سب مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے ایک دفعہ ایک قصہ سنا تھا اور میں تو



بھائی سے سچ بھی مانتا ہوں۔ قصہ یہ تھا کہ اگلائیون (Aglaion) کا بیٹا  
 لیونٹی اس (Leontius) ایک دن پرے اس (Piraeus) سے واپس  
 آتا تھا، شمالی فصیل کے باہر کی طرف مقتل میں اُسے کچھ لاشیں زمین پر پڑی دکھائی  
 دیں۔ اسکے جی میں خواہش پیدا ہوئی کہ انہیں دیکھے، مگر ساتھ ہی کچھ نفرت اور خون  
 کا احساس بھی ہوا تھوڑی دیر تک یہ اندرونی کشمکش جاری رہی اور اسے اپنی نگاہیں  
 ہاتھوں سے ڈھانپ لیں، لیکن بالآخر اس سے نہ رہا گیا، دیکھنے کی خواہش غالب  
 آئی، چنانچہ آنکھوں کو خوب زور سے پھاڑ کر یہ لاشوں کی طرف یہ کتا ہوا دوڑا، لو  
 دیکھ لو، کبختو! آپ جی بھر کر اس دلفریب نظارہ کا تماشہ کر لو۔“

گ۔ میں نے خود یہ قصہ سنا ہے۔

میں :- اس قصہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ کبھی کبھی غصہ خواہش سے اس طرح

برسرِ پکار ہوتا ہے گو یا یہ دو مختلف چیزیں ہیں۔

گ :- جی ہاں، اس کا یہی مطلب ہے۔

میں :- اسکے علاوہ بھی آپ نے بہت سی ایسی صورتیں دیکھی ہوں گی جنہیں انسان

کی خواہشات بجز اس کی عقل پر غالب آ جاتی ہیں، تو پھر وہ اپنے کو ملامت کرتا اور

اس اندرونی جبر و تشدد پر خفا ہوتا ہے اور اس کشمکش میں جس کی مثال ایک یا اسکے

مختلف مخالف گروہوں کی کشمکش کی ہی ہے اس کی دلدل (dilemma) عقل کی طرفدار

ہوتی ہے۔ لیکن غالباً تم نے نہ تو خود اپنی ذات میں دیکھا ہو گا نہ کسی اور میں کہ جب

عقل نے ایک فہم فیلہ کر دیا کہ میری مخالفت نہ کی جائے تو اسکے بعد نفس (جو امراض اور اس کے  
خواہشات کا ساتھ دیا ہو۔

گ۔ ہرگز نہیں۔

میں۔ فرض کیجئے ایک شخص کو احساس ہو کہ وہ غلطی پر ہے، تو اس کی فطرت  
جس قدر شریف ہوگی اسی قدر وہ ان تکالیف (مثلاً بھوک، پیاس، سردی وغیرہ)  
پر کم غصہ محسوس کریگا، جو شخص مجروح نے سپردِ االی ہوں۔ یہ تو ان منراؤں کو جائز  
تصور کرتا ہے اور اسی لیے اس کا غصہ اتنے متحرک ہوئیے انکار کرتا ہے۔

گ۔ سچ ہے۔

میں۔ لیکن جب وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے ساتھ بُرائی کی گئی ہے تو وہ  
غصہ سے پیچ و تاب کھانے لگتا ہے، اب یہ اپنے کو حق بجانب جانتا ہے، چنانچہ بھوک  
پیاس، سردی وغیرہ کی تکلیفیں برداشت کر کے اس میں عزم و استقلال و فتح  
حاصل کرنے کا جذبہ اور بھی پیدا ہوتا ہے۔ اس کی شریف فطرت اس وقت تک شہتشی  
نہیں بڑتی جب تک یا تو دشمن کو قتل نہ کر دے یا خود قتل نہ ہو جائے یا پھر یہ ہو کہ  
اپنے پاس بان گڈریے یعنی عقل کی آواز نہ سنائی دیک جائے کہ "بس کتے بس اب  
زیادہ مت بھونک؟"

گ۔ خوب، یہ تو نہایت کامل تشیل ہے۔ ہم تو کہہ ہی رہے تھے کہ ہماری ریاست  
میں معاونین کتے ہوں گے اور حکام کی آواز سنیں گے جو ہنزلہ گڈریوں کے ہونگے۔



میں۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ نے میرا مفہوم پوری طرح سمجھ لیا ہے۔ لیکن  
ہاں ایک نکتہ اور ہے جس پر چاہتا ہوں کہ آپ ذرا غور کریں۔

گ۔۔ وہ کیا؟

میں۔۔ آپ کو یاد ہو گا کہ پہلے پہل جذبہ اور نفسِ لوامہ (SPRIT) خواہشات  
کی قسم معلوم ہوتے تھے۔ لیکن اب تو ہم اس کے بالکل خلاف کہیں گے۔ کیونکہ روح  
کی کشمکش میں نفسِ لوامہ (SPRIT) اصولِ عقلی کا جانبدار ہوتا ہے۔

گ۔۔ بیشک۔

میں۔۔ لیکن ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے۔ یعنی کیا جذبہ عقل سے مختلف ہے؟ یا  
اسی کی ایک قسم؟ بحالت ثانی روح میں بجائے تین قوتوں کے دو ہی ہوں گی یعنی  
قوتِ عقلی و قوتِ ہستہائی۔ یا یوں ہے کہ جیسے ریاست میں تین طبقے تھے یعنی تاجرا،  
معاون، اور مشیر۔ اسی طرح فرد کی روح میں بھی ایک تیسرے عنصر ہو یعنی نفسِ لوامہ  
(SPRIT) اور اگر بڑی تعلیم اسے خراب نہ کر ڈالے تو یہ فطرتاً عقل کا معاون ہوتا ہے۔  
گ۔۔ ہاں اسے تو ایک تیسرا اصول ہونا چاہیے۔

میں۔۔ ہاں، بشرطیکہ جس طرح یہ خواہشات سے مختلف ثابت ہو چکا ہے،  
اسی طرح عقل سے بھی مختلف ثابت ہو جائے۔

گ۔۔ یہ تو آسانی سے ہو جائے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے بچوں میں  
نفسِ لوامہ (SPRIT) تو پیدائش کے وقت سے ہی موجود ہوتا ہے، لیکن ان میں سے اکثر کو

عقل کا استعمال کافی دیر میں آتا ہے اور بعض کو تو کبھی آتا ہی نہیں۔

میں بہت خوب۔ اور یہ تو آپ وحشی جانوروں میں بھی دیکھ سکتے ہیں جو آپ کی بیان کی صداقت کا مزید ثبوت ہے۔ ہم پہلے بھی اس کا ذکر کر چکے ہیں، اور اب پھر ہر کے یہ الفاظ پیش کرتے ہیں کہ "و اسنے اپنا سینہ پٹیا اور اپنے غضبناک نفس کو ملامت کی" کیونکہ اس مصرعہ میں ہر نے صاف طور پر اس قوت کے وجود کو تسلیم کیا ہے جو بڑے بھلے کی تیسیر کرتی ہے اور اسے اس غیر عقلی غصہ سے مختلف بنا رہے یہ (عقل) ملامت کرتی ہے۔

گ۔ بہت درست۔

میں۔ خدا کا شکر ہے کہ موجوں کے بہتیرے تھپیرے کھانے کے بعد ہم بالآخر ساحل پر آن لگے اور اس بات پر متفق ہو گئے کہ جو اصول رہائش میں ہوتے ہیں وہی فرد میں بھی ہوتے ہیں اور ان کی تعداد تین ہے۔

گ۔ جی۔

میں۔ کیا اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ فرد بھی اسی طرح اور اسی صفت کے باعث عقلمند و حکیم ہوتا ہے جیسے ریاست۔

گ۔ یقیناً۔

میں۔ جو صفت ریاست میں شجاعت کا باعث ہے وہی فرد کی شجاعت کا سبب ہے اور فرد اور ریاست کا علاقہ دیگر محاسن میں بھی یکساں ہے۔



گ۔۔ بلاشبہ۔

میں۔۔ اور ہم فرد کو بھی اسی طرح عادل تسلیم کرینگے جیسے ریاست کو کیا تھا؟  
گ۔۔ لامحالہ۔

میں۔۔ خوب یاد ہوگا کہ ریاست کا عدل تو یہ تھا کہ تینوں طبقے اپنا اپنا کام  
انجام دیتے رہیں۔

گ۔۔ اسے بھولنا تو بہت مشکل ہے۔

میں۔۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہیے کہ وہ فرد عادل ہوگا جس کی طبیعت  
کی مختلف صفات اپنا اپنا کام کریں اور وہ خود بھی اپنا مفوضہ کام انجام دے۔  
گ۔۔ جی ہاں، یہ بھی ضرور یاد رکھنا چاہیے۔

میں۔۔ پھر کیا یہاں بھی اصول عقلی کو حکومت نہ کرنی چاہیے کہ یہ حکیم ہی اور  
روح کی نگرانی اسی کے سپرد ہی اور عنصر نفس کو اس کا ماتحت اور معاون ہونا چاہیے  
گ۔۔ بیشک۔

میں۔۔ اور جیسے ہم کہہ رہے تھے موسیقی اور ورزش کا متحدہ اثر انہیں اتحاد  
ویگانگت پیدا کر دیگا۔ پچھے اچھے اقوال اور سباق سے عقل کی نشوونما اور تقویت  
ہوگی اور ہم آہنگی اور اوزان سے نفس کی وحشت میں اعتدال نرمی اور تہذیب  
پیدا ہو جائیگی۔

گ۔۔ بالکل بجا۔

میں۔ جسمان دونوں کی نشوونما اور تعلیم ہو چکے گی اور یہ اپنے اپنے وظائف سے ہٹنا ہو جائیں گے تو پھر ہی اس اصول اشدہائیہ پر حکومت کریں گے جس پر ہم سبکی روحوں کا سب سے بڑا حصہ مشتمل ہے اور جو باطبع سیر نہیں ہوتا۔ یہ دونوں سپرنگراں رہیں گے تاکہ کہیں لذات جسمانی کی کثرت سے پھول کر ابلنے سے قوت حاصل کر کے یہ اصول اشدہائیہ اپنے حقیقی حیطہ اثر سے تجاوز نہ کرنے پائے اور لگے ان اجزا روح پر اپنا تسلط جانے اور انھیں اپنا حلقہ بگوش بنانے جو طبعی طور پر اس کے ماتحت نہیں اور اس طرح حیات انسانی کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔

گ۔ نہایت درست۔

میں۔ یہ دونوں ملکر کیا خارجی حملوں سے کل روح اور کل جسم کے بہترین محافظ نہ ہوں گے؟ ایک مشورہ دیگا، دوسرا اس کی قیادت میں لڑیگا، اور شجاعت کے ساتھ اس کے احکام اور مشوروں کی بجا آوری کریگا۔

گ۔ بیشک۔

میں۔ اور شجاع اسے سمجھنا چاہیے جس کا نفس لوامہ (SPRIT) لذت و الم، خوشی اور ریج میں عقل کے اُن احکام پر قائم رہ سکے کہ کس چیز سے ڈرنا چاہیے اور کس سے نہیں؟

گ۔ بجا۔

میں۔ حکیم اور عقلمندان سے کہیں گے جس میں یہ چھوٹا سا عنصر موجود ہو، جو



حکومت کرتا اور احکام دیتا ہے۔ یہ بات پہلے سے فرض کر لی گئی ہے کہ یہ حصہ تینوں اجزاء اور نیرکل کے اغراض و مقاصد سے بخوبی واقف ہے۔  
گ۔۔ یقیناً۔

میں۔ پھر کیا عینف اسے نہ کہو گے جس میں یہ سب عناصر باہم دوستانہ یک آہنگی رکھتے ہیں؛ جس میں عقل کا حکم اور عنصر اور نفس (لو امر) اور خواہشات کے ماتحت عناصر یکساں اس امر پر متفق ہیں کہ عقل کو حکومت کرنی چاہیے اور اس کے خلاف بغاوت بھی نہیں کرتے۔

گ۔۔ بیشک ایسا در فرد دونوں میں عفت کی اسی کیفیت ہی ہے۔  
میں۔ اور اس کی تشریح تو ہم بار بار کر چکے ہیں کہ ایک انسان کس طرح اور کس صفت کی وجہ سے عادل ہوتا ہے؟  
گ۔۔ جی۔

میں۔ کیا فرد میں صل کچھ دھندلا اور کم روشن ہے اور یہاں بھی اسی بہت وہی ہے جو رایت میں تھی یا کچھ مختلف؟  
گ۔۔ میرے خیال میں تو کوئی اختلاف نہیں۔

میں۔ میں نے اسلئے پوچھا کہ اگر اب بھی ہمارے ذہن میں اس کی بابت کچھ شبہات باقی ہوں تو چند روز مرہ کی عام مثالوں سے میرے بیان کی تصدیق ہو جائے گی۔

گ۔۔ کیسی مثالیں؟

میں۔۔ مثلاً اگر ہائے سامنے یہ معاملہ پیش ہو تو کیا ہم پشیم نہ کرینگے کہ ایک عادل ریاست یا ایک ایسا شخص جس کی تربیت یہی ریاست کے اصولوں میں ہوئی ہو اس میں بتفاوید ایک غیر منصف شخص کے سونے چاندی کی ایک مانت کو لے اٹھنے کے کم امکانات ہیں۔ کیوں کیا کوئی اس سے انکار کر سکتا ہے؟

گ۔۔ کوئی نہیں۔

میں۔۔ کیا ایک عادل انسان یا شہری کبھی اہانت مذہب یا سرقہ کا مرتکب ہو سکتا ہے یا اپنے دوست یا ملک کے ساتھ دغا بازی اور غداری کر سکتا ہے؟

گ۔۔ کبھی نہیں۔

میں۔۔ کبھی اپنی قسم اور عہد توڑ سکتا ہے؟

گ۔۔ ناممکن۔

میں۔۔ اگر کتاب زنا، اہانت الدین، فرائض دینی کی ناخوانی، کاجستہ رقم احتمال اس شخص سے ہے اور کسی سے نہ ہوگا۔

گ۔۔ جی، کبھی نہیں۔

میں۔۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس کا ہر جزو اپنا کام انجام دے رہا ہے، چاہے یہ کام حکومت ہو یا محکومی۔

گ۔۔ بیشک۔



میں۔ کیا آپ اس بیان سے مطمئن ہیں کہ جو صفت ایسے افراد اور ایسی باتوں کو جو میں لاتی ہوں اسی کا نام عدل ہے؛ یا آپ کسی اور انکشاف کی اُمید رکھتے ہیں؟  
گ۔ نہیں، مجھے تو کوئی اور اُمید نہیں۔

میں۔ اچھا تو ہمارا خواب پورا ہوا۔ اور اس تعمیر کے آغاز میں ہمیں جو شبہ ہوا تھا کہ عدل کی اصلی صورت تک کسی الہی قوت نے ہمیں پہنچایا ہے، اس کی اب تصدیق ہو گئی۔

گ۔ جی ہاں، بیشک۔

میں۔ اور وہ تقسیم عمل جس کی رو سے بڑھتی، موجی، اور دوسرا ہل سرف سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ اپنا اپنا کام دیکھیں دوسرے کے کام میں دخل نہ دیں، دراصل عدل کا ایک سایہ تھا، اور اسی لیے بہت کارآمد ثابت ہوا۔  
گ۔ ظاہر ہے۔

میں۔ لیکن درحقیقت عدل کو انسان کے ظاہر سے سروکار نہیں باطن سے ہے کہ یہی انسان کی اصلی اور اس کی حقیقی غایت ہے۔ عادل آدمی اپنے مختلف اندرونی عناصر کو ایک دوسرے میں مداخلت کی اجازت نہیں دیتا؛ نہ ایک کو دوسرے کا کام کرنے دیتا ہے۔ وہ اپنی باطنی زندگی کو منضبط کر لیتا ہے۔ خود اپنا آقا ہوتا ہے، خود ہی اپنے لیے قانون بنا لیتا ہے، اور اپنی ذات سے برسرِ پیکار نہیں ہوتا، بلکہ صلح و سلامتی کے ساتھ رہتا ہے۔ جب یہ اس طرح اپنی روح کے تینوں اصول کو (جو بنزرا اوپر نیچے اور

متوسط مقامات صوت اور ان کے درمیانی فصل کے ہیں، باہم متحد کر لیا جاوے اور ہمیں کثرت باقی نہیں رہتی بلکہ ایک معتدل اور منضبط طبیعت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر وقت ضرورت یہ عمل کی طرف اپنا قدم اٹھاتا ہے، خواہ یہ عمل اطلاق کے بارے میں ہو یا ہم کے علاج کے متعلق یا کوئی سیاسی یا خانگی معاملہ جو چیز اس متناسب اور یک آئینہ کیفیت کو قائم رکھے یا اس میں مدد ہو اسے یہ نیک اور عادلانہ سمجھیں گے اور کہیں گے جو علم اس عمل خیر کا باعث ہو اسے حکمت و عقل سے تعبیر کریں گے، جو عمل اس کیفیت میں حائج ہو اسے غیر عادلانہ قرار دیں گے اور جو اسے و قیاس اس کی وجہ ہوگی اسے جہل۔

گ :- آپ نے بالکل ٹھیک ٹھیک حقیقت کا اظہار فرما دیا۔

میں :- بہت خوب۔ تو اگر ہم اب یہ دعویٰ کریں کہ ہم نے عادل انسان اور عادل ریاست کا پتہ چلا لیا اور ان دونوں میں عدل کی ماہیت بھی دریافت کر لی تو غالباً ہم دروغ بیانی کے مرتکب نہ ہونگے؟

گ :- یقیناً نہیں۔

میں :- تو پھر کیا ہم یہ دعویٰ کریں؟

گ :- ہاں ہاں، کیوں نہیں۔

میں :- اچھا تو اب نا انصافی پر غور کرنا باقی رہا۔

گ :- ظاہر ہے۔



میں :- نا انصافی ان تینوں اصولوں میں کشمکش اور پیکار کی حالت ہوگی  
 ہر دم مداخلت بیجا، ہر لحظہ ایک دوسرے کی راہ میں حائل ہونا، روح کے ایک جنم  
 کا گل کے خلاف غم بغاوت بلند کرنا، ناجائز و ناروا اختیار کا دعویٰ جو باغی رعایا  
 اپنے حقیقی بادشاہ کے خلاف کرتی ہو اگرچہ قدرتاً اس کی باج گزار ہے۔ یہ تمام  
 پراگندگی اور فریب کیا ہو اگر نا انصافی، بے عفتی، بزدلی، جہل اور شرکی شکلیں  
 گ :- یقیناً۔

میں :- اگر عدل و نا انصافی کی ماہیت معلوم ہو تو غیر منصفانہ عمل کرنے  
 اور غیر منصف ہونے یا منصفانہ عمل کرنے کے معنی بالکل صاف ہونگے۔  
 گ :- آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں :- ان کی مثال صحت و مرض کی سی ہے۔ روح میں ان کی حیثیت  
 وہی ہے جو جسم میں صحت و مرض کی۔  
 گ :- یہ کیسے؟

میں :- جو جسم ہے وہ صحت کا باعث بھی ہوتا ہے، جو مریض ہے وہ مرض  
 پیدا کرتا ہے۔

گ :- جی۔

میں :- عادلانہ اعمال عدل کے باعث ہیں اور غیر عادلانہ نا انصافی کے  
 گ :- یہ تو یقینی ہے۔

میں۔ اور صحت پیدا کرنے کے معنی ہیں اجزاء و اجسام میں فطری نظام حکومت کا قائم کر دینا۔ مرض نام ہے اس فطری نظام سے متعارف حالات کے پیدا ہونے کا۔  
گ۔۔ درست۔

میں۔ اسی طرح کیا عدل اجزاء و روح میں ایک فطری نظام حکومت کے قیام کا نام نہیں اور کیا نا انصافی اس فطری نظام کے مخالف صورت حالات کے پیدا ہونے کو نہیں کہتے؟  
گ۔۔ بیشک۔

میں۔۔ لہذا نیکی و خیر روح کی صحت، اسکی فلاح، اور اس کا حسن ہونے اور شر اس کا مرض، اس کی کمزوری اور بدصوتی ہے۔  
گ۔۔ درست۔

میں۔۔ اور کیا اعمال صالحہ نیکی کی طرف اور اعمال سیئہ بُرائی کی طرف نہیں لے جاتے؟  
گ۔۔ یقیناً۔

میں۔۔ اب تک عدل اور نا انصافی کے اعتباری فوائد کے پرانے سوال کا جواب نہیں ہوا۔ عادل بنا، عادلانہ اعمال کرنا، نیکی پر کار بند ہونا خواہ دیوتا اور انسان دیکھیں یا نہ دیکھیں یہ زیادہ سود مند ہے یا غیر منصف ہونا اور غیر منصفانہ اعمال کرنا بشرطیکہ اصلاح و تادیب ہو۔



گ۔۔ میری رائے میں تو یہ سوال اب کچھ مضحکہ خیز سا ہو گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جب کسی شخص کا نظام جسمانی بگڑ جاتا ہے تو زندگی دو بھر ہو جاتی ہے چاہے پھر سے طرح طرح کے کھانے پینے کی چیزوں سے کتنا ہی پرکرو اور خواہ کتنی ہی دولت اور قوت باس کیوں نہ ہو۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ جب اصول حیات کی جڑا لودہ اور کھوکھلی ہو جائے تو اس وقت بھی انسان کے لیے زندگی اس لیے کوئی رکھنے کے قابل چیز ہو سکتی ہے کہ سولے عدل اور نیکی کے حصول کے اور نمانضانی سے بچنے کے وہ جو چاہے کر سکتا ہے؟ اور پھر عدل و نمانضانی، خیر و شر کی ماہیت وہ جو ہم نے بیان کی ہے؟

میں۔۔ بیشک آپ کے نزدیک یہ سوال مسخرانگیز ہے۔ لیکن پھر بھی چونکہ ہم اس مقام سے قریب ہیں جہاں سے خود اپنی آنکھوں سے حقیقت کا صاف نظارہ ہو سکتا ہے تو پھر راہ میں کیوں رک جائیں۔  
گ۔۔ ہاں، ہرگز نہ رکے۔

میں۔۔ اچھا تو ادھر آؤ۔ اور شرکی مختلف شکلیں دیکھو، میرا مطلب اسے ہی جو دیکھنے کے قابل ہیں۔

گ۔۔ ہاں ہاں، آپ چلیے میں بھی پیچھے پیچھے آتا ہوں۔

میں۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری دلیل اس قدر بلندی پر پہنچ گئی ہے کہ وہاں سے ایک مشاہدہ کی مینار کی طرح آدمی نیچے دیکھ سکتا ہے کہ نیکی و خیر تو ایک ہی ہے لیکن

پرائی اور شرکی بیشمار شکلیں ہیں، ان میں سے چار خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں۔  
گ۔۔ وہ کونسی؟

میں۔۔ میرا مطلب یہ ہے کہ روح کی بھی اتنی ہی قسمیں معلوم ہوتی ہیں جتنی  
رہایت کی مختلف شکلیں ہیں۔

گ۔ یعنی کتنی؟

میں۔۔ رہایت کی پانچ قسمیں ہیں اور روح کی بھی پانچ ہیں۔

گ۔۔ یہ کیا قسمیں ہیں؟

میں۔۔ پہلی قسم تو وہ ہے جس کا بیان ہم لوگ کر رہے تھے اور اس کے دو نام ہیں  
شخصی یا موثری، شخصی اگر ایک ممتاز آدمی حکومت کرے اور موثری اگر بہت سے  
آدمی حکومت کریں۔

گ۔۔ درست۔

میں۔۔ لیکن میرے نزدیک یہ دونوں نام ایک ہی قسم کا اظہار کرتے ہیں، کیونکہ

عنانِ حکومت ایک شخص کے ہاتھ میں ہو یا بہت سوں کے، اگر حکام کی تربیت سطح  
ہوئی ہے جیسی کہ ہم فرض کر رہے ہیں تو رہایت کے اصولی اور بنیادی قوانین ضرور  
قائم رکھے جائیں گے۔

گ۔۔ بالکل درست۔





# پہلی کتاب

میں۔ اچھے شہر اور حقیقی ریاست کا تو یہ حال ہے، اور نیک اور کامل انسان بھی اسی نمونہ کے مطابق ہوتا ہے؛ اور اگر یہ نمونہ صحیح ہے تو دوسرے سب کے غلط ہیں۔ پھر اسی طرح بُرائی بھی وہی ہے جو صرف ریاست ہی کے نظام کو متاثر نہ کرے بلکہ انفرادی رُوح کے انضباط میں بھی حائل ہو۔ اور یہ چار شکلوں میں دیکھا ہوتا ہے۔

گ۔ وہ کیا؟

میں ان چار بُرائیوں کو بالترتیب بیان کرنا ہی چاہتا تھا کہ باہم کس نے جو ایڈی مینٹس سے ذرا اوپر قریب ہی بیٹھا تھا اپنا ہاتھ بڑھایا اور شانہ کے تڑپ اس کا کوٹ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا، اور خود بھی اس کی طرف ذرا جھک کر آہستہ سے کان میں کچھ کہا میں بس اتنا سن پایا کہ ”وہ انھیں جانے دیں یا کیا کریں؟“ ایڈی مینٹس نے اس کے جواب میں ذرا اونچی آواز سے کہا ”نہیں ہرگز نہیں“ میں۔ وہ کون غریب ہے جس کی رہائی سے آپ انکار کرتے ہیں؟



ایڈ۔۔ خود جناب !

میں۔۔ کیوں؟ آخر مجھے رہا نہ کرنے کی کیا خاص وجہ؟

ایڈ۔۔ اس لیے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ آپ سُست آدمی ہیں۔ اور اس قصہ کے ایک ٹپے کے پوسے باب سے ہیں آپ دہوکا دیکر نکال لیجانا چاہتے تھے۔ آپ شاید سمجھتے تھے کہ ہم آپ کے اس ہوائی انداز گفتگو کو نہ معلوم کر سکیں گے۔ آپ نے تو ابھی ابھی ایسے فرمایا گو یا ہر شخص پر یہ بات بین اور ظاہر ہے کہ عورتوں اور بچوں کے معاملہ میں ”احباب کے ماہین سب کچھ مشترک ہونا چاہیے“

میں۔۔ تو ایڈی مین شس! کیا یہ ٹھیک نہ تھا؟

ایڈ۔۔ بیشک، لیکن بہت سی ٹھیک باتوں کی بھی تو تشریح کی ضرورت ہوتی ہو۔ مثلاً یہ کہ اشتراک کئی قسم کا ہوتا ہے۔ لہذا براہ کرم بتائیے کہ آپ کا مقصد کس قسم کے اشتراک سے ہے؟ ہم بڑی دیر سے متوقع بیٹھے تھے کہ آپ شہریوں کی خانگی زندگی کے متعلق کچھ فرمائیں گے؛ کہ ان کے بچے کیسے پیدا ہوں گے؛ پیدائش کے بعد یہ ان کی پرورش کس طرح کریں گے؛ اور بہ الفاظ عام اس اشتراک نے زندگی کی نوعیت کیا ہوگی۔ اس لیے کہ ہمارے خیال میں ان معاملات کا اچھا یا بُرا انتظام ریاست کی تحسین یا تخریب پر بہت گہرا اثر رکھینگا۔ اور چونکہ اس سوال کا جواب ہنوز متعین نہیں ہوا اور آپ لگے دوسری ریاست کی طرف متوجہ ہونے، اسیلئے جیسا آپ نے خود سن لیا، ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ جب تک آپ ان سب باتوں کو

بیان نہ کر دیں آپ کو ہرگز نہ چھوڑا جائے۔

گلاکن :- اس قرار داد سے میں بھی بالکل متفق ہوں۔

تھریسی میکس :- زیادہ ہنگامہ کی ضرورت نہیں؛ آپ سمجھئے کہ ہم سب سے باتفاق رائے منظور کیا۔

میں :- آپ لوگ نہیں جانتے کہ مجھ پر اس طرح چھا پامار کر آپ لوگ دراصل کیا کر رہے ہیں۔ اللہ آپ پر است کے متعلق پھر کس مسئلہ کو چھپرتے ہیں؟ میں تو سمجھا تھا کہ بس میں نے اپنا بیان ختم کیا اور خوش تھا کہ اس مسئلہ کو اس وقت تو ختم کر دیا، اپنی خوش نصیبی پر ناز کر رہا تھا کہ آپ لوگوں نے میری گزارش کو شرف پذیرائی بخشا۔ لیکن آپ تو اب مجھے پھرتے سرے سے چلنے کا حکم دیتے ہیں شاید آپ نہیں جانتے کہ آپ الفاظ کی بھڑوں کے کس چھتے کو چھپرتے ہیں۔ میں آنے والی مصیبت کو سمجھتا تھا اور اسی لیے بچ کر نکلا تھا۔

تھریسی میکس :- لیکن آپ کے خیال میں آخر ہم لوگ یہاں کس لیے حاضر ہوئے ہیں، چشمہ جیواں کی تلاش میں یا آپ کی تقریر سننے؟

میں :- درست۔ لیکن آخر تقریر کی بھی تو کوئی انتہا ہوتی ہے۔

گلاکن :- جی، عقلمندوں کے نزدیک اس قسم کی تقریریں سننے کی حد ساری عمر ہے۔ لیکن خیر نہیں جانے دیجئے، ہمارا خیال نہ کیجئے۔ آپ خود ہمت کیجئے اور اپنے انداز خاص میں اس سوال کا جواب دیجئے۔ عورتوں اور بچوں کا وہ کیسا اشتراک ہو جو



ہمارے محافظین میں رنج ہونا چاہیے۔ ولادت اور تعلیم شروع ہونے کے درمیان کے زمانہ میں بچوں کا کیا انتظام ہوگا، کہ اس زمانہ میں بڑی نگہداشت کی ضرورت ہے۔ ان چیزوں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمائیے۔

میں :- بجا و درست۔ لیکن میرے بھولے دوست! اس کا جواب تیار دشوار ہے۔ گذشتہ بالائے ناسخ کے مقابلہ میں اس معاملہ پر بہت زیادہ شبہات وارد ہوئے ہیں۔ اول تو اس تجویز کا قابل عمل ہونا مشتبہ، اور پھر دوسرے نقطہ نظر سے دیکھو تو اگر قابل عمل سہی تو اس کا مفید اور اچھا ہونا بھی مشتبہ۔ اس لیے میں اس مسئلہ پر گفتگو کرتے جھکتا ہوں کہ کہیں ہماری آرزوئیں بس ایک خواب نہ ثابت ہوں۔

گلاکن :- بہت ڈریئے نہیں۔ آپ کے سامعین بہت سخت گیری کریں گے؛ ان میں نہ تشکک ہو نہ مخالف۔

میں :- یہ کہہ کر آپ شاید میری ہمت بندھا نا چاہتے ہیں۔

گ :- جی ہاں؟

میں :- تو میں آپ سے عرض کر دوں کہ آپ اس کے بالکل مخالف عمل کر رہے ہیں۔ آپ کی ہمت افزائی نہایت خوب ہونی اگر خود مجھے یقین ہوتا کہ جس چیز پر میں گفتگو کر رہا ہوں اس سے واقف ہوں۔ ان امور مہمہ کے متعلق جن کی آدمی وقعت کرتا اور جسے محبت کھتا ہے، ایک ایسے مجمع عقلا ہیں جو سب خود اس کی

ذات سے اُٹس کھتے ہوں، اعلانِ حق باعثِ خوف و تذبذب نہ ہونا چاہیے۔ لیکن جب آدمی خود تذبذب ہو اور پھر اس مسئلہ کے متعلق دلیلیں کرے تو یہ خطرناک بات ہے۔ اور یہی حال میرا ہی ہے۔ مجھے اس کا خوف نہیں کہ لوگ مجھ پر ہنسیں گے؛ یہ خوف تو سراسر غلطی ہے، بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ جہاں اپنے قدم پر پوتے، اعتماد کی ضرورت ہے وہیں پاؤں لغزش نہ کھائے اور حقیقت سے محروم نہ رہوں اور خود گروں سو گروں کیسے احباب کو بھی ساتھ نہ گراؤں۔ میں انتقام کی دیوی سے دست بدعا ہوں کہ میں جو کچھ کہنے والا ہوں وہ سچ ہی پر صادق ہو۔ کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ کسی انسان کو بلا ارادہ قتل کر دینا اتنا بڑا جرم نہیں جتنا کہ حسنِ خوبی اور اصولِ عدل ٹھانڈا کرنے کے متعلق کسی کو دھوکا دینا۔ اور یہ خطرہ ایسا ہے کہ میں دشمنوں میں تولے برداشت بھی کروں لیکن دوستوں میں ہرگز نہیں کر سکتا۔ آپ نے دیکھا کہ آپ کی ہمت افزائی نے کیا کام کیا؟

گلا گن۔ (ہنکرا) اچھا اگر آپ نے یا آپ کے دلائل نے ہمیں کوئی سخت نقصان پہنچایا تو ہم پہلے سے آپ کو قتل کے جرم سے بری کرتے ہیں اور آپ کو دھوکا یا فریب دینے والا بھی قرار نہ دینگے۔ ہمت کیجئے اور فرمائیے۔

میں :- قانون کی رو سے اگر کوئی شخص ہا کر دیا جائے تو گویا وہ جرم سے

بری ہے، اور جو قانون کا دستور ہے وہی بحث و مباحثہ میں بھی سہی!

گ :- تو پھر کیا خیال ہے؟



میں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ذرا نیچے ہٹنا پڑے گا، اور اس وقت وہ کہنا ہوگا جو پہلے کہہ چکنا چاہیے تھا اچھا مردوں کا حصہ تو پورا ہو گیا، اب قدرتا عورتوں کی باری ہے۔ میں اب انکا ذکر کرتا ہوں، اسوجہ سے اور بھی کہ آپ لوگ اصرار کرتے ہیں۔

ہمارے شہریوں کی سی طبیعت اور تعلیم کے لوگوں کے لیے عورتوں اور بچوں کی حیثیت اور ان کے استعمال کے متعلق صحیح نتیجہ پر پہنچنے کا بس ایک ہی راستہ ہے یعنی وہ جس سے ہم نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا تھا، کہ مردوں کی وہ حیثیت مانی جائے جو گلے میں محافظوں نگراں کتے کی ہوتی ہے۔

گ۔۔۔ دست۔

میں۔۔۔ تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیجئے کہ ہماری عورتوں کی تولید و تعلیم بھی نہیں یا تقریباً ایسے ہی ضوابط کی پابند ہے۔ اس کے بعد معلوم ہوگا کہ آیا نتیجہ ہمارا ارادہ کے مطابق ہے یا نہیں۔

گ۔۔۔ کیا، اس سے آپکا کیا مطلب ہے؟

میں۔۔۔ میرا مفہوم ایک سوال کی شکل میں کھا جاسکتا ہے یعنی کیا کتوں تکیر و تانبہ کی تفریق ہوتی ہے؟ یا وہ سب سب شکار، نگہبانی اور دیگر فرائض کیساں انجام دیتے ہیں؟ یا ایسا ہوتا ہے کہ ہم صرف نرکتوں کو تو گلہ کی نگہداشت کے لئے چھوڑ دیں اور کتوں کو یہ سمجھ کر گھر پر رہنے دیں کہ بچے دینا اور انھیں دودھ پلانا

ان کے لیے بس کافی محنت ہے؟  
 گ۔۔ نہیں، وہ تو سب یکساں ان کاموں میں شریک ہوتے ہیں، صرف  
 اتنا فرق ہوتا ہے کہ نرؤں زیادہ مضبوط ہوتے ہیں اور مادہ ذرا کم نور۔  
 میں۔۔ اچھا بتاؤ کہ اگر دو جانوروں کو ایک سی تربیت اور ایک سی غذا  
 نہ دی جائے تو کیا وہ دونوں ایک ہی کام کر سکتے ہیں؟  
 گ۔۔ نہیں۔

میں۔۔ چنانچہ اگر عورتوں اور مردوں کے فرائض ایک سے ہیں تو ان کی  
 تعلیم اور پرورش بھی ایک ہی ہونی چاہیے۔  
 گ۔۔ جی ہاں۔

میں۔۔ مردوں کے لیے ہم نے جو تعلیم تجویز کی ہے وہ تو ورزش اور موسیقی ہے۔  
 گ۔۔ جی۔

میں۔۔ تو کیا عورتوں کو بھی موسیقی اور ورزش جسمانی کی تعلیم دیجائے، نیز  
 فن حرب کی اسپر یہ بھی مردوں کی طرح عمل پیرا ہوں۔  
 گ۔۔ جی، نتیجہ تو یہی نکلتا ہے۔

میں۔۔ میرا گمان ہے کہ ہماری تجاویز اس درجہ غیر معمولی ہیں کہ اگر عمل میں آئیں  
 تو شاید مضحکہ انگیز ثابت ہوں۔  
 گ۔۔ اس میں کیا شک ہے۔



میں۔ ہاں، اور سب سے زیادہ مضحکہ خیز منظر یہ ہوگا کہ اکھاڑے میں عورتیں مردوں کے ساتھ برہنہ ورزش کرتی ہوں۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ انکا زمانہ شباب رخصت ہو گیا ہو، کہ پھر اس وقت تو یہ منظر حسن بھی باقی نہ رہے گا جیسے تم نے دیکھا ہو بعض معمر لیکن جوشیلے لوگ باوجود اپنی بد صورتی کے سارے بدن کا گوشت لٹکا اور ٹھجڑیاں پڑی ہیں، اکھاڑوں کی گرد چھانتے پھرتے ہیں۔

گ۔ جی، موجودہ خیالات کے مطابق تو یہ تجویز نہایت مضحکہ خیز تصور ہوگی میں۔ لیکن ہم لوگوں نے چونکہ اپنے خیالات کے اظہار کا تہیہ کر لیا ہے، اس لیے ہم ظریف طبع لوگوں کے ان فقروں کا کچھ خیال نہ کریں گے جو اس حدت کو بد فحاشی ملامت بنائیں، ہمیں اس کی کیا پروا ہے کہ وہ موسیقی اور ورزش میں عورتوں کی قابلیت صلاحیت کا کس طرح ذکر کریں گے، یا انکے زرہ بکتر پہن کر گھوڑوں پر چڑھنے کا کیسا خاکہ اڑائیں گے۔

گ۔ بالکل بجا۔

میں۔ لیکن جب ایک دفعہ شروع کر دیا تو اس قانون کے ناگوار حصول کو بھی لینا ہی ہوگا۔ اور ہم ان حضرات سے التجا کریں گے کہ زندگی بھر میں بس ایک مرتبہ تو ذرا سنجیدہ بن جائیں۔ ہم انھیں یاد دلائیں گے کہ بہت دن نہیں ہوئے خود اہل یونان کا یہ خیال تھا اور غیر مہذب قوموں میں تو اب بھی موجود ہے کہ کسی برہنہ مرد کو دیکھنا نہایت غیر مناسب اور مضحکہ خیز ثابت ہے، اور جب پہلے پہل اہل کریٹ

اور ان کے بعد اہل لیبی ڈی مونیانے اس رسم کو شروع کیا تو اس زمانے کے  
ظریف بھی بعینہ اسی طرح اس حدت کا مذاق اڑا سکتے تھے۔  
گ۔۔ بیشک۔

میں۔۔ لیکن جب تجربہ بنے ہندو دیا کہ سب چیزوں کا کھلا رکھنا انھیں چھپانے  
سے بہتر جو اور ظاہر میں آنکھ پر جو مضحکہ خیز اثر اس منظر کا ہوتا تھا جب وہ عقل کے بہتر  
اصولوں کے سامنے غائب ہو گیا تو اس شخص کی جو قوی معلوم ہو گئی جو حماقت  
اور بُرائی کے علاوہ کسی اور چیز کو اپنے طعن و تمسخر کا نشانہ بناتا اور جس کے اندازہ  
کے لیے خیر و خوبی کے علاوہ کوئی اور معیار مقرر کرتا ہی۔  
گ۔۔ بالکل درست۔

میں۔۔ خواہ اس سوال کو مزاح میں لیجئے یا سنجیدگی کے ساتھ سوچیئے  
سب سے پہلے ہمیں عورت کی فطرت کے متعلق ایک بات پر قائم ہو جانا چاہیئے۔  
یعنی آیا وہ کلی یا جزوی حیثیت سے مرد کے کاموں میں شریک ہو سکتی ہے  
یا مطلق نہیں؟ آیا فن حرب منجملہ ان ہنسون کے ہر جن میں وہ شرکت کر سکتی ہے؟  
غالباً تحقیق کے شروع کرنے کا یہی بہترین طریقہ ہوگا اور غالباً اسی سے بہترین  
نتائج نکل سکیں گے۔

گ۔۔ بیشک یہی بہترین طریقہ ہوگا۔

میں۔۔ کیوں، تو پھر ہم پہلے اس دلیل کا دوسرا رخ نہ لے لیں یعنی اپنے



خلافت دلیل پیش کریں۔ اس طرح مخالفت کا دعویٰ بلا وکالت نہ رہے گا۔

گ۔۔ ہاں ہاں، ضرور، کیوں نہیں۔

میں :- اچھا تو اپنے مخالفوں کی زبان سے ایک تقریر کریں۔ وہ لوگ کچھ یوں کہیں گے : ”جناب سقراط اور گلاکن ! اس کی ضرورت ہی کیا کہ کوئی مخالفت آپ پر الزام لگائے ! آپ نے تو خود ریاست کی بنیاد ڈالتے وقت اس اصول کو تسلیم کیا تھا کہ ہر شخص بس وہی کام کرے جسکے لیے وہ فطرتاً موزوں ہے“ اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ بات ہم نے تسلیم ضرور کی تھی۔

”اور کیا عورت اور مرد کی فطرت میں بہت بڑا تفاوت نہیں ہوتا؟“

ہم جواب دینے کے متشکک ہوتا ہے۔ پھر سوال ہو گا کہ ”عورتوں اور مردوں کو جو کام

تفویض کیے جائیں کیا وہ علیحدہ علیحدہ اور ان کی مختلف طبائع کے مناسب نہ ہونے

چاہئیں؟“ جواب : بیشک ہونے چاہئیں۔ ”پھر اگر ایسا ہے تو آپ نے یہ کہہ کر

کیسی بے جوڑ بات کی کہ مرد اور عورتیں جن کی طبائع اس درجہ متباہن ہیں جسکے

سب یکساں کام کریں“ کوئی یہ اعتراض کرے تو جناب من، اس کا جواب آپ کے

پاس ہے؟

گ۔۔ ہاں، اگر یکساں کوئی یہ سوال پوچھ بیٹھے تو اس کا جواب کچھ سہل نہیں

اور میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اپنی طرف سے بھی اس معاملہ کی پیروی کریں

میں :- میاں گلاکن ! یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے اعتراضات ہیں

جنہیں میں پہلے سے سمجھ رہا تھا اور اسی لیے عورتوں اور بچوں کی تھیک اور پرورش کے متعلق کسی قانون کی تدوین کو ہاتھ لگانے سے خائف و متردد تھا۔

گ۔۔۔ زبیں کی قسم! یہ مسئلہ اور چاہے کچھ ہو، آسان تو ہرگز نہیں۔  
میں۔۔۔ ہاں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب آدمی اپنے قدم سے زیادہ پانی میں گرا تو چاہے وہ تیرنے کا تالاب ہو یا بحرِ ذخارت سے لیکھاں ہی تیرنا پڑتا ہے۔  
گ۔۔۔ بیشک۔

میں۔۔۔ تو پھر ہم بھی تیر کر ساحل تک پہنچنے کی کوشش کیوں نہ کریں۔  
امید رکھنی چاہیے کہ آریون کی ڈالمن یا کوئی اور غیبی طاقت مدد کر کے ہمیں بچالے گی۔

گ۔۔۔ مجھے بھی یہی امید ہے۔

میں۔۔۔ اچھا تو آؤ، دیکھیں کہ اس سے بچنے کی کوئی صوت بھی ہے۔  
تسلیم کیا تھا کہ مختلف طبائع کے لیے مختلف کام ہونے چاہئیں اور یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ عورتوں اور مردوں کے طبائع مختلف ہیں۔ کیوں تسلیم کیا تھا نا؟ اور اب ہم کیا کہتے ہیں؟ یہ کہ مختلف طبائع کے لیے ایک ہی شغل ہو۔ ہم پر اس بے جواز اور متناد بات کا الزام لگایا جاتا ہے۔

گ۔۔۔ جی ہاں، بس یہی الزام ہے۔

میں۔۔۔ فن مناظرہ کی قوت بھی عجب شان رکھتی ہے؟



گ :- یہ آپ نے کیوں فرمایا؟

میں :- اس لیے کہ میرے خیال میں اکثر لوگ اپنے ارادہ کے خلاف اپنی عمل پیرا ہونے لگتے ہیں۔ آدمی سمجھتا ہے کہ معقول دلیل ہے رہا ہے، لیکن دراصل مناظرہ میں مشغول ہوتا ہے۔ اور یہ صرف اس لیے کہ تقسیم و تعریف نہ کر سکنے کے باعث وہ اپنے موضوع گفتگو سے ہی واقف نہیں ہوتا۔ مناظرہ و مباحثہ کی خاطر محض لفظی مخالفت میں پڑا رہتا ہے اور اصل مسئلہ پر کوئی معقول تحقیق نہیں کرتا۔

گ :- جی ہاں، اکثر ایسا ہوتا ہے؛ لیکن اسے آخر ہم سے یا ہماری بحث کو کیا واسطہ؟

میں :- کیوں، بہت کچھ یقیناً ہمارے لیے بھی بے جانے اسی لفظی بحث میں گرفتار ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

گ :- یہ کیسے؟

میں :- ایسے کہ ہم بھی تو نہایت شجاعانہ اور مجاہدانہ اسی لفظی حقیقت پر مصر ہیں کہ مختلف طبائع کی مناسبت سے مشاغل بھی مختلف ہونے چاہئیں۔ لیکن ہم نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ طبیعت کی کیسانی یا اختلاف کا مفہوم کیا ہے اور ہم نے جب یکساں طبیعت والوں کو ایک سے اور مختلف طبیعت والوں کو مختلف مشاغل سپرد کیے تھے تو آخر یہ تفریق ہم نے کی کیوں تھی؟

گ :- ہاں، بیشک۔ اس کا تو ہم نے بالکل خیال نہ کیا۔

میں۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے ہم پوچھیں کہ گنجے اور بالدار آدمی میں  
اختلاف طبیعت ہی یا نہیں۔ اگر ہم اختلاف تسلیم کر لیں اور گنجے لوگ موجی کا کام  
کرتے ہوں تو کیا ہم تمام بالدار شخصوں کے لیے موجی کا کام ممنوع قرار دیں گے

اس کے مخالف صورت میں اس کے برعکس؟

گ۔۔۔ یہ تو عجیب ال لگی ہو جائیگی۔

میں۔۔۔ بیشک مذاق ہوگا۔ لیکن سہ کیوں؟ اس لیے کہ تعمیر مابیت  
کے وقت ہمارا مطلب یہ نہ تھا کہ یہ اختلاف ہر معمولی فرق سے عبارت ہی بلکہ  
وہ فرق پیش نظر تھے جسے اس فرد کے شغل پر اثر پڑتا ہے۔ مثلاً ہمیں کہنا چاہیے تھا  
کہ ایک طبیب اور ایک ایسا شخص جس کے دماغ کو طب سے مناسبت ہو دونوں  
ایک سی طبیعت رکھتے ہیں۔

گ۔۔۔ درست۔

میں۔۔۔ لیکن طبیب اور بڑھئی کے طبائع مختلف ہیں۔

گ۔۔۔ بیشک۔

میں۔۔۔ اب اگر مردوں اور عورتوں میں باعتبار ان مشاغل و فنون کے  
کوئی فرق ہی جنمیں وہ مصروف ہونا چاہتے ہیں تو پھر تو ہمیں ضرور ایک شغل ایک  
صنف کو اور دوسرا دوسرے کو تفویض کرنا چاہیے لیکن اگر فرق صرف اتنا ہے کہ غور  
نیچے جتنی اور مرد نیچے پیدا کرتے ہیں، تو میرے نزدیک یہ تو اس امر کا ثبوت نہیں ہے



کہ جس قسم کی تعلیم مرد کو دیا جائے وہ عورت کے لیے مناسب نہیں۔ چنانچہ ہم اس خیال پر قائم رہ سکتے ہیں کہ محافظین اور ان کی بیویاں دونوں کے لیے ایک شکل ہونا چاہیے۔

گ۔۔ بالکل صحیح۔

میں۔۔ اب ہم اپنے مخالف سے پوچھیں کہ باعتبار مشاغل اور شہری زندگی کے فنون کے لحاظ سے عورت کی طبیعت مرد سے کس طرح مختلف ہے؟

گ۔۔ ہاں، بالکل جائز سوال ہے۔

میں۔۔ اور غالباً وہ بھی آپ کی طرح یہ جواب دیگا کہ فوراً تو اس سوال کا جواب دینا سہل نہیں، البتہ تھوڑے سے غور کے بعد کوئی دشواری نہ رہے گی۔

گ۔۔ جی، غالباً یہی جواب ملے گا۔

میں۔۔ اچھا تو ہم اسے دعوت دیں کہ گفتگو میں ذرا ہمارا ساتھ دے۔ اور مجھے امید ہے کہ ہم اس پر واضح کر سکیں گے کہ عورت کی طبیعت میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں جس کا اثر انتظام ریاست کے کام پر پڑتا ہو۔

گ۔۔ ضرور دعوت دیجیے۔

میں۔۔ ہم اس سے کہیں، ”آئیے۔ ہم آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتے ہیں۔ آپ نے جو یہ فرمایا کہ کسی میں ایک چیز کا ملکہ ہوتا ہے کسی میں دوسری کا تو اس سے آپ کا مطلب کیا تھا؟ کیا یہ مفہوم تھا کہ ایک آدمی ایک چیز کو آسانی سے حاصل

کر سکتا ہے اور دوسرا مشکل سے؛ ایک تھوڑا سا علم حاصل کیے کے بہت سے اختلافات  
 کر سکتا ہے، دوسرا سخت مطالعہ اور توجہ کے بعد بھی جو کچھ سیکتا ہے بھلا دیتا ہے اور ایک  
 کا جسم اس کے ذہن کا اچھا تابع اور دوسرے کا جسم اس کے لیے ایک سنگ راہ  
 ہے؛ ایک شخص جسے قدرت نے کچھ ودیعت کیا ہے اور دوسرا جسے کچھ نہیں ملا؛ دونوں  
 میں یہی وجوہ امتیاز ہو سکتی ہیں۔

گ۔۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے؟

میں۔۔ اور کیا آپ انسانی مشاغل میں سے کسی کا نام لے سکتے ہیں جس میں  
 مرد کو بقابلہ عورت کے یہ صفات زیادہ نہ ودیعت کیے گئے ہوں سینے، میں آپ کا  
 وقت نوربانی، مرتے اور نان خطائی کی طیاری وغیرہ کے ذکر میں کیوں ضائع کروں۔  
 کہ ان میں تو عورت درحقیقت افضل معلوم ہوتی ہے اور مرد یہاں آسانی سے رک  
 کھاتے اور اپنی مہنسی اڑواتے ہیں۔

گ۔۔ آپ صحیح فرماتے ہیں۔ عام طور پر عورتیں مردوں سے کم درجہ رکھتی ہیں۔  
 اگرچہ یہ بھی ضرور ہے کہ بہت سی عورتیں اکثر کاموں میں بہت سے مردوں سے بہتر  
 بہتر ہوتی ہیں۔ پھر بھی بحیثیت مجموعی آپ جو کچھ فرماتے ہیں درست ہے۔

میں۔۔ محب من۔ اگر ایسا ہے تو انتظام ریاست کے اعتبار سے کوئی ایسی

خاص قابلیت نہیں جو عورت میں بحیثیت عورت ہونے کے اور مرد میں بحیثیت  
 مرد کے موجود ہوتی ہو۔ قدرت کی دین دونوں میں یکساں بنتی ہے۔ جو مرد کے شغل



ہیں، سب عورت کے بھی شغل ہیں۔ ہاں، سب میں عورت مرد سے کمتر درجہ رکھتی ہے۔  
گ۔۔ بالکل صحیح۔

میں۔۔ ہاں، تو کیا ہم اپنے قوانین صرف مردوں ہی پر عائد کریں، عورتوں  
پر کچھ نہیں؟

گ۔۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے!

میں۔۔ ایک عورت میں مرض سے شفا دینے کی قابلیت ہوتی ہے دوسری  
میں نہیں۔ ایک ماہر موسیقی ہے اور دوسری کی فطرت میں موسیقی یکپلم مفقود۔  
گ۔۔ جی۔

میں۔۔ یا ایک عورت کہ ورزش جسمانی اور فوجی کاموں کی طرف رغبت  
ہوتی ہے، دوسری ورزش سے نفور اور جنگ سے بیزار۔  
گ۔۔ یقیناً۔

میں۔۔ کوئی عورت فلسفی ہوتی ہے، کوئی فلسفہ کی دشمن کسی میں جرأت ہوتی  
ہے، کسی میں یہ ہتیر سہے سے نمائے۔  
گ۔۔ جی۔

میں۔۔ یعنی کسی عورت کا مزاج محافظین کا سا ہے اور کسی کا نہیں؟ مرد محافظین  
کا انتخاب بھی تو آخر انہیں اختلافات کی بنا پر ہوا تھا؟  
گ۔۔ جی ہاں۔

میں :- عورت اور مرد دونوں میں محافظین کے صفات موجود ہوتے ہیں  
 فرق صرف ان کی اعتباری قوت اور کمزوری کا ہے۔  
 گ :- ظاہر ہے۔

میں :- جن عورتوں میں یہ صفات موجود ہوں انکا انتخاب کر کے ان مردوں  
 کا ساتھی اور معاون بنانا چاہیے جنہیں اسی قسم کی صفات ہوں اور جسے یہ بہ اعتبار  
 صلاحیت اخلاق مشابہ ہوں۔  
 گ :- بہت درست۔

میں :- اورکیساں طبائع کے لیے ایک سے ہی اشغال بھی چاہئیں۔  
 گ :- ضرور۔

میں :- چنانچہ جیسے ہم پہلے کہہ چکے ہیں، محافظین کی بیویوں کو ورزش  
 اور موسیقی کا کام تفویض کرنے میں کوئی خلاف فطرت بات نہیں گھوم گھام کر ہم پر  
 اسی نکتہ پر ان پہنچے۔  
 گ :- یقیناً کوئی خلاف فطرت بات نہیں۔

میں :- لہذا ہم نے جو قانون بنایا تھا وہ مطابق فطرت ہی۔ اور اس لیے نہ  
 غیر ممکن ہونہ محض ایک آرزو ہی آرزو۔ بلکہ آج کل جو اسکے خلاف عمل ہوتا ہے وہ اصل  
 یہ قوانین قدرت کی نافرمانی ہے۔

گ :- جی، آپ کا ارشاد معلوم تو صحیح ہوتا ہے۔



میں :- ہمیں پہلے تو یہ دیکھنا تھا کہ ہماری تجاویز پر عمل ممکن بھی ہو نہیں  
اور دوسری بات یہ تھی کہ اگر عمل ہو سکے تو آیا یہ سب سے زیادہ سومت تجاویز ہیں؟  
گ :- جی ہاں۔

میں :- اب انکا امکان تو مسلم ہو گیا؟  
گ :- جی۔

میں :- باقی رہا اسکے کثیر المنفعت ہونیکا ثبوت۔  
گ :- بیشک۔

میں :- آپ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ جو تعلیم مرد کو اچھا محافظ بناتی ہے وہ عورت  
کو بھی اچھا محافظ بنا سکیگی؛ کیونکہ ان کی اصلی طبیعت ایک ہے۔  
گ :- جی ہاں۔

میں :- اب میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔  
گ :- وہ کیا؟

میں :- بہت سباز خوبی کیا سب مرد باہم برابر ہیں یا ایک دوسرے سے  
بہتر ہوتا ہے؟

گ :- دوسری صورت صحیح ہے۔

میں :- اچھا تو ہم جن بایست کی بنیاد رکھ رہے ہیں اس میں وہ محافظ  
زیادہ کامل انسان ہونگے جن کی تربیت ہمارے مجوزہ نظام کے ماتحت ہوئی ہے

یادہ موچی جنہیں صرف موچی گری کی تعلیم ملی ہے؟

گ :- کیا خوب ! آپ نے بھی کس قدر مضحکہ خیز سوال دریافت فرمایا ہے !!  
 میں :- جی، مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ اب یہ فرمائیے کہ ہم ذرا اور کس  
 بڑھ کر کیا یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے محافظین بہترین شہری ہیں؟  
 گ :- سب سے بہتر۔

میں :- اور کیا ان کی بیویاں بہترین عورتیں نہ ہوں گی؟  
 گ :- بیشک سب سے بہتر ہوں گی۔

میں :- اور کیا ریاست کے اغراض کے لئے اس سے بہتر کوئی بات ہو سکتی  
 ہے کہ اسکے مرد اور عورتیں حتیٰ الوسع اچھے ہوں۔

گ :- اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے؟

میں :- اگر موسیقی اور ورزش جسمانی کے فنون اس طرح موجود ہوں جیسا  
 کہ ہم نے بیان کیا ہے تو کیا ان سے یہ نتیجہ مترتب نہ ہوگا؟  
 گ :- بیشک۔

میں :- تو گویا ہم نے ایسا قانون تیار کر لیا جو یہی نہیں کہ ممکن العمل ہو بلکہ  
 ریاست کے لیے بدرجہ اولیٰ مفید بھی ہے۔

گ :- درست۔

میں :- پھر کیا ہے۔ ہمارے محافظین کی بیویاں کپڑے اتار سکتی ہیں کہ نیکی



ان کا لباس ہو۔ انہیں جنگ آزمانی اور حفاظت ملک کی تکلیفیں بھی اٹھانی ہوں گی،  
 البتہ کام کی تقسیم میں عورتوں کو ذرا ہلکا کام دیا جائے کہ یہ باطنج کمزور ہوتی ہیں نہ  
 یوں عہدت سبار ورائض کے تو سب یکساں ہیں۔ پھر ان برسہ عورتوں پر جو بہترین  
 محرمات کے باعث جہانی محنت کرتی ہیں اگر کوئی ہنسے تو وہ ”فہم خام کی خوشہ چینی  
 کرتا ہے“ اور خود اس چیز سے بیخبر ہی جسپر ہنستا ہے۔ کیونکہ بہترین مقولہ یہ ہے اور ہمیشہ  
 رہیگا کہ ”جو چیز مفید ہے وہی شریف ہے، جو مضر ہے وہ ذلیل ہے“  
 گ۔۔ بیشک۔

میں۔۔ طبقہ اناٹا کے متعلق ہمارے قوانین میں ایک وقت تو یہ بھی جس  
 احمدیہ کہ ہم بیچ گئے۔ اس خیال کو قانون کا جزو بنانے پر کہ دونوں اصناف کے  
 محافظین کے مشاغل مشترک ہوں شکر ہے کہ نکتہ چینی کا سیلاب ہمیں بہا نہیں لے گیا۔  
 اس انتظام کے افادہ اور امکان کی شہادت خود ہماری دلیل کی باہمی مطابقت  
 سے فراہم ہوتی ہے۔

گ۔۔ جی، دو بڑی زبردست موج تھی جس سے آپ بیچ نکلے۔  
 میں۔۔ لیکن ابھی اس سے بھی زور کی ایک اور آرہی ہے، اسے دیکھئے گا  
 تو پہلی کا کچھ خیال نہ رہیگا۔  
 گ۔۔ اچھا تو چلئے دیکھوں۔

میں۔۔ گذشتہ بالا قانون اور نیز تمام سابقہ قوانین کا حاصل یہ ہے کہ ہمارے

مخاطبین کی بیویاں مشترک ہوں، بچے مشترک ہوں، والدین اپنے بچوں کو نہ پہچانیں  
 نہ بچے اپنے والدین کو۔“

گ۔۔ بیشک یہ لہر تو پہلی سے کہیں بڑی ہے۔ اور اس قانون کا امکان  
 اور فائدہ دونوں اُس سے بدرجہا زیادہ مشتبہ ہے۔

میں۔۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ عورتوں اور بچوں کے مشترک رکھنے کے افادہ  
 عظیم سے کوئی بھی انکار نہ کریگا۔ البتہ اس کا ممکن العمل ہونا یہ دوسری بات ہے،  
 اور اس کی لوگ ضرور مخالفت کریں گے۔

گ۔۔ میری رائے میں تو دونوں باتوں کے متعلق بہت سے شبہات  
 پیش کیے جاسکتے ہیں۔

میں۔۔ آپ کا مطلب شاید یہ ہے کہ ان دونوں سوالوں کو ملا دیا جائے۔ میں یہ  
 چاہتا تھا کہ آپ اسکے افادہ کو تسلیم کر لیتے اور یوں میں ایک حصہ کے بار شہوت  
 سے بچ جاتا اور صرف اسکا امکان ثابت کرنا باقی رہ جاتا۔

گ۔۔ آپ کی یہ چالاکی تو پکڑی گئی، اب تو دونوں کے ہی لائل دیجیے،  
 میں۔۔ خیر راضی برضا۔ لیکن مجھ پر تھوڑی سی عنایت ضرور کیجیے، یعنی  
 اجازت دیجیے کہ میں خیالی پلاؤ پکاؤں جیسے تنہائی میں ٹہلتے ہوئے دن میں  
 خواب دیکھنے والے پکایا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اپنی خواہشوں کے پورا کرنے کے  
 وسائل دریافت کرنے سے پہلے (اور اس بارے میں تو وہ شاید ہی اپنے کو تکلیف دیتے



ہوں) یہ کبھی انکے امکان کے خیال سے اپنے دماغ کو نہیں تھکاتے۔ بلکہ پہلے تو یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان کی تمام خواہشیں انھیں مل گئیں اور پھر اپنی خیالی تدابیر چلتے ہیں اور ان آرزوں کے برائے کے بعد جو کچھ کرنے کا ارادہ ہو اسکی تفصیلات سے اپنا دل خوش کرتے ہیں۔ اس وقت چونکہ میرا بھی دل کچھ چھوٹا سا جاتا ہے، اس لیے آپ کی اجازت سے چاہتا ہوں کہ فی الحال امکان کے سوال کو رہنما دوں۔ میں پہلے اس تجویز کو ممکن فرض کیے لیتا ہوں، اور یہ دریافت کرتا ہوں کہ حکام اس انتظام کو چلائیں گے کیسے، پھر یہ ثابت کروں گا کہ اگر اینرمل ہو اور یا اور محافظ دونوں کو بہت کچھ فائدے حاصل ہوں گے۔ اس لیے اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو پہلے تو میں آپ کی مدد سے اس تجویز کے فوائد پر غور کروں اور بعد میں اس کے قابل عمل ہونے پر۔

گ۔۔۔ جی نہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

میں۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارے محافظ اور ان کے معاون جس نام کے حامل ہیں اس کے شایاں بھی ہوں تو لازم ہے کہ ایک میں اطاعت شعاری و دوسرے میں حکم دینے کی قابلیت ہو۔ محافظین خود بھی قوانین کی پابندی کریں، اور جہاں کہیں انھیں اختیار تیز حاصل ہو وہاں قانون کی غایت صلی کو پیش نظر رکھیں۔

گ۔۔۔ درست۔

میں۔۔۔ بہ حیثیت نافذ قانون آپ نے مردوں کا انتخاب کیا تھا، اب آپ

عورتوں کا انتخاب کر کے انہیں بیچے۔ جہاں تک ممکن ہو یہ عورتیں اور مرد ایک سی طبیعت کے ہوں سب کے سب مشترک مکانات میں ہیں اور ساتھ بیٹھا کھانا کھائیں کسی کے پاس کوئی چیز بھی مخصوص کسی فرد کی ملک نہ ہو۔ یہ سب ساتھ رہیں گے ساتھ ہی ان سب کی تربیت اور پرورش ہوگی، ورزش جسمانی کے سلسلہ میں ایک دوسرے کا ساتھ ہوگا اور اس طرح ایک لزوم فطری کی کشش ان میں باہمی تعلقات پیدا کر دیگی۔ غالباً اس خیال کے لیے لزوم کافی معنی خیز نظر ہے۔

گ۔۔۔ جی کیوں نہیں؛ لزوم؛ علم ہندسہ والا لزوم، نہیں بلکہ دوسری قسم کا جس سے محبت کر نیوالے آشنا ہوتے ہیں اور عامۃ الناس کے لیے اسکی قطعیت پر ہان اور اسکا حکم جاہرانہ اول الذکر لزوم سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔ میں۔۔۔ سچ ہے۔ لیکن اور چیزوں کی طرح اسے بھی ایک منضبط طریقے سے چلنا چاہیے۔ مبارک لوگوں کے شہر میں تو عیاشی ایک ناپاک فعل سمجھا جائے گا، اور محافظین ضرور اس کی مانعت کریں گے۔

گ۔۔۔ بیشک اسکی تو اجازت نہ ہونی چاہیے۔

میں۔۔۔ لہذا دوسری بات یہ ہے کہ تجویز کو حتی الوسع مقدس بنایا جائے اور تقدس کا معیار یہ ہو کہ جو سب سے زیادہ مفید ہے وہی سب سے زیادہ مقدس ہے۔ گ۔۔۔ بالکل سچا۔



میں۔ تو شادیوں کو سب سے زیادہ مفید کیونکر بنایا جاسکتا ہے؟ میں آپ سے  
یہ سوال اس لیے کرتا ہوں کہ آپ کے مکان میں بہت سے شکاری گتے اور  
اچھی قسم کی چڑیاں دیکھ رہا ہوں، براہ کرم فرمائیے کہ آپ نے کبھی ان کے جوڑا  
ملانے یا بچے نکالنے کی طرف بھی توجہ فرمائی؟  
گ۔۔ کیسی توجہ؟

میں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر چند یہ سب جانور اچھی قسم کے ہیں لیکن پھر بھی  
کیا ان میں سے بعض اوروں سے بہتر نہیں؟  
گ۔۔ ہیں۔

میں۔ تو آپ سب سے بلا تفریق بچے لیتے ہیں یا صرف بہترین سے؟  
گ۔۔ صرف بہترین سے۔

میں۔ زیادہ عمر والے جانور بچتے ہیں تاہم عمر والے یا صرف وہ جو ٹھیک  
جوان عمر کے ہیں۔

گ۔۔ صرف ٹھیک جوان عمر والے۔

میں۔ اور اگر بچے لینے میں کافی نگہداشت نہ کی جائے تو کتوں اور چڑیوں  
میں بہت اخطا طر و نما ہو جائے۔

گ۔۔ یقیناً۔

میں۔۔ یہی حال گھوڑوں اور دوسرے جانوروں کا ہے۔

گ۔ بیشک۔

میں :- اللہ عنی۔ اگر یہی اصول نوع انسانی پر عائد کرنا ہو تو ہمارے  
محافظین کو کس قدر اعلیٰ درجہ کی مہارت کی ضرورت ہوگی۔

گ۔ اصول تو یقیناً یہی عائد ہوگا؛ لیکن اس میں خاص مہارت کی آپ  
کو کنسی بات ہے؟

میں :- اس لیے کہ ہمارے حکام کو جسم سیاسی پر اکثر ادویہ کا استعمال کرنا  
ہوگا۔ آپ جانتے ہیں کہ جیب مریض کو دوا دینے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی  
بلکہ کسی مخصوص غذا کا تجویز کر دینا ہوتا ہے تو اس کے لیے معمولی سا طبیب بھی  
کافی سمجھا جاتا ہے؛ لیکن جب وادینی ہو تو پھر طبیب کا اچھا ماہر ہونا ضروری ہے  
گ۔ یہ تو سب درست؛ لیکن آپ کا اشارہ آخر کدھر ہے؟

میں :- میرا مطلب یہ ہے کہ رعایا کی فلاح کے لیے حکام کو ادویہ کذب و  
فریب کی کافی خوراک درکار ہوگی۔ یہ تو ہم مان ہی چکے ہیں کہ ان چیزوں کا استعمال  
بطور دوا کے مفید ہوتا ہے۔

گ۔ جی، اور ٹھیک مان چکے ہیں۔

میں :- ان چیزوں کا یہ جائز استعمال تزویج و تناسل کے انضباط میں کثرت

درکار ہوگا۔

گ۔ یہ کیسے؟



میں :- یہ اصول تو ہم بیان کر ہی چکے ہیں کہ ایک صنف کے بہترین افراد کو دوسری صنف کے بہترین افراد سے جتنے زیادہ مرتبہ ہو سکے ملا یا جا اور دونوں اصناف کے بدترین افراد کو جب قدر ہو سکے کم، اور اگر گلہ کو اعلیٰ درجہ کی حالت میں رکھنا منظور ہی تو صرف اول الذکر اتحاد سے جو نچے پیدا ہوں ان کی پرورش کرنی چاہیے دوسروں کی نہیں۔ اب چاہیے یہ کہ یہ ساری کارروائی صیغہ راز میں ہو اور بس حکام کو اس کا علم ہو، ورنہ گلہ میں بغاوت کا ایک اندیشہ پیدا ہو جائے گا۔

گ :- بالکل بجا۔

میں :- کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ ہم بعض تہوار مقرر کر دیں ان موقعوں پر دو طہادولہن بچا ہو سکیں، قربانیاں کی جائیں، شعراء شادی کی نظمن پڑھیں یہی شادیوں کی تعداد سولے سے مطلقاً حکام کے اختیار تیزی پر چھوڑنا چاہیے کہ ان کے پیش نظر رہائش کی اوسط آبادی برقرار رکھنے کا مقصد ہو گا، اگر علاوہ اور بھی بہت سی باتیں ہیں جنکا انھیں خیال کرنا پڑیگا، مثلاً جنگ، وبا اور دوسری اسی قسم کی چیزوں کے اثرات، تاکہ جہاں تک ممکن ہو رہائش نہ تو بہت ٹہی ہو جائے نہ بہت چھوٹی۔

گ :- یقیناً۔

میں :- اپنی باری کے لیے لوگوں کو چھٹیاں اٹھا کر قسمت آزمائی کرنی

ہوگی یا ایسا ہی اور کوئی عیارانہ طریقہ ایجا کرنا ہوگا تاکہ کم درجہ کے لوگ ب  
 کبھی یکجا ہونے والے ہوں تو انھیں یہ چھپیاں اٹھانی پڑیں اور وہ حکام پر الزام  
 نہ لگا سکیں بلکہ خود اپنی بد نصیبی کو اس کا ذمہ دار قرار دیں۔  
 گ :- ضرور۔

میں :- اور میں تو سمجھتا ہوں کہ اعلیٰ قسم کے بہادر نوجوانوں کو جہاں او  
 اعزاز و انعام عطا ہوں وہاں اُنکے لیے عورتوں سے خلوت کے معاملہ میں بھی  
 سہولتیں بہم پہنچانی چاہئیں۔ اس کی وجہ ان کی بہادری ہے اور مقصد یہ ہے کہ  
 ایسے باپوں کے جتنے بیٹے ہو سکیں ہوں۔  
 گ :- بجا ہی۔

میں :- اور افسران متعلق خواہ مرد ہوں یا عورت۔ کیونکہ افسر تو مرد بھی  
 ہو سکتے ہیں اور عورتیں بھی۔  
 گ :- جی۔

میں :- ہاں، تو افسران متعلق اچھے والدین کی اولاد کو بارہ میں لیجائینگے  
 اور انھیں آیاؤں کے سپرد کر دینگے؛ یہ آیا میں علیحدہ مکانات میں رہا کرینگے۔ کم  
 درجہ لوگوں کی اولاد یا اچھوں کی وہ اولاد جو اتفاق سے بگڑ گئی ہو انھیں کسی  
 محفی نامعلوم مقام پر ڈال دیا جائیگا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ اسی کے مستحق ہیں۔  
 گ :- جی ہاں، اگر نسل کو خالص رکھنا ہی تو محافظین کو یہی کرنا ہوگا۔



میں :- پھر ہی افسران بچوں کی پرورش کا انتظام کریں گے جب ماؤں کا دودھ بھرکے گا تو انھیں باڑہ میں داخل کریں گے لیکن اس امر کا خاص خیال رکھا جائیگا کہ کوئی ماں اپنے بچہ کو نہ پہچان سکے اگر ضرورت ہوئی تو دودھ پلانے کے لیے اور دائیاں رکھ لی جائیں گی۔ اس کا بھی خیال رکھا جائیگا کہ دودھ پلانے کا کام زیادہ دیر تک جاری نہ رہے، ماؤں کو رات میں بے وقت اٹھنا اور دوسری پریشانیاں بھی نہ اٹھانا پڑیں گی، کیونکہ اس قسم کا سارا کام آیاؤں اور نوکروں کے سپرد کر دیا جائے گا۔

گ :- یعنی محاشطین کے بچوں کے جب بچہ ہوگا تو تو یہ خوب چین کرینگے؟  
میں :- کیوں نہیں ضرور کرینگے۔ خیر یہ تو ہوا، چلیے اپنی تجویز کو ذرا اور کچھ بڑھائیں۔ ہم یہ کہہ رہے تھے تاکہ والدین کی عمر کا زمانہ عنفوان شباب ہونا چاہیے؟  
گ :- بیشک۔

میں :- اور اس زمانہ شباب کا تعین کیسے ہو؟ کیا عورت کا شباب بیس سال اور مرد کا بیس سال نہیں ہوتا؟  
گ :- اور یہ زمانہ رہیگا کب تک؟

میں :- عورت بیس برس کی عمر سے رہا بہت کے لیے بچہ پیدا کرنا شروع کر سکتی اور چالیس سال کی عمر تک اس کام کو جاری رکھ سکتی ہے۔ مرد اپنا کام پچیس سال کی عمر سے شروع کر سکتا ہے۔ یعنی اس وقت کے گزرنے کے بعد

بعض حیات کی رفتار سب سے زیادہ تیز ہوتی ہے اور اسے پچپن سال کی عمر تک جاری رکھ سکتا ہے۔

گ۔۔ بیشک، عورت اور مرد دونوں میں ہی زمانہ جسمانی اور دماغی قوت کے معراج کا زمانہ ہے۔

میں۔۔ ان مقررہ حدود سے کم یا زیادہ عمر کا کوئی شخص اگر عام جہنمائے تزویج میں حصہ لے تو وہ سخت ناپاک اور بڑے کام کام تکلیف سمجھا جائے گا۔ اگر اس کا کوئی بچہ زندہ رہ گیا تو سمجھا جائیگا کہ یہ عمل اس قربانی اور عبادت کے زیر اثر قرار نہیں پایا تھا جو ہر حشر شادی کے موقع پر تمام بچاریوں، بچاریوں اور سارے شہر کی طرف سے اس لیے ادا کی جاتی ہے کہ آئندہ نسل اپنے والدین سے بہتر اور مفید تر ثابت ہو۔ بلکہ اس شخص کی اولاد ظلمت اور شہوت پرستی کا نتیجہ بنتی ہوگی۔

گ۔۔ درست۔

میں۔۔ اور یہی قانون حدود مقررہ کے اندر عمر والوں پر بھی عائد ہوگا۔ اگر وہ عنوان شباب میں بلا اجازت حکام کسی عورت سے تعلق پیدا کر لیں۔ کیونکہ پھر یہ ریاست کے لیے حرامی بچے پیدا کریں گے جن کی نہ تصدیق ہوگی نہ تقدیس۔

گ۔۔ بیشک۔

میں۔۔ اور جب عمر کی مقررہ حدود سے یہ لوگ نکل جائیں تو پھر انھیں آزادی



ہونی چاہیے کہ جس سے چاہیں میں جلیں اور تعلق رکھیں؛ البتہ یہ ضرور ہو کہ کوئی شخص  
اپنی بیٹی یا نواسی یا اپنی ماں نانی سے تعلق نہ پیدا کر لے۔ اسی طرح عورتوں کیلئے  
اپنے بیٹوں پوتوں یا باپ اور دادا سے تعلق ممنوع ہو۔ ان لوگوں کو پہلے سے بتا دیا  
اس امر پر متنبہ کر دینا چاہیے کہ اگر اس طرح کوئی حمل قائم ہو گیا تو بچہ کو پیدا نہ ہونے  
دیا جائے گا اور اگر یہ کسی طرح پیدا ہو ہی جائے تو والدین کو ابھی طرح سمجھ لینا چاہیے  
کہ یہی اولاد کی پرورش نہیں کی جاسکتی۔

گ۔ یہ تجویز بھی معقول ہے۔ لیکن یہ تو فرمائیے کہ انہیں یہ معلوم کیسے ہو گا کہ کون  
باپ ہے اور کون بیٹی؟

میں۔ ہاں، اس کا تو انہیں کبھی بھی علم نہ ہو گا۔ لیکن یہ طریقہ رکھیں گے کہ جشن  
تزوج کے دن سے ساتویں یا دسویں مہینہ جتنے لڑکے پیدا ہوں گے انہیں دیکھا  
اپنا لڑکا اور جتنی لڑکیاں پیدا ہوں گی انہیں اپنی بیٹی کہیں گے۔ یہ سب اسے باپ کے  
بیکاریں گے، ان بچوں کے بچوں کو وہ پوتا پوتی سمجھیں گے اور یہ اس مسن جماعت کے  
ساتھ افراد کو دادا دادی کہیں گے۔ ماؤں اور باپوں کی خلوت کے وقت جن جن کا عمل  
ساتھ قرار پایا تھا وہ بھائی بہن مانے جائیں گے اور انہیں شادی ممنوع ہوگی۔ لیکن  
یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بھائی بہنوں میں شادی کی یہ ممانعت بالکل قطعی ہے۔ اگر قرعہ انداز  
اس کی موافقت کرے اور پیتھیا کے کاہن سے بھی اجازت مل جائے تو  
قانون بھی اس کی اجازت دیدیگا۔

گ۔ بہت دیرت،

میں۔۔ محافظین میں اشتراک ازواج اور خاندان کے متعلق تو یہ تجویز ہے۔  
اب غالباً آپ یہ چاہیں گے کہ اسے جماعت کے دو سر حصوں میں بھی مطالب ثابت  
کیا جائے اور یہ بھی ظاہر ہو سکے کہ اس سے بہتر اور کوئی صورت نہیں۔ کیوں؟  
آپ یہی چاہتے ہیں نا؟

گ۔ جی ہاں، یقیناً۔

میں۔ کیا یہ ٹھیک نہ ہوگا کہ ہم پہلے ایک مشترک معیار دریافت کریں،  
یعنی واضعاً قانون کو قانون وضع کرنے اور ریاست کے نظام و ترتیب میں  
کیا مقصد خاص طور پر پیش نظر رکھنا چاہیے۔ سب سے زیادہ بہتر صورت کیا ہے۔  
یعنی کثرت خیر کس میں ہے اور سب سے بدتر کہا یعنی کثرت شر کس میں؟ یہ معیار دریافت  
ہو لے تو دیکھیں کہ ہماری تجویز پر خیر کا اطلاق ہو سکتا ہے یا شر کا۔

گ۔ ضرور۔

میں۔۔ اچھا تو کیا نفاق اور انتشار سے بھی زیادہ بڑی کوئی چیز ہے؟ یا جہاں  
وحدت مطلوب ہو وہاں کثرت؟ اور کیا وحدت کے بندھن سے بھی زیادہ اچھی  
کوئی چیز ہے؟

گ۔ جی، ہرگز نہیں۔

میں۔۔ اور وحدت اور ایکاد ہیں ہوتا ہی جہاں لوگوں کا رخ و راحت،



آرام و تکلیف مشترک ہو۔ یعنی جہاں شہری خوشی باریج کے موقعوں پر سب کے سب  
یکساں خوش باریجیدہ ہوتے ہوں؟  
گ۔۔ بیشک۔

میں۔۔ اور جہاں کوئی مشترک احساس نہیں بلکہ صرف شخصی حس ہو تو ریاست  
غیر منتظم اور منتشر ہوتی ہے، یعنی جب شہر میں ایک ہی واقعہ پر آدمی نیا لڑائی  
منائی ہو اور دوسری آدمی غرق غم ہو۔  
گ۔۔ بیشک۔

میں۔۔ اور یہ اختلافات عموماً ان لفظوں کے استعمال میں اختلاف سے پیدا  
ہوتے ہیں یعنی یہ چیز ”میری ہے“ یا ”میری نہیں“۔ ”اس کی ہے“ یا ”اسکی نہیں“۔  
گ۔۔ جی، یہی وجہ ہے۔

میں۔۔ تو کیا اس ریاست کا انتظام بہترین نہیں جس میں اشخاص کی زیادہ سے  
زیادہ تعداد اسی چیز پر ”میری ہے“ یا ”میری نہیں“ کا یکساں استعمال کیسکے!  
گ۔۔ درست۔

میں۔۔ یا وہ ریاست جسکی حالت ایک فرد کی سی ہو جس طرح جسم انسانی میں  
ایک انگلی مجروح ہو جائے تو سارا کا سارا بدن (جسکا مرکز روح ہے) اور جو اس کے زیر  
حکومت ایک ریاست کی حیثیت رکھتا ہے) اس تکلیف کو محسوس کرتا اور ماؤں حصّہ  
سے ہمدردی کرتا ہے، اور ہم کہتے ہیں کہ اس آدمی کی انگلی میں درد ہو رہا ہے۔ اسی طرح

اگر کسی اور حصہ میں رد کی وجہ سے تکلیف پادرد کی کمی کی وجہ سے آلام پہنچ رہا ہو، تو اس کے لیے بھی یہی الفاظ استعمال کر سکتے ہیں۔

گ۔۔ بالکل درست۔ میں آپ سے متفق ہوں کہ جن ریاست میں بہترین نظام ہوگا وہ آپ کے اس بیان کو وہ احساس مشترک کے بہت قریب پہنچ چکی ہوگی۔  
میں۔۔ یعنی اگر کسی ایک شہری پر کوئی اچھی یا بُری بات گزری تو ساری ریاست اسے اپنا معاملہ سمجھے گی، اس کے ساتھ خوش ہوگی اور اسی کے ساتھ بخیرہ۔  
گ۔۔ جی ہاں، ایک عمدہ منتظم ریاست میں تو یہی صورت حال ہوگی۔

میں۔۔ ہاں، تو میں سمجھتا ہوں کہ اب وقت ہے کہ ہم اپنی ریاست کی طرف نظر رجوع کریں اور دیکھیں کہ اس کی جو شکل ہم نے تجویز کی ہے وہی ان بنیادی اصولوں کے مطابق ہے یا کوئی دوسری۔

گ۔۔ بہت خوب۔

میں۔۔ ہر دوسری ریاست کی طرح ہماری ریاست میں بھی حاکم اور محکوم ہونگے؟  
گ۔۔ جی۔

میں۔۔ یہ سب کے سب ایک دوسرے کو شہری کہا کریں گے؟

گ۔۔ جی ہاں۔

میں۔۔ لیکن دوسری ریاستوں میں کیا حاکموں کو کوئی دوسرا لقب نہیں دیتے؟

گ۔۔ عموماً آقا کہتے ہیں، لیکن جمہوری ریاستوں میں صرف حاکم کہہ کر پکارتے ہیں۔



میں :- اور اپنی رہائش میں حاکموں کو شہری کے علاوہ اور کیا کہتے ہیں؟  
گ :- محافظ اور مددگار۔

میں :- اور حکام عوام الناس کو کیا کہتے ہیں؟  
گ :- پالنے اور پرورش کرنے والے۔

میں :- اور دوسری رہائشوں میں؟  
گ :- غلام۔

میں :- دوسری رہائشوں میں حکام ایک دوسرے کو کیا کہتے ہیں؟  
گ :- شریک حکومت۔

میں :- اور اپنی رہائش میں؟  
گ :- شریک حفاظت۔

میں :- کیا تم کسی ایسی مثال سے واقف ہو کہ ایک رہائش میں کوئی  
حاکم اپنے ایک شریک کار کو تو دوست بتلائے اور دوسرے کو دشمن سمجھے۔  
گ :- جی ہاں، ایسی مثالیں تو اکثر ملتی ہیں۔

میں :- دوست کے ساتھ تو وہ دھپپی کا اظہار کرتا اور اس سے واقفی  
دھپپی لکھتا بھی ہے، لیکن دوسرے کو جہنی جانتا ہے اور اس سے کوئی دھپپی نہیں  
رکھتا؟

گ :- جی ہاں۔

میں۔ لیکن تمہارے محافظین میں سے بھی کوئی کسی دوسرے محافظ کو ایسا  
بتا سکتا یا سمجھ سکتا ہے؟

گ۔۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ یہ تو جس سے ملیں گے اُسے اپنا بھائی یا بہن سمجھیں گے  
یا ماں یا باپ، یا بیٹا یا بیٹی یا پھر ان متعلقین میں سے کسی کی اولاد۔

میں۔۔ بہت خوب۔ لیکن میں آپ سے ذرا ایک دفعہ اور پوچھ لوں کہ

یہ مشترک خاندان کیا بن نام ہی نام کا خاندان ہوگا یا اپنے اعمال سے یہ لوگ  
اس نام کو حقیقت بنا دیں گے۔ مثلاً ”باپ“ کے لفظ کے ساتھ ایک باپ کی

سی نگرانی و تعلق خاطر اور دوسری طرف احکام قانون کے مطابق اشکائے عزت

اور اطاعت بھی لازم ہوگی یا نہیں؟ پھر کیا یہ ہوگا کہ ان فرائض کو پس پشت

ڈالنے والا بد اور غیر متقی سمجھا جائے اور خدا اور بندہ کسی کے ہاتھ سے اسے

کوئی قبض نہ پونے۔ اور کیا بچوں کے کانوں میں اپنے نام نہاد والدین اور دوسرے

اعزہ کے متعلق اس قسم کی باتیں سب شہریوں کی زبانی پڑتی رہیں گی یا نہیں؟

گ۔۔ بیشک وہ یہی سنیں گے، اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ کیونکہ یہ تو ایک منہ ہی

کی بابت ہوگی کہ یہ بس مُتھ سے تو اپنے قرابت خاندانی کے نام لیں لیکن ان کی

اصلیت پر ذرا بھی عامل نہ ہوں۔

میں۔۔ یعنی ہمارے شہر میں دوسرے شہروں کی بہ نسبت کچھ ترقی اور میل ملاپ

کی گفتگو زیادہ کثرت سے سنائی دیتی۔ اور جیسے میں پہلے کہہ چکا ہوں، جب کوئی



اچھے حال میں ہوگا یا بُرے حال میں تو سب کی زبان پر عام کلمہ یہ ہوگا کہ میں خوش ہوں یا ”میں بُرے حال میں ہوں“  
گ۔ بیشک۔

میں۔ تو پھر اسی طریقہ فکر و گفتار کے عین مطابق تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ ان کی خوشی و غم، آرام اور تکلیف سب مشترک ہوں گے۔  
گ۔ جی ہاں، ایسا ہی ہوگا۔

میں۔ جس چیز کو یہ سب اپنا، کہیں گے اس میں سب مشترک چسپی بھی ہیں اور اس چسپی کی وجہ سے ان کی خوشیاں اور غم بھی مشترک ہوں گے۔  
گ۔ بیشک، بقابلہ دوسری ریاستوں کے بہت زیادہ۔

میں۔ ریاست کے عام دستور اساسی کے علاوہ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہوگی کہ محافظین میں زن و فرزند مشترک ہوں گے۔  
گ۔ اور کیا، یہی تو خاص وجہ ہوگی۔

میں۔ ایک عمدہ منتظم ریاست کو جسم اور اعضائے مشابہہ کرنے وقت، اس حدت احساس کو سب سے بڑی خوبی تسلیم کیا تھا۔  
گ۔ جی۔ تسلیم کیا تھا اور صحیح تسلیم کیا تھا۔

میں۔ گویا ہمارے شہر میں عورتوں اور بچوں کا مشترک ہونا ریاست کے لیے سب سے بڑی خوبی کا باعث ہو۔

گ۔ یقیناً۔

میں :- اور یہ بات اس دوسرے اصول سے بھی مطابقت کرتی ہے کہ  
محافظین کے باپس مکانات اراضی، یا اور کسی قسم کی املاک نہ ہونی چاہیے۔  
ان کی تنخواہ بس غذا ہو جائیں، دس دس شہریوں سے ملے۔ ان کے کوئی خانگی  
اور ذاتی اخراجات نہ ہوں۔ تاکہ یہ حقیقی محافظ کی خصوصیات قائم رکھ سکیں  
گ۔ درست۔

میں :- جیسے میں نے عرض کیا اشتراک ملک اور اشتراک خاندان یہ دونوں  
باتیں انھیں حقیقی محافظ بنانے میں مدد ہوں گی۔ یہ لوگ اپنے اور پرانے کے  
جھگڑوں میں شہر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کریں گے۔ یہ نہ ہوگا کہ جس نے جو کچھ حاصل  
کیا اسے بس ایک لاکھ میں گھسیٹے لیے جا رہا ہے۔ جہاں اس کے علیحدہ بڑی  
بچے اور ذاتی سامان آرام و آسائش ہے، چنانچہ محض شخصی احساس رنج و خوشی بھی  
رکھتا ہے۔ بلکہ حتی الامکان سب کے سب مسرت و اطمینان سے یکساں متاثر ہونگے اور  
اعزاء و اقربا کے متعلق چونکہ متحد الخیال ہوں گے لہذا خواہ مخواہ ایک ہی مقصد  
کی طرف ان سب کا رجحان بھی ہوگا۔

گ۔ بیشک۔

میں :- ان کے باپس چونکہ اپنے بدن کے سوار کوئی چیز نہ ہوگی جسے یہ اپنا،  
کہہ سکیں لہذا مقدمہ و استغاثہ کا وجود ہی نہ ہوگا، اور روپیہ، اولاد اور دوسرے



تعلقات کے باعث جو جھگڑے ٹٹھے ہوتے ہیں ان سے یہ ایک قلم ناموں جو جائینگے۔  
گ۔۔ ظاہر ہے۔

میں۔۔ حملہ یا ہتک عزت کے مقدمات کا ہونا بھی زیادہ ترین قیاس نہیں،  
کیونکہ یہ بات تو جائز اور مستحب سمجھی جائے گی کہ برابر والا برابر والے کا مقابلہ جو  
کر لے اور حفاظت جسم کو تو ہم لازمی قرار دیدینگے۔  
گ۔۔ یہ خوب ہوگا۔

میں۔۔ ہاں، اور اس قانون میں ایک فائدہ اور ہے۔ وہ یہ کہ جہاں کسی کا  
کسی سے جھگڑا ہوا تو وہ وہ میں اپنے غصہ کو ٹھنڈا کر لے گا اور معاملہ زیادہ خطرناک  
حد تک طول نہ پکڑے گا۔  
گ۔۔ بیشک۔

میں۔۔ مسن لوگوں کو کمسن آدمیوں پر حکومت کرنے اور انھیں سزا  
دینے کا فرض تفویض کیا جائے گا۔  
گ۔۔ ظاہر ہے۔

میں۔۔ اور اس میں تو شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ بڑوں پر چھوٹے کبھی  
ہاتھ نہ اٹھائیں گے، نہ ان پر کوئی اور تشدد روا رکھیں گے، نہ کسی طرح ان کی سبکی  
کریں گے۔ سوائے اس صورت کے کہ کوئی حاکم انھیں اس کا حکم دے۔ چھوٹوں کو  
ان باتوں سے باز رکھنے کے لئے دو قوی محافظ ہیں، شرم اور خوف۔ شرم تو

اس سے مانع ہو کہ انسان اپنے والدین پر ہاتھ اٹھائے، خوف یہ کہ اس بیٹے کی مدد دوسرے لوگ کریں گے جو اسکے بھائی بیٹے یا باپ ہیں۔

گ۔۔۔ سچ ہے۔

میں :- غرض یہ کہ یہ قوانین ہر طرح شہریوں میں باہمی صلح و امن قائم رکھنے میں مدد دیں گے۔

گ :- صلح و امن کی تو بیشک کچھ کمی نہ ہوگی۔

میں :- اور جب محافظین میں آپس میں کوئی جھگڑا نہ ہوگا تو پھر بقیہ شہر میں بھی ان کے خلاف یا خود آپس میں تفرقہ ہونے کا اندیشہ نہیں۔

گ :- بالکل نہیں۔

میں :- ان ذرا ذرا سی خفیف الحکمتیوں کا تو ذکر کرنا بھی خلاف شان سمجھتا ہوں جسے یہ لوگ سچ جائیں گے۔ مثلاً غریبے گ جو امیروں کی خوشامد کرتے ہیں، یا خاندان کی پرورش میں جو تکلیفیں لوگوں کو برداشت کرنی ہوتی ہیں، یا گھر بلو پھرتوں کے لیے جو روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے، اس روپیہ کا قرض لینا، پھر ادا کرنے سے انکار کرنا، جیسے تیسے روپیہ حاصل کر کے عورتوں یا غلاموں کی تحویل میں دینا، یا اس قسم کی بہتیری برائیاں جو لوگوں کو پیش آتی ہیں اتنی معروف اور اس قدر وسیل ہیں کہ قابل ذکر بھی نہیں۔

گ :- جی ہاں، ان برائیوں کے دیکھنے کے لیے تو انکھیں بھی درکار نہیں۔



میں۔ اچھا تو یہ لوگ ان ساری برائیوں سے بچ جائیں گے اور انکی زندگی  
فاتحان اولیٰ کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ مبارک ہو جائیگی۔  
گ۔۔ یہ کیسے؟

میں۔۔ ہمارے شہریوں کو جو خیر نصیب ہے اس کا محض ایک جزو ملجانے  
پر لوگ فاتح اولیٰ کی خوش قسمت سمجھنے لگتے ہیں۔ ہمارے شہریوں نے جو فتح  
حاصل کی ہے وہ اس سے بدرجہا زیادہ شاندار ہے اور صرف عام سے ان کی زیادہ  
مکمل کفالت ہوتی ہے۔ کیونکہ انھیں جو فتح نصیب ہوئی ہے اس میں تو ساری ریاست  
کی نجات ہے اور ان کے اور ان کی اولاد کے سر پر جو تاج رکھا گیا وہ انکی تمام زندگی  
کی ضروریات کا کفیل ہے۔ زندگی میں اپنے ملک کے ہاتھوں نہیں انعام ملتے ہیں اور  
مرنے کے بعد باعزازہ تجہیز و تکفین۔

نام لینے سے کیا حاصل ہوتی ہے یا وہ ہو گا کہ اس سے پہلے مباحثہ میں ایک صاحب  
نے ہم پر الزام لگایا تھا کہ ہم محافظین کو نہایت پٹے حالوں رکھ رہے ہیں اور جہاں  
یہ سب چیزوں پر قابض ہو سکتے تھے ہم نے انکے لیے کچھ نہ چھوڑا۔ اسکا جواب  
ہم نے یہ دیا تھا کہ اگر آگے چل کر کوئی موقع ملا تو اس سوال پر پھر غور کریں گے،  
اس وقت تو ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ محافظین کو حقیقی محافظ بنالیں اور ترتیب  
ریاست میں زیادہ سے زیادہ خوشحالی کو پیش نظر رکھیں، کسی خاص طبقہ یا گروہ  
کی مرفہ احوالی نہیں بلکہ ساری ریاست کی۔

گ :- جی ہاں، مجھے یاد ہے۔

میں :- اور اب آپ کیا کہتے ہیں؟ محافظین کی زندگی تو فائنڈیشن  
اوپر سے بھی بہتر نکلی! کیا اب بھی اس سے موشوں یا دوسرے کارپوریٹ  
یا کسانوں کی زندگی کا مقابلہ کیا جائیگا؟

گ :- ہرگز نہیں۔

میں :- اس کے ساتھ میں اس موقع پر پھر اس بات کو دوہرا دوں جو میں  
پہلے بھی کہ چکا ہوں کہ اگر سمارا کوئی محافظ ایسی خوشی حاصل کرنا چاہے کہ وہ  
محافظ ہی باقی نہ رہے؛ یا اگر وہ اس محفوظ اور متناسبت زندگی پر قانع نہیں  
جو ہمارے نزدیک بہترین زندگی ہے؛ بلکہ جنون شباب سے متاثر ہو کر مسرت  
اور خوشی کے کسی ایسے خیال کو اپنے سر میں جگہ دے کہ ساری کی ساری ریاست  
خود لے بیٹھوں؛ تو اسے بالآخر جیسا یاد کے فہم و حکمت کی داد دینی ہوگی کہ اس نے  
کس قدر سچ کہا تھا کہ ”نصف کل سے زیادہ ہوتا ہے“!

گ :- یہ اگر مجھ سے مشورہ کرے تو میں تو اسے ہی رٹے دوں کہ بھائی  
جب تمہیں ایسی زندگی نصیب ہے تو بہتر ہی ہے کہ جہاں ہو وہیں ہو۔

میں :- ہاں، تو آپ اتفاق کرتے ہیں کہ مرد و عورت سب کا وہی مشترک  
طریقہ زندگی ہو جو ہم نے تجویز کیا ہے۔ یعنی مشترک تعلیم، مشترک اولاد، اور شہر میں  
ہوں یا جنگ پر، سارے شہریوں کی مشترک حفاظت؛ ساتھ ملکر بہرہ دیں، سب



ملکر سکا کریں (جیسے کہتے کرتے ہیں) اور سب باتوں میں حتی الامکان عورتیں مردوں  
 کا ساتھ دیں، کہ ان کے لیے یہی بہترین راہ ہے، اور اسپر عامل ہو کر وہ ذکر و انا  
 کے قدرتی تعلق کو توڑنے کے بجائے اسے قائم و محفوظ کریں گی۔  
 گ۔ میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔

میں۔ لیکن ابھی یہ بات تو دریافت کرنی رہی گئی کہ اور جانوروں  
 کی طرح آدمیوں میں یہ اشتراک ممکن بھی ہو گا یا نہیں؟ اور اگر ہو گا تو کس طرح؟  
 گ۔ آپ نے پیش قدمی کی، ورنہ میں ہی سوال کرنا لاتا تھا۔  
 میں۔ مثلاً اس بات کے دریافت کر نہیں تو کوئی دشواری نہیں کہ یہ لوگ  
 جنگ کس طرح کریں گے؟  
 گ۔ کیسے؟

میں۔ کیوں، یہ سب ملکر ہم پر جا یا کریں گے۔ چونچے کا فی منصبہ ہیں  
 اپنے ساتھ لیجا ئیں گے، تاکہ کاریگروں کے بچوں کی طرح یہ بچے بھی اپنی آنکھ سے  
 اس کام کو دیکھ لیں جو بڑے ہو کر انھیں کرنا پڑے گا۔ اور یہی نہیں کہ یہ بچے صرف جنگ  
 کا نظارہ کریں، بلکہ جنگ میں مدد بھی دینگے اور کارآمد ثابت ہونگے اور اپنے  
 والدین کی خدمت کریں گے۔ تم نے کبھی مشاہدہ نہیں کیا کہ مکھار کے بچے چاک کو  
 ہاتھ لگانے سے بہت پہلے اپنے والدین کو کام کرتے دیکھتے اور انکی مدد کرتے ہیں،  
 گ۔ جی، میں نے دیکھا ہے۔

میں۔ تو کیا کہہاں کہ مخالفین کے مقابلہ میں اپنے بچوں کی تربیت اور انہیں اپنے کام کے مشاہدہ اور مشق کے مواقع فراہم کر نیکا زیادہ خیال ہوگا؟  
گ۔۔ یہ تو خیال ہی مضحکہ خیز ہے۔

میں۔۔ پھر ایک بات اور یہ ہے کہ والدین پر بھی ان کی موجودگی کا اثر ہوگا اور جانوروں کی طرح انسان کے لیے بھی اپنے بچوں کی موجودگی اظہارِ محبت کی بہت قوی محرک ہوتی ہے۔

گ۔۔ یہ تو سچ ہے۔ لیکن اگر انہیں شکست ہوئی (اور جنگ تو آخر جنگ ہی، اکثر ایسا ہوگا) تو پھر خطرہ کس قدر بڑا ہے؟ والدین کے ساتھ بچے بھی ضائع ہو جائینگے اور ریاست کو دوبارہ بننے کا کوئی موقع نہ رہے گا۔

میں۔۔ ٹھیک ہے۔ لیکن کیا آپ انہیں کبھی کسی خطرہ میں نہیں ڈالنا چاہتے؟  
گ۔۔ نہیں، میرا مطلب تو نہیں۔

میں۔۔ تو اگر کبھی نہ کبھی خطرہ برداشت ہی کرنا ہی تو پھر ایسے موقع پر کیوں نہ ہو کہ اگر وہ تباہی سے بچ جائیں تو پھر اس خطرہ کو برداشت کرنے کی وجہ سے انہیں کچھ حاصل بھی ہو؟

گ۔۔ جی، یہ تو ٹھیک ہے۔

میں۔۔ آئندہ سپاہی بننے والے آیا کمسنی کے زمانہ میں جنگ کا نظارہ کریں مائیک کریں، یہ ایک اہم معاملہ ہے جس کی خاطر کچھ نہ کچھ خطرہ جائز طور پر برداشت



کیا جاسکتا ہے۔

گ :- بیشک معاملہ ہی تو بہت اہم۔

میں :- لہذا ہمارا پہلا قدم تو یہ ہونا چاہیے کہ بچوں کو جنگ کا نظارہ کرا دیں  
لیکن ایسی تدابیر بھی کرنی چاہئیں کہ یہ خطرے سے محفوظ رہیں۔ پھر تو سب ٹھیک ہوگا  
گ :- جی ہاں۔

میں :- ان بچوں کے والدین کچھ اندھے تو ہونگے نہیں کہ جنگ کے خطرات  
سے واقف نہوں اور جہاں تک انسانی دورانہ نشینی کام سے کہتی ہے یہ بھی جان  
سکتے ہیں کہ کونسی مہم محفوظ ہے، کونسی خطرناک ہے  
گ :- ہاں، یہ تو فرض کیا جاسکتا ہے۔

میں :- تو پھر یہ بچوں کو محفوظ مہم میں لیجائیں گے اور پھر خطر مہم میں احتیاط  
سے کام لیں گے۔

گ :- درست۔

میں :- اور ان بچوں کو تجربہ کار اور جنگ آزمودہ لوگوں کے تحت میں  
رکھیں گے اور انھیں کوانٹا سر دار اور معلم مقرر کریں گے۔  
گ :- بہت ٹھیک۔

میں :- تاہم جنگ کے خطرات ہمیشہ پہلے سے معلوم نہیں ہو سکتے پھر بھی  
ہزارا اتفاق ہیں۔

گ۔ بشک۔

میں۔ ایسے اتفاقات کے خلاف تو ان بچوں کے پرگھا دینے چاہئیں تاکہ ضرورت کے وقت اڑ کر بچ سکیں۔

گ۔ کیسے؟ آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ شروع بچپن ہی سے انھیں گھوڑوں پر سوار کرنا چاہیے۔ جب سواری سیکھ جائیں تو انھیں گھوڑوں پر سوار کر کے جنگ دکھانے بجانا چاہیے۔ یہ خیال ہے کہ ان کے گھوڑے جوشیلے اور جنگی نہ ہوں بلکہ بہت سیدھے لیکن نہایت سبک رفتار۔ اس طرح یہ بچے اپنے آئندہ شغل زندگی کا خوب نظارہ کر سکیں گے اور اگر خطرہ ہوا تو بس اپنے معر سرداروں کے پیچھے بھاگ کر اپنی جان بچالیں گے۔

گ۔ میری رائے میں آپ بالکل درست فرماتے ہیں۔

میں۔ اسکے بعد دیکھنا یہ ہے کہ جنگ میں سپاہیوں کے باہمی تعلقات کیا ہوں گے اور دشمن سے کیا؟ میں تو یہ تجویز کروں گا کہ جو سپاہی اپنی جگہ چھوڑ دے، یا ہتھیار ڈال دے، یا کسی اور بزدلانہ حرکت کا مرتکب ہو اسے کسانوں یا کاریگروں کے طبقہ میں اتار دینا چاہیے۔ کیوں آپ کا کیا خیال ہے؟

گ۔ ضرور۔

میں۔ جو اپنے کو قید ہو جانے دے وہ دشمنوں کے نذر ہے۔ وہ انکا جائز سزا ہے۔



اس لیے وہ اس کے ساتھ جو چاہیں کریں۔

گ۔ بیشک۔

میں۔ لیکن جس بہادر شخص نے جنگ میں امتیاز حاصل کیا ہوا ہے اس کے ساتھ کیا کرنا چاہیے؟ سب سے پہلے تو اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ہاتھ سے اس کی عزت کرائی جائے ان میں کا ہر ایک اس کے سر پر ایک تاج رکھے۔ کیوں ٹھیک ہو؟

گ۔ جی ہاں، میں اسے پسند کرتا ہوں۔

میں۔ پھر سب اس سے ملائے کو اپنا اپنا ہاتھ بڑھاؤں۔

گ۔ میں اس سے بھی متفق ہوں۔

میں۔ لیکن غالباً آپ میری اگلی تجویز سے اتفاق نہ کریں گے؟

گ۔ وہ کیا ہے؟

میں۔ یہ کہ وہ ان سب کا بوسہ لے اور یہ سب اس کا بوسہ لیں۔

گ۔ ضرور۔ بلکہ میں تو اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھاؤنگا۔ کہ دورانِ مہم میں وہ جس کسی کا بوسہ لینا چاہے وہ اُسے بوسہ دینے سے انکار نہیں کر سکتا۔ تاکہ اگر فوج میں کوئی عاشق ہو (چاہے اس کا معشوق کوئی لڑکا ہو یا لڑکی) تو وہ اس طرح اپنی شجاعت کا انعام حاصل کر سکی کہ شش کرے۔

میں۔ بہت خوب۔ یہ بات تو پہلے ہی طے ہو چکی ہے کہ بہادر آدمی دوسروں سے زیادہ بیویاں کھ سکیگا، اور ان کے مقابلہ میں اسے انتخاب میں حق تقدم بھی

حاصل ہوگا تاکہ یہ جتنے بچے ممکن ہو پیدا کر سکے۔

گ :- صادر ہے۔

میں :- اس کے علاوہ ہومس کے ہاں بہادر جوانوں کی عزت افزائی کا ایک اور طریقہ ہے۔ ہومس نے اجلاس کا حال بیان کیا ہے کہ میدان کارزار میں ممتاز خدمات انجام دینے پر اسے گائے کے گوشت کے ٹکڑے انعام میں ملتے تھے یہ ایک شجاع شخص کے لیے جو عنفوان شباب میں ہو نہایت مناسب ہے یہ تحسین معلوم ہوتا ہے کہ اس سے یہی نہیں کہ اس کی عزت افزائی ہوتی ہے بلکہ یہ خود تہمت تقویت بخش چیز بھی ہے۔

گ :- بیشک۔

میں :- چنانچہ اس معاملہ میں ہم ہومس کی استادی قبول کرتے ہیں اور قربانیوں یا دوسرے اسی قسم کے موقعوں پر ہم بھی اپنے بہادر مردوں اور عورتوں کی عزت افزائی انکی شجاعت کی مناسبت سے گیتوں اور دوسرے مذکورہ بالا طریقوں سے کیا کریں گے۔ اسکے علاوہ یہ کہ انھیں اعزازی جگہ دینگے اور ان کے لیے عمدہ گوشت اور لبالب جام شراب فراہم کریں گے۔ اور اسی عزت افزائی کے سلسلہ میں ان کی تعلیم بھی ہوتی جائیگی۔

گ :- یہ بہت ہی خوب ہے۔

میں :- اور جب کوئی بہادری کے ساتھ میدان کارزار میں جان دیکھتا تو



سب سے پہلے تو ہم اُسے نسل زدیں کا رکن بتلائیں گے۔  
گ۔ یقیناً۔

میں :- یہی نہیں۔ بلکہ ہمارے پاس کیا ہیسپاڈ کی شہادت موجود نہیں  
کہ یہ لوگ مرنے کے بعد زمین پر پاک اور مقدس فرشتوں کی طرح رہتے ہیں یعنی  
منہج خیر و مانع شر اور صفت گفتار کھنے والے انسان کے محافظ۔

گ :- ہاں ہاں اور ہم اس کی شہادت کو تسلیم بھی کرتے ہیں۔

میں :- اسی دیوتا سے ہمیں یہ سبق بھی لینا چاہیے کہ ان الہی ہستیوں، اور  
مشاہیر کے مقبروں کی تعمیرس طرح عمل میں آئے اور انکا امتیاز خصوصی کیا ہو۔ پھر  
جو ہدایت کرے ہمیں اُنہی کے مطابق عمل پیرا ہونا چاہیے۔

گ :- ضرور۔

میں :- ہم لوگ ہمیشہ ہمیشہ ان کی عزت کریں گے اور مشاہیر کے مقبروں کی طرح  
ان کے مزاروں پر اپنا رازا نوخم کیا کریں گے۔ یہ عزت ہمیں تک محدود نہ ہوگی بلکہ ہر  
وہ شخص اس اعزاز کا مستحق متصور ہوگا جو غیر معمولی طور پر اچھا اور نیک خیال کیا  
جاتا ہو خواہ وہ زیادتی عمر کی وجہ سے شکار اجل ہو یا اور کسی طرح۔

گ :- بہت ٹھیک۔

میں :- ہاں، اب دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے سپاہی دشمنوں کے ساتھ  
کیسا برتاؤ کریں گے؟

گ۔۔ کس معاملہ میں؟

میں۔۔ سب سے پہلے تو غلامی کے بارہ میں۔ کیا آپ کے نزدیک یونانیوں کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اور یونانی ریاستوں کو غلام بنائیں یا اگر ان میں ان کی حفاظت کی قوت ہو تو انھیں دوسروں کا غلام بننے دیں۔ اس خطرہ کا خیال کر کے کہ کہیں ساری یونانی نسل برابر اقوام کے زیرِ عنان نہ آجائے کیا ان لوگوں میں یہ رسم نہ ہو کہ انھیں غلام بنانے سے درگزر کریں؟

گ۔۔ میرے خیال میں درگزر کرنا بہتر ہے۔

میں۔۔ یعنی یہ کسی یونانی کو اپنی غلامی میں نہ رکھیں۔ یہ خود اس قاعدہ کی پابندی کریں گے اور دوسرے یونانیوں کو بھی اسپرِ عامل ہونے کا مشورہ دیں گے۔

گ۔۔ اس طرح یہ لوگ ایک دوسرے پر دست درازمی نہ کریں گے اور برابر اقوام کے مقابلہ میں متحد رہیں گے۔

میں۔۔ دوسری بات دریافت طلب مقبولوں کی بابت ہے۔ کیا فاتح مقبولین کے اسلحہ کے علاوہ اور کچھ بھی لیں گے؟ کیا دشمن کو لوٹنے کا عمل بے پروا زمانی سے بچنے کا ایک حیلہ نہیں بنجاتا؟ بڑوں لوگ لاشوں کے قریب چھپ رہتے ہیں اور بہانہ یہ کرتے ہیں کہ ہم بھی تو ایک فرض انجام دے رہے ہیں۔ آج سے پہلے کتنی ہی فوجیں اسی لوٹ مار کی محبت میں تباہ ہو چکی ہیں۔



گ :- بجا ہے۔

میں :- اور کیا لاش کو لوٹے ٹھسوٹے میں شقاوت اور ہوس کی نہیں آتی؟ مردہ جسم کو دشمن بنانا، حالانکہ صلیب دشمن بنا دینا اس جنگ چھوڑ کر آگیا ہو اس میں بھی ایک طرح کا کمینہ پن اور ایک قسم کی نساہیت معلوم ہوتی ہے۔ یہ تو وہی کتے کی سی مثال ہوتی کہ جب اپنے حملہ آور تک نہیں پہنچ سکتا تو ان پتھروں سے لڑتا ہے جو آکر اسے لگے ہیں۔

گ :- جی ہاں، بالکل اسی کتے کی سی مثال ہے۔

میں :- لہذا ہمیں لاشوں کے لوٹنے سے باز رہنا اور ان کے دفن کرنے میں کبھی خارج نہ ہونا چاہیے۔

گ :- جی ہاں، اس سے تو یقیناً باز رہنا چاہیے۔

میں :- یوں تو کبھی بھی دیوتاؤں کے مندروں پر اسلحہ کا نذرانہ نہ پیش کرنا چاہیے اور اگر دوسرے یونانیوں سے اچھے تعلقات رکھنا منظور ہیں تو پھر یونانیوں کے اسلحہ کا تو ہرگز نہیں اور بیچ پوچھو تو اے ۱۰ اور رشتہ داروں سے حاصل کیے ہوئے مال غنیمت کا نذرانہ تو ناپاک تصور کیا جاسکتا ہے۔ ہاں سولے اس صوت کے کہ خود دیوتائے اس کا حکم دیا ہو۔

گ :- بہت صحیح۔

میں :- اس کے بعد یونانی علاقوں کی تاخت اور مکانات کے جلائے کے

مشعل ہمارا کیا رویہ ہونا چاہیے ؟  
 گ۔ آپ اپنی رائے فرمائیے، میں اُسے سننا چاہتا ہوں۔  
 میں۔ میری رائے میں تو دونوں باتیں ممنوع ہونی چاہئیں۔ میرا نزدیک  
 صرف سالانہ پیداوار کے ٹینی چاہیے اور بس۔ اس کی وجہ میں بتلاتا ہوں۔  
 گ۔ فرمائیے۔

میں۔ آپ جانتے ہیں کہ باہمی نفاق و فساد اور جنگ میں بس نام ہی کا  
 فرق نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی ماہیت بھی مختلف ہے۔ ایک سے اندرونی  
 اور خانگی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے اور دوسرے سے بیرونی و خارجی کا۔ پہلی کیفیت  
 کو فساد دوسری کو جنگ کہتے ہیں۔

گ۔ جی، بالکل صحیح تفریق ہے۔  
 میں۔ پھر کیا یہ بات بھی اسی طرح مسلم نہیں کہ یونانی نسل سب کی سب  
 خون اور دوستی کے تعلق کی وجہ سے متحد ہے اور بربر قوموں سے اجنبی اور جدا۔  
 گ۔ جی۔

چنانچہ جب بربر اور یونانی برسرِ پیکار ہوں تو یہ ایک دوسرے کے دشمن  
 کہلائیے اور اس حالت کو جنگ سے تعبیر کیا جائیگا۔ لیکن اگر یونانی باہم لڑیں تو  
 کہا جائے گا کہ یونان میں بد نظمی اور فساد برپا ہے۔ یہ لوگ دراصل دوست ہیں اور  
 ان کی وقتی خصومت اور لڑائی، فساد سے تعبیر کی جائیگی۔



گ :- میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں ۔

میں :- تو ذرا سوچو کہ اگر کسی شہر میں وہ کیفیت پیدا ہو جسے ہم نے فساد سے موسوم کیا ہے یعنی شہر میں دو فرقے ہو جائیں اور یہ دونوں لگیں ایک دوسرے کی آراضی کو تاخت و تاراج اور مکانون کو سپرد آتش کرنے تو یہ پیکار کس قدر فتنہ خیز ہو جائیگی ۔ ملک کا کوئی سچا محبت کر نیوالا کس طرح اپنے کو اپنی ماں (مادر وطن) اور دانی (پرورش کر نیوالا وطن) کو ٹکڑے کر کے پر آمادہ کر سکیگا ۔ البتہ فاتح اگر مفتوح کو اس کی سالانہ فصل سے محروم کر دے تو اس میں پیر بھی کچھ معقولیت ہے ۔ لیکن تاہم ان کے دلوں میں صلح و امن ہی کا خیال ہوگا اور وہ ہرگز ہمیشہ برسر پیکار رہنے کا ارادہ نہ کریں گے ۔

گ :- جی ہاں ، یہی بہتر رویتہ ہے ۔

میں :- اور جس شہر کی آپ بنیاد ڈال رہے ہیں کیا وہ یونانی شہر نہ ہوگا ؟

گ :- کیوں نہیں ، ضرور ۔

میں :- تو کیا اسکے شہری بہت اچھے اور مہذب لوگ نہ ہونگے ؟

گ :- بیشک ، بہت مہذب ۔

میں :- کیا وہ یونان کے عاشق نہ ہونگے ، اور اسے اپنا وطن سمجھیں گے ؟

یا یونان کے مشترک مندروں اور عبادت گاہوں میں شریک نہ ہونگے ؟

گ :- کیوں نہیں ، ضرور ہوں گے ۔

میں :- ان میں سب کبھی کوئی باہمی اختلاف ہو گا تو یہ اسے محض ایک نفاق یا فساد خیال کریں گے؛ یعنی دوستوں کا ایک باہمی جھگڑا ہے جنک کے نام سے موسوم نہیں کر سکتے۔

گ :- اسے ہرگز جنک نہیں کہہ سکتے۔

میں :- وہ ان لوگوں کی طرح جھگڑینگے جو روٹتے ہیں لیکن پھر ایک دن منے کیلے۔

گ :- بیشک۔

میں :- یہ باہم دوستانہ صلاح کی کوشش کریں گے۔ اپنے مخالفوں کو نہ بتاؤ کریں گے نہ انھیں غلام بنائیں گے؛ ایک دوسرے کے مصلح ہونگے نہ کہ دشمن۔

گ :- بیشک۔

میں :- چونکہ خود بھی یونانی ہیں اس لیے یونان میں تاخت نہ کریں گے؛ نہ کبھی مکانوں کو آگ لگائیں گے۔ نہ یہ خیال کریں گے کہ کسی شہر کی ساری کی ساری آبادی مرد، عورت، بچے، یکساں اٹکے دشمن ہیں وہ خوب جانتے ہیں جنک کا جرم چند اشخاص تک محدود ہوتا ہے اور اکثریت دھل ان کی دوست ہے۔ ان وجوہ سے یہ نہ تو ان کی زمینیں خراب کریں گے نہ ان کے مکان مسمارانگی دشمنی پس اس وقت تک قائم رہیگی کہ معصوم مظلوموں کی اکثریت ان جیسے مجرموں کو اپنے جرم کی تلافی کرنے پر مجبور کر دے۔



گ۔ میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں کہ ہمارے شہری اپنے یونانی دشمنوں سے یہ رویہ رکھیں گے اور بیروں سے وہ طریقہ جو آج کل آپس میں ہوتے ہیں۔ میں :- اچھا تو ہم اپنے محافظین کے لیے یہ قانون بھی وضع کر دیں کہ وہ نہ تو یونانیوں کی آراضی پر تاخت کریں ان کے مکان جلائیں۔

گ :- طریقی۔ اور دوسرے قوانین موضوعہ کی طرح ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہی بہت اچھا قانون ہے۔ لیکن میں پھر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ اسی طرح چلتے گئے تو اس دوسرے سوال کو آپ بالکل بھول جائیں گے جسے اس تحقیق کے شروع میں آپ نے ایک طرف ڈال دیا تھا۔ یعنی آیا یہ صوت اور یہ نظام ممکن بھی ہے؟ اور ممکن ہے تو کس طرح اس لیے کہ آپ کی تجویز اگر قابل عمل ہو تو میں اس کے تسلیم کرنے کے لیے بالکل تیار ہوں کہ اس سے رہائست کو طرح طرح کے فوائد ہونگے۔ بلکہ میں تو یہ اور اعضاء کو بگاڑ جو آپ نے چھوڑ دیا ہے یعنی ہمارے شہری بہادر ترین جنگ آزما ہونگے اور کچھ بہتر اپنی جگہ سے نہ ٹلیں گے؛ اس لیے کہ ایک دوسرے سے واقف ہوں گے اور باہم باپ، بھائی یا بیٹا کہہ کر ایک دوسرے کو پکارینگے۔ اور اگر یہ بھی مانا جائے کہ عورتیں بھی ان فوجوں میں شامل ہونگی خواہ پیش پیش ہوں یا عقب میں؛ دشمن کے لیے برق عذاب کی حیثیت سے ہوں یا بوقت ضرورت مردوں کو مدد پہنچانے کے لیے تو تو میسر یقین ہے کہ یہ فوج ناقابل تسخیر ہوگی۔ اس کے علاوہ بہت سے خانگی فوائد بھی ہیں جن کا ذکر اس سلسلہ میں کیا جاسکتا ہے اور میں انھیں بے کم و کاست تسلیم کرتا ہوں۔

لیکن چونکہ میں ان تمام فوائد کو اور ان کے علاوہ جتنے آپ اور فرمائیں ان سب کو اس شرط پر تسلیم کرتا ہوں کہ آپ کی یہ ریاست عالم وجود میں بھی آجائے اسلئے اس ان فوائد کے متعلق زیادہ کہنے سُسنے کی تو ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب اب سب کے وجود میں آنے کے امکان اور اس کے وسائل و ذرائع کے سوال کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔

ہیں۔۔ میں جہاں ذرا بھٹکا کہ آپ حملہ کر دیتے ہیں اور ذرا رحم نہیں کرتے؛ میں پہلی اور دوسری زو سے مشکل بچا اور آپ شاید نہیں جانتے کہ آپ نے تیسری زو مہیا کر دی۔ اور یہ تیسری زو سب سے قوی اور سب سے بڑی ہے۔ جب آپ بھی اس تیسری موج کو دیکھ بھاں لیں گے تو میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ میری شکل کا زیادہ خیال کریں گے اور غالباً تسلیم کریں گے کہ ایسی غیر معمولی تجویز پیش کرنے سے پہلے میرا خوف اور میری جھجک فطری تھی اور جائز۔

گ۔۔ آپ جتنی زیادہ اس قسم کی درخواستیں کرتے ہیں اسی قدر ہمارا عزم قوی ہوتا ہے کہ آپ سے اس مایست کے امکان کے ذرائع دریافت کر کے چھوڑیں۔ بس کہئے بھی۔ جلدی کیجئے۔

میں۔۔ میں پہلے تو آپ کو یہ یاد دلادوں کہ ہم یہاں پہنچے ہیں عدل اور ناصافی کی تلاش میں! گ۔۔ جی، لیکن اس سے مطلب؟



میں۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر ان چیزوں کی ماہیت معلوم ہو چکی ہو تو کیا عادل انسان کو کسی معاملہ میں عدل مطلق کے جاوہ سے انحراف نہ کرنا چاہیے؟ یا ہم مطلق ہو جائینگے اگر وہ قریب قریب عادل ہو اور صفت عدل کا وجود اسمیں اور انسانوں سے زیادہ پایا جاتا ہو؟

گ۔۔۔ بس قریب قریب عادل ہونا کافی ہوگا۔

میں۔۔۔ مگر یاد رہے کہ ہم عدل مطلق کی ماہیت اور عادل کامل کی خصوصیات دریافت کر رہے تھے، اور اسی طرح مطلق نا انصافی کی ماہیت اور کامل غیر منصف کی خصوصیتیں۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ ہمارے سامنے ان چیزوں کا ایک تصور قائم ہو جائے۔ اور ان کی تلاش اس لیے تھی کہ اس معیار سے مقابلہ کر کے اور یہ دیکھ کر کہ ہم اپنے کس درجہ مشابہ یا غیر مشابہ ہیں، ہم خود اپنی خوشحالی یا عدم خوشحالی کا اندازہ کر سکیں۔ کچھ یہ تھوڑی ہی ظاہر کرنا تھا کہ یہ تصورات واقعہ موجود بھی ہو سکتے ہیں گ۔۔۔ درست۔

میں۔۔۔ کیا ایک مصور اسوجہ سے بُرا مصور ہو جائیگا کہ کمال ہنرمندی سے ایک حسین شکل کے خط و خال تیار کرنے کے بعد وہ یہ نہیں بتا سکتا کہ آیا یہی شکل کبھی موجود بھی تھی۔

گ۔۔۔ نہیں، کبھی نہیں۔

میں۔۔۔ اچھا تو ہم بھی تو ایک کامل ریاست کا تصور قائم کر رہے تھے۔

گ :- جی ،

میں :- تو کیا ہمارا نظریہ اسوجہ سے برا قرار پا جائیگا کہ ہم یہ نہیں ثابت کر سکتے کہ کبھی شہر یا ریاست کے اس طرح مرتب ہونیکا امکان بھی ہے۔

گ :- نہیں ، ہرگز نہیں۔

میں :- بیشک حقیقت تو یہی ہے۔ لیکن اگر آپ کی درخواست پر میں یہ بتلانے کی کوشش کروں کہ کن حالتوں میں ایسی ریاست کے وجود کا امکان سب سے زیادہ ہے تو میں پہلے آپ سے تمام سابقہ مسلمات کے دوہرانے کی درخواست کروں گا۔

گ :- کونسے مسلمات ؟

میں :- میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا زبان کبھی بھی تصورات کی پوری ترجمانی کر سکتی ہے۔ کیا الفاظ و اوقات سے زیادہ اظہار نہیں کرتے اور آدمی جو چاہے سمجھے کیا لازمی طور پر وجود حقیقت سے کچھ کم نہیں ہوتا۔ کیسے آپ کا کیا خیال ہے ؟

گ :- میں آپ کا ہم خیال ہوں۔

میں :- تو پھر آپ اس امر پر مصر نہ ہوں کہ عالم وجود میں جو ریاست ہوتی ہے اسے من و عن اپنے تصور کے مطابق ثابت کروں۔ اگر بس اتنا ہی معلوم ہو جائے کہ ہماری تجویز کے لگ بھگ کسی شہر کیس طرح حکومت ہو سکتی ہے تو غالباً آپ تسلیم کر لیں گے کہ آپ جس امکان کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ معلوم ہو گیا۔ بس اسی پر قناعت



کیجئے گا۔ مجھے تو یقین ہے کہ میں اس پر قانع ہو جاؤنگا۔ کیوں، کیا آپ نہ ہونگے؟

گ۔۔ ہاں ہاں، میں بھی ہو جاؤنگا۔

میں۔۔ اس کے بعد میں یہ بتلانے کی کوشش کرتا ہوں کہ ریاستوں کی کونسی

غلطی ان کی موجودہ تنظیم کا باعث ہے۔ اور وہ کم سے کم اصلاح کو سنسی ہے جو ریاست کو بہتر شکل میں تبدیل کر سکتی ہے۔ ممکن ہو تو اصلاح بس ایک ہی چیز کی ہونی چاہئے، یاد دہانی بغیر جس تبدیلیاں حسبِ در کم اور حسبِ قدر خفیف ہوں بہتر ہے۔

گ۔۔ بیشک۔

میں۔۔ میرے خیال میں اگر ایک تبدیلی کر دی جائے تو ریاست کی

اصلاح ممکن ہے۔ ہر چند یہ تبدیلی نہ آسان ہے نہ خفیف، البتہ ممکن ضرور ہے۔

گ۔۔ وہ کیا؟

میں۔۔ میں اب اس چیز سے دوچار ہوتا ہوں جسے میں سب سے بڑی ٹیٹے

تعبیر کیا تھا۔ اب چاہئے یہ لہر مجھے طوفانِ متحضر و تحقیر میں غرق ہی کیوں نہ کر دے، حقیقت کا اظہار تو بہر حال ضروری ہے۔ اچھا تو غور سے میری بات سُنو۔

گ۔۔ ارشاد۔

میں۔۔ شہروں کو بلکہ نواحِ انسانی کو اپنے مصائب سے اُس وقت تک بچا

نصیب نہ ہوگی جب تک دنیا میں فلسفی بادشاہ نہ ہوں یا بادشاہوں اور شہزادوں میں فلسفی کی روح اور فلسفہ کی قوت نہ آجائے۔ یعنی جب تک سیاسی عظمت

اور عرفان حقیقت دونوں یکجا ہوجائیں اور وہ عامیانا طبائع جوان میں سہتر  
ایک کی اتباع کرنے اور دوسرے کو چھوڑ دیتے ہیں، علیحدہ ہونے پر مجبور ہوجاتے ہیں  
ایسا ہوجائے تو ہماری ریاست عالم وجود میں آسکتی ہے اور اسی وقت اس کے  
لیے امکان حیات بھی ہے۔

گلاکن : میرا تو یہ خیال ہے اور اگر یہ اس درجہ مسابلقہ آمیز نہ معلوم ہوتا تو میں  
ابتداء میں اس کا اظہار کر چکا ہوتا۔ لوگ اسکے بڑی مشکل سے قائل ہوں گے کہ کسی اور  
ریاست میں شخصی یا جماعتی خوشی کا پایا جانا ممکن ہی نہیں۔

گ : جناب سقراط ! یہ آپ کہہ کیا ہے ہیں؟ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں  
کہ یہ جو الفاظ آپ نے ابھی ابھی فرمائے، اپنی تو اکثر لوگ اور بہت سے معزز اشخاص فوراً  
اپنی عبا قبلا تار جو ہتھیار ہاتھ پٹے لے لیکر آپ پر نہ معلوم کس نیت سے ایسے  
دوڑ پڑیں گے کہ آپ کو علم بھی نہ ہو گا کہ آپ ہیں کہاں۔ اور اگر آپ نے پہلے سے کوئی  
جواب تیار نہ کر لیا تو یہ اپنی ذکاوت سے بس آپ کے ٹکڑے ٹکڑے ہی تو کر ڈالینگے۔  
اور..... اور بجا کریں گے۔

میں :- جی جی۔ تم نے مجھے اس مصیبت میں ڈالا۔

گ :- اچھا تو کیا۔ لیکن خیر میں آپ کو اس سے نکلانے کی بھی ہر ممکن کوشش  
کرونگا۔ لیکن سوائے نیک ارادہ اور نیک مشورہ کے اور میرے پاس ہی کیا؟ البتہ  
شاید آپ کے سوالوں کا جواب اوروں سے بہتر دے سکوں تو دے سکوں اپنے سنا،



آپ کے مددگار کا تو یہ حال ہے، اب منکرین و مخالفین کو اپنے حق بجانب ہونیکا یقین دلائیے۔

میں :- آپ جب ایسی گراں بہا امداد ہم پہنچائیں تو مجھے بھی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمارے بچنے کی بس ایک یہ صوت ہے کہ ہم پہلے ہی بتلا دیں کہ جب ہم کہتے ہیں کہ فلسفی بادشاہ ہوں، تو ہماری مراد کن لوگوں سے ہے۔ اس طرح ہم اپنی بریت کر سکیں گے۔ دنیا میں بعض طبائع آپ کو ایسی ملیں گی جنہیں فلسفہ کا مطالعہ کرنا اور رر مایست کا سردار بننا چاہیے اور بعض طبائع ایسی ہوں گی جو فلسفی بننے کے لیے پیدا ہی نہیں ہوتیں۔ ان کی غایت جو عقیدہ و اتباع ہے، اقتدار نہیں۔

گ :- ہاں، تو فلسفی کی تعریف کر دیجئے۔

میں :- سُنئے۔ مجھے اُمید ہے کہ جیسے تمہارے اس کی تسلی بخش توضیح کر دوں گا۔

گ :- فرمائیے۔

میں :- آپ کو تو یاد ہو گا اس لیے اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں کہ ایک شخص کو بشرطیکہ وہ اس نام کا واقعی مستحق ہو اپنے محبوب کے کسی جزو سے اظہار محبت نہ کرنا چاہیے بلکہ کل سے۔

گ :- میں نہیں سمجھا۔ ذرا میرے حافظہ کی مدد فرمائیے۔

میں :- اور کوئی شخص بھی آسانی سے ہی آپ کا سا جواب دے سکتا تھا لیکن آپ جیسے طرح دار آدمی کو تو معلوم ہوتا چاہیے کہ تمام وہ لوگ جو عنفوان شباب میں

ہوتے ہیں کسی نہ کسی طرح کسی عاشق کے سینہ میں ایک کسک پیدا کرتے یا کسی کو  
کو تخریب دیتے ہیں اور عاشق انہیں اپنی محبت آمیز توجہ کا مستحق سمجھتا ہے۔ سینوں کے  
معامہ میں لوگوں کا طرز عمل کیا یہ نہیں ہوتا کہ اگر معشوق کی ناک ذرا پھٹی ہو تو اس کے  
دل فریب چہرہ کی تعریف ہو رہی ہو، کسی کی بہت لمبی ناک ہو تو اس کے شاہانہ انداز  
کی تحسین ہو، جس میں یہ دونوں باتیں نہیں تو اس میں حسن تناسب کی مدح سرائی  
ہی۔ اگر رنگ ذرا سیاہ ہو تو یہ مردانگی کی علامت ہے، عموماً رنگ وا دیوتاؤں  
کی اولاد میں رہتے "زر و علی" تو ان کے تو نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی  
عاشق کی تلاش اور تصنیف ہے جس کے لیے زردی اگر عارض شباب پر نمودار ہو  
تو وہ بھی ناگوار نہیں۔ غرض وہ کونسا بہانہ ہی جو لوگ اس غرض سے نہ بنالیں گے  
اور کونسی بات ہے جو اس لیے نہ ڈھونڈ لیں گے کہ بہارستان شباب کا ایک  
پھول بھی ان کے ہاتھ سے نہ جانے پائے۔

گ۔ اگر دلیل کی خاطر آپ مجھے معاملات عشق و محبت میں سد بناتے ہیں  
تو خیر مجھے منظور ہے۔

میں :- پھر شراب کے دلدادوں کا کیا حال ہے؟ وہ بھی کرتے ہیں کہ کسی  
قسم کی شراب ہو، اُسے پینے کے لیے ہر طرح کا بہانہ خوشی سے ڈھونڈ لیں گے۔  
گ :- بہت درست۔

میں :- یہی حال حریص اور حوصلہ مند لوگوں کا ہے۔ پوری فوج کی تیاریاں



نصیب نہیں ہوئی تو ایک قطار ہی کی سہی۔ اگر بڑے اور معزز لوگ ان کی عزت نہیں کرتے تو کم حیثیت اور بیخ لوگوں سے خراج تحسین وصول کر کے خوش ہیں بس غرض یہ ہے کہ کسی نہ کسی قسم کی عزت ضرور ہو۔  
گ۔۔۔ خجی بالکل ہی حال ہے۔

میں۔۔۔ تو میں پھر ایک مرتبہ پوچھتا ہوں کہ جب کوئی شخص کسی نوع خوبی کا دلدادہ ہوتا ہے تو پوری نوع کی آرزو رکھتا ہے یا محض ایک جزو کی۔  
گ۔۔۔ کل کی۔

میں۔۔۔ چنانچہ ہم فلسفی کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ وہ حکمت و عرفان کسی جزو کا عاشق نہیں ہوتا بلکہ کل کا۔  
گ۔۔۔ بیشک، کل کا۔

میں۔۔۔ جو علم کو ناپسند کرتا ہو خصوصاً کسنی میں ہی کہ ابھی خیر و شر میں تمیز کی قوت نہیں ہوتی، تو ایسے آدمی کو ہم فلسفی یا محبت علم نہیں قرار دے سکتے۔ جو غذا سے انکار کرے وہ بھوکا نہیں اس کی اشتہا بڑی ہے، اچھی نہیں۔  
گ۔۔۔ بالکل ٹھیک۔

میں۔۔۔ اس کے برعکس جسے ہر قسم کے علم کا ذوق ہو اور جو ہر بات کو دیکھنے کا متمنی ہو اور کبھی اس سے سیر ہی نہ ہوتا ہو تو ایسے شخص کو بجا طور پر فلسفی (حکیم) کہا جاسکتا ہے۔ کیوں، میں ٹھیک کہتا ہوں نا؟

گ۔۔ اگر آدمی محض تجسس سے حکیم بن جاتا ہے تو تو آپ کو عجیب و غریب باتیں  
اس لقب کی مستحق ملیں گی۔ مختلف نظارے اور تماشے دیکھنے والے سب کے  
سب کو دیکھنے سے خوش ہوتے ہیں، اس لیے یہ بھی شامل کیے جانے چاہئیں۔  
موسیقی کے نوکھے یوں تو فلسفیوں میں کھتے نظر آتے نہیں، اس لیے کہ اسے بن پر  
تو کبھی فلسفیانہ بحث و تحقیق کے قریب ہٹکیں بھی نہیں۔ لیکن سارے دیا ایسی  
تواروں میں یہ حضرات ادھر ادھر ایسے ڈوڑے ڈوڑے پھرتے ہیں گویا ہمت  
گوش ہیں اور اپنے کانوں کو ہر ترانہ کے لیے وقف شنیدن کر چکے ہیں۔ پھر جا  
یہ محفل سماع شہر میں ہو یا گاؤں میں، اس کی کچھ پروا نہیں۔ یہ حضرات ہیں کہ موجود  
ہیں۔ اچھا تو کیا اس وجہ سے ہم انھیں، اور ان کے ہم مذاق دوستوں کو گنیز  
اور چھوٹے چھوٹے فن جاننے والوں کو فلسفی قرار دیں گے؟

میں :- نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ لوگ تو محض نقل ہیں۔

گ :- اور اصل پھر کون ہیں؟

میں :- وہ جو نظارہ حقیقت کے دلدادہ ہیں۔

گ :- بہت خوب، لیکن میں ذرا آپ کا مفہوم سمجھنا چاہتا ہوں۔

میں :- کسی اور کے سامنے اس کی تشریح شاید کچھ مشکل ہوتی، لیکن میں کچھ

کہنے والا ہوں اُسے تم تو غالباً ضرور تسلیم کر لو گے۔

گ :- وہ کیا؟



میں :- چونکہ حُسنِ قبح کی ضد ہے، اس لیے یہ دو جُدا جُدا چیزیں ہیں۔

گ :- بیشک۔

میں :- اور چونکہ یہ دو مختلف چیزیں ہیں، ایسے نہیں سے ہر ایک ایک چیز کو

گ :- یہ بھی صحیح ہے۔

میں :- اسی طرح عدل و نمانضائی، خیر و شر اور ہر دوسری تقسیم کے متعلق

یہی بیانِ راست آتا ہے۔ علیحدہ علیحدہ تو ان میں سے ہر ایک ایک وحدت پر لیکن

اعمال اور شیاء میں انکے باہم جو مجموعے بنجاتے ہیں ان کی وجہ سے یہ مختلف

صورتوں میں دکھائی دیتے ہیں اور بہت سے معلوم ہوتے ہیں۔

گ :- بہت ٹھیک۔

میں :- یہی ہستیاء میں تماشائی یا عملی محبان فنون اور ان لوگوں میں کرتا

ہوں جنکا میں نے تذکرہ کیا تھا۔ بس یہی مؤخر الذکر لوگ حقیقی فلسفی کہلانے کو مستحق ہیں

گ :- آپ یہ تفریق کس طرح کرتے ہیں؟

میں :- یہ عاشقانِ نغمہ اور دلدادگانِ جلوہ میرے خیال میں سچ پوچھو تو ہر

آواز، عمدہ الوان، اور خوبصورت شکلوں اور ان سے جو مصنوعی چیزیں پیدا ہوتی ہیں،

ان کے چاہنے والے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا دماغ حسنِ مطلق کے نظارہ یا اسکی محبت

کے بکھلم ناکابل ہوتا ہے۔

گ :- بیشک۔

میں :- وہ لوگ بہت کم ہیں جو اس کا نظارہ حاصل کر سکیں۔  
گ :- بلاشبہ۔

میں :- میں تو یہ پوچھتا ہوں کہ ایک ذمی ہے جو حین ہشیاء کا حس نو رکھتا ہے  
لیکن حس مطلق کا اسے بالکل احساس نہیں؛ پھر اگر کوئی اسے اس حس کی طرف پہنچانا  
چاہے تو یہ اس کے پیچھے پیچھے چل ہی نہیں سکتا، تو آیا یہ آدمی بیدار ہی یا خواب  
میں؛ سوچو۔ کیا خواب دیکھنے والا، خفتہ ہو کہ بیدار، وہ نہیں ہوتا جو غیر مماثل اشیاء  
کو باہم مشابہ کرے اور اصل چیز کے بجائے اس کی نقل کو قبول کرے۔  
گ :- بیشک ایسا شخص خواب میں ہے۔

میں :- اس کے مقابلہ میں ایک دوسرے شخص کا حال دیکھیے جو حس مطلق  
کے وجود کو پہچانتا اور اس کے تصور کو ان اشیاء سے ممیز کر سکتا ہے جو اس تصور میں  
شریک ہیں؛ اور نہ تو ان اشیاء کو تصور کی جگہ رکھتا ہے، نہ تصور کو ان اشیاء کی جگہ؛  
تو یہ شخص خواب میں ہے یا بیدار۔

گ :- بالکل بیدار۔

میں :- گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو جانتا ہے اس کے ذہن میں علم ہے، اور محض  
قیاس سے کام کرتا ہے اس میں ظن ورے۔  
گ :- بیشک۔

میں :- لیکن عرض کرو کہ یہ مؤخر الذکر شخص ہم سے جھگڑے اور ہمارے



بیان کی تردید کرے تو ایسی حالت میں کیا یہ ممکن ہے کہ اسپر اس امر کا اظہار کیے بغیر کہ اسکے ہوا میں سخت بے ترقیبی اور خبط ہی ہم کوئی جدا گانہ مسکن اس کے لیے تجویز کر دیں یا کوئی اور بہتر مشورہ اسے دے سکیں۔

گ۔۔ بیشک اس غریب کو کوئی اچھا مشورہ دینا چاہیے۔

میں۔۔ اچھا تو آؤ سوچیں کہ اس سے کیا کہا جائے۔ میں جانتا ہوں کہ پہلے تو اسے یقین دلائیں کہ بھائی تمہیں اگر کسی چیز کا علم ہے تو ہم بہت خوش ہیں تمہیں مبارک۔ لیکن ہاں اس سے ایک سوال بھی پوچھنا چاہیے یعنی جس شخص کو علم ہوتا، وہ کچھ جانتا ہے یا نہیں جانتا؟ آپ اس کی طرف سے جواب دیجئے۔

گ۔۔ میں جواب دیتا ہوں کہ وہ کچھ جانتا ہے۔

میں۔۔ یہ کچھ چیز موجود ہے یا موجود نہیں؟

گ۔۔ موجود ہے۔ کیونکہ جو ہی نہیں اس کا علم کس طرح ہو سکتا ہے؟

میں۔۔ تو کیا اس مسئلہ پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالنے کے بعد ہم کو یقین ہے

کہ وجود مطلق کے متعلق تو علم ہی یا ہو سکتا ہے؛ لیکن جو چیز بالکل غیر موجود یا معدوم ہو وہ

بالکل غیر معلوم بھی ہوگی؟

گ۔۔ اس سے زیادہ یقینی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔

میں۔۔ بہت خوب؛ لیکن اگر کوئی چیز ایسی ہو کہ ہو بھی اور نہ بھی ہو تو اسے

خالص وجود اور مطلق عدم وجود کے درمیان جگہ دیجائیگی۔

گ۔۔ ہاں، اتکے بین بین۔

میں :- اور جس طرح علم مطابق تھا وجود سے اور جہل لازمًا وابستہ تھا عدم وجود سے اسی طرح اس عدم وجود کے درمیان حالت کے لیے ایک کیفیت معلوم کرنی چاہیے جو علم اور جہل کے بین بین ہو؛ بشرطیکہ ایسی چیز کہیں ہو بھی۔  
گ۔۔ بیشک۔

میں :- کیا آپ ظن اور رائے کا وجود تسلیم کرتے ہیں؟  
گ۔۔ بلاشبہ۔

میں :- علم اور رائے ایک ہی چیز ہیں یا مختلف صلاحیتیں؟  
گ۔۔ مختلف صلاحیتیں۔

میں :- تو اس اختلاف صلاحیت کے مطابق علم اور رائے مختلف چیزوں سے بحث بھی کرتے ہونگے؟  
گ۔۔ جی ہاں۔

میں :- علم تو موجود سے متعلق ہی اور موجود کو جانتا ہی۔ لیکن ان کے چلنے سے پہلے میں ایک تقسیم اور کرونگا۔  
گ۔۔ کیسی تقسیم؟

میں :- پہلے تو میں سب صلاحیتوں کو ایک گروہ میں رکھتا ہوں۔ صلاحیتیں ہماری اور دیگر شیاؤں کی وہ قوتیں ہیں جنکے باعث ہمارا عمل وہ ہی جو کہ ہمیشہ



باصرہ اور سامعہ کو میں صلاحیتیں نہ کہوں گا۔ میں جس گروہ کا ذکر کرتا ہوں اس کی غالباً کافی توضیح ہو گئی ہوگی؛  
گ۔۔۔ جی ہاں، میں سمجھ گیا۔

میں :- تو اب میں ان کے متعلق اپنا خیال ظاہر کروں۔ ان کو چونکہ میں دیکھتا نہیں اس لیے رنگ، شکل و غیرہ کا اختلاف جو دوسری چیزوں میں باہم امتیاز کر دیتا ہے وہ ان پر عائد نہ ہوگا۔ میں جب صلاحیت کا ذکر کرتا ہوں تو اسکے حیطہ اثر اور اس کے نتیجہ کا خیال میرے ذہن میں ہوتا ہے۔ جن صلاحیتوں کا حیطہ اثر اور نتیجہ ایک ہوا نہیں میں ایک صلاحیت کہتا ہوں، جن کا حیطہ عمل اور نتیجہ مختلف ہوا نہیں مختلف صلاحیتیں آپ بھی کیا اسی اصول پر گفتگو کریں گے؟  
گ۔۔۔ جی ہاں۔

میں :- کیا آپ براہ نوازش ایک سوال کا اور جواب دیں گے؟ علم کو کیا کیا آپ صلاحیت مانتے ہیں! اور اسے کس گروہ میں جگہ دیتے ہیں؟  
گ۔۔۔ بیشک، علم صلاحیت ہے، اور سب سے زبردست صلاحیت۔  
میں :- اور رائے قیاس بھی ایک صلاحیت ہے؟  
گ۔۔۔ بیشک، کیونکہ قیاس ہی وہ صلاحیت ہے جس سے ہم رائے قائم کرتے ہیں۔

میں :- اور ابھی تھوڑی دیر ہوئی آپ نے تسلیم کیا تھا کہ علم اور رائے ایک

چیز نہیں۔

گ :- ہاں، تو کیا ہوا؟ کوئی معقول شخص ایک ایسی چیز کو جو غلطی اور خطا سے بہتر ہے اس چیز سے کیوں کر ملا سکتا ہے جس میں غلطی اور خطا ہوتی ہے۔

میں :- سبحان اللہ۔ آپ نے نہایت خوب جواب دیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان دونوں کے فرق سے بخوبی آشنا ہیں۔  
گ :- جی۔

میں :- گویا علم اور قیاس کی جدا جدا قوتیں ہیں؛ ان کا میدان جدا ہے اور ان کا موضوع تحقیق جدا۔  
گ :- یقیناً۔

میں :- علم کا موضوع یا میدان تحقیق وجود ہے، اور علم ماہیت وجود کے جاننے کا نام۔  
گ :- جی ہاں۔

میں :- اور قیاس گویا ایک رائے رکھنے کو کہتے ہیں۔  
گ :- جی۔

میں :- ہم جو قیاس کرتے ہیں کیا اسے جانتے بھی ہیں (اس کا علم بھی رکھتے ہیں) کیا قیاس اور علم کا موضوع ایک ہی ہے؟

گ :- نہیں، اس کے تو خلاف پہلے ہی ثابت ہو چکا ہے۔ اختلاف صداقت



کے معنی اگر اختلاف حیطہ اثر اور اختلاف موضوع ہیں اور اگر علم و قیاس مختلف صلاحتیں ہیں تو پھر ان کا میدان تحقیق ایک نہیں ہو سکتا۔

میں :- اگر علم کا موضوع وجود ہی تو قیاس کا اور کچھ ہونا چاہیے۔

گ :- جی ہاں، کچھ اور چاہیے۔

میں :- اچھا، تو قیاس کا موضوع کیا غیر وجود ہی؟ مگر معدوم اور غیر موجود

کے متعلق اسے کیسے قائم ہو سکتی ہے؟ ذرا سوچو۔ جب انسان اسے قائم کرتا ہے تو کسی چیز کے متعلق ہی تو قائم کرتا ہے یا ایسی اسے رکھنا بھی ممکن ہے جو کسی چیز کے متعلق

گ :- یہ تو ناممکن ہے۔

میں :- جو شخص اسے رکھتا ہے وہ کسی چیز کی بابت رکھتا ہے۔

گ :- جی۔

میں :- اور معدوم وغیر موجود چیز نہیں ہوتی۔

گ :- درست۔

میں :- غیر موجود کا لازمی سبب تو ہبل تسلیم کیا گیا تھا اور وجود کا علم۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- تو گو پارے موجود اور غیر موجود دونوں میں سے کسی سے تعلق نہیں

گ :- جی ہاں، کسی سے نہیں۔

میں :- چنانچہ یہ نہ علم ہی، نہ ہبل۔

گ۔ یہ تو ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔

میں :- لیکن اس کے کی تلاش کیا ان دونوں کے باہر اور اسے پرے کرینی چاہیے یعنی علم سے زیادہ صفائی اور وضاحتیں یا جہل سے زیادہ تاریکی میں؟  
گ۔ دونوں میں سے کسی میں نہیں۔

میں :- میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے خیال میں اسے علم سے کچھ تاریک اور جہل سے کچھ روشن ہوتی ہے۔

گ۔ جی، اور یہ کیا کوئی تخفیف اختلاف ہے؟

میں :- ہاں، اور اسے علم اور جہل کی حدود کے اندر اور ان کے بین میں ہی ہوتی ہونا؟

گ۔ جی ہاں،

میں :- گویا آپ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ قیاس اسے درمیانی چیز ہے۔

گ۔ بلاشبہ۔

میں :- تھوڑی ہی دیر ہوئی کہ ہم کہہ رہے تھے کہ اگر کوئی چیز ایسی ہو کہ ایک ہی وقت میں ہو بھی اور نہ بھی ہو، تو وہ خالص وجود اور مطلق غیر موجود کے درمیان رکھی جائیگی اور اس کے مطابق صلاحیت نہ علم ہوگی نہ جہل بلکہ ان کے بین میں ایک کیفیت۔

گ۔ جی ہاں۔



میں :- اس بیچ کے فصل میں ہمیں ایک چیز معلوم ہونی ہے جسے ہم رائے و  
قیاس سے موسوم کرتے ہیں۔

گ :- جی ہاں،

میں :- اب جس کا پتہ لگانا ہے وہ وہ چیز ہے جو موجود اور غیر موجود دونوں کی  
ماہیت کی حامل ہو، اور جو نہ خالص موجود کی جاسکے نہ محض غیر موجود۔ یہ نامعلوم  
لفظ جب معلوم ہو جائے گا تو یہی بجا طور پر صلاحیت رائے و قیاس کا موضوع قرار  
پائے گا۔ پھر سب موضوع اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق کر دیے جائیں گے،  
دونوں انتہائی موضوع انتہائی صلاحیتوں کے اور درمیانی موضوع درمیانی  
صلاحیت کے۔

گ :- درست۔

میں :- جب یہ طر ہو چکا تو میں اب ان حضرت سے ایک سوال کروں گا جنکی  
سے میں حسن کا کوئی عین اور غیر متغیر تصور نہیں ہے۔ جن کے نزدیک حسن کثرت  
میں ہے، وہی، وہی آپ کے نظار ہائے حسین کے دلدادہ جنہیں اس امر کا اظہار  
گوارا نہیں کہ حسن ایک وحدت ہے اور اسی طرح عدل وحدت ہے اور دوسری  
چیزیں بھی۔ میں ان حضرت کی خدمت میں گزارش کروں گا کہ ”جناب عالی۔  
کیا آپ ازراہ نوازش تمام حسین و جمیل چیزوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی بتلا  
سکتے ہیں جو بھونڈی اور بد شکل بھی نہ معلوم ہوتی ہو، یا کوئی انصاف و عدل کی

ایسی مثال جو غیر منصفانہ بھی نہ پائی جائے، یا کوئی ایسی متعصب چیز جو ناپاک بھی نہ ہو؟

گ۔۔ نہیں، ہر عین کسی نہ کسی پہلو سے ضرور بھونڈا اور بد شکل معلوم ہوگا، اور یہی حال دوسری چیزوں کا ہے۔

میں۔۔ بہت سی چیزیں جو دو گنی ہیں کیا وہ آدمی بھی نہیں، یعنی اگر کسی کی دو چند ہیں تو کسی کی نصف؟

گ۔۔ جی۔

میں۔۔ جن چیزوں کو ہم بھاری یا ہلکا، بڑا یا چھوٹا کہتے ہیں کیا یہ بالکل اُسے نام سے نہیں پکاری جاسکتیں، یعنی بھاری کو ہلکا، بڑے کو چھوٹا، کہ یہ سب اعتباری لفظ ہیں۔

گ۔۔ ہاں ہاں، دونوں نام عائد ہو سکتے ہیں۔

میں۔۔ اور کیا ان بہت سی چیزوں کے متعلق جنہیں مخصوص ناموں سے پکارتے ہیں، کبھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہیں اور کبھی یہ کہ نہیں؟

گ۔۔ یہ چیزیں تو ان پہیلیوں کی سی حیثیت رکھتی ہیں جنہیں لوگ دعویٰ کے موقعوں پر پوچھا کرتے ہیں یا بچوں کے اُس معمہ کی سی جس میں وہی خواجہ سرا نے چمگا در کا نشانہ لیا تھا۔ اسی میں تو پوچھتے ہیں کہ اس نے چمگا در کو کہا ہے سے مارا اور چمگا در بیٹھا کلبہ پر تھا۔ جن انفرادی چیزوں کا میں نے ذکر کیا



وہ بھی ایک عمدہ ہیں اور دوسرے معنی رکھتی ہیں۔ آپ انہیں اپنے ذہن میں نہ تو موجود کی حیثیت سے قائم کر سکتے ہیں نہ غیر موجود کی طرح، نہ یہی ہے کہ دو لوگوں یا پھر ایک بھی نہ ہوں۔

میں :- تو اب ان کے ساتھ آپ کرینگے کیا؟ کیا وجود و عدم وجود کے درمیانی جگہ سے کوئی اور بہتر جگہ ان کے لئے نکل سکتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ غیر موجود و معدوم سے زیادہ تاریکی اور عدم میں تو نہیں ہیں اور نہ موجود سے زیادہ روشنی اور وجود میں۔

گ :- یہ تو بالکل صحیح ہے۔

میں :- تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہم نے یہ پتہ لگایا کہ عوام حسن اور دوسری چیزوں کے متعلق جو بہت سے خیالات و تصورات رکھتے ہیں وہ سب کے سب ایسی چیزوں کی بابت ہیں جو اس علاقہ میں ماری پھرتی ہیں جو خالص وجود اور بالکل غیر موجود کے درمیان واقع ہے۔

گ :- جی ہاں، یہی پتہ چلا۔

میں :- اور یہ ہم پہلے ہی طے کر چکے ہیں کہ اس قسم کی جس چیز کا پتہ پتہ چلیگا وہ موضوع قیاس و اراپائیگی نہ کہ موضوع علم یعنی یہ وہ درمیانی برنخ ہے جو درمیانی صلاحیت کے حصہ میں آتا ہے۔

گ :- بالکل بجا۔

میں :- تو پھر جو لوگ بہت سی حسین اور جمیل چیزیں تو دیکھتے ہیں لیکن پھر بھی تو

حسن مطلق کا نظارہ نہیں نصیب ہے، نہ وہ کسی ایسے راہبر کا تتبع ہی کرتے ہیں جو اس کی راہ بتلا سکے؛ یا وہ لوگ جو کثرت سے عادل تو دیکھتے ہیں لیکن عدل مطلق کو نہیں دیکھتے یا ان جیسے اور لوگ، ان سب کو قیاس رائے کا حامل کہا جاسکتا ہے علم کا نہیں۔  
گ :- یقیناً۔

میں :- لیکن جو حقیقت مطلق ابدی وغیر متبدل کا نظارہ کرتے ہیں وہ تو حامل علم ہیں؛ یہ صرف رائے ہی رائے نہیں کہتے۔  
گ :- اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔

میں :- ایک گروہ تو موضوع علم سے محبت کرتا اور اُسے سینہ سے لگاتا ہے، دوسرے گروہ موضوع قیاس سے۔ یہ دوسرے گروہ نہیں لوگوں کا ہے جو سامعہ نواز ترانے سنتے اور نظر فریب زد دیکھتے تھے لیکن حسن مطلق کا وجود انہیں گوارا نہ تھا۔  
گ :- جی ہاں، مجھے یاد ہے۔

میں :- تو اگر انہیں بجائے شیفتگان معرفت کے محبان قیاس رائے کہیں تو کیا کچھ بچا ہوگا؟ اور کیا واقعی اسپریم سے بہت ناراض ہو جائینگے؟  
گ :- نہیں نہیں، میں سمجھا دوں گا کہ خفا نہ ہوں۔ امر حق پر کسی کو ناراض نہ ہونا چاہیے۔ میں :- اسکے برعکس جو لوگ ہر شے میں حقیقت کے ولدا وہ ہیں انہیں محبان معرفت و حکمت کہا جائیگا نہ کہ شیڈائیوں قیاس و رائے۔  
گ :- یقیناً۔



# ریاست

## باب ششم

### فلسفہ حکومت

میں :- گلاکن ! اس قدر طول طویل دلیل و بحث کے بعد بالآخر سچے اور چھوٹے فلسفیوں کی حقیقت ظاہر ہو گئی۔

گ :- میں تو سمجھتا ہوں کہ بحث میں اختصار ممکن ہی نہ تھا۔

میں :- ہاں غالباً نہ تھا۔ لیکن اگر بحث اسی ایک موضوع تک محدود رہتی

اور دوسرے سوالات منتظر تحقیق نہ ہوتے، چہر غورا اور نظر اس شخص کے لیے اہم ضروری ہی جو عدل اور نا انصافی کی زندگی میں جب امتیاز معلوم کرنا چاہتا ہے، تو میرا یقین ہے کہ ہم فلسفیوں کی ان دو اقسام کا بہتر نظارہ کر سکتے۔

گ :- تو اب اس کے بعد دوسرا مسئلہ کیا ہے؟

میں :- یقیناً وہی سوال جو ترتیب سے اسکے بعد پیدا ہوتا ہے۔ یعنی چونکہ فلسفی ہی حقیقت ابدی و غیر متبدل کو پاسکتے ہیں اور جو لوگ کثرت اور تغیر کے میدان میں دشت پیمائی کرتے ہیں وہ فلسفی نہیں، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کونسا گروہ

ہماری رہایت کا حکم ایا ہو؟

گ :- اس سوال کا صحیح جواب کس طرح دیا جائے؟

میں :- یوں کہ ان میں سے جو گروہ بھی ہمارے قوانین اور تشبیقات کی بہتر حفاظت کر سکے اسے ہی کو ہم اپنا محافظ بنا لیں۔

گ :- بہت خوب۔

میں :- اس میں بھی کلام نہیں کہ جس محافظ کو کوئی چیز قائم و سلامت رکھنی ہو اسکے آنکھیں ہونی چاہئیں یہ نہیں کہ اندھا ہو۔

گ :- اس میں کیا کلام ہے۔

میں :- اور کیا وہ لوگ جو ہر چیز کے حقیقی وجود کے علم سے محروم ہیں جنکی روح میں کوئی صاف نمونہ موجود نہیں، جو اس قابل نہیں کہ مصور کی طرح حقیقت مطلق کو دیکھ سکیں اور پھر اس اصلیت کی طرف رجوع کریں اور دوسری دنیا کا کامل مشاہدہ کر کے اس عالم میں حسن و نیکی اور عدل کے متعلق قوانین نافذ کر سکیں (بشرطیکہ پہلے سے ان قوانین کا نفاذ نہ ہو چکا ہو) اور پھر ان کے ترتیب و نظام کو برقرار و محفوظ رکھ سکیں۔ جن لوگوں میں یہ کوئی بات موجود نہ ہو کیا وہ اندھے نہیں؟

گ :- سچ ہے۔ وہ تقریباً اسی حال میں ہیں۔

میں :- پھر کیا یہ لوگ اسی حالت میں ہمارے محافظ ہو سکتے ہیں کہ دوسرے



ایسے لوگ موجود ہوں جو تجربہ میں ان کے ہم پلہ اور کسی خاص خوبی میں ان سے کم نہ ہونے کے علاوہ ہر چیز کی اصل حقیقت کا علم بھی رکھتے ہیں۔  
 گ۔ کوئی وجہ نہیں کہ جن لوگوں میں یہ بہترین صفت موجود ہو انہیں مسترد کیا جائے۔ انہیں کو ہمیشہ تقدم حاصل ہونا چاہیے بشرطیکہ یہ کسی دوسری حیثیت سے کم نہ ہوں۔

میں :- اچھا تو اب یہ معلوم کریں کہ یہ لوگ اس خوبی کے ساتھ دوسرے محاسن کو کھانٹا کھج کر سکتے ہیں؟  
 گ۔ ضرور۔

میں :- جیسا کہ ہم شروع میں کہہ چکے ہیں سب سے پہلے تو فلسفی کی ماہیت دریافت کرنی چاہیے۔ اس کے متعلق پہلے ایک سمجھوتہ ہو جائے۔ جب یہ ہو گیا تو غالباً (اگر میں غلطی پر نہ ہوں) ہم یہ بھی تسلیم کر لیں گے کہ صفات کی یہ یکجائی ممکن ہے۔ اور صرف وہی لوگ حکام ریاست ہو سکتے ہیں جن میں یہ صفات مستحضر یکجا ہوں۔  
 گ۔ آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں :- فرض کیجئے کہ فلسفیانہ دماغ ہمیشہ ایسے علم سے انس رکھیں گے جو انہیں اشیاء کی اس ازلی ماہیت سے آگاہ کرے جو کون و فساد سے متغیر نہ ہو۔  
 گ۔ ٹھیک ہے۔

میں :- یہ بھی فرض کیجئے کہ وہ کل کے کل وجود حقیقی سے محبت کرتے ہیں۔

اور کوئی حصہ بڑا ہو یا چھوٹا کم قابل عزت ہو یا زیادہ، وہ اُسے ترک کرنے کے لئے  
راضی نہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے عاشق اور حریص انسان کے متعلق کہہ چکے ہیں۔  
گ۔۔۔ درست۔

میں۔۔۔ اور اگر ان لوگوں کی یہی حالت ہو جو ہم نے بیان کی تو کیا ان میں  
ایک اور صفت کا ہونا ضروری نہیں؟

گ۔۔۔ وہ کیا صفت؟  
میں۔۔۔ صداقت۔ یہ لوگ کبھی اپنے ذہن میں ارادۂ دروغ و کذب کو جگہ  
نہ دینگے۔ دروغ سے تو یہ سخت نفور ہوں گے اور صداقت کے دلدادہ۔

گ۔۔۔ جی ہاں، انکے متعلق یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے۔

میں۔۔۔ کیا جاسکتا ہے، نہیں بلکہ کہئے کہ کیا جانا چاہیے، کیونکہ جن طبیعت  
میں کسی چیز کی محبت ہو وہ اپنے محبوب کے متعلقات اور ملتی جلتی چیزوں سے محبت  
کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

گ۔۔۔ بجا۔

میں۔۔۔ کیا کوئی اور چیز علم و حکمت سے اس درجہ ملتی جلتی ہے جتنی کہ صداقت؟

گ۔۔۔ اور کون چیز ہو سکتی؟

میں۔۔۔ کیا ایک ہی طبیعت علم و حکمت کی عاشق بھی ہو سکتی ہے اور دروغ

و کذب کی بھی؟



گ۔ کیسے نہیں۔

میں :- سچے محب علم کو تو اوائل عمر ہی سے حتی الامکان تمام حق و صداقت کی آرزو ہونی چاہیے۔

گ۔ یقیناً۔

میں :- اس کے علاوہ ہم تجربہ سے جانتے ہیں کہ کسی شخص کی خواہشات ایک طرف قوی ہوتی ہیں تو دوسری جانب کمزور ہو جاتی ہیں۔ اس کی مثال ایک دریا کی سی ہے جس کا پانی ایک طرف نالی سے نکال لیا گیا ہو۔

گ۔ بیشک۔

میں :- چنانچہ جس شخص کی تمام خواہشات بس جملہ انواع علم کی طرف منعطف ہوں وہ تولدات روحانی میں محو ہو جائے گا اور لذات جسمانی مشکل سے محسوس کریگا۔ لیکن میرا مطلب حقیقی فلسفی سے ہے یونہی کسی ایسے سے نہیں۔

گ۔ یہ تو یقینی امر ہے۔

میں :- ایسا آدمی یقیناً معتدل مزاج اور باعفت ہوگا اور لاپچی کی ضد کیونکہ اس کی طبیعت میں ان محرکات کی جگہ ہی نہیں جو دوسروں کو پالنے اور صبر کرنے کا آرزو مند بناتے ہیں۔

گ۔ درست۔

میں :- اسکے علاوہ فلسفیانہ طبیعت کا ایک اور معیار بھی قابل توجہ ہے۔

گ۔ وہ کیا؟

میں۔ یعنی اس میں ذمہ داری اور بے مروتی کے لیے کوئی معافی جگہ نہ ہو۔ جو طبیعت  
الہی اور انسانی ہشیار کی کلیت کی آرزو رکھتی ہو اس کے لیے کم ظرفی اور کمینہ پن  
سے زیادہ کوئی چیز مخالفت نہیں ہو سکتی۔

گ۔ بالکل بجا۔

میں۔۔۔ تو جس شخص میں شوکت و علو ذہنی ہو، اور جو کل زمانہ اور کل وجود  
کا ناظر ہو، وہ انسانی زندگی کو بہت اہمیت دے سکتا ہے۔  
گ۔ جی ہاں، نہیں دے سکتا۔

میں۔۔۔ اور کیا ایسا آدمی موت کو خطرناک متصور کر سکتا ہے؟

گ۔ ہرگز نہیں۔

میں۔۔۔ اور کیا یہ شخص، جس کی طبیعت کی ترکیب نہایت ہموار ہوئی ہو  
جو نہ لاپچی ہو نہ کم ظرف، شیخی خور ہو نہ بزدل، میں پوچھتا ہوں کیا یہ شخص کبھی  
اپنے معاملات میں غیر منصف اور متشدد ہو سکتا ہے؟

گ۔ ناممکن۔

میں۔۔۔ تو پھر تم آسانی سے دیکھ سکتے ہو کہ آیا ایک شخص منصف مزاج

اور شریف ہو یا اگھر اور وحشی۔ یہ وہ علامات ہیں جو کمسنی ہی میں فلسفیانہ  
اور غیر فلسفیانہ طبائع کو ایک دوسرے سے ممتاز کر دیتی ہیں۔



گ :- دست ۔

میں :- ایک اور بات بھی ہے جس پر نظر کر لینا چاہیے ۔

گ :- وہ کیا ۔

میں :- وہ یہ کہ آیا سیکھنے (تحصیل علم سے اسے کچھ لذت اور خط حاصل ہوتا ہے یا نہیں)۔ کیونکہ کوئی آدمی ایسی چیز سے محبت نہیں کرتا جو اسے کرب و الم پہنچاتی ہو یا جس میں بہت محنت کے بعد وہ تھوڑی سی ترقی کرتا ہو ۔

گ :- یقیناً نہیں ۔

میں :- یا اگر وہ بھول جاتا ہے اور جو کچھ سیکھتا ہے اسے محفوظ نہیں رکھ سکتا تو بس یہ طرف خالی کا خالی رہیگا ۔

گ :- یقیناً ۔

میں :- اس سعی لا حاصل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بالآخر خود اپنی ذات اور اپنے بے فائدہ شغل دونوں سے نفرت کرنے لگیگا ۔

گ :- جی ۔

میں :- چنانچہ جس روح میں نسیان ہو وہ حقیقی فلسفیانہ طبائع میں شمار نہیں کیجا سکتی، ہمیں اس بات پر اصرار کرنا چاہیے کہ فلسفیوں کا حافظہ اچھا ہوتا

گ :- بیشک ۔

میں :- تم نے پھر دیکھا کہ ناہموار اور بھٹی طبیعت کا رجحان عدم تعلق

کی طرف ہو۔

گ۔ بلاشبہ۔

میں۔ اور تم صداقت کو تناسب سے متعلق سمجھتے ہو یا عدم تناسب؟

گ۔ تناسب سے۔

میں۔ تو علاوہ دیگر صفات کے ہمیں ایسے دماغ کی تلاش کرنی چاہیے

جو اپنے اندر فطراناً حسن تناسب اور شرافت رکھتا ہو اور خود بخود تمام اشیاء کے

وجود حقیقی کی طرف حرکت کیے۔

گ۔ یقیناً۔

میں۔ کیا یہ تمام صفات جنہیں ہم ایک ایک کر کے گننا رہے ہیں یکجا

نہیں ہوتیں اور ایسی روح کے لیے جو وجود میں بدرجہ اتم و اکمل شرکت کئے

یہ سب گویا ایک طرح لازمی نہیں۔

گ۔ قطعاً لازمی ہیں۔

میں۔ تو اس علم پر کون حرف رکھ سکتا ہے جس کا اکتساب وہ شخص کرے

جو ذکی الفہم ہو اور اچھا حافظہ رکھتا ہو شریف ہو اور شفیق اور صداقت و انصاف

جرات و اعتدال کو دوست رکھتا ہو کہ یہ اس کے مجاہد ہیں۔

گ۔ اس علم میں تو رشک کا دیوتا تک کوئی بُرائی نہیں نکال سکتا۔

میں۔ چنانچہ ایسوں کو اور صرف ایسوں کو ہم اپنی ریاست سپر کر سکتے



جب عمر اور تعلیم سے ان کی تکمیل ہو جائے۔ یہاں ایڈمینٹیشن نے بات کاٹی اور کہنے لگے۔ "جناب سقراط! آپ کے ان بیانات کا تو کوئی جواب نہیں دے سکتا لیکن جب آپ اس طرح گفتگو کرتے ہیں تو آپ کے سامعین کے ذہن میں ایک عجیب احساس پیدا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دلیل کے ہر قدم پر وہ حقیقت سے تھوڑا سا ہٹ جاتے ہیں اور یہ اس لیے کہ انھیں سوالات پوچھنے اور ان کا جواب دینے میں کافی مہارت نہیں۔ یہ تھوڑا تھوڑا مل کر بہت ہو جاتا ہے اور اختتام بحث پر معلوم ہوتا ہے کہ انھیں سخت شکست ہوئی۔ اور بظاہر ان کے تمام سابقہ خیالات بالکل الٹ جاتے ہیں جس طرح شطرنج میں ایک ماہر کھلاڑی اپنے غیر ماہر حریف کے تمام گھر بند کر دیتا ہے اور وہ کوئی چال نہیں چل سکتا اسی طرح یہ بیچارے محسوس کرتے ہیں کہ بالآخر گھر گئے۔ چونکہ اس نئے کھیل میں جس کے ٹہرے الفاظ ہیں ان کے پاس کوئی چال باقی نہیں رہی لیکن باوجود اسکے دراصل وہی حق پر ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے جو ہو رہا ہے اس سے مجھے یہ خیال پیدا ہوا۔ کیونکہ ہم میں سے ہر ایک یہ کہہ سکتا ہے کہ باوجودیکہ وہ دلیل کی ہر منزل پر الفاظ سے آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تاہم وہ اس بات کو بطور واقعہ کے دیکھتا ہے کہ فلسفہ کے وہ دلدادہ جو اس کا مطالعہ صرف جوانی ہی میں بطور جزو تعلیم کے نہیں بلکہ اپنی آخری عمر کے شغل کے طور پر بھی جاری رکھتے ہیں، ان میں سے اکثر اگر مطلق بد معاش نہیں تو کچھ عجیب

منہج سے ضرور ہو جاتے ہیں۔ اور ان میں کے بہترین لوگ اسی مطالعہ کے باعث  
جس کی آپ استفادہ تعریف کر رہے ہیں دنیا کے لیے بیکار ہو جاتے ہیں۔

میں :- اچھا تو جو لوگ یہ کہتے ہیں کیا وہ آپ کے خیال میں غلط کہتے ہیں؟  
ایڈ :- میں نہیں کہہ سکتا، البتہ میں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں  
میں :- تو سچے میرا جواب سنئے۔ میری رائے ہے کہ یہ لوگ بالکل سچ کہتے ہیں  
ایڈ :- جب ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ لوگ شہر کے لیے مفید نہیں تو پھر آپ  
یہ کس طرح فرماتے ہیں کہ شہر اس وقت تک برائی سے نہ باز رہیں گے جب تک  
فلسفی ان میں حکومت نہ کریں۔

میں :- آپ نے ایسا سوال کیا ہے جس کا جواب صرف ایک تمثیل سے دیا  
جاسکتا ہے۔

ایڈ :- جی ہاں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس طریق کلام کے بالکل مد  
نہیں!

میں :- ہاں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ مجھے اس مشکل بحث میں ڈال کر آپ  
تعمایت مخطوط ہیں۔ لیکن اب میری تمثیل سنئے، اس کے بعد میری تنگی تمثیل سے  
آپ اور بھی مخطوط ہوں گے۔ کیونکہ بہترین آدمیوں کے ساتھ ان کی ریاستوں  
میں جس طرح سلوک ہوتا ہے وہ اس درجہ رنج و ہرجا کہ دنیا میں کوئی اور چیز اسکے  
مقابلہ میں پیش نہیں کی جاسکتی اور اس لیے اگر میں ان کی طرف سے وکالت



کروں تو مجھے افسانہ کا سہارا لینا ہوگا اور بہت سی چیزیں ملا کر ایک شکل طہری  
 کئی ہوگی جیسے بکروں اور بارہ سنگھوں کی خیالی ترکیب تصویروں میں ملتی ہے  
 اچھا تو ایک بھری بیڑے یا ایک ہماز کا تصور کیجئے جس کا کپتان دوسرے ملاحوں  
 سے مضبوط اور زیادہ قد اور بڑی لیکن ذرا اونچا سنتا ہے، اس کی بصارت بھی ذرا  
 کمزور ہے اور فن ہماز رانی میں بھی اس کا علم دوسروں سے کچھ زیادہ بہتر نہیں۔  
 ملاح ناخدائی کے بارہ میں ایک دوسرے سے لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ ہر شخص کی رائے  
 ہے کہ اسے ناخدائی کا حق ہے اگرچہ اسے کبھی ہماز رانی کا فن نہیں سیکھا اور یہ  
 نہیں بتا سکتا کہ کب اور کس نے اسے یہ فن سکھایا بلکہ وہ ایک قدم اور آگے بڑھتا  
 ہے، یعنی دعویٰ کرتا ہے کہ یہ فن سکھایا ہی نہیں جاسکتا۔ اگر کوئی شخص اس کے فن  
 کچھ کہے تو یہ لوگ اُسے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر تیار ہیں۔ یہ سب کے سب  
 کپتان کے گرد جمع ہوتے ہیں اور التجا کرتے ہیں کہ سکان انکے سپرد کر دیا جائے  
 اور اگر کبھی ایسا ہو کہ ان کی بات نہ مانی جائے اور دوسروں کو اپنی ترجیح دیا جائے  
 تو یہ ان دوسروں کو مار کر ہماز سے پھینک دیتے، اور پہلے شریف کپتان کے حوالے  
 کو شراب یا کسی منشی دوا سے مجبوس کر کے یہ لوگ علم بغاوت بلند کرتے ہیں اور جہاز  
 پر قبضہ کر کے ذخائر کو خوب لٹے تلٹے سے اڑاتے ہیں۔ اور اس طرح کھانڈ اڑانی  
 اپنے سفر کو بس اس طرح جاری رکھتے ہیں جیسی کہ ایسے لوگوں سے توقع ہو سکتی ہے۔  
 جو ان کا شریک ہے اور چالاکی سے ان کی اس سازش میں مدد دیتا ہے، کہ یہ جہاز پھر غیب سے

ہماز کو کپتان کے ہات سے نکال کر اپنے قابو میں لے آئیں، اسے یہ ملاح، ناخدا، قابل ہماز راں کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگوں کو برا بھلا کہتے اور بیکار محض بتلاتے ہیں۔ لیکن ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ حقیقی ناخدا کیلئے (اگر وہ دراصل ہماز پر حکومت کے قابل ہونا چاہے) ضروری ہے کہ موسم وقت آسمان کی کیفیت ستاروں، ہواؤں اور پٹے فن کے دیگر متعلقات کی طرف توجہ کرے، اور خواہ دو سے لوگ اسے پسند کریں یا نہ کریں اسے کو ہماز کا ناخدا ہونا چاہیے اور وہی ہوگا۔ الغرض خستہ سارا در فن ناخدا بنی کا یہ اتھا، کبھی ان لوگوں کے خیالات میں اچھی طرح داخل نہیں ہوا۔ اب تم ہی سوچو کہ ایک ایسے ہماز میں جو بغاوت کی حالت میں ہے، باغی ملاح پے ناخدا کو کس نظر سے دیکھیں گے۔ کیا یہ سب اسے خواہ مخواہ بکو اس کرنے والا، خیالی پلاؤ پکالنے والا اور بیکار محض نہ کہیں گے؟

ایڈ۔۔ بیشک۔

میں :- غالباً اب آپ کو اس تشبیہ کی مزید تشریح کی ضرورت نہ ہوگی کہ یہ یاں اور پٹے فلسفی کا تعلق بیان کرتی ہے، آپ نے شاید اسے ابھی سے سمجھ لیا ہے۔

ایڈ۔۔ جی ہاں۔

میں :- اچھا تو اب آپ اس تمثیل کو ان حضرات کے پاس لیجائیے جو اس بات پر متعجب تھے کہ شہروں میں فلسفیوں کی کوئی عزت نہیں۔ انھیں یہ اچھی طرح سمجھا دیجئے اور باور کرانے کی کوشش کیجئے کہ ان لوگوں کا شہروں میں معزز ہونا زیادہ



غیر معمولی اور تعجب خیز ہوتا۔

ایڈ۔۔ میں ضرور ایسا کر دوں گا۔

میں۔۔ اسے کہیے کہ فلسفہ کے دلدادوں کو باقی دنیا کے لیے بیکار سمجھنے میں صحیح ہیں، لیکن انہیں یہ بھی بتلا دیجئے کہ ان کی بیکاری کو ان لوگوں کی غلطی سے سو کرنا چاہیے جو اسے فائدہ نہیں اٹھاتے نہ کہ خود ان کی ذات سے۔ تا خدا کو یہ تھوڑی ہی چاہیے کہ ملاحوں سے بجز التجا کرے کہ وہ اس کے احکام مانیں، یہ نظام فطرت نہیں۔ نہ یہ ہو سکتا ہے کہ ”مختلار دو تمندوں کے درپر جائیں“۔ اس مقولہ کے چالاک مصنف نے ایک کذب کا اظہار کیا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب آدمی بیمار ہوتا ہے تو خواہ غریب ہو خواہ امیر اسے طبیب کے پاس جانا ہوتا ہے، اسی طرح جو اپنے اوپر حکومت کرانا چاہتا ہے اسے ایسے شخص کے پاس جانا ہوگا جو حکومت کرنے کے قابل ہے۔ جس عالم میں کچھ بھی خوبی ہو اسے ہرگز اپنی رعایا سے التجا نہ کرنی چاہیے کہ میرے محکوم بنو، اگرچہ نوع انسانی کے موجودہ حکمران ذرا دوسری قسم کے ہیں۔ ان کی مثال تو باغی ملاحوں کی سی ہے اور سچے ناخدا کی مثال ان کی سی جنہیں یہ باغی بیکار محض اور خیالی پلاؤ پکانے والا کہتے ہیں۔

ایڈ۔۔ بالکل سچ ہے۔

میں۔۔ اس قسم کے لوگوں میں اور مذکورہ وجوہ سے یہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ گروہ مخالف فلسفہ کی، کہ اشرف ترین مشاغل ہے، کچھ زیادہ غرت

کرے۔ اور یہ نہیں کہ اس علم کو اپنے مخالفوں سے ہی شدید ترین اور پائیدار نقصان  
پہنچتا ہے بلکہ خود اپنے نام نہاد متبعین سے، اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق  
آپ کے فرضی مستغیث نے کہا تھا کہ ان میں سے اکثر، بر خود غلط بد معاش،  
اور ان کے بہترین بیکار محض ہوتے ہیں۔ اور اس واسطے سے میں نے اتفاق کیا تھا

ایڈ۔ جی

میں :- ان میں سے اچھوں کے بیکار ہونے کی وجہ تو ظاہر ہو گئی۔

ایڈ۔ درست۔

میں :- اب کیا ہم یہ بتلائیں کہ اس گروہ میں اکثریت کی تخریب بھی ناگزیر ہے  
اور گذشتہ بالا صوت کی طرح یہ بھی فلسفہ کی فرد جرائم میں نہیں شامل ہو سکتا ہے؟

ایڈ۔ ضرور فرمائیے۔

میں :- اچھا، تو باری باری سوال و جواب کریں، اور سب سے پہلے  
نرم اور شریف طبیعت کے بیان کی طرف ذرا پھر رجوع کریں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ  
حق اس کا رہنما تھا، جس کی اتباع وہ ہمیشہ اور ہر چیز میں کرتا ہے، اگر یہ نہیں تو وہ  
کذاب ہے اور حقیقی فلسفہ میں اس کا نہ کوئی دخل ہے نہ کوئی حصہ۔

ایڈ۔ جی ہاں، یہ بات تو ہو چکی ہے۔

میں :- دوسری صفات کا تو ذکر ہی کیا، کیا فلسفی کا جو موجودہ تخیل ہے اس سے

خود ہی صفت باکل بعید ہے۔



ایڈ :- یقیناً۔

میں :- اور کیا ہم اس کی وکالت میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ علم کا سچا عاشق ہمیشہ وجود حقیقی کی تلاش میں کوشاں ہوگا۔ یہ سچ یہ ہے کہ یہ اس کی فطرت ہے۔ افراد کی اس کثرت میں جو صرف ظاہری ہول سے چین نہ پڑے گا، بلکہ اپنی آرزو کی تیز دھار کو کند کرنے بغیر اور اپنی خواہش کی قوت میں کمی کیے بن وہ برابر بڑھتا چلیگا حتیٰ کہ اپنی رُوح کی مماثل اور ہمدردانہ قوت سے ہر اصلیت کی حقیقی ماہیت کا علم حاصل کرے، اور اس قوت کے ذریعہ وجود حقیقی سے قرب و اختلاط پیدا کرے اور بالآخر اس میں مل جائے جب اس طرح ذہن اور صداقت پیدا ہو جائیں تو اسے علم حاصل ہوگا اور اب یہ صحیح معنوں میں زندگی گزارے گا اور نشوونما پائے گا۔ کہیں اس وقت جا کر اسکی تکلیف دہ محنت ختم ہوگی، اس سے پہلے نہیں۔

ایڈ :- اس توضیح سے صحیح تر اس کا کوئی بیان نہیں ہو سکتا۔

میں :- اور کیا جھوٹ کی محبت فلسفی کی طبیعت کا جزو ہوگی؟ کیا وہ

جھوٹ سے مطلقاً نفرت نہ کریگا؟

ایڈ :- ضرور کریگا۔

میں :- اور جب صداقت اہمنا اور سردار ہو تو جس گروہ کی یہ قائد ہے اس پر

ہم کسی برائی کا شبہ نہیں کر سکتے؟

ایڈ :- ناممکن۔

میں :- عدل اور صحت ذہنی ان کے ہمراہ ہونگے اور عظمت و اعتدال چھوڑ دیا۔  
ایڈ :- درست۔

میں :- اب غالباً اسکی ضرورت نہیں کہ میں پھر فلسفی کے تمام محاسن کو سامنے لاؤں، آپ کو یقیناً یاد ہوگا کہ جرأت، فراخ دلی، ذکاوت، حافظہ، اس کے فطری صفات ہونگے۔ آپ نے اعتراض کیا تھا کہ اگرچہ میرے اس قول سے انکار ممکن نہیں، تاہم اگر الفاظ کو چھوڑ کر واقعات پر نظر کی جائے تو تین لوگوں کا یوں ذکر ہو رہا تھا ان میں سے بعض بین طور پر بیکار اور اکثر مطلقاً بد معاش ہیں۔ اس پر ہم نے ان الزامات کے وجوہ دریافت کیے، اور اب اس سوال پر پوچھے تھے کہ یہ اکثریت کیوں خراب ہو اور اس سوال نے ضرورتاً ہمیں سچے فلسفی کی تعریف اور تحقیق کی طرف رجوع کرایا۔

ایڈ :- بالکل بجا۔

میں :- اب اس کے بعد ہمیں فلسفیانہ طبائع کی تخریب پر غور کرنا ہے کہ اتنے بہت سے کیوں خراب ہو جاتے ہیں اور کیوں اتنے کم بگڑنے سے بچتے ہیں۔ میں انکا ذکر کر رہا ہوں جنہیں بیکار کہا گیا ہے شریر نہیں۔ جب ہم اسے نبٹ چکیں گے تو پھر فلسفہ کے نقالوں کا ذکر کریں گے، کہ یہ قسم کے لوگ ہیں جو اس پیشہ کے متمنی ہیں جو اسے بالآخر اور جس کے وہ اہل نہیں اور جو اپنے گونا گوں تناقض و تضاد نفسی سے فلسفہ اور تمام فلسفیوں پر وہ عالمگیر ملامت عائد کرتے ہیں جو ہماری گفتگو کا موضوع ہے۔



ایڈ :- یہ خرابیاں کیا ہیں ؟  
 میں :- دیکھیے میں اس کی توضیح کی کوشش کرتا ہوں، معلوم نہیں بن پرے  
 یا نہیں۔ کیوں۔ اس بات کو تو ہر شخص تسلیم کرے گا کہ ایک ایسی طبیعت جس میں وہ  
 تمام صفات بدرجہ کمال موجود ہوں جو ہم فلسفی میں طلب کرتے ہیں انسانوں  
 میں ایک کمیاب پودے کی طرح شاذ و نادر ہی دکھائی دیتی ہے۔

ایڈ :- بیشک۔ یہ تو بہت کمیاب ہے۔  
 میں :- اور کتنے گنتی اور زبردست اسباب ہیں جو ان کمیاب طبائع  
 کو بھی برباد کر دیتے ہیں ؟

ایڈ :- کون اسباب ؟  
 میں :- سب سے پہلے خود ان کے محاسن ہیں، یعنی انکی جرأت ان کی  
 عفت و اعتدال پسندی وغیرہ کہ ان میں سے ہر ایک قابل قدر صفت ہے اور  
 یہ ایک عجیب معاملہ ہے اس روح کو جو ان کی حامل ہوتا ہے اور فلسفہ سے متاثر کرتی  
 ہے۔

ایڈ :- یہ تو طرفہ ماجرا ہے !  
 میں :- پھر ان کے بعد زندگی کی معمولی خوبیاں ہیں مثلاً حسن، دولت،  
 قوت، مرتبہ ریاست میں اعلیٰ تعلقات۔ آپ ان چیزوں کو سمجھتے ہوں گے تو  
 یہ سب بھی محض اور موجد اثر رکھتی ہیں۔

ایڈ :- میں سمجھا لیکن میں ذرا ٹھیک ٹھیک معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کا ان کے متعلق کیا مطلب ہے۔

میں :- ذرا صحیح طریقہ سے پوری حقیقت پر عبور کرنے کی کوشش کرو تو پھر ان سابقہ ملاحظیات کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی اور پھر یہ تمہیں عجب بھی نہ معلوم ہونگے۔

ایڈ :- لیکن میں آخر یہ کیسے کروں ؟

میں :- کیوں ؟ اس میں کیا ہے ؟ ہم سب جانتے ہیں کہ تمام جسم اشم یا بیج خواہ نباتی ہوں خواہ حیوانی جب انھیں صحیح غذا، یا آب و ہوا، یا زمین نہیں ملتی تو اس وقت یہ جس قدر قوی ہوتے ہیں اسی قدر اپنے ماحول کی ناموافقیت سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ کیونکہ جو چیزیں اچھی نہیں ہیں ان کے مقابلہ میں بُرائی اُن کی زیادہ دشمن ہے جو اچھی ہیں۔

ایڈ :- بہت صحیح۔

میں :- یہ فرض کرنے کے جوہ ہیں کہ ناموافق حالات میں بہترین طبائع کو نسبت ادنیٰ طبائع کے زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ کیونکہ تضاد زیادہ ہے۔

ایڈ :- یقیناً۔

میں :- اور ایڈمنٹس ! کیا ہم اسی طرح یہ نہیں کہہ سکتے کہ اگر تعلیم خراب ہو تو بہترین دماغ ہی بدرجہ اتم خراب ہو جاتے ہیں۔ اور کیا خالص شرکے جذبہ



اور بڑے بڑے جرائم کا سرچشمہ وہ نشوونما یافتہ طبائع نہیں ہوتیں جنہیں تقسیم نے  
برباد کر دیا ہے نہ کہ کم درجہ اور ادنیٰ طبائع۔ برخلاف اس کے کمزور طبائع میں  
نہ کسی بڑی اچھائی کی صلاحیت ہوتی ہے نہ کسی بڑی بُرائی کی۔

ایڈ :- ہاں، میرا خیال ہے کہ آپ بجا فرماتے ہیں۔

میں :- اور ہمارے فلسفی کی مثال بھی بس ایسی ہی ہے۔ وہ ایک پودے  
کی طرح ہے کہ اگر اس کی صحیح پرورش ہو تو وہ ضرور بڑھتے اور اس میں تمام خوبیاں  
پیدا ہوں، لیکن اگر بنا موافق زمین میں اس کا بیج بویا اور اسی میں اسے لٹکایا  
جائے تو سب جہاڑیوں سے زیادہ مضرت رساں ثابت ہوتا ہے۔ لہذا کہ  
کوئی الٰہی طاقت اسے محفوظ و برقرار رکھے۔ جیسا کہ اکثر لوگ کہتے ہیں، کیا آپکا  
بھی واقعی یہ خیال ہے کہ گروہ سافسطائی ہمارے نوجوانوں کی تخریب کا باعث ہے  
یا فنون کے خانگی اساتذہ کا اس میں معتد بہ اور قابل ذکر حصہ ہے؟ کیا سب سے بڑا  
گروہ سافسطائیہ خود وہ عام جمہور نہیں جو یہ کہتے ہیں؟ کیا یہی نہیں جو ہر جوان اور  
بڑھے، مرد اور عورت کو یکساں پوری طور پر تعلیم دیتے اور حسبِ دخواہ اپنی تربیت  
کرتے ہیں۔

ایڈ :- اور یہ سب کچھ آخر تک؟

میں :- جب یہ باہم ملتے ہیں، یا مجلس میں ساری دنیا جمع ہوتی ہے یا ملتوں  
تاشاگا ہوں شکروں اور دوسری عام ملاقات کی جگہوں پر هجوم ہوتا ہے سب

شور و غوغا مچاتے ہیں کسی چیز کی جو وہاں کہی یا کی جا رہی ہو تعریف کرتے اور کسی کی مذمت کرتے ہیں، اور لطف یہ کہ چیخ چلا کر اور تالیاں بجا بجا کر دونوں مساوی مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ خود جلسہ گاہ اور قریبی پہاڑیوں سے سکیں گشت ان کی تحسین یا مذمت کی صداؤں کو دو چند کر دیتی ہے۔ تو جب یہ سب کچھ ہو رہا ہو تو تم ہی بتلاؤ کیا ایک جوان آدمی کا دل اس کے بہلو میں اچھلنے نہ لگیگا۔ کیا کوئی خانگی تربیت اسے اسے عامہ کے اس اُمنڈتے ہوئے سیلاب کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنے کے قابل بنا سکتی ہے؟ یا وہ اس کی رو میں بہ جائیگا؟ عام جہو کے ذہن میں خیر و شر کا جو ٹھیل ہو کیا وہی اس کے دماغ میں بھی نہوگا؟ جو وہ کرتے ہیں یہ کریگا، اور جیسے وہ ہیں ویسا ہی یہ بنے گا۔

ایڈ:- ہاں، جناب سقراط، ضرورت اسے مجبو کرے گی۔

میں:- اور یہی نہیں۔ ابھی تو ایک اس سے بڑی ضرورت باقی ہے جسکا

ذکر میں نے نہیں کیا۔

ایڈ:- وہ کیا؟

میں:- استبلح، ضبطی، یا موت کی نرم طاقت۔ کہ حیب باتوں سے کام

نہیں چلتا (جیسا کہ آپ جانتے ہیں) سافطائیوں اور معلموں کا یہ طبقہ جس کا نام جمہو

ہے اس قوت کا استعمال کرتا ہے۔

ایڈ:- بیشک کرتے ہیں اور نہایت تیزی سے کرتے ہیں۔



میں۔ بھلا اس غیر مساوی مقابلہ میں کسی دوسرے سافسطائی یا نیچ کے شخص کی رائے کا غالب آنا کیسے ممکن ہے۔  
ایڈ۔۔ جی، کوئی صوت نہیں۔

میں یہ سچ پوچھو تو اس کی کوشش کرنا ہی بڑی حماقت ہے۔ رائے عامہ سے اخلاقی محاسن کی تعلیم پا کر جو نمونہ پیدا ہوتا ہے اس سے مختلف نمونہ اخلاقی نہ ہو، نہ کبھی ہوا ہے، نہ آئندہ ایسا ہونا قرین قیاس ہے۔ خیال رہے کہ یہ صرف انسانی خوبیوں کا ذکر ہے، جو فوق الانسان ہے وہ اس میں شامل نہیں۔ کیوں کہ میں آپ کو اس امر سے بیخبر نہیں کہتا چاہتا کہ حکومتوں کی موجودہ حالت بدیا جو کچھ بیچ جاتا اور خیر میں منسج ہوتا ہے وہ سچ یہ ہے کہ خدا کی قوت سے محفوظ رہتا۔  
ایڈ۔۔ میں اسے کلیتہً قبول کرتا ہوں۔

میں :- تو پھر میں ایک مزید امر میں بھی آپ کے قبول کا ملتمس ہوں۔

ایڈ۔۔ آپ کیا فرمانا چاہتے ہیں؟

میں :- یہ کہ تمام وہ کراہیہ کے ٹیو جنہیں عوام سافسطائی کہتے ہیں اور وہ جنہیں ان کا مد مقابل خیال کیا جاتا ہے سب کے سب اصل عوام کی رائے ہی کی تعلیم دیتے ہیں، یعنی اپنی مجلسوں کی رائے کی۔ بس یہی ان کی حکمت ہے یہی ان کا عرفان میں ان کی مثال اس شخص سے دے سکتا ہوں جو ایک بہت بڑے مضبوط جانور کو کھلاتا اور اس کے مزاج اور خواہشات کا مطالعہ کرتا ہے۔ یہ شخص رفتہ رفتہ معلوم

کر لے گا کہ اس جانور کے پاس کس طرح جائے اور اس سے کیسا برتاؤ کرے، کوئی  
 وقت اور کن وجوہ سے یہ خطرناک ہو جاتا ہے اور کن سے اس کے برعکس، اسکی مختلف  
 آوازوں کا کیا مفہوم ہے، دوسرا شخص کسی آواز میں کانٹے تو یہ ٹھنڈا پڑتا ہے یا  
 برا فروختہ ہو جاتا ہے؛ فرض کیجئے اس طرح متواتر نگہداشت سے یہ شخص ان باتوں  
 میں کامل ہو گیا تو لگا پنے اس علم کو حکمت کہتے، اس سے ایک نظام باہن مرتب  
 کرنے، اور اس فن کی تعلیم دینے۔ حالانکہ جن اصول یا جذبات کا یہ ذکر کرتا ہے  
 اس کے ذہن میں ان کے مفہوم کا بھی کوئی حقیقی تصور نہیں۔ لیکن وہ بلا تامل اس  
 بڑے جانور کے مزاج اور مذاق کی پہنچائی میں ایک چیز کو قابل عزت اور دوسری  
 کو ناقابل عزت، اسے اچھا سے بُرا، کسی کو بہنی بر عدل اور کسی کو غیر عادلانہ بتلاتا ہے  
 جن چیزوں سے یہ جانور خوش ہو یہ انھیں خیر اور جنھیں یہ ناپسند کرے ان کو شر کہتا  
 ہے۔ اور اس بارہ میں سولے اسکے کوئی وجہ نہیں بتلاتا کہ عدل و شرافت وہ ہے جو  
 ضروری ہو۔ درانحالیکہ اس نے کبھی نہ اسکا مشاہدہ کیا، نہ اس میں یہ صلاحیت ہے،  
 کہ دوسروں کو ان چیزوں کی ماہیت یا انکا وسیع باہمی فرق سمجھا سکے۔ واللہ اعلم  
 شخص کیسا نادار معلوم ہوگا!۔

ایڈ۔۔۔ سچ ہے، نہایت نادار!

میں۔۔۔ اور اس آدمی سے جس کا ہم نے ذکر کیا وہ شخص کس طرح مختلف ہے  
 جو سمجھتا ہے کہ حکمت رنگ برنگ کے الوان، انبوہ، کے مزاج اور مذاق کی پہچان کا



نام ہی، خواہ مصوری میں ہو، موسیقی میں ہو یا بالآخر سیاست میں۔ کیونکہ جہاں آدمی نے عوام (اکثریت) سے رشتہ باندھا، اور ان کے سامنے اپنی نظم، یا کوئی لطیف کام، یا ریاست کے لیے اپنی خدمات پیش کیں اور انھیں اپنا حکم بنایا (حالانکہ وہ ایسا کرنے پر مجبور نہیں)، تو پھر ڈایومینڈی کی کسی ضرورت کے لیے ایسی چیزیں بنانے پر مجبور کرے گی جس کی یہ لوگ تعریف کریں۔ تاہم، اچھے، اور قابل عزت، کے متعلق اپنے خیالات کی تصدیق میں یہ لوگ جو وجوہ پیش کرتے ہیں وہ بالکل مہمل اور مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی کوئی وجہ سنی ہے جس پر یہ صادق نہ آتا ہو؟

ایڈ:۔ نہیں۔ اور نہ کبھی سُننے کا احتمال ہے۔

میں:۔ میں جو کچھ گزارش کر رہا ہوں آپ اسکی صداقت تسلیم کرتے ہیں نا؟ تو اب میں آپ سے اس امر پر غور کرنے کی درخواست کرتا ہوں کہ کیا دنیا کبھی بھی حسن مطلق کے یقین پر آسکتی ہے بجائے اسکے کہ بہت سی حسین چیزوں پر یقین کئے یا اسی طرح ہر نوع میں بجائے اس نوع کی بہت سی چیزوں کے اسکے عین مطلق پر۔

ایڈ:۔ ہرگز نہیں۔

میں:۔ تو دنیا کے فلسفی ہونے کا گویا کوئی امکان نہیں؟

ایڈ:۔ ناممکن۔

میں:۔ لہذا لازم ہے کہ فلسفیوں پر ہمیشہ دنیا کی لعنت رہے۔

ایڈ :- لازمی ۔

میں :- اور لوگوں کی لعنت بھی جو انہوہ سے ساز باز رکھتے اور اُسے خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔

ایڈ :- ظاہر ہے ۔

میں :- اچھا، تو پھر کوئی طریقہ تمہیں ایسا نظر آتا ہے کہ فلسفی آخر تک اپنے کام میں قائم رہ سکے؟ اور ہم اس کے متعلق جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ یاد ہے یعنی انہیں جستی، حافظہ، جرأت، اور فراخ دلی ہو۔ انہیں ہم سچے فلسفی کے صفات تسلیم کر چکے ہیں۔

ایڈ :- جی ہاں ۔

میں :- تو کیا ایسا شخص اوائل طفولیت سے ہی ہر چیز میں سے آگے نہ ہوگا، خصوصاً اگر اس کے جسمانی قوی بھی دماغی کی طرح ہوئے؟

ایڈ :- یقیناً ۔

میں :- جوں جوں اس کی عمر بڑھے گی اس دوست اور دوستوں کے ہم شہرے اپنے اغراض کے لیے استعمال کرنے چاہیں گے؟

ایڈ :- اس میں کیا کلام ہے۔

میں :- یہ اس کے پیروں پڑ پڑ کر اس سے درخواستیں کریں گے اسکی عزت اور خوشامد ہوگی، کیونکہ یہ لوگ اس وقت اس قوت کو اپنے ہات میں لینا چاہتے ہیں



جو ایک دن اسکے قبضہ میں ہوگی۔

ایڈ :- جی اکثر ایسا ہوتا ہے۔

میں :- پھر اگر یہ چوڑا چکلا جوان کسی بڑے مالدار شہر کا باشندہ ہو تو یہ حالات اس سے کیا سرزد ہونیکا احتمال ہوگا؟ کیا اس کا دماغ بشمار حوصلوں سے پر نہ ہو جائیگا اور وہ اپنے خیال میں اپنے کو باشندگان ہیلا اس اور قوم بربر سب کے معاملات کے انتظام کا اہل تصور نہ کریگا۔ اور جب اس کے تریا سودا سما پاتے تو کیا متمدانہ شان و شوکت اور بے معنی غرور میں وہ دل کھو کر اپنے کو بڑا ہے چڑھائیگا نہیں۔

ایڈ :- ضرور ایسا کریگا۔

میں :- اچھا تو جب اس کی دماغی کیفیت کا یہ حال ہے۔ اسکے پاس آہستہ سے کوئی شخص آئے اور کہے کہ تم بیوقوف ہو، سمجھ حاصل کرنے کی کوشش کرو اور یہ سمجھ بلا غلامی کیے نہیں، تو تم کیا خیال کرتے ہو کہ ان مخالف حالات میں کیا وہ باسانی اس شخص کی بات سننے پر آمادہ ہو جائیگا۔

ایڈ :- تو بہ کیجیے۔

میں :- اور اگر کسی کی نگھیں اپنی ذاتی خوبی یا فطری معقول پسندی کی وجہ سے کچھ کھلیں بھی، اس میں انکسار پیدا ہوا اور فلسفہ اسے اپنا شیدائی بنالے تو ایسے شخص کے دوستوں کا کیا رویہ ہوگا، جب یہ لوگ سوچیں گے کہ اس کے ساتھ

جو فوائد متوقع تھے وہ سب کے سب ہاتھ سے جاتے ہیں؟ کیا یہ لوگ اسے اپنی  
فطرت کے احسن جزو کی اتباع سے روکنے، اور اسکے معلم کو بے بس بنانے میں فوجاً  
و فعلاً سب کچھ نہ کر ڈالیں گے اور اس غرض کے لیے پوشیدہ سازشیں علانیہ  
سزائیں سب کچھ استعمال نہ کریں گے؟

ایڈ۔۔ اس میں بھلا کیا شبہ ہے۔

میں :- تو پھر جس شخص کے حالات ماحول ایسے ہوں وہ کیسے فلسفی بن سکتا ہے  
ایڈ۔۔ ناممکن ہے۔

میں :- پھر کیا ہم اپنے اس قول میں صحیح نہ تھے کہ اگر تعلیم خراب ہو تو نہ صرف  
دولت اور اسکے متعلقات یا اور نام نہاد متاع زندگی بلکہ خود وہ صفات جو انسان  
کو فلسفی بناتی ہیں اسے فلسفہ سے منحرف کر نیکاً باعث ہونگی؟  
ایڈ۔۔ ہم لوگ بالکل ٹھیک تھے۔

میں :- عزیز محترم۔ فضل ترین مشاغل کے لیے جن طبائع میں بہترین مناسبت  
ہو انکی تباہی و ناکامی اس طرح عمل میں آتی ہے۔ یہ وہ طبائع ہیں جو ہمارے خیال میں  
ہر زمانہ میں کمیاب ہوتی ہیں، یہی وہ طبقہ ہے جس میں سے وہ لوگ نکلتے ہیں جو  
ریاست اور افراد دونوں کے لیے بڑی سے بڑی بُرائیوں کے بانی ہوتے ہیں اور  
اور پھر زواہ نہیں دوسری طرف لے جاے تو بڑی سے بڑی بھلائیوں کے بھی۔ لیکن  
کسی چھوٹے آدمی نے تو فرد کے لیے یا ریاست کے لیے کبھی کوئی بُرا کام نہیں کیا۔



ایڈ۔۔۔ بالکل سچ ہے۔

میں۔۔۔ چنانچہ یوں عروس فلسفہ بغیر ازیر ہم شادی کی تکمیل کے تہنہ یا  
 و مددگار رہ جاتی ہے، جو اسکے اپنے تھے انہوں نے ایسا ایک کر کے اسکا ساتھ  
 چھوڑ دیا، اور جب یہ لوگ ایسی باطل زندگی گزارنے لگے جو ان کی شان کے  
 شایان نہیں اور جب دوسرے نا اہلوں نے دیکھا کہ اب اسکا کوئی عزیز قریب  
 نہیں رہا جو اس کی حفاظت کرے تو یہ اس کے گھر میں گھس پڑے اور اس کی  
 آبروریزی کی اور سپردہ ملامتیں عائد کرائیں جن کا بقول آپ کے منجھلین فلسفہ  
 اظہار کرتے ہیں، یعنی یہ کہ فلسفہ کے بعض لداوہ تو بیکار محض ہوتے ہیں اور اکثر  
 شدید ترین تعذیر کے مستحق۔

ایڈ۔۔۔ جی ہاں، بیشک لوگ یہی کہتے ہیں۔

میں۔۔۔ ہاں تو جب تم اس حقیر مخلوق کا خیال کرو تو اسکے علاوہ اور توقع  
 ہی کیا ہو سکتی ہے۔ یہ اس میدان کو اپنے لیے کھلا پا کر اور میدان بھی کیسا، اچھے  
 اچھے ناموں اور ناماشی خطابوں سے بھرے ان قیدیوں کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں جو  
 محبس سے کسی امن کی جگہ میں بچکر جا رہے ہوں۔ یہ اپنے پیشوں کو ترک کر کے بس  
 فلسفہ میں کود پڑتے ہیں۔ اور لطف یہ کہ ایسا کرنے والے غالباً وہی لوگ ہوتے ہیں  
 جو اپنی اپنی بد نصیبی و گرفت میں سب سے ہوشیار تھے۔ کیونکہ فلسفہ لاکھ لاکھ اپنی  
 موجودہ حالت بد میں ہو بھر بھی اسکے ساتھ اتنی شان اور اتنا وقار باقی ہے کہ کسی دوسرے

فن کو نصیب نہیں۔ چنانچہ اس وجہ سے بہت سے وہ لوگ اس کی طرف کھنچے جاتے ہیں جن کی طبائع ناقص اور جن کی ارواح کم ظرفی اور کمینہ پن سے اس طرح مجروح و بد بنا ہو گئی ہو جیسے انکا جسم ان کے پیشیا اور حرف سے۔ کیا یہ صوت حال ناگزیر نہیں؟ ایڈ۔۔ ہاں۔

میں۔۔ کیا ان کی مثال بالکل اس چھوٹے خیمہ کی سی نہیں جس نے ابھی قید سے نکل کر خوشن بختی کا منہ دیکھا ہے، اور اب نہاد دھو، نئے کپڑے پہن بن بنوار کر دوٹھا بنا ہے اور اپنے آقا کی لڑکی سے جو نادر اور بے یار و مددگار رہ گئی ہے شادی کرنے جا رہی۔

ایڈ۔۔ نہایت ہی صحیح تمثیل ہے۔

میں۔۔ تو پھر اسی شادیوں کا نتیجہ کیسے بچے ہونگے، کیا یہ رفیوں اور غفل نہ ہوں گے۔

ایڈ۔۔ اس میں کیا کلام ہے؟

میں۔۔ اسی طرح جب ناقابل تربیت لوگ فلسفہ کی طرف پڑھتے، اور اُس سے اپنا رشتہ کرتے ہیں جو مرتبہ میں اُسے بالآخر ہی تو اس سے کس قسم کے خیالات اور ارادے پیدا ہونے کا احتمال ہے؟ کیا یہ محض سافسطائی مغالطے نہ ہونگے جو بس سامعہ فریب ہوں لیکن ان میں نہ کوئی اصلیت ہو نہ حقیقی حکمت سے قرب نہ اسکے شایان شان۔



ایڈ۔ بلاشبہ۔

میں :- ایڈمنٹس ! اس طرح چھٹ چھٹا کر فلسفہ کے پتے پر وہیں  
تھوڑے ہی سے باقی رہ جائیں گے۔ مثلاً شاید کوئی شریف اور تعلیم یافتہ شخص  
جلا وطنی کے باعث اس کی خدمت میں ہو اور محرب اثرات کی عدم موجودگی کے  
سبب اب تک اس کا شیدائی رہا ہو، یا کوئی اعلیٰ اور بلند پایہ روح کسی چھوٹے  
ذیل سے شہر میں پیدا ہو جائے اور اس کی سیاست کو نظر حقارت سے دیکھ کر  
اس سے چشم پوشی کرے اور کچھ ایسے بالکمال لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو فنون کو چھو کر  
(جن کی جائز طور پر یہ تحقیر کرتے ہیں) فلسفہ کی طرف آئے ہوں، یا پھر ایسا ہی ہو سکتا  
ہو کہ بعض کو ہمارے دوست تھیاگیس کی لگام روکے؛ کیونکہ تھیاگیس کی زندگی  
میں تمام چیزوں نے گویا اسے فلسفہ سے منحرف کرنے کی ایک سازش کی تھی لیکن  
بس بیماری نے اسے ہمیشہ سیاست سے الگ رکھا۔ رہا خود میرا معاملہ یعنی  
دلیل باطن، تو اس کا ذکر بھی چنداں ضروری نہیں، کیونکہ ایسا مندرگرا کر کسی کو  
عطا کیا بھی گیا ہو تو بہت شاذ۔ ہاں تو جو لوگ (حقیقی فلسفیوں کے) اس چھوٹے  
سے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں انھوں نے اسے اس کا مزہ چکھا ہی اور اس کی شیرینی اور  
برکت سے واقف ہیں انھوں نے انہوہ کے جنون کو بھی خوب دیکھا ہی، یہ لوگ  
چلتے ہیں کہ سیاسیوں میں کوئی بھی ایماندار نہیں۔ نہ کوئی عدل و انصاف کا  
ایسا حامی ہو کہ اسکے ساتھ معرکہ آرا ہو کر یہ اپنی نجات حاصل کر سکیں، اس گروہ کے

انوار کی مثال اس انسان کی سی ہے جو جنگلی درندوں میں جا پڑا ہو، نہ تو یہ اپنے ساتھیوں کی شرارت کا شریک ہو سکتا ہے نہ تنہا ان کی خوشنوا رطباع کا دفاع اس سے ممکن ہے، اس لیے جب یہ دیکھتا ہے کہ میں نہ رہا است کے لیے مفید ہو سکتا ہوں نہ اپنے دوستوں کے لیے اور جب سوچتا ہے کہ گویا اپنی ذات یا دوسروں کو کچھ فیض پہنچائے بغیر اسے بس اپنی زندگی ضائع کرنی ہے تو یہ غریب دم سادہ کہ چپ رہتا اور اپنی راہ جاتا ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو گرد و غبار کے اس طوفان میں جو آندھی کے ساتھ اٹھتا ہے کسی دیوار کی پتاہ لیکر الگ ہو جائے۔ یہ جب بقیہ نوع انسانی کو شر سے پُر پاتا ہے تو اسی پر قانع ہو جاتا ہے کہ خود تو اپنی زندگی جوں توں شروع و باطل سے پاک رہ کر گزار سکے اور روشن امیدوں کے ساتھ باہرین آشتی یہاں سے رخصت ہو جائے۔

ایڈ۔۔ ہاں، رخصت ہونے سے پہلے لسنے تو بڑا کام انجام دیا۔  
میں۔۔ بیشک بڑا کام، لیکن جب تک یہ اپنے مناسب حال یا است نہ پائے  
سب سے بڑا کام نہیں۔ کیونکہ مناسب حال یا است میں اس کی نشوونما زیادہ وسیع  
ہوگی اور یہ اپنی اور اپنے ملک دونوں کی نجات کا باعث ہوگا۔

اچھا تو اب فلسفہ کی بدنامی کے اسباب کی کافی تشریح ہو چکی ہے، فلسفہ  
کے خلاف جو الزام ہیں ان کی بے انصافی بھی ظاہر ہو گئی، کیا آپ کو اور کچھ



ایڈ۔ اس مسئلہ پر تو اب کچھ نہیں کہنا، البتہ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کی رائے میں موجودہ حکومتوں میں سے کون فلسفہ کے لیے سب سے زیادہ مناسب ہے؟

میں :- کوئی بھی نہیں۔ اور بس ہی الزام تو میں ان سب پر لگاتا ہوں کہ ان میں سے ایک بھی فلسفیانہ طبیعت کے شایان نہیں اور اس لیے یہ طبیعت معوج اور منحرف ہو جاتی ہے۔ جس طرح پر دسی بیج ایک خارجی زمین میں اپنی فطرت صحیحہ کے مطابق نہیں اُگتا بلکہ اس نئی مٹی میں اس کے مغلوب ہو کر فنا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ہوتا ہے، اسی طرح فلسفہ کی یہ نشوونما بجائے قائم رہنے کے بگڑ کر ایک نیازنگ اختیا کر لیتی ہے۔ لیکن اگر فلسفہ کو کبھی ریاست میں وہ کمال ملجائے جس سے کہ وہ خود عبارت ہے تو اس وقت پتہ چلے کہ یہ اپنی صداقت میں الہی ہے اور تمام دوسری چیزیں خواہ انسانی طبائع ہوں یا نظامات و تنسیقات سب کی سب انسانی ہیں؛ اور میں جانتا ہوں کہ آپ اب یہ سوال کر نیوالے ہیں کہ ایسی ریاست کیا ہے؟

ایڈ۔ نہیں نہیں۔ آپ نے غلطی کی۔ میں ایک اور سوال پوچھنے والا تھا۔

وہ یہ کہ آیا وہ ریاست وہی ہے جسکے بانی و مخترع ہم ہیں یا کوئی اور؟

میں :- ہاں ہاں، اکثر اعتبارات سے ہماری ہی ریاست ہے۔ تمہیں یاد ہوگا

میں نے پہلے کہا تھا کہ جس ریاست میں دستور اساسی کا وہی تخیل ہو جس بھشت

وضعین قانون آئین بناتے وقت تمہاری رہنمائی ہوئی تھی تو ایسی ریاست میں

ہمیشہ کسی زندہ سیادۃ کی ضرورت ہوگی۔

ایڈ۔۔۔ یہ تو کہا گیا تھا۔

میں۔۔۔ ہاں، لیکن قابل اطمینان طریقہ سے نہیں کہا گیا تھا۔ تم نے بیچ میں اعتراضات کر کے سب کو ڈرا دیا تھا، اور ان اعتراضات سے یقینی طور پر ظاہر ہوتا تھا کہ بحث طویل و درد شوار ہوگی اور اب بھی جو کچھ باقی ہے وہ سہل کی ضد ہی ہے۔

ایڈ۔۔۔ کیوں، اور اب باقی کیا ہے؟

میں۔۔۔ یہ سوال کہ فلسفہ کے مطالعہ کو کس طرح منظم کیا جائے کہ ریاست کی

تباہی کا باعث نہ ہو۔ تم جانتے ہی ہو کہ تمام ٹبری کوششوں میں کچھ خطرہ ضرور ہوتا ہے، عام قول ہے جو کٹھن سوا چھا۔

ایڈ۔۔۔ پھر بھی اچھا ہی یہ نکتہ صاف ہی ہو جائے۔ تو پھر تحقیق پوری ہوگی۔

میں۔۔۔ میں اگر رکاوٹ خواہش اور ارادہ کی کمی کی وجہ سے نہیں، قوت اور

قدرت کی کمی کی وجہ سے رکوں گا۔ میرا جوش آپ خود دیکھ سکتے ہیں اور میں جو کچھ

اب کہنے والا ہوں اس میں براہ مہربانی ذرا دیکھئے گا کہ میں کس جرات کے ساتھ

بے پس و پیش اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ ریاستوں کو فلسفہ کا حصول اس طرح

ہرگز نہ چاہیے جس طرح وہ آج کل کرتی ہیں، بلکہ اس سے بالکل مختلف طریقہ سے

ایڈ۔۔۔ یعنی کس طرح؟

میں۔۔۔ آج کل فلسفہ کے متعلمین بالکل نوجوان ہوتے ہیں ابھی بچپن سے



پیشگی گزر چکے ہیں کہ اس کی ابتدا ہو جاتی ہے، روپیہ کمانے اور مورخانہ داری سے جو وقت بچتا ہے صرف وہ ان مشاغل میں صرف کرتے ہیں اور ان میں سے وہ تک جن کی بڑی شہرت ہوتی ہے کہ ان میں فلسفیانہ جذبہ بہت ہے، جہاں مضمون کی بڑی دشواری یعنی منطق پر نظر پڑی کہ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ آئندہ عمر میں اگر کہیں کسی دوسرے نے بلا لیا تو جا کر ایک آدھ تقریر سن آتے ہیں اور پھر اس کا بڑا چرچا کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ خود فلسفہ کو اپنا اصلی اور صحیح شغل نہیں سمجھتے۔ بالآخر ڈبھے ہو کر اکثر صورتوں میں یہ ہر ایک لای شس کے آفتاب سے بھی زیادہ پیچھے معنوں میں سمجھ جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ تو پھر روشن بھی ہوتا ہے، یہ پھر بھی روشن نہیں ہوتے۔

ایڈ۔ لیکن خستہ اور کیا طریقہ ہونا چاہیے؟

میں :- اسکا بالکل الٹا۔ بچپن اور جوانی میں ان کا مطالعہ اور فلسفہ میں جو کچھ سیکھیں وہ انکے عمر کے مناسب ہونا چاہیے۔ اس زمانہ میں جب وہ بڑے کرپورے آدمی بن رہے ہیں ان کے جسموں کی طرف خاص توجہ کرنی چاہیے تاکہ انھیں فلسفہ کی خدمت میں لگا سکیں۔ جوں جوں عمر بڑھے اور ذہن پختہ ہونا شروع ہوتو توں یہ روح کی پرورش کو بڑھائیں لیکن جب ان کی طاقت جواب دیدے اور یہ مدنی یا فوجی خدمت کے لائق نہ رہیں تو انھیں اپنی مرضی کے مطابق رہنے سمنے دیا جائے اور انے کوئی مشقت نہ کرائی جائے۔ کیونکہ ہم چاہتے ہیں کہ یہ یہاں خوش رہیں اور آئندہ زندگی میں بھی ایسی ہی خوشی پا کر اس زندگی کے سترچ

تاج رکھیں۔

ایڈ۔ جناب سقراط! میں تو ابھی طرح جانتا ہوں کہ آپ اس ریلے میں کس درجہ خلوص رکھتے ہیں۔ مجھے تو یقین ہی، لیکن اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ کے سامعین میں سے اکثر آپ کی مخالفت میں غالباً اس سے بھی زیادہ خلوص رکھتے ہیں اور یہ شاید کبھی قائل نہوں ان میں سب سے بڑھکر تھریسی میکیس۔

میں۔ تھریسی میکیس اور مجھ میں کیوں خواہ مخواہ پھر جھگڑا کرتے ہو، ابھی تو ملاپ ہوا ہی اگرچہ سچ پوچھو تو دشمنی ہی کب تھی۔ لیستہ میں تو اپنے بس بھر کوشش کیے ہی جاؤں گا حتیٰ کہ یا تو تھریسی میکیس اور دیگر اشخاص کو قائل کر لوں یا کوئی ایسی بات کروں جو اس دن انکے کام آئے جب ہ وہ دوبارہ زندہ ہونگے اور اسی قسم کی گفتگو ایک دوسرے عالم وجود میں ہوگی۔

ایڈ۔ آپ اس وقت کی باتیں کر رہے ہیں جو بہت قریب نہیں! میں۔ بلکہ ایسے زمانہ کی جوازل کے مقابلہ میں بمنزلہ عدم کے ہی۔ تاہم مجھے حیرت نہیں کہ اکثر لوگ یقین کرنے سے انکار کرتے ہیں، کیونکہ ہم جس چیز کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں اسے انہوں نے کبھی حاصل ہوتے نہیں دیکھا، انہوں نے بس فلسفہ کی ایک سہمی نقل دیکھی ہے جو الفاظ کے محض ایک مصنوعی مجموعہ پر مشتمل ہے جن میں ہماری گفتگو کی سی فطری وحدت بھی نہیں۔ لیکن ایسا وجود انسانی جو اپنے قول و فعل کے عہت بار سے کامل طور پر ایسے سانچے میں ڈھل چکا ہو کہ اس میں بقدر



امکان خیر کی مناسبت اور مماثلت پیدا ہو جائے اور پھر یہ شخص ایک ایسے شہر پر حکمراں ہو جو خود بھی اسی سانچہ کا اثر رکھتا ہو، ایسا انسان انھوں نے کبھی نہیں دیکھا نہ ایک بہت۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ انھوں نے کبھی دیکھا ہی؟

ایڈ۔۔ واقعا نہیں دیکھا۔

ہیں۔ اور محبت من، یہی نہیں بلکہ ان لوگوں نے اگر کبھی آزاد اور شریفانہ اظہار جذبات کو سنا بھی ہو گا تو بس یونہی شاذ و نادر۔ میرا مطلب ایسے خیالات سے ہے جو انسان کے منہ سے اس وقت نکلتے ہیں جب وہ خلوص کے ساتھ اور اپنی تمام امکانی قوت سے علم کی خاطر حق و صداقت کے متلاشی ہوتے ہیں اور ان مسائل پر موٹگائیوں کی طرف سے سرد مہری اور بے اعتنائی برتتے ہیں جنکا حاصل مناقشہ اور قیاس ہی خواہ یہ موٹگائیاں قانونی عدالتوں میں ہوں یا معاشرت اجتماعی میں۔

ایڈ۔۔ جی ہاں۔ جن افعال کا آپ ذکر کر رہے ہیں ان سے یہ لوگ بالکل نا آشنا ہیں۔

میں۔۔ اور یہی بات تھی جو ہم نے پہلے سے دیکھی تھی اور یہی وجہ تھی کہ صدائے انہیں بلا خوف و تردد اس امر کے تسلیم کرنے پر مجبور کیا کہ شہر، حکومتیں یا افراد ان میں سے کوئی اس وقت تک کہاں کو نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ فلسفیوں کا وہ چھوٹا سا گروہ جسے ہم نے بیکار کہا ہے لیکن جس کی تخریب نہیں ہوئی اسے خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے رہائستہ کی خبر گیری پر من اللہ ما مور نہ کیا جائے اور اس طرح

مرباست پران کی اطاعت لازم کر دی جائے یا پھر یہ ہو کہ بادشاہوں بادشاہوں اور شہزادوں کی اولاد کے دل میں خدا کی طرف سے فلسفہ حقیقی کی کاپی مجتہب پر کر دی جائے، میں یہ کہنے کی کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ ان دو صورتوں میں سے کوئی ایک ناپردوزا ممکن ہے، اگر ایسا ہوتا تو لوگ بیشک ہمیں متخیلیں اور خوفناک کہہ کر ہماری مہنسی اڑا سکتے تھے۔ کیوں میں صحیح کہتا ہوں نا؟

ایڈ۔ بالکل درست۔

میں :- تو اگر ماضی کی بے گنتی جگہوں میں یا خود اس وقت کسی ایسے ملک میں جو ہم سے دور اور ہمارے علم کے باہر ہے کبھی کسی کامل فلسفی کو ایک عالی طاقت نے حکومت کی باگ ہاتھ میں لینے پر مجبور کیا ہے، یا کبھی آئندہ اس طرح مجبور کرے گی تو ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں (اور ایسا دعویٰ کہ اگر غلط ہو تو ہماری سزا موت) کہ یہی ہمارا دستور ایسی ہاں رائج رہا ہوگا یا رائج ہو۔ اور جہاں کہیں فلسفہ کی دیوی ملکہ ہوگی وہاں یہی رائج ہوگا۔ اس میں کوئی بات محال نہیں، ہاں مشکل ہے، سوسکا ہمیں خود اقرار ہے۔

ایڈ۔ - میری رائے آپ سے متفق ہے۔

میں :- کیا تمہارا مطلب ہے کہ عوام کا یہ خیال نہیں۔

ایڈ۔ - ہاں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ نہیں ہے۔

میں :- لے میرے دوست عوام پر حملہ نہ کرو، یہ اپنی رائے تبدیل کر دیں گے



بشرطیکہ سرچرچہ نہ کر جا رہا نہ طریقہ سے نہیں بلکہ ترمی سے نہیں تسکین دینے اور زیادتی و تعلیم سے ان کی نفرت کو دور کرنے کے لیے تم انہیں اپنے اصل فلسفی دکھاؤ اور ان کے سامنے ان فلسفیوں کے خصائص و اشغال کو اسی طرح بیان کرو جس طرح ابھی ابھی بیان کیا جا رہا تھا تو جمہور اناس دیکھ لینگے کہ تم جس کا ذکر کر رہے ہو وہ ایسا نہیں جیسا کہ یہ سمجھتے تھے۔ جب وہ اسے اس نئی روشنی میں دیکھیں گے تو یقیناً اس کے متعلق اپنے خیالات کو بدلینگے اور بالکل جداگانہ طریقہ سے تمہارے عامل اس کے سوال کا جواب دیں گے۔ اپنے محبت کر نیوالے سے کون دشمنی کریگا، جو خود نرم دل اور حسد سے پاک ہو وہ ایسے آدمی سے کیوں شک کریگا جس میں خود رشک نہیں۔ میں آپ جو اب دیتا ہوں کہ ممکن ہو لگے ڈگے میں یہ سنگ طبعی پانی جائے لیکن نوع انسانی کی اکثریت میں تو یہ کبھی نہ ملیگا۔ ایڈ۔۔ میں آپ سے بالکل اتفاق کرتا ہوں۔

میں :- اور کیا تم بھی میری طرح یہ نہیں سمجھتے کہ عوام میں فلسفہ کے خلاف جو شدید احساس پایا جاتا ہے اس کی ابتدا ہوتی ہے دراصل ان نام نہاد فلسفیوں سے جو ناخواندہ آگوتے ہیں اور ہمیشہ ان لوگوں کو برا بھلا کہتے اور اپنے نکتہ چینی اور عین جونی کرتے اور شہیاد کے بجائے اشخاص کو اپنا موضوع گفتگو بناتے ہیں؟ اور فلسفی کے شان کے منافی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

ایڈ :- یہ از حد نازیا ہے۔

میں :- کیونکہ ایڈمیٹنیٹس، جس کی کو جو حقیقی سے لگی ہو اسے یقیناً دنیا  
 معاملات پر نظر ڈالنے کی فرصت نہیں ہوتی، نہ اسے اس کی مہلت کہ کہینہ اور جبر سے  
 پڑائساؤں سے مجاہدہ کرتا پھرے۔ اس کی نگاہ بھی ہوتی ہو تو قائم اور دائم چیزوں  
 پر، جنہیں وہ دیکھتا ہو کہ نہ یہ ایک دوسرے کو ضرر پہنچاتی ہیں، نہ انہیں کوئی ضرر  
 پہنچتا ہو، اور سب کی سب عقل کے مطابق ایک نظام سے متحرک ہیں۔ وہ انکی  
 نقل کرتا ہو اور جہاں تک اس سے بن پڑتا ہو اسے مطابقت کرنا چاہتا ہو۔ اور انسا  
 بھلا اس کی نقالی کیے بغیر کیسے رہ سکتا ہو جس سے اسے معتقدانہ لگاؤ اور ربط

ضبط ہو

ایڈ :- ناممکن۔

میں :- اور اس طرح نظام الہی سے ربط ضبط رکھنے والا فلسفی خود بھی جہاں تک  
 فطرت انسانی اجازت دیتی ہو، منظم اور الہی ہو جاتا ہو۔ البتہ اور ہر چیز کی طرح  
 اسے اس میں بھی تھوڑی سی کمی ضرور ہوگی۔

ایڈ :- ظاہر ہے۔

میں :- اور اگر اسپرہ کام لازم کر دیا جائے کہ نہ صرف اپنی بلکہ عام فطرت  
 انسانی کی تشکیلیں خواہ ریاست میں ہو یا افراد میں اس کے مطابق کرے جو وہ  
 کہیں اور دیکھ رہا ہو تو کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ عدل، عفت و اعتدال اور دیگر محاسن  
 شہری کا ایک غیر ہنرمند کار دیکر ثابت ہوگا۔



ایڈ۔ سب کچھ ہو سکتا ہے، لیکن غیب سے مراد نہیں۔

میں۔ اور اگر دنیا دیکھ لے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہی تو کیا وہ فلسفہ سے ناراض ہو سکتی ہے۔ اور کیا لوگ ہمارے اس کہنے پر یقین نہ کریں گے کہ وہ ریاست کبھی خوش نہیں ہو سکتی جس کا نقشہ ایسے صناعتوں نے نہ بنایا ہو جو آسمانی نمونہ کی نقل کرتے ہیں؟

ایڈ۔ سمجھنے کے بعد تو پھر یہ ناراض رہیں گے۔ لیکن جس نقشہ کا آپ ذکر کرتے ہیں وہ کس طرح کھینچیں گے؟

میں۔ یہ ریاست اور آدمیوں کے اطوار سے ابتدا کریں گے اور جیسے تختی سے تصویر مٹا دیتے ہیں یہ سب مٹا کر صاف سطح چھوڑ دیں گے۔ یہ کچھ سہل کام نہیں لیکن سہل ہو یا نہ ہو ان میں اور دوسرے واضعان قوانین میں بس ہی فرق ہوگا یہ اس وقت تک زودیا ریاست سے کوئی سروکار نہ رکھیں گے نہ کوئی قوانین بنا جائیں گے۔ جب تک یا تو انھیں ایسی صاف سطح ملے یا یہ خود اسے صاف نہ کر لیں۔

ایڈ۔ بہت ٹھیک کریں گے۔

میں۔ جب یہ ہو جائیگا تو پھر یہ دستور اساسی کا خاکہ بنانا شروع کریں گے۔

ایڈ۔ بلاشبہ۔

میں۔ اور اس خاکہ کو پُر کرتے وقت میرے تخیل کے مطابق یہ اکثر اوپر

تلی نظر ڈالیں گے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ یہ پہلے تو عدل مطلق، اور حسن و اعتدال

مطلق کو دیکھیں گے اور پھر ان کی انسانی نقل کو، اور مختلف عناصر حیات کو شکل  
انسانی میں ملا کر داخل کریں گے اور اسکا تخیل وہ اس دوسری شکل سے قائم کریں گے  
کہ جو جب انسانوں میں موجود ہوتی ہے تو ہوسرے سے شکل مثال خداوندی کتا ہے  
ایڈ۔ بہت درست۔

میں۔ یہ ایک شکل کو مثالیں گے اور دوسری کو اس کی جگہ ثبت کریں گے  
یہاں تک کہ اطوار انسانی کو حتی الامکان اطوار الہی کے مطابق بنا دیں۔  
ایڈ۔ بیشک، اور کسی طرح یہ اس سے حسین تر تصویر نہیں بنا سکتے۔  
میں۔ ہاں جن لوگوں کے متعلق منہ کہا تھا کہ ہم پر غرور جھپٹیں گے شاید  
اب ہم نہیں سمجھانے لگے ہیں کہ روایت کے دستور اساسی کا نقش کھینچنے والا  
ایسا ہی جس کی ہم تعریف کر رہے تھے اور جس کے ہاتھ میں عنان حکومت دینے  
پر وہ اس درجہ برا فروخت تھے۔ کیا یہ لوگ ہماری ابھی ابھی کی باتیں سُنکر ذرا  
خاموش نہیں ہونے لگے؟

ایڈ۔۔ اگر ان میں ذرا بھی عقل ہے تو ضرور خاموش ہو جائیں گے۔  
میں۔۔ اب آخر اعتراض کی کون وجہ باقی رہی؟ کیا یہ لوگ اس میں شبہ  
کریں گے کہ فلسفی حق و صداقت اور وجود مطلق کا عاشق ہے؟  
ایڈ۔۔ ایسے بے عقلے تو کیا ہونگے!  
میں۔۔ یا اس میں شبہ کریں گے کہ اس کی فطرت عیبی کہ ہم نے امارتِ حیران



سے مطابق ہوگی!

ایڈ :- نہ اس میں شبہ کر سکتے ہیں۔

میں :- تو کیا یہ لوگ پھر یہ کہیں گے کہ اسی فطرت موافق و مساعد حالات میں بھی کامل اچھی اور عقل مند نہیں ہو سکتی (بشرطیکہ کامل خیر و حکمت کبھی کسی کو حاصل ہو ہو) یا کہیں یہ لوگ انھیں ترجیح نہ دیں جنھیں ہم نے مسترد کر دیا ہے؟

ایڈ :- نہیں، ہرگز نہیں۔

میں :- پھر کیا یہ ہمارے اس کہنے پر اب بھی خفا ہونگے کہ جب تک فلسفیوں کے ہاتھ میں حکومت نہ ہو ریاستوں اور افراد کو شر سے چین نہ نصیب ہوگا اور نہ ہی یہ خیالی ریاست کبھی عالم وجود میں آسکے گی؟

ایڈ :- میں سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ اب کم ناراض ہونگے۔

میں :- کیا ہم یہ نہیں فرض کر سکتے کہ اب یہ نہ صرف کم ناراض ہونگے بلکہ بالکل نرم ہوں گے، اب انکا خیال بٹپٹ گیا ہوگا اور اور کچھ نہیں تو شرماشی ہی یہ صلح کرنے سے انکار نہ کریں گے۔

ایڈ :- ضرور فرض کر سکتے ہیں۔

میں :- تو پھر فرض کرو کہ یہ باہمی مفاہمت ہوگئی۔ اب کیا کوئی شخص ہمارے دوسری صوت سے انکار کرے گا کہ بادشاہوں اور شہزادوں کی ایسی اولاد ہو سکتی ہے جو باطن فلسفی ہو۔

ایڈ :- یقیناً، کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

میں :- اور کیا کوئی کہہ سکتا ہو کہ عالم وجود میں آنے کے بعد ان کی تخریب و تباہی لازمی ہے اس سے تو ہمیں بھی انکار نہیں کہ ان کا بچانا بہت دشوار ہے۔ لیکن یہ بھلا کون کہہ سکتا ہو کہ قرہنا قرن میں انہیں سے ایک واحد بھی نزع کیے گا؟ ایڈ :- بیشک کون کہہ سکتا ہو۔

میں :- لیکن ایک کافی ہے۔ بس ایک آدمی چاہیے کہ ایک شہر کے ارادے کا تابع ہو، اور یہ اکیلا اس بہترین نظام حکومت کو عالم وجود میں لاسکتا ہو جس کے متعلق دنیا اس قدر مشتبه اور مشکوک ہے۔

ایڈ :- ہاں۔ ایک کافی ہے۔

میں :- حاکم ان قواعد و قوانین کو نافذ کرے گا جو ہم بیان کر رہے ہیں اور عوام غالباً ان کی اطاعت پر آمادہ ہوگی۔

ایڈ :- یقیناً۔

میں :- اور یہ بات نہ محال ہے نہ معجزہ کہ جسے ہم پسند کرتے ہیں اسے

دوسرے بھی پسند کریں۔

ایڈ :- میں تو سمجھتا ہوں کہ نہیں ہے۔

میں :- اپنی ساری پھولی گفتگو میں ہم نے کافی طور پر ظاہر کر دیا ہے کہ اگر سچے ممکن ہو تو یقیناً بہترین نتائج رونما ہوں گے۔



ایڈ :- جی ہاں۔

میں :- اور اب ہم صرف یہ نہیں کہتے کہ اگر ہمارے قوانین نافذ ہو سکتے تو بہترین نتائج کا باعث ہوتے۔ بلکہ اب ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ انکا نفاذ اگرچہ مشکل سی لیکن ناممکن نہیں ہے۔

ایڈ :- بہت خوب۔

میں :- خیر بہنوار کاوشش و دشواری ہم ایک مضمون کے ختم پر تو ہونے لگیں ابھی اس سے زیادہ بحث کے لیے باقی ہے، یعنی اس نظام اساسی کے فطرت کس طرح، کن اشغال اور کن چیزوں کے مطالعہ سے پیدا ہونگے، اور یہ ان مختلف علوم کی تحصیل پر کس کس عمر میں مشغول ہوں۔

ایڈ :- بیشک۔

میں :- میں نے عورتوں پر قبضہ بچوں کی پیدائش اور نکاح کے تہ کے تکلیف دہ معاملات اس لیے حذف کر دیئے تھے کہ میں جانتا تھا کہ کامل ریاست پر لوگ شک و رقابت سے نظر ڈالیں گے اور اس کا حصول دشوار ہوگا، لیکن یہ چالاکی سے زیادہ کام نہ آئی اور مجھے پھر بھی اپنی بحث کرنی ہی پڑی۔ اب عورتوں اور بچوں کا معاملہ تو طری ہو لیکن دوسرا مسئلہ یعنی حکام کے سوال کی باکل شروع سے تحقیق ہونی چاہیے تمہیں یاد ہوگا ہم کہہ رہے تھے کہ یہ اپنے ملک کے عاشق ہوں، مسرت و الم، خط و کرب کے امتحان سے انکی آزمائش ہو چکی ہو، صعوبتوں میں خطرہ میں

کسی اور اہم اور کٹھن موقع پر یہ اپنے جذبہ بخت وطن کو کھونڈ بیٹھیں جو ان آزمائشوں میں ناکام ہونے سے مسترد کر دیا جائے، لیکن جو ہمیشہ خاص نکمے جیسے سنار کی بھٹی سے تپا ہوا سونا نکلتا ہے تو وہ حاکم بنا یا جائے اور زندگی میں اور بعد موت اعزاز و انعام کا موذ ہو۔ ہم اس قسم کی باتیں کر رہے تھے کہ دلیل نے ایک طرف کو مڑ کر اپنے چہرہ پر نقاب ڈال لی وہ چاہتی تھی کہ جو سنیاب چھڑ گیا ہے اس میں مغل نہ ہو۔

ایڈیٹر: مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

میں :- ہاں میرے دوست میں اُس وقت صاف صاف الفاظ کہنے سے جھکتا تھا۔ لیکن اب میں صاف کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ کامل محافظ کے لیے لازم ہے کہ وہ فلسفی ہو۔

ایڈیٹر :- ہاں اب یہ دعویٰ کر دینا چاہیے۔

میں :- اور یہ نہ سمجھو کہ یہ فلسفی بہت سے ہونگے، کیونکہ ہم نے جن صفات کو لازمی قرار دیا ہے وہ بہت شاذ یکجا ہوتی ہیں۔ وہ اکثر ٹکڑے ٹکڑے اور پارہ پارہ بنتی ہیں۔

ایڈیٹر :- آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں :- تم واقف ہو کہ ذکاوت، حافظہ، ہوشمندی و فہم، چالاکی اور دوسری ایسی ہی صفات اکثر یکجا نہیں ملتیں اور جن لوگوں میں یہ ہوتی ہیں اور وہ ساتھ ساتھ فراخ دل اور عالی حوصلہ بھی ہوں تو فطرت کی طرف سے انکی کچھ ایسی ساخت ہوتی ہے



کہ وہ منتظم، پرامن و سکون اور ایک مستقل وضع کی زندگی نہیں گزار سکتے۔ انکے ہیجان  
انہیں جدمر چاہتے ہیں لیجاتے ہیں اور ان کی تمام ٹھوس صہلیت انسے نکلمانی ہو۔  
ایڈ :- بہت درست۔

میں :- برخلاف اسکے وہ مستقل طبائع ہیں جسپر زیادہ اعتماد کیا جاسکتا ہے  
جو جنگ میں اٹل اور خوف سے بالکل غیر متاثر ہوتی ہیں، تو یہ غریب جب کچھ  
سیکھنے سمجھنے کا معاملہ ہوتا ہے تب بھی ایسی ہی غیر متحرک اور مٹھنا بت ہوتی ہیں یہ  
ہمیشہ ایک سا کرن کیفیت میں رہتی ہیں، اور جہاں کچھ ذہنی محنت کا معاملہ آیا ہوتا  
ہوتا ہے وہ کہ یہ جوانمیاں لیکر سو جائینگے۔

ایڈ :- بالکل بجا۔

میں :- لیکن ہم کہہ چکے ہیں کہ جن لوگوں کو اعلیٰ تعلیم دینی ہے اور جو کسی عہدہ  
یا منصب پر قابض ہونوالے ہیں ان کے لیے یہ دونوں صفات لازمی ہیں۔  
ایڈ :- بیشک۔

میں :- تو کیا یہ نہایت کمیاب طبقہ ہوگا ؟

ایڈ :- ہاں، یقیناً۔

میں :- تو اس کے امیدوار کا امتحان صرف ان مسرتوں، مشقتوں، اور  
خطرات سے نہ ہوگا جنکا ہم ذکر کر چکے ہیں بلکہ ایک اور قسم کی آزمائش بھی ہے جس کا  
بیان ابھی رہ گیا تھا یعنی مختلف قسم کے علوم میں سکی مشق کرانی چاہیے تاکہ معلوم

ہوسکے کہ آیا اس کی روح افضل ترین علوم کا تحمل کرسکے گی یا نہیں؟  
ایڈ۔۔۔ ہاں۔۔۔ یہ تو بالکل ٹھیک ہے کہ آپ اس کی آزمائش کر لیں لیکن افضل  
ترین علم سے آپ کا مقصد کیا ہے؟

میں۔۔۔ تمہیں یاد ہوگا کہ ہم نے روح کے تین حصہ کیے تھے اور عدلِ عفت  
واعتدالِ جرات اور عقل کی جداگانہ ماہیتوں میں تمیز کی تھی۔  
ایڈ۔۔۔ خوب، اگر میں اسی کو بھول جاؤں تو پھر آگے گفتگو سننے کا مستحق  
ہی نہیں۔

میں۔۔۔ اور اپنی بحث کرنے سے قبل جو بھی الفاظ کہے گئے تھے وہ تمہیں  
یاد ہیں؟

ایڈ۔۔۔ آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟  
میں۔۔۔ اگر میں غلطی نہ کرتا ہوں تو غالباً ہم نے کہا تھا کہ جو شخص نہیں انکے  
کامل حسن میں دیکھنا چاہتا ہوئے ذرا طویل و پرتعرج رہتے اختیار کرنا ہوگا اس کے  
ظہور نے پر یہ ظاہر ہوں گی۔ لیکن ہم ان کی ایک عامیانا توضیح بھی اضافہ کرسکتے  
ہیں جس کی سطح گذشتہ بحث کی سی ہو۔ اسپرٹم نے جواب دیا کہ بس یہی توضیح تمہیں  
لیے کافی ہوگی۔ چنانچہ تحقیق اس انداز سے جاری ہوئی جو میرے خیال کے مطابق  
نہایت غیر صحیح طریقہ ہے۔ رہا یہ کہ تم بھی اس سے مطمئن ہوئے یا نہیں یہ تمہارے بتا کی بات ہے۔  
ایڈ۔۔۔ جی، میرا دوزیر دیگر احباب کا خیال ہے کہ آپ نے ہمیں صداقت کا



ایک معقول معیار فراہم کر دیا۔

میں۔۔۔ لیکن، میرے دوست ان چیزوں کا ہر وہ معیار جو کامل صداقت سے ذرا کس قدر بھی کم ہو وہ معقول معیار نہیں۔ کوئی ناقص چیز کسی دوسری چیز کا معیار نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ لوگ عموماً قانع ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مزید تلاش کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ جب لوگ کاہل ہوں تو یہ صورت کچھ غیر معمولی نہیں۔

میں۔۔۔ ہاں، اور رباہیت اور آئین کے محافظ کے لئے اس سے بڑا کوئی اور عیب نہیں ہو سکتا۔

ایڈ۔۔۔ درست۔

میں۔۔۔ تو پھر محافطہ سے یہ طویل راہ اختیار کرانی چاہیے اور اسے علم اور روزگار دونوں میں محنت کرنی چاہیے ورنہ وہ کبھی اس فضل ترین علم کو نہ حاصل کر سکیگا جیسا کہ ہم ابھی ابھی کہہ رہے تھے، اس کا اصلی مقصد ہے۔

ایڈ۔۔۔ کیا؟ کیا کوئی علم اس سے بھی اعلیٰ اور افضل ہے۔ یعنی عدل اور دیگر محاسن سے بھی اعلیٰ۔

میں۔۔۔ ہاں، ہر۔ اور خود ان مذکورہ محاسن کا بھی ہمیں محض خاکہ نہ دیکھنا چاہیے جیسا کہ ہم فی الحال کر رہے ہیں۔ بہترین مکمل تصویر سے کم پر مطمئن ہی نہونا چاہیے۔ جب چھوٹی چھوٹی چیزوں کو انتہائی محنت کے ساتھ تفصیلی طور پر بنایا جاتا ہے، تاکہ وہ اپنے پورے حسن اور کامل وضاحت سے ظاہر ہو سکیں، تو کیسی تسخیر انگیز بات ہے،

کہ ہم اعلیٰ ترین حقائق کو صحت کامل حاصل کرنے کے قابل نہ سمجھیں۔

ایڈ۔۔ نہایت اعلیٰ خیال ہے۔ لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اس سوال سے با  
آجائینگے کہ آخر یہ افضل ترین علم کیا ہے؟

میں۔۔ نہیں نہیں، تمہارا جی چاہے تو پوچھو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تم بارہا اسکا  
جواب سن چکے ہو، اور یا تو تم مجھے سمجھتے نہیں اور یا غالباً تم محض شرارت پر آمادہ ہو  
تمہیں اکثر بتایا گیا ہے کہ خیر کا تصور (عین)، اعلیٰ ترین علم ہے۔ اور تمام دوسری چیزیں  
اسی کو استعمال کر کے مفید اور کارآمد بنتی ہیں۔ تم اس سے تو مشکل ہی بنا واقف ہو گے کہ  
میں اب اسی کے متعلق گفتگو کرنے والا تھا، اور تم نے مجھے اکثر کہتے سنا ہوگا کہ ہم اسکے  
متعلق سب سے کم جانتے ہیں۔ اور اس کے بغیر مرد و سہرا علم اور ہر قسم کی متاع ہمارے لیے  
بیودہی۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمام دوسری چیزوں پر قبضہ ہمارے لیے کوئی بھی قیمت رکھتا  
ہے، اگر ہمارے قبضہ میں خیر نہ ہو۔ یا تمام دوسری چیزوں کا علم ہمارے لیے کوئی قدر  
رکھ سکتا ہے اگر ہمیں حسن خیر کا علم نہ ہو۔

ایڈ۔۔ یقیناً نہیں۔

میں۔۔ تم اس سے بھی آگاہ ہو کہ اکثر لوگ مسرت و حظ کو خیر کہتے ہیں لیکن انہ  
لطیف تر عقلیں اسے علم سے تعبیر کرتی ہیں۔

ایڈ۔۔ جی ہاں۔

میں۔۔ اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ یہ مؤخر الذکر لوگ یہ واضح نہیں کر سکتے کہ انکا



علم سے کیا مفہوم ہو اور بالآخر مجبور ہو کر اسے خیر کا علم کہہ دیتے ہیں۔

ایڈ :- کیا خوب، کیسی تمسخر خیر بات ہو!

میں :- جی ہاں۔ پہلے تو یہ لوگ ہم پر ملامت کرتے ہیں کہ خیر سے ناواقف تھے اور پھر فرض کر لیتے ہیں کہ ہمیں اس کا علم ہے۔ کیونکہ خیر کی تعریف یہ لوگ کرتے ہیں کہ علم خیر، گو یا جب انہوں نے لفظ خیر استعمال کیا تو ہم اس کے معنی سمجھتے ہی تھے۔ نہایت مضحکہ انگیز بات ہے۔

ایڈ :- بالکل بجا۔

میں :- اسی طرح جو مسرت و حظ کو خیر کہتے ہیں وہ بھی برابر کی ہی پریشانی میں مبتلا ہیں کیونکہ انہیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جہاں اچھی مسرتیں ہیں وہاں ہی مشرت بھی ہیں۔

ایڈ :- یقیناً

میں :- اس طرح گو یا انہیں تسلیم کرنا ہوتا ہے کہ اچھا اور بُرا ایک ہی ہے۔

ایڈ :- بجا۔

میں :- جن لاتعداد مشکلات میں یہ مسئلہ آتا ہے یہ نہیں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

ایڈ :- کوئی شبہ نہیں۔

میں :- پھر کیا ہم بہت سے لوگوں کو اسپر آمادہ نہیں پاتے کہ صلیت و برکت کے بغیر وہ کریں یا رکھیں یا معلوم ہوں جو بظاہر مبنی بر انصاف و عدل قابل عبادت ہو

لیکن خیر کے محض ظاہر سے کوئی مطمئن نہیں ہوتا۔ تلاش تو حقیقت کی ہے اور خیر کے معاملہ میں ہر ایک محض ظاہر صورت کو ذلیل سمجھتا ہے۔  
ایڈ۔۔ مابل بجا۔

میں۔۔ اس چیز سے جس کی تلاش ہر انسانی روح کو ہے اور جسے وہ اپنے تمام اعمال کا مقصد بناتی ہے، کیونکہ اسے پہلے سے یہ خیال ہے کہ ایسا مقصد ہونا چاہیے۔ لیکن پھر متامل ہے کہ نہ اس کی ماہیت کا علم رکھتی ہے نہ اس کے متعلق وہ یقین جو دوسری چیزوں کے متعلق ہے اور اس طرح دوسری چیزوں میں جو کچھ خوبی ہو اسے ضائع کر دیتی ہے، کیا اس عظیم الشان اصول کے متعلق ہماری رہایت کا بہترین انسان جسکے سپرد سب کچھ ہے، ہجرت کی تار مٹی میں ہوگا؟  
ایڈ۔۔ ہرگز نہیں۔

میں۔۔ میرا یقین ہے کہ جو شخص نہیں جانتا کہ حسن و عدل ساتھ ہی ساتھ خیر بھی کس طرح ہوتے ہیں، وہ حسن و عدل کا کچھ بونی سا محافظ ہوگا۔ اور میں شبہ رکھتا ہوں کہ جو شخص خیر سے ناواقف ہے وہ ان کا علم بھی نہیں رکھ سکتا۔  
ایڈ۔۔ نہایت بجا شبہ ہے۔

میں۔۔ اور اگر ہمیں ایسا محافظ مل جائے جسے یہ علم ہو تو پھر تو ہماری رہایت میں کامل نظم ہوگا۔  
ایڈ۔۔ بلاشبہ، لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے یہ بتلائیں کہ آپ خود خیر کے



اس اصل اعلیٰ کے متعلق کیا خیال کرتے ہیں؟ آیا یہ علم ہی یا مسرت و حظ یا ان دونوں سے جداگانہ کوئی شے؟

میں :- ہاں ہاں، میں پہلے ہی سے جانتا تھا کہ تم جیسا باریک میں اور چھان بین کرنے والا ان معاملات پر محض دوسرے لوگوں کے خیالات سننے پر قانع نہ ہوگا۔

ایڈ :- جناب سقراط! یہ سچ ہی لیکن میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ آپ جس شخص کو جسے اپنی ساری زندگی فلسفہ کے مطالعہ میں صرف کی ہو اس پر کبھی قانع نہ ہونا چاہیے کہ بس دوسروں کی رائیں دہرائے اور خود اپنی ریلے کبھی نہ بتلائے۔ میں :- درست، لیکن کیا کسی شخص کو اس معاملہ پر کوئی قطعی ریلے دینے کا حق ہے جانتا نہ ہو؟

ایڈ :- نہیں، اسے اپنا خیال قطعی یقین کے ساتھ نہ پیش کرنا چاہیے۔ اس کا اسے بیشک حق نہیں لیکن وہ یہ کہہ سکتا ہو کہ اس معاملہ پر اس کا کیا خیال ہے یعنی محض بطور رائے کے۔

میں :- کیا تم نہیں جانتے کہ محض ارادہ تمام کی تمام بُری ہوتی ہیں اور انہیں سے بہترین بھی کورتھم اس سے تو انکار نہ کرو گے کہ جن لوگوں کے ذہن میں بلا سمجھ کے کوئی صحیح خیال ہوا انکی مثال اندھوں کی سی ہے جو سڑک پر اپنا راستہ محسوس کر لیتے ہیں۔ ایڈ :- بالکل صحیح۔

میں۔ پھر کیا تم اسے دیکھنے کی خواہش رکھتے ہو جو کورپورس اور مسخ و ذلیل  
جسکے دو سکر تمہیں حسن و نجلی بتانے پر طیار ہیں۔

گلاکن :- پھر بھی جناب سقراط میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ عین اس وقت  
کہ ہم منزل مقصود پر پہنچ رہے ہیں اپنا منہ نہ موڑیے۔ اگر آپ خیر کی بھی ایسی ہی  
توضیح کر دیں جیسی کہ آپ نے عدل و عفت اور دیگر محاسن کی کی ہو تو ہم مطمئن  
ہو جائیں گے۔

میں :- ہاں۔ میرے دوست! مجھے بھی کلم از کم اتنا ہی اطمینان حاصل ہو گا؛  
لیکن مجھے ڈر ہے کہ میں ناکام رہوں گا۔ اور میرا بیجا جوش میری عینسی اڑوا بیگا نہیں  
نہیں۔ میرے مہربانوں، ہم اس وقت نہ پوچھیں کہ خیر کی اصل ماہیت کیا ہے۔ کیونکہ اس  
مقام پر پوچھنے کے لیے جو اس وقت میرے خیال میں ہے ایسی ہی درکار ہے جو میری  
طاقت سے باہر ہوگی۔ البتہ میں خیر کے ایک بچے کا ذکر کر سکتا ہوں جو سب سے زیادہ  
اس سے مشابہ ہے، بشرطیکہ مجھے یہ یقین ہو جائے کہ آپ لوگ سے سُنتا چاہتے ہیں۔  
ورنہ یہ بھی نہیں۔

گلاکن :- ہاں ہاں ضرور بچے کا ذکر کیجئے۔ اور باپ کا بیان آپ پر گویا واجب الادا  
ہے گا۔

میں :- سچ پوچھو تو میں تو خود چاہتا ہوں کہ میں صرف اولاد ہی کا نہیں بلکہ  
والد کا حساب بھی چکا سکتا اور تم اسے بھی وصول کر لیتے۔ لیکن خیر فی الحال اسی کو



بطور سود کے لے لو اور خیال رکھو کہ میں کہیں غلط حساب تو نہیں دیتا۔ اگرچہ پیسہ پوچھو تو میرے دل میں تمہیں دھوکہ دینے کا ذرا بھی قصد نہیں ہے۔

گلاکن :- بہت اچھا، آپ آگے چلیے، ہم حتیٰ الوسع پوری احتیاط برتیں گے۔ میں :- ہاں، لیکن پہلے میں آپ لوگوں سے ایک سمجھوتہ کر لوں، اور آپ کو ایک بات پھر یاد دلا دوں جو اٹنا بحث میں اور تیر دوسرے موقعوں پر میں بیان کر چکا ہوں۔

گلاکن :- وہ کیا؟

میں :- وہی پُرانا قصہ، کہ ایک حسن کثرت ہوتا ہے اور خیر کثرت اور اس طرح اور دوسری چیزوں کے متعلق جنکا تذکرہ اور تعریف ہم کرتے ہیں۔ ان سب پر لفظ کثرت کا اطلاق ہوتا ہے۔

گلاکن :- درست۔

میں :- اور ایک ہوتا ہے حسن مطلق اور خیر مطلق، نیز جن دوسری چیزوں پر لفظ کثرت عائد ہوتا ہے ان کا بھی ایک مطلق ہے، کیونکہ یہ سب ایک واحد عین کے تحت لائے جاسکتے ہیں جو ہر ایک کا اصل وجود ہر کہلاتا ہے۔

گلاکن :- بہت صحیح۔

میں :- کثرت دیکھی جاتی ہے، جانی نہیں جاتی، اور اعیان جانے جاتے ہیں دیکھے نہیں جاتے۔

گ۔ ب۔ جا۔

میں :- مری چیزوں کو ہم کاہت سے دیکھتے ہیں؟

گ۔ ب۔ باصرہ سے۔

میں :- اور سامعہ سے سنتے، اور دیکر جو اس پر دوسرے موارد حسن کا احسا

کرتے ہیں۔

گ۔ ب۔ درست۔

میں :- لیکن تم نے کبھی اس طرف توجہ کی ہے کہ باصرہ بہتر مندی کا سب سے قیمتی

پر عیدہ کام ہے جو صنایع جو اس نے انجام دیا ہے؟

گ۔ ب۔ نہیں میں نے کبھی اور دھیان نہیں کیا۔

میں :- تو ذرا غور کرو۔ کیا کان یا آواز کو اس لیے کہ وہ سن سکے یا یہ سنا جانے

کسی تیسری یا اضافی چیز کی ضرورت ہے؟

گ۔ ب۔ کسی چیز کی نہیں۔

میں :- دھیل نہیں۔ اور یہی حال اگر سب کا نہیں تو اکثر جو اس کا ہے۔ کیا تمہارے

خیال میں کسی حس کو یہ اضافی چیز درکار ہے؟

گ۔ ب۔ ہرگز نہیں۔

میں :- لیکن کسی دوسری شے کے اضافہ کے بغیر دیکھنا ممکن ہے نہ دیکھا جانا۔

گ۔ ب۔ یہ کیسے؟



میں۔ ایسے کہ باوجودیکہ آنکھوں میں باصرہ موجود ہو، اور آنکھوں والا دیکھنا بھی چاہتا ہو، رنگ بھی موجود ہو، لیکن جب تک اس غرض کے لیے ایک اور تیسری چیز موجود نہ ہو اس وقت تک آنکھوں والا کچھ نہ دیکھ سکیگا اور رنگ غیر مری رہے گی۔

گ۔۔ آپ کس چیز کا ذکر کر رہے ہیں؟  
میں۔۔ اسکا جسے تم روشنی کہتے ہو۔  
گ۔۔ ہاں، درست۔

میں۔۔ شریف ہو وہ رشتہ جو باصرہ کو مری چیزوں سے جوڑتا ہو اور دوسرے رشتوں سے بوجہ اپنے کثیر اختلافِ ماہیت کتنا مہتمم بالشان۔ کیونکہ یہ رشتہ روشنی ہی اور روشنی کوئی ذلیل شے نہیں۔

گ۔۔ ذلیل کی بالکل ضد۔

میں۔۔ اور تمہارے خیال میں آسمانی دیوتاؤں میں اس عنصر کا مالک کون ہے؟ وہ روشنی کس کی ہے جو آنکھ کو پوری طرح دیکھنے اور مشہود کو نظر پہنچنے دیتی ہے۔  
گ۔۔ آپ کا مطلب آفتاب ہی ہے۔ آپ کا نیز تمام نوعِ انسانی کا یہی خیال ہے۔

میں۔۔ روشنی سے اس دیوتا کا تعلق کیا اس طرح بیان نہیں ہو سکتا؟

گ۔۔ کس طرح؟

میں۔۔ نہ تو آنکھ آفتاب ہے اور نہ باصرہ جو آنکھ میں رہتی ہے۔

گ۔۔ نہیں۔

میں :- تاہم تمام اعضاء جیسے میں آنکھ ہی سب سے زیادہ سورج کی طرح ہو  
گ :- سب سے زیادہ ۔

میں :- اور آنکھ میں جو قوت ہو وہ گویا آفتاب سے ایک طرح کا شجرح والفتاب  
گ :- بالکل ۔

میں :- تو گویا آفتاب باصرہ نہیں باصرہ کا باعث اور منبع ہے جسے باصرہ جانتی  
اور مانتی ہے ۔

گ :- درست ۔

میں :- اسی کو میں خیر کا بچہ کہتا ہوں جسے خیر نے اپنے مشابہ پیدا کیا تاکہ علم  
مرئی میں اس کا تعلق باصرہ اور اشیا مشہود سے وہی ہو جو تعلق عالم ذہنی میں خیر  
کو ذہن اور اشیا ذہنیہ سے ہے ۔

گ :- کیا آپ براہ نوازش اسے ذرا اور صاف کریں گے ؟

میں :- کیوں ، تم یہ تو جانتے ہی ہو کہ اگر ایک شخص اپنی آنکھیں ایسی چیزوں کی  
طرف سے پھیرے جنہیں اون کی روشنی نہ پڑ رہی ہو بلکہ صرف چاند تاروں کی تواسکی  
آنکھیں دھندلا دھندلا دیکھیں گی اور تقریباً گور ہوں گی ، ان میں بصارت کی  
صفائی نہ ہوگی ۔

گ :- بہت صحیح ۔

میں :- لیکن جب ایسی چیزوں کی طرف پھیرا جائے جنہیں آفتاب چمک



رہا ہو تو پھر ان میں بصارت ہوگی اور وہ صاف صاف دیکھ سکیں گے۔  
گ۔ یقیناً۔

میں :- تو روح کی مثال بھی آنکھ کی سی ہے جب وہ ادھر دیکھتی ہے جہاں  
حقیقت وجود مطلق اپنی روشنی ڈال رہے ہیں تو وہ دیکھتی ہے اور سمجھتی ہے اور اپنے  
فہم سے طلعت یزہوتی ہے۔ لیکن جب اس کا رخ کون و فساد کے ٹھکھکے کی طرف  
ہوتا ہے تو پھر یہ محض ظن و رائے رکھتی ہے اور پھرتی ہے ادھر ادھر ٹاپک ٹوٹیاں  
مارتی، کبھی ایک رائے رکھتی ہے کبھی دوسری اور معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں کوئی فہم یہ  
گ۔ بالکل ہی حالت ہوتی ہے۔

میں :- ہاں تو یہ چیز جو معلوم کو صداقت اور عالم کو قوت علم عطا کرتی ہے یہ ہے  
وہ چیز جسے میں چاہتا ہوں کہ تم عین خیر کہو۔ یہی تمام حکمت کی علت ہے اور تمام صداقت  
کی بھی، جہاں تک صداقت علم کا موضوع بن سکتی ہے۔ اور یوں اگرچہ صداقت علم دونوں  
حسین جمیل ہیں، لیکن تم حق بجانب ہو گے اگر اس چیز کو ان دونوں سے حسین  
جمیل تر سمجھو، جس طرح گذشتہ بالا مثال میں دشمنی اور باصرہ کو بجا طور پر آفتاب  
سے مشابہ کہہ سکتے تھے، لیکن پھر بھی یہ آفتاب نہ تھیں، اسی طرح اس دوسرے حلقہ  
میں حکمت و صداقت کو بھی خیر سے مشابہ مان سکتے ہیں لیکن خود خیر نہیں خیر کا  
تخت اعزاز انہی بھی بلند تر ہے۔

گ۔ وہ چیز حسن و جمال کا کیسا حیرت کہہ ہوگی جو حکمت و صداقت کی موجودگی

پھر حسن میں اسے بڑھکر کیونکہ آپ کا یہ تو مطلب ہرگز نہ ہوگا کہ مسرت و حظ خیر ہی؟  
میں :- نفوذ باللہ۔ لیکن کیا میں آپ سے درخواست کر سکتا ہوں کہ اس

تصویر پر ایک اور نقطہ سے نظر ڈالیں۔

گ :- وہ کونسا نقطہ نظر ہی؟

میں :- آپ یہ تو کہیں گے نا کہ آفتاب نہ صرف تمام مرنی چیزوں کے نظام

ہی کا باعث ہے بلکہ تخلیق اور نشوونما کا بھی اگرچہ وہ خود (تخلیق) نہیں۔

گ :- بیشک۔

میں :- علیٰ ہذا القیاس خیر کے متعلق بھی کہا جاسکتا ہے کہ تمام معلوم چیزوں کو

علم ہی کا نہیں بلکہ ان کے وجود و صہلیت کا بھی باعث ہے۔ لیکن باوجود اسکے خیر خود

یہ صہلیت نہیں بلکہ اپنی شان و قوت میں اس صہلیت سے کہیں افضل ہے۔

گ :- (ایک مشخرا میں تقابہت سے) آسمان کی روشنی کی قسم! کیسی حیرت

انگیزا ہے ہیں!

میں :- ہاں ہاں۔ اور اگر کچھ مبالغہ ہی تو اس کا الزام تمہارے ذمہ ہے کہ

تم نے مجھے اپنے تخیلات بیان کرنے پر مجبور کیا۔

گ :- خدارا، ابھی بیان کیے جائیے۔ کم از کم اگر اس آفتاب والی تمثیل کے

متعلق کچھ کہنا باقی ہو تو اسے تو ضرور سنائیے۔

میں :- ہاں۔ ابھی تو بہت کچھ باقی ہے۔



گ :- تو پھر سر مو بھی حذف نہ کیجئے۔

میں :- میں اپنی سی کوشش کرونگا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بہت کچھ حذف کرنا

ہوگا۔

گ :- مجھے توقع ہے کہ ایسا نہ ہوگا۔

میں :- تو پھر تصور کرو کہ دو حکمراں طاقتیں ہیں ایک ذہنی دنیا پر مسلط ہے

ایک عالم مرئی پر۔ میں آسمان اس لیے نہیں کہتا کہ مبادا تم سمجھو کہ میں محض نام سے

کھیل رہا ہوں کیا میں سمجھ لوں کہ ذہنی اور مرئی کی یہ تفریق تمہارے ذہن میں اچھی

ظرح آگئی؟

گ :- جی ہاں۔ آگئی۔

میں :- اچھا اب ایک خط لوجو دو غیر مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان

دو حصوں کو پھر اسی نسبت سے تقسیم کرو۔ اور فرض کرو کہ اصلی دو تقسیمیں مرادف ہیں

ایک عالم مرئی اور دوسری عالم ذہنی کے، پھر ان مزید تقسیموں کا انکی وضاحت اور

عدم وضاحت کے اعتبار سے مقابلہ کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ عالم مرئی میں پہلا

جزو تصاویر پر مشتمل ہے۔ اور تصاویر سے میری مراد ہے اول تو سایہ سے اور دوسرے

ان عکسوں سے جو پانی یا منجمد سطح اور چکنی یا ایسی ہی اور چیزوں میں پڑتے ہیں۔

آپ سمجھ گئے؟

گ :- جی ہاں، سمجھ گیا۔

میں :- اب دوسرے جزو کا تصور کرو جسکی بعض مشابہت تھی۔ اس میں وہ جانور شامل ہیں جو ہم دیکھتے ہیں اور ہر وہ چیز جو قدرتا پیدا ہوتی ہے یا بنائی جاتی ہے۔  
گ :- بہت خوب۔

میں :- کیا تم تسلیم نہ کرو گے کہ اس تقسیم کے ہر وہ اجزاء میں سادگی کے مختلف درجے ہیں اور نقل کو اصل سے وہی نسبت ہے جو حلقہ آرا کو حلقہ علم سے۔  
گ :- بلاشبہ۔

میں :- اسکے بعد دیکھیے کہ اشیاء ذہنیہ کا حلقہ کس طرح منقسم ہونا چاہیے؟  
گ :- ہاں، کس طرح؟

میں :- اس طرح، اسکی دو فریدی میں ہیں۔ انیس سے اہل میں روح ان اشکال کا جو سابقہ تقسیم سے آتی ہے بطور تصاویر استعمال کرتی ہے تحقیق صرف فرضی ہو سکتی ہے، اور بجائے اسکے کسی اصول کی طرف اوپر چلے یہ دوسرے سرے کی طرف اترتی ہے۔ قسم اعلیٰ میں روح مفروضہ سے گذر کر ایک اصول کی طرف جاتی ہے جو مفروضہ سے بالاتر ہے پہلے کی طرح صو کا استعمال نہیں کرتی بلکہ خود اعیان میں سے اور اعیان ہی کے ذریعہ آگے بڑھتی ہے۔  
گ :- میں آپ کا مفہوم پوری طرح نہیں سمجھا۔

میں :- تو میں پھر کوشش کروں گا۔ میں اگر کچھ تمہیدی ابتدائی باتیں پہلے کہ دوں تو تم بہتر سمجھو گے۔ تم جانتے ہو کہ ہندسہ حساب اور دوسرے اسی قسم کے علوم کے طلباء اپنے علوم کی مختلف شاخوں میں طاق و جفت بعض اشکال تین



قسم کے زاویہ اور اسی قسم کی چیزیں فرض کر لیتے ہیں۔ یہ ان کے مفروضات ہیں جس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ خود اور ہر دوسرے شخص نہیں جانتا ہے۔ اس لیے ان کی تشریح کی تکلیف یہ نہ خود اپنے لیے گوارا کرتے ہیں نہ دوسروں کے لیے لیکن شروع نہیں سے کرتے ہیں اور آگے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ بالآخر درجہ بدرجہ یہ اپنے تئیں پتہ پہنچ جاتے ہیں۔

گ۔۔۔ جی ہاں، میں اس سے واقف ہوں۔

میں۔۔۔ اور کیا تم یہ بھی نہیں جانتے کہ اگرچہ یہ لوگ مرئی اشکال کا استعمال کرتے اور انھیں کے متعلق دلیلیں دیتے ہیں لیکن دراصل ان کے ذہن میں ان شکلوں کا خیال نہیں بلکہ ان ارسامات کا ہی جسنے یہ مشابہ ہیں۔ ان شکلوں کا نہیں جو یہ کھینچتے ہیں بلکہ مربع مطلق اور قطر مطلق کا اور علیٰ ہذا القیاس۔ جو شکلیں یہ کھینچتے یا بناتے ہیں اور جب کا خود بھی پانی میں سایہ اور عکس پڑتا ہے انھیں یہ لوگ تصویروں میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ لیکن دراصل متلاشی ہوتے ہیں۔ یہ اس چیز کوئی نفسہ دیکھنے کے اور اسے صرف چشم ذہن سے دیکھا جاسکتا ہے۔

گ۔۔۔ سچ ہے۔

میں۔۔۔ اسی قسم کو میں نے قابل فہم کہا تھا۔ اگرچہ اس کی جستجو میں روح کو مفروضات کا استعمال مجبورا کرنا پڑتا ہے، وہ کسی اصول اولیہ کی طرف صعد نہیں کرتی کیونکہ وہ عالم مفروضات سے بلند ہونے کی قابلیت نہیں رکھتی۔ ہاں ان چیزوں کو بطور صورت استعمال کرتی ہے جن کے سایے خود اپنی جگہ تشبیہیں ہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں اپنے سایہ اور عکس کے

مقابلہ میں زیادہ وضاحت اور لہذا زیادہ قدر رکھتی ہیں۔

گ۔ میں سمجھتا ہوں۔ آپ ہندسہ اور دیگر متعلق فنون کا ذکر کر رہے ہیں۔ میں۔ اور جب میں قابل فہم کی دوسری تقسیم کا ذکر کرونگا تو تم سمجھ لو گے کہ میں اس دوسری نوع علم کی طرف اشارہ کر رہا ہوں جو عقل خود منطبق کی قوت سے حاصل کرتی ہے۔ اور مفروضات کو بطور اصول اولیہ نہیں بلکہ محض بطور مفروضات استعمال کرتی ہے، یعنی بالفاظ دیگر ایک ایسی دنیا میں جو مفروضات سے بالاتر ہے بطور منزل و نشان کے تاکہ اپنے پرے کل کے اصول اول تک پروا نہ کر سکے اور پھر کبھی اس کے سہارے سے اور کبھی اس کے سہارے سے جو اس پر منحصر ہے درجہ بدرجہ و منزل بہ منزل یہ پھر کسی محسوس شے کی مدد کے بغیر آرتی ہے، اعیان سے اعیان میں ہوتے ہوئے پھر اعیان پر ہی اگر ختم کرتی ہے۔

گ۔ میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ بالکل تو نہیں کیونکہ آپ ایک ایسا کام بیان کر رہے ہیں جو حقیقتاً مجیر لعقول معلوم ہوتا ہے۔ تاہم میں یہ سمجھا کہ آپ کی رائے میں وہ علم وجود جو علم منطبق کا موضوع ہے ان فنون کے تصورات سے واضح تر ہوتے ہیں جو محض مفروضات پر اپنی بنیاد رکھتے ہیں۔ انہیں بھی عقل ہی دیکھتی ہے جو اس نہیں، تاہم چونکہ یہ ابتدا کرتے ہیں مفروضات سے اور کسی اصول تک صعو د کرتے نہیں اس لیے ان کے دیکھنے والے آپ کے نزدیک ان پر عقل اعلیٰ کا استعمال نہیں کرتے۔ اگرچہ جب ان کے ساتھ ایک اصول اولیہ کا اضافہ کر دیا جائے



تو یہ عقل اعلیٰ کے لیے معروف ہو جاتے ہیں اور جو عادت ہندسہ اور متعلق علوم سے وابستہ ہو اسے غالباً آپ فہم کہیں گے نہ کہ عقل اور گویا پیرائے اور عقل کے بین بین ہوگی۔

میں :- تم میرا مفہوم بالکل سمجھ گئے۔ اب ضرورت ہے کہ ان چار تقسیموں کے مطابق روح میں چار صلاحیتیں یا قوتیں ہوں۔ اعلیٰ ترین کی مراد فہم، دوسری کا فہم، تیسری کا عقیدہ اور آخری کے مراد فہم سایوں کا ادراک۔ اور ان کا ایک پیمانہ ہونا چاہیے۔ اوہم یہ فرض کر لیں کہ مختلف صلاحیتوں میں اسی درجہ کی وضاحت ہوتی ہے جتنی کہ ان کے موضوع میں صداقت ہو۔

گ :- میں سمجھ گیا۔ اور میں اس سے اتفاق کرتا اور آپ کی ترتیب کو تسلیم کرتا ہوں۔

# ساتویں کتاب

ہیں :- اچھا اب میں آپ کو ایک تشیل دیکر بتلاؤں کہ ہماری طبائع کس حد تک روشن ہیں اور کہاں تک غیر روشن :- دیکھو ! انسانوں کو ایک زمین دوز غار میں رہتا ہوا خیال کرو جس کا منہ روشنی کی طرف ہے اور روشنی غار کے ایک سرے سے دوسرے تک پہنچتی ہے۔ یہ لوگ اس میں بچپن سے ہیں، ان کے پیر اور گردنیں بخیر و بے جگڑی ہیں تاکہ یہ ہل جھل نہ سکیں اور چونکہ زنجیروں کی وجہ سے سر نہیں پھیر سکتے اس لئے یہ صرف اپنے سامنے ہی دیکھ سکتے ہیں۔ ان کے اوپر پشت کی طرف کچھ فاصلہ پر ایک آگ دہک رہی ہے اس آگ اور ان زندانیوں کے درمیان ایک مرتفع راستہ ہے، اور اگر تم ذرا دھیان سے دیکھو تو اس راستہ کے برابر ایک نیچی سی دیوار بنی ہوئی دکھائی دے گی جس طرح بازی گر اپنے سامنے ایک پر وہ سا بنا لیتے ہیں اور اس کے



اوپر کٹھ پتلیاں دکھلاتے ہیں۔

گلاکن :- جی، میں نے دیکھا۔

میں :- اور تم اس دیوار پر یہ بھی دیکھتے ہو کہ لوگ ادھر سے ادھر گزر رہے ہیں، ان کے ہاتھوں میں طرح طرح کے برتن، محسے، اور جانوروں کی شکلیں ہیں، بعض لکڑی کے بعض پتھر کے اور دوسری مختلف چیزوں کے ان لوگوں میں سے بعض باتیں کر رہے ہیں اور بعض خاموش ہیں۔

گلاکن :- آپ نے تو مجھے عجیب تصویر دکھائی اور یہ قیدی بھی عجیب ہیں

میں :- ہمیں جیسے ہیں۔ اور یہ بس خود اپنا یا ایک دوسرے کا

کاسایہ دیکھتے ہیں جو آگ سے غار کی مقابل دیوار پر پڑتا ہے۔

گلاکن :- سچ ہے۔ جب انہیں سر ہی ہلانے کی اجازت نہیں تو

پھر یہ سوائے سایہ کے اور کچھ کیسے دیکھ سکتے ہیں۔

میں :- اور ہاتھوں میں جو دوسری چیزیں ہیں ان کا بھی بس

اسی طرح سایہ ہی دیکھیں گے۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- اور اگر یہ ایک دوسرے سے بات چیت کر سکیں تو کیا یہ

نہ سمجھیں گے کہ یہ ان چیزوں کے نام لے رہے ہیں جو واقعتاً ان کے

زور رہیں؟

گ۔ بالکل درست۔

میں۔ اچھا یہ اور فرض کرو کہ اس زنداں میں دوسری جانب سے ایک آواز بازگشت آتی۔ تو اگر کوئی باہر کا گزرنے والا کچھ کہتا تو کیا یہ یقیناً یہ نہ خیال کرتے کہ یہ آواز اس کے متحرک سایہ سے آ رہی ہے۔

گ۔ بلاشبہ۔

میں۔ ان لوگوں کے لئے صداقت بس حرفاً حرفاً ان صو کے سایہ سے عبارت ہوگی۔

گ۔ یقینی بات ہے۔

میں۔ اچھا اب ذرا یہ دیکھو کہ اگر ان قیدیوں کو رہا کر دیا جائے اور ان کی یہ غلط فہمی رفع ہو جائے تو اس کا فطری نتیجہ کیا ہوگا۔ ان میں سے کسی کو آزاد کر کے جب ایک دم کھڑے ہو کر گردن پھیرنے، ذرا چلنے اور روشنی کی طرف دیکھنے پر مجبور کیا جائے گا تو پہلے پہل تو اسے نہایت شدید کرب محسوس ہوگا۔ روشنی کی چمک اسے اذیت پہنچائے گی اور وہ ان حقایق کو دیکھنے کے قابل نہ ہوگا جن کا اپنی سابقہ حالت میں وہ سایہ دیکھتا تھا۔ اب تصور کرو کہ کوئی شخص اس سے کہتا ہے کہ اس نے پہلے جو کچھ دیکھا سب خیالی دھوکہ تھا۔ البتہ اب کہ وہ وجود الی صلی



سے قریب تر ہو رہا ہے اور اس کی آنکھیں زیادہ حقیقی وجود کی طرف  
 مڑی ہیں، اس کا نظارہ پہلے سے واضح تر ہے۔ تو وہ اس کا کیا جواب  
 دینگا؟۔ پھر فرض کرو کہ جیسے جیسے مختلف چیزیں اس کے سامنے سے  
 گذرتی ہیں اس کا معلم اس سے ان کے نام لوانا چاہے تو کیا یہ مبہوط  
 نہ ہو جائیگا کیا یہ غریب یہ نہ سمجھے گا کہ جو سایے یہ پہلے دیکھتا تھا وہ ان  
 چیزوں سے زیادہ حقیقی تھے جو اب اسے دکھانی جا رہی ہیں۔

گ۔ جی ہاں۔ کہیں زیادہ حقیقی جانے گا۔

میں۔ اور اگر اسے مجبور کیا جائے کہ بالکل سیدھے روشنی کی طرف  
 دیکھے تو اس کی آنکھوں میں کیسی تکلیف ہوگی اور کیا یہ ان چیزوں کی طرف  
 منہ موڑ کر پناہ نہ لینا چاہیگا۔ جنہیں یہ دیکھ سکتا ہے اور جو اسکے خیال میں  
 دراصل ان چیزوں سے واضح تر ہیں جو اسے دکھانی جا رہی ہیں۔

گ۔ درست۔

میں۔ اور آگے فرض کرو کہ اسے ایک دشوار گزار سیدھی چڑھائی  
 پر بادل ناخواسہ گھسیٹ لے گئے اور اس وقت تک اسے خوب مضبوط پکڑو  
 رہے کہ یہ خود آفتاب کے حضور میں مجبوراً پیش ہو گیا تو کیا اس کا درد  
 محسوس کرنا اور اس پر چڑچڑانا قرین قیاس نہیں؟ یہ جب روشنی کی طرف  
 بڑھیگا تو اس کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی اور جنہیں ہم حقایق کہہ رہے ہیں

یہ ان میں کسی کو نہ دیکھ سکے گا۔

گ۔ ہاں یکایک کیسے دیکھ سکے گا؟

میں۔ یہ اس عالم بالا کے نظارے کا ہوتے ہوئے ہی عادی ہوگا  
 پہلے تو یہ سایہ کو سب سے اچھی طرح دیکھ سکے گا۔ پھر پانی میں آدمیوں  
 اور دوسری چیزوں کے عکس کو اور پھر کہیں خود اصلی چیزوں کو۔ اب یہ چاند  
 اور تاروں اور روشن آسمان کی روشنی کی طرف نظر کرے گا۔ دن میں سورج  
 اور اس کی روشنی کے نسبت یہ رات میں آسمان اور تاروں کو بہتر  
 دیکھ سکے گا۔

گ۔ یقیناً۔

میں۔ سب سے آخر میں یہ آفتاب کو دیکھ سکے گا۔ نہ صرف پانی  
 میں اس کے عکس کو یا کسی اور جگہ بلکہ خود اس کی اپنی مخصوص جگہ پر اور  
 یہ اب آفتاب کا کما ہی نظارہ کریگا۔

گ۔ یقیناً

میں۔ اب یہ لگی گائیوں دلیل کرنے کہ یہی آفتاب موسم اور سال کا  
 باعث ہے، یہی تمام ان چیزوں کا محافظ ہے۔ جو عالم مرفی میں ہے اور ایک معنی کہ  
 یہی ان تمام اشیاء کی علت ہے جنہیں یہ اور اسکے ساتھی دیکھنے کے عادی ہیں  
 گ۔ جی ہاں۔ صاف ہے، پہلے یہ آفتاب کو دیکھے گا۔ اور پھر اس کے



مفہوم غلط نہیں سمجھا۔ یہ میرا عقیدہ ہے جو تمہاری خواہش پر میں نے ظاہر کر دیا  
 صحیح یا غلط خدا جانتا ہے۔ لیکن سچ ہو یا جھوٹ میری رائے یہ ہے کہ علم کی دنیا  
 میں خیر کا تصور سب سے آخر میں آتا ہے اور پھر بھی بڑی کوشش سے  
 دکھائی دیتا ہے۔ ہاں جب دکھائی دیکھاتا ہے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام  
 حسین اور صحیح چیزوں کا باعث، اور اس عالم مرئی میں سلطان نور و نوروں  
 کا پروردگار اور عالم ذہنی میں عقل و صداقت کا بلا واسطہ منبع، اور پتہ چلنا  
 ہے کہ جو کوئی شخصی یا اجتماعی زندگی میں عقل کے مطابق عامل ہونا چاہے  
 اسے اپنی نگاہ اسی پر قائم رکھنی چاہئے۔

گ۔ جہاں تک میں آپ کا مفہوم سمجھ سکتا ہوں میں آپ سے متفق ہوں  
 میں۔ نیز تمہیں اس پر تعجب نہ کرنا چاہئے کہ جو لوگ اس مسعود منظر  
 کو جاہل کر لیتے ہیں وہ معاملات انسانی کی لپٹی پر نہیں اترنا چاہتے انکی رویا  
 تو عالم بالا کی طرف بجلت راہ پیمایاں اور وہیں قیام کرنا چاہتی ہیں۔ اور اگر  
 ہماری تمثیل قابل اعتماد ہو تو انکی یہ خواہش بالکل قدرتی ہے۔  
 گ۔ جی۔ بالکل قدرتی۔

میں۔ اور کیا اس میں کوئی حیرت کی بات ہے کہ ایک شخص جو انکار الہی  
 سے گذر کر انسان کی حالت سیئہ پر اتر آتا ہے۔ اس سے یہاں نہایت مضحک  
 اعمال سرزد ہوتے ہیں۔ مثلاً ابھی کہ اس کی آنکھیں چمپا رہی ہیں اور وہ

ابھی اپنے ماحول کی تاریکی کا عادی نہیں ہوا ہے اسے قانونی عدالتوں میں مقدمہ بازی کرنا پانا اور کہیں عدل کے شکل ظاہری یا خود اس شکل کے سایہ کے متعلق لڑنا پڑے اور وہ ان لوگوں کے تصور کی مطابقت کرنا چاہے جنہوں نے کبھی عدل مطلق کی شکل ہی نہیں دیکھی۔

گ: اس میں حیرت کی کونسی بات ہے۔

میں: ہر شخص جس میں معمولی سمجھ ہے جانتا ہو گا کہ آنکھ کی حیرت اور پریشانی دو قسم کی اور دو وجوہ سے ہوتی ہے۔ یعنی یا تو روشنی میں سے نکلنے سے یا روشنی میں داخل ہونے سے۔ اور یہ حقیقت بصیرت ذہنی پر بھی ویسے ہی عاید ہوتی ہے جیسے جسمانی ہے۔ جو شخص اس بات کو پیش نظر رکھتا ہے وہ جب کسی کو دیکھے گا کہ اس کی نظر کمزور اور پر اگندہ ہے تو اس پر فوراً ہنس نہ دیکھا بلکہ وہ یہ دریافت کرے گا کہ آیا اس انسان کی روح روشن تر زندگی سے یہی تاریکی میں آئی ہے جس کی وہ عادی نہیں یا تاریکی سے روز روشن کی طرف رخ کرنے پر فراوانی لٹورنے سے خیرہ کر دیا ہے۔ ایک کی حالت پر اسے خوشی ہوگی اور دوسرے پر افسوس۔ اور اسے اگر ہنسنا ہی ہے تو اس روح پر اس کی ہنسی زیادہ قرین عقل ہوگی جو تاریکی سے روشنی میں آئی ہے بہ نسبت اس کے جو نور کی بلندی سے قعر تاریکی میں واپس آئی ہے۔

گ: یہی یہ بالکل بجا تفریق ہے۔



میں :- لیکن اگر میرا خیال درست ہو تو پھر بعض ان فاضل معلمین کا یہ خیال غلط ہونا چاہئے کہ جیسے کوئی کورا آنکھ میں روشنی داخل کرے یہ روح میں وہ علم ٹھونس سکتے ہیں جو اس میں پہلے سے موجود نہ تھا۔  
گ :- ہاں۔ یہ کہتے تو بیشک ہیں۔

میں :- حالانکہ ہماری دلیل یہ بتلاتی ہے کہ سیکھنے کی قوت اور صلاحیت روح میں پہلے سے موجود ہوتی ہے اور جس طرح آنکھ تاریکی سے روشنی کی طرف بلا پورے جسم کے مڑے ہوئے اپنا رخ نہیں کر سکتی اسی طرح انسان کا آلہ علم بھی کل روح کی حرکت سے ہی شہود سے وجود کی طرف پھر سکتا اور رفتہ رفتہ وجود، اور وجود میں روشن ترین اور بہترین وجود یعنی بالفاظ دیگر اخیر کے نظارہ کی تاب لا سکتا ہے۔

گ :- بہت درست۔

میں :- اور کیا کوئی ایسا فن نہ ہونا چاہئے جو اس تبدیلی کو سہل تر اور زود تر طریقہ سے عمل میں لے آئے اس فن کے لئے یہ کام نہیں کہ یہ قوت بصر پیدا کرے کیونکہ یہ تو پہلے سے موجود ہی ہے البتہ اس کا رخ غلط سمت میں ہے اور وہ صداقت سے بعید تر جانب دیکھ رہی ہے۔

گ :- جی ہاں۔ ایسے فن کا وجود فرض کیا جاسکتا ہے۔

میں :- اور ہر چند دیگر محاسن روح صفات جسمانی سے ملتے جلتے ہیں کہ

اگر اصلاً فطرت میں مہمتر بھی نہ ہوں تو بعد کو عادت اور مشق سے پیدا کئے جاسکتے ہیں  
 دانش و عرفان کی خوبی پر دوسری چیز سے زیادہ اپنے اندر ایک الہی عنصر  
 رکھتی ہو جو ہمیشہ باقی رہتا ہو اور جو اس تبدیلی سے مفید اور سود مند ہو جاتا  
 ورنہ بحالت دیگر بیکار اور ضرر رساں رہتا ہو کیا تھے کبھی کسی چالاک بد معاش  
 کی تیز آنکھوں میں کوتاہ بین ذہانت کی چمک نہیں دیکھی۔ وہ کیسا منحس ہوتا  
 ہے اور اس کی چھوٹی روح کس صفائی سے اپنے مقصد کی راہ دیکھ لیتی ہے،  
 وہ اندھا نہیں اندھے کی تو ضد ہو۔ ہاں اس کی تیز قوت نظر شرکی خدمت  
 میں لگی ہوتی ہو۔ اور جتنا چالاک ہو اسی نسبت سے شریر ہے۔

گ: بہت درست۔

میں: لیکن اگر نوعمری ہی میں ان طبائع کی قطع و برید ہو جاتی اور انہیں اکل  
 و شرب جیسی لذات شہوانی سے علیحدہ کر لیا جاتا جو پیدا ہونے کے ساتھ ہی  
 ان کی گردن میں سیسہ کے بوتھوں کی طرح باندھ دی گئیں اور جو انہیں ہمیشہ  
 اسفل کی طرف کھینچتی اور انکی نظر کو نیچے کی چیزوں کی طرف پھیرتی ہیں ہاں  
 تو اگر ان موانع سے آزاد کر کے ان کا رخ مخالف سمت میں کر دیا جاتا تو ان کی  
 یہی صلاحیت صداقت کو بھی اسی تیزی سے دیکھتی جس طرح اب ان چیزوں  
 کو دیکھتی ہے جنکی طرف انکا رخ ہو۔

گ: بہت ممکن ہے۔



میں :- ہاں اور ایک بات اور بھی انقلب ہو، بلکہ یوں کہتے کہ گفتگوئے  
 ماسبق سے لازماً مستخرج ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ نہ تو غیر تعلیم یافتہ اور صداقت  
 سے بے خبر ہماری ریاست کے قابل وزیر ہو سکتے ہیں اور نہ وہ جو اپنی تعلیم  
 کو ختم ہی نہیں کرتے اول الذکر تو اسلئے نہیں کہ یہ اپنے فرض کا کوئی مقصد حید  
 نہیں رکھتے جو ان کے تمام اعمال شخصی و اجتماعی کا دستور ہو اور موخر الذکر اس  
 وجہ سے نہیں کہ یہ سوائے جبر کے اور کسی طرح کام ہی نہ کریں گے اور یہ  
 خیال کرتے رہیں گے کہ وہ ابھی سے متبرکین کے علیحدہ جزیرہ میں مقیم ہیں۔  
 گ :- بہت صحیح۔

میں :- چنانچہ ہمارا کام رکھ ہم اس ریاست کے باقی ہیں، یہ ہے کہ بہترین  
 دماغوں کو اس علم کے حصول پر مجبور کریں جسے ہم نے ابھی ابھی اعلیٰ ترین علم  
 ظاہر کیا ہے، یہ اپنی چڑھائی اور پرواز یہاں تک جاری رکھیں کہ خیر، تک پہنچ  
 جائیں۔ لیکن جب اس بلندی پر چڑھ جائیں اور کافی دیکھ چکیں تو ہم انہیں  
 وہ نہ کرنے دیں جو یہ آج کل کرتے ہیں۔

گ :- آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں :- یعنی یہ لوگ اسی عالم بالا میں رہ جاتے ہیں۔ اس کی اجازت  
 نہ ہونی چاہئے۔ انہیں پھر غار کے قیدیوں میں اتارنا چاہئے اور انہیں پھر  
 ان کی مشقتوں اور ان کے انعاموں میں حصہ لینا چاہئے خواہ یہ لینے کے

قابل ہوں یا نہیں۔

گ: مگر کیا یہ بے انصافی نہیں؟ جب یہ بہتر زندگی گزار سکتے ہیں تو کیا ہیں انکو ایک بدتر زندگی دینا چاہئے؟

میں: میرے دوست۔ تم پھر وضع قانون کا مقصد بھول گئے ہیں گا مقصد ریاست میں کسی ایک طبقہ کو دوسروں سے زیادہ خوشحال بنانا نہ تھا۔ اسے خوشحالی و کار تھی ساری ریاست کی۔ اس نے شہریوں کو ترغیب اور ضرورت کے زور سے یکجا رکھا، انہیں ریاست کا محسن اور اس طرح گویا ایک دوسرے کا محسن بنایا اور اس غرض سے انہیں پیدا کیا، اس لئے نہیں کہ اپنے کو خوش کریں بلکہ ریاست کے بندھن باندھنے کا آلہ ہوں۔

گ: درست ہے میں بھول گیا تھا۔

میں: گلاکن، اوسر دیکھو۔ ہم اگر اپنے فلسفیوں کو دوسروں کی نگرانی اور پرورش پر مجبور کریں تو اس میں کوئی بے انصافی نہ ہوگی ہم انہیں سمجھا دیں گے کہ دوسری ریاستوں میں ان کے طبقہ کے لوگ مساعی میاں سید میں حصہ لینے پر مجبور نہیں ہوتے۔ اور یہ بات معقول بھی ہے، کیونکہ یہ لوگ خود من مانی مرضی سے پیدا ہوتے ہیں بلکہ ریاست تو ان کے نہ ہونے کو شاید زیادہ پسند کرتی چونکہ یہ اپنی تعلیم آپ کرتے ہیں اس لئے ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ اس تعلیم کے لئے اظہار تشکر و احسان مندی کریں جو انہیں کبھی ملی ہی نہیں لیکن



تمہیں ہمنے دنیا میں اس چھتے کے حکمران بننے کے لئے پیدا کیا ہے، یعنی خود  
 اپنے باوشاہ ہونے کے لئے اور نیز اور شہریوں کے۔ ان سے کہیں بہتر اور  
 کامل تر تعلیم ہمنے تمہیں دی ہے اور تم اتنے زیادہ اس دو گونہ فرض میں حصہ  
 لینے کے لائق ہو۔ اس لئے تم میں سے ہر ایک کو چاہئے کہ جب اس کی باری  
 آئے تو وہ عام زمین و وز مسکن میں نیچے جائے اور تباہی میں دیکھنے کی عادت  
 ڈالے جب تم یہ عادت ڈال لو گے تو تم ساکنان غار سے دس ہزار گنا بہتر  
 دیکھ سکو گے۔ تم جانو گے کہ یہ مختلف صورتیں کیا ہیں اور کاپیلی نمائندگی کرتی  
 ہیں کیونکہ تم نے حسن، عدل اور خیر کو انکی سچی صورت میں دیکھا ہے۔ اس طرح  
 ہماری ریاست، جو تمہاری ریاست بھی ہے، ایک حقیقت ہوگی نہ کہ محض ایک  
 خواب، اور اس کا انتظام ان دوسری ریاستوں سے بالکل جداگانہ انداز  
 پر ہوگا جن میں انسان محض سایوں کے متعلق ایک دوسرے سے لڑتے  
 اور طاقت و اقتدار کی کشمکش میں جو ان کی نظر میں ایک خیر عظیم ہے اپنے  
 کو منتشر اور پرانگندہ رکھتے ہیں۔ حالانکہ سچ یہ ہے کہ جس ریاست کے حکام حکومت  
 سے سب سے زیادہ بچنا چاہیں اسی پر سب سے عمدہ اور خاموشی کے ساتھ  
 حکومت ہوتی ہے اور جس میں حکام حکومت کرنے کے سب سے زیادہ مشتاق  
 ہوتے ہیں اسی کی حکومت بدترین ہوتی ہے۔

گ۔ بالکل بجا۔

میں :- تو کیا ہمارے شاگرد یہ سننے کے بعد بھی اپنی باری پر اصرار میں  
 صکو مت میں حصہ لینے سے انکار کریں گے درآخالیکہ انہیں اس  
 امر کی اجازت ہو کہ اپنے وقت کا پڑا حصہ باہم آسانی اور میں گذاریں۔  
 گونا گونا گوں ہو۔ یہ منصف لوگ ہیں اور ان پر جو احکام عاید کر رہے ہیں  
 وہ بنی برانصاف ہیں۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ یہ لوگ اپنے عہدہ کو اس طرح نہ  
 لیں گے جیسے ہمارے موجودہ حکام بلکہ اسے ایک ناکریر ضرورت سمجھیں گے۔  
 میں :- ہاں میرے دوست یہی تو اصل نکتہ ہے۔ تمہیں اپنے آئندہ حکام کے لئے  
 محض ایک حاکم سے مختلف اور بہتر زندگی فراہم کرنی چاہئے اور بس پھر تمہاری بایست میں  
 عمدہ نظام ہو سکتا ہے۔ کیونکہ صرف اس بایست میں جو یہ زندگی پیش کرتی ہے صحیح معنوں میں  
 دولت مند لوگ حکومت کر سکتے وہ نہیں جو سیم و زر رکھتے ہیں بلکہ وہ جو خوبی و عرفان کی دولت  
 سے مالا مال ہیں کہ اپنی زندگی کی سچی نعمتیں ہیں۔ برخلاف اسکے اگر یہ لوگ امو عامہ کے نظام  
 میں مفلس اور اپنے خانگی فوائد کے لیے بھوکے مشغول ہوئے اور لہذا سمجھتے رہے کہ انہیں خود  
 اصلی خوبی چھپٹ لینا چاہئے تو پھر نظم ہرگز باقی نہیں رہ سکتا۔ اس لیے کہ یہ لوگ اپنے عہدہ  
 اور منصب کے متعلق اڑتے رہیں گے اور جو خانگی و شہری قضیے اس سے پیدا ہونگے وہ خود ان  
 حکام کو تیز ساری بایست کو تباہ و برباد کر دیں گے۔

گ :- بالکل صحیح۔

میں :- اور وہ واحد زندگی جو سیاسی جوصلہ مندی اور ہوس کو بہ نظر حقارت دیکھتی ہو



فلسفیانہ زندگی ہی کیا تم کوئی اور ایسی زندگی جانتے ہو؟

گ :- واقعات میں نہیں جانتا۔

میں :- اور حکومت کرنیوالوں کو اس شغل حکومت سے مجتنب ہونی چاہئے، کیونکہ اگر یہ

اسکے عاشق ہوئے تو دوسرے رقیب عشاق بھی ہوں گے اور یہ پھر آپس میں لڑیں گے۔

گ :- بلاشبہ۔

میں :- تو پھر وہ کون لوگ ہیں جنہیں ہم محافظ بننے پر مجبور کریں؟ یقیناً

یہ وہی لوگ ہوں گے جو امور مملکت میں سب سے عقلمند اور انتظام ریاست

میں بہترین ہوں اور ساتھ ہی ساتھ یہ دوسرے اعزاز بھی رکھتے ہوں اور

ایک دوسری زندگی جو سیاسی زندگی سے بہتر ہو۔

گ :- بس یہی لوگ ہیں، اور میں انہیں کو منتخب کرونگا۔

میں :- اب کیا اس مسئلہ پر غور کریں کہ ایسے محافظ آخر پیدا کیسے ہونگے

اور انہیں تاریکی سے روشنی میں کیسے لایا جائیگا جیسے بیان کیا جاتا ہے کہ بعض

لوگ عالم اسفل سے دیوتاؤں کے پاس تک چاہو نچے ہیں۔

گ :- ضرور۔

میں :- یہ طریقہ، یہ عمل ایک محار کے گھونکے کا چت یا پٹ پٹ جانا

نہیں بلکہ ایک روح کا رخ بد بنا ہی جو ایک ایسے دن سے جو راست سے مشکل

بہتر تھا اب وجود کے اصلی روز روشن میں آرہی ہے یعنی اسفل سے اعلیٰ کی طرف

پرواز کر رہی ہو اور یہی ہمارے دعویٰ کے مطابق سچا فلسفہ ہے۔

گ :- بجا ہے

میں :- اور کیا اب ہم یہ دریافت نہ کریں کہ ایسا تشریح پیدا کرنے کی طاقت

کس علم میں ہے۔

گ :- یقیناً۔

میں :- وہ کس قسم کا علم ہے جو روح کو شہود سے وجود حقیقی کی طرف

کہنچے گا؟ اور ابھی ابھی ایک اور بات کا خیال آیا۔ تمہیں یاد ہو گا کہ ہمارے

نوجوان جنگی پہلوان بھی ہونے چاہتے ہیں۔

گ :- جی ہاں۔ یہ تو کہا جا چکا ہے۔

میں :- تو اس نئے قسم کے علم میں ایک اور اضافی صفت بھی ہونی چاہئے

گ :- یہ کون سی صفت؟

میں :- جنگ میں مفید اور کارآمد ہونا۔

گ :- ہاں۔ اگر ممکن ہو۔

میں :- ہماری سابقہ تجویز تعلیم میں دو حصے تھے نا؟

گ :- جی ہاں۔

میں :- ایک ورزش تھی جو جسمانی نشوونما کی نگرانی تھی، لہذا

اسے تخلیق و تخریب سے متعلق سمجھنا چاہئے؟



گ :- بجا۔

میں :- تو پھر تو وہ علم نہیں ہے جس کے اکتشاف کے ہم متلاشی ہیں!

گ :- نہیں

میں :- لیکن موسیقی کے متعلق کیا کہتے ہو کہ یہ بھی ایک حد تک ہماری

سابقہ تجویز میں شامل تھی؟

گ :- آپ کو یاد ہو گا کہ موسیقی ورزش کا مقابل حصہ تھی اور عادت کے اثر سے محافظین کی تربیت کرتی تھی، یعنی اپنے تناسب سے انہیں تناسب اور اپنے وزن سے انہیں توازن۔ لیکن یہ ان کے لئے حکمت فراہم نہیں کرتی تھی اور اس کے الفاظ میں خواہ یہ محض فسانہ ہوں یا ممکن ہے سچ ہوں تناسب و توازن کے عناصر شامل ہوتے تھے۔ لیکن موسیقی میں ایسی کوئی چیز نہ تھی جو اس خیرگی طرف راجع ہو جس کی اب آپ کو تلاش ہے۔

میں :- تمہاری یادداشت بہت صحیح ہے۔ موسیقی میں بیشک اس قسم کی کوئی چیز نہ تھی۔ لیکن عزیزم گلاکن! آخر یہ مطلوب صفت علم کی کس شاخ میں ہو سکتی ہے؟ ہم نے تمام مفید فنون کو تو ذلیل ہی قرار دے دیا۔

گ :- بیشک۔ اگر ورزش اور موسیقی کو نکال دیکھئے اور پھر فنون کو بھی خارج

کر دیکھئے، تو باقی کیا رہ جاتا ہے؟

میں :- ہاں، ممکن ہے ہمارے مخصوص مضامین میں کچھ باقی نہ رہے اور

پھر ہمیں کوئی ایسی چیز یعنی ہو جو کسی خاص چیز پر نہیں بلکہ عالمگیر طور پر ناپید ہوتی ہو۔

گ :- ایسی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔

میں :- یہ وہ چیز ہوگی جسے تمام علوم، فنون اور عقول مشترک طور پر استعمال کرتی ہیں اور جو ہر شخص کو مبادی تعلیم میں سیکھنا پڑتی ہے۔

گ :- وہ کیا؟

میں :- یہ چھوٹی سی بات یعنی ایک اور تین میں تمیز کرنا یعنی مختصر گنتی اور حساب۔ کیا تمام علوم اور فنون لازماً انہیں استعمال نہیں کرتے۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- رفن جنگ بھی استعمال کرتا ہے؟

گ :- یقیناً۔

میں :- پالا میدا یس ہمیشہ جب بھی وہ المناک ٹانگ میں رونسا ہوتا ہے تو اگا منان کو سپہ سالاری کے لئے کس درجہ مضحکہ خیز طور پر ناقابل ثابت کرتا ہے۔ کیا تم نے کبھی اس بات پر دھیان نہیں کیا کہ وہ کس طرح اعلان کرتا ہے کہ عدد اس نے ایجاد کئے جہازوں کو گنا اور ٹراٹی میں فوج کو صف بستہ کیا؟ جس سے یہ مفہوم ہے کہ اس سے پہلے کبھی انہیں گنا نہ گیا تھا اگا منان کے متعلق سمجھنا چاہئے کہ وہ اپنے پاؤں تک گننے سے قاصر تھا۔ اور جب عدد



سے ہی ناواقف ہو تو آخر گئے کیسے؟ اگر یہ سچ ہے تو وہ کیسا سپہ سالار رہا ہوگا؟  
گ:۔ اگر واقعہ آپ کے بیان کے مطابق تھا تو میں کہوں گا کہ عجیب و غریب  
سپہ سالار تھا۔

میں:۔ کیا ہم اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ ایک جنگ آزما سپاہی کو  
حساب کا علم ہونا چاہئے؟  
گ:۔ یقیناً اگر یہ فوجی چالوں کو ذرا بھی سمجھنا چاہتا ہو، میں تو کہوں گا  
کہ اگر مطلقاً آدمی ہی ہونا چاہتا ہو تو اسے ضروریہ علم ہونا چاہئے۔  
میں:۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا اس علم کے متعلق تمہارا  
بھی وہی خیال ہے جو میرا ہے؟  
گ:۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

میں:۔ مجھے تو یہ اس قسم کا علم معلوم ہوتا ہے جس کے ہم متلاشی ہیں۔  
اور جو قدرتا مائل و تفکر کی طرف لیجاتا ہے۔ لیکن اسے کبھی صحیح طور پر استعمال نہیں  
کیا گیا، کیونکہ اسکا صحیح استعمال تو بس روح کو وجود کی طرف کھینچنا ہے۔

گ:۔ کیا آپ ذرا اپنے مفہوم کی توضیح فرمائیں گے؟  
میں:۔ کوشش کرونگا، اور چاہتا ہوں کہ تم بھی اس تحقیق میں میرے  
شریک ہو اور جب میں اپنے ذہن میں علم کی ان شاخوں کو مینر کرنا چاہوں،  
جن میں یہ قوت جاذبہ موجود ہے تو تم ہاں، یا نہیں کہہ دینا۔ تاکہ ہم پر ذرا اور

وضاحت سے ثابت ہو جائے کہ آیا علم الحساب میرے گمان کے مطابق منجملہ  
ان علوم کے ہے یا نہیں۔

گ: بہت خوب فرمائیے۔

میں: میرا مطلب یہ ہے کہ اشیاء جس دو قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض تو  
فکر و خیال کو متوجہ نہیں کرتیں اس لئے کہ انکے بارہ میں جس کافی مناسب  
حکم جو برخلاف اس کے دوسری قسم کے اشیاء کے بارہ میں جو اس اس  
درجہ ناقابل اعتماد ہیں کہ مزید تحقیق بشدت مطلوب ہوتی ہے۔

گ: ظاہر ہے کہ آپ کا اشارہ اس طریقہ کی طرف ہے جس سے فاصلہ،  
جو اس پر اثر ڈالتا ہے یا روشنی و سایہ کی مصوری و رنگ آمیزی۔

میں: نہیں نہیں یہ مطلقاً میرا مفہوم نہیں۔

گ: تو پھر اور آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں: فکر و خیال کو متوجہ و مدعو کرنے والے چیزوں سے مراد ان سے  
ہے جو ایک جس سے دوسرے مخالف جس میں نہیں پہنچتے، اور متوجہ کرنے  
والے وہ ہیں جو پہنچتے ہیں۔ اس موخر الذکر صورت میں حاسہ جب کسی چیز  
پر عمل کرتا ہے تو سوائے اس کی ضد کے اور کسی خاص چیز کا واضح تصور پیدا  
نہیں کرتا۔ ایک تشیل سے میرے معنی زیادہ صاف ہو جائیں گے۔  
یہ دیکھو، تین انگلیاں ہیں۔ چھوٹی انگلی، دوسری اور تیسری کی انگلی۔



گ: بہت خوب۔

میں: فرض کرو کہ انہیں بالکل قریب سے دیکھا جا رہا ہے۔ اور اب صلی

نکتہ آتا ہے۔

گ: وہ کیا؟

میں: ان میں سے ہر ایک مساوی طور پر انگلی معلوم ہوتی ہے، خواہ

اسے بیچ میں دیکھو یا سرے پر، خواہ یہ سفید ہو یا سیاہ، موٹی ہو کہ تہلی۔ اس

سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ انگلی بہر حال انگلی ہی ہے۔ ایسی حالت میں انسان فکر و

خیال سے یہ سوال کرنے پر مجبور نہیں ہوتا کہ انگلی کیا چیز ہے؛ کیونکہ باصرہ کبھی

ذہن کو یہ نہیں بتاتی کہ انگلی علاوہ انگلی کے اور کچھ ہے۔

گ: درست۔

میں: چنانچہ ہمارے حسب توقع اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو سمجھ

کی دعوت یا تحریک کا باعث ہو۔

گ: بیشک نہیں ہے۔

میں: لیکن انگلیوں کی بڑائی اور چھوٹائی کے متعلق بھی کیا یہ بات ایسی

ہی صحیح ہے؟ کیا باصرہ انہیں کافی طور پر محسوس کر سکتی ہے اور کیا اس امر سے

کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایک انگلی بیچ میں ہے اور ایک سرے پر؟ اسی طرح کیا

لامہ موٹے یا پتلے پن کو کافی صحت کے ساتھ محسوس کر سکتی ہے یا سختی اور نرمی

کو۔ علیٰ ہذا القیاس دوسرے حواس بھی کیا ایسے امور میں کامل اطلاع بخشنے  
ہیں؟ کیا ان کا طریقہ عمل کچھ اس قسم کا نہیں کہ جو حس سختی کی صفت سے متعلق  
ہے وہی لازمی طور پر نرمی سے بھی تعلق رکھتی ہو اور روح کو بس یہ اطلاع پہنچاتی  
ہے کہ ایک ہی چیز سخت اور نرم دونوں محسوس ہوتی ہو۔  
گ:- آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں۔

میں:- اور کیا روح اس اطلاع پر پریشان نہ ہوتی ہوگی جو حواس ایک ایسی  
سخت چیز کے متعلق دیتا ہو جو نرم بھی ہو پھر اسی طرح دیکھو کہ ہلکے اور بھاری  
کے آخر کیا معنی ہیں جب ہر شے جو ہلکی ہو بھاری بھی ہو اور ہر بھاری چیز  
ہلکی بھی ہو۔

گ:- جی بیشک۔ یہ طلا عین جو روح کو پہنچتی ہیں کچھ عجیب غریب ہیں  
اور محتاج توضیح۔

میں:- ان چیدگیوں میں روح فطرتاً اپنی مدد کے لئے سمجھ اور حساب  
کو طلب کرتی ہوتا کہ یہ دیکھ سکے کہ یہ جو مختلف چیزیں اس کے سامنے پیش کی گئی  
ہیں ایک ہی ہیں یا دو۔

گ:- درست۔

میں:- اور اگر یہ دونوں نکلیں تو کیا ان میں سے ہر ایک خود ایک اور جداگانہ



گ: یقیناً۔

میں:۔ اور حیب ان میں سے ہر خود ایک ہو اور دونوں ملکر  
تو روح ان دو کو حالت تقسیم میں تصور کرے گی۔ کیونکہ اگر یہ غیر منقسم ہو  
تصویر ایک ہی کی حیثیت سے ہو سکتا۔

گ: درست۔

میں:۔ آنکھ نے بلاشبہ چھوٹے اور بڑے دونوں کو دیکھا تھا، بلکہ  
صرف ایک گنجلک طریقہ سے۔ یہ دونوں باہم گرامتاز نہ تھے۔

گ: جی۔

میں:۔ برخلاف اس کے ہاں گتھی کو سلجھانے کے لئے ذہن کو  
طریقہ عمل کو بالکل پٹ دینے پر مجبور ہوا اور اس نے چھوٹے اور بڑے  
حیثیت سے نہیں بلکہ جدا جدا نظر کی۔

گ: بہت صحیح۔

میں:۔ تو کیا یہ اس تحقیق کا آغاز نہ تھا کہ ”بڑا کیا ہے“ اور چھوٹا

گ: یقیناً۔

میں:۔ چنانچہ اس طرح مرنی اور مفہوم کی تفریق پیدا ہوئی

گ: بالکل درست۔

میں:۔ جب میں نے ان آثار کا ذکر کیا تھا جو عقل کو متوجہ کر

ان کا جو متوجہ نہیں کرتے تو اس سے میرا مفہوم یہ تھا۔ بن آثار کے ساتھ ساتھ انکی ضد بھی ہو وہ فکر کو متوجہ کرتے ہیں اور جنگی ساتھ نہ ہو وہ نہیں کرتے۔

گ:- میں سمجھ گیا اور آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔

میں:- اور وحدت اور عدد ان میں سے کس قسم میں آتے ہیں؟

گ:- میں نہیں جانتا۔

میں:- ذرا غور کرو تو معلوم ہو گا کہ سابقہ گفتگو سے اس کا جواب مل جاتا ہے

اسلئے کہ اگر ہم محض سادہ وحدت کو باصرہ یا کسی دوسری شے سے مشورس کر سکتے تو جیسا کہ ہم نگلی کے بارہ میں کہہ چکے ہیں اس میں بھی کوئی چیز وجود مطلق کی طرف

کھینچنے والی نہ ہوتی۔ لیکن جہاں ہمیشہ ایک ضد موجود ہو اور ایک ایک کا الٹا

بھی ہو اور وحدت میں کثرت کا تصور بھی مضمحل ہو تو پھر ہم میں فکر و خیال کو

تحریک ہوتی ہے اور پریشان روح فیصلہ پر پہنچنے کے لئے سوال کرتی ہے کہ

”وحدت مطلق کیا ہے؟ اس واسطے وحدت کے مطالعہ میں دماغ کو وجود مطلق

کے سوچنے کی طرف منعطف اور مائل کرنے کی قوت ہے۔“

گ:- اور یقیناً یہ بات وحدت کے معاملہ میں تو اور بھی خاص طور پر پائی

جاتی ہے۔ اس لئے کہ ایسی چیز کو ہم بطور وحدت بھی دیکھتے ہیں اور بطور کثرت

لاحد ولا بھسی۔

میں:- ہاں اور جب یہ وحدت کے متعلق ٹھیک ہے تو اور عدد کے



متعلق بھی ایسا ہی درست ہوگا؟

گ: یقیناً۔

میں: اور تمام علم الحساب اور شمار کو اعداد ہی سے واسطہ ہے؟

گ: جی ہاں۔

میں: اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذہن کو صداقت کی طرف لجاتے ہیں؟

گ: جی ہاں ایک بہت خاص انداز سے۔

میں: تو یہی اس قسم کا علم ہے جس کی ہمیں تلاش ہے، یعنی جس کا دوہرا

استعمال ہو، فوجی اور فلسفیانہ جنگی آدمی کو فن اعداد کو سیکھنا لازمی ہے ورنہ

وہ اپنی افواج کو صف بستہ کرنا نہ جانتیگا اور فلسفی کو بھی ضروری ہے کہ یہ تغیر کے

بحر سیکراں سے نکل کر وجود حقیقی کو پانا چاہتا ہے۔ چنانچہ اسے بھی حساب و اہل ہونا

چاہئے۔

گ: بجائے۔

میں: اور ہمارا محافظ سپاہی بھی ہے اور فلسفی بھی؟

گ: یقیناً۔

میں: لہذا یہ ایسا علم ہے جسے وضعین قانون بجا طور پر لازم قرار دے سکتے

ہیں۔ اور ہمیں اپنی ریاست کے خالصان مستقبل کو رغبت دلانی چاہئے کہ وہ

علم الحساب کو محض شوقیہ بتدیوں کی طرح نہ دیکھیں بلکہ اس وقت تک اس کا

مطالعہ جاری رکھیں جب تک صرف ذہن سے وہ باہمت ایڈکونڈ ویکے  
 لیں، اسی طرح اس کا مطالعہ تاجروں اور خوردہ فروشوں کی طرح خرید و فروخت  
 کے خیال سے نہیں بلکہ اس کے فوجی فائدہ اور خود روح کی خاطر کریں۔ کیونکہ  
 روح کے لئے شہود سے صداقت اور وجود مطلق تک پہنچنے کا یہ سب سے  
 سہل راستہ ہوگا۔

گ: بہت ہی خوب۔

میں: ہاں اب جبکہ یہ ذکر ہو چکا ہے مجھے یہ بھی افسانہ کر دینا چاہئے کہ یہ  
 کس قدر دلفریب علم ہے! اور اگر دو کانداروں کی طرح نہیں بلکہ فلسفیانہ انداز  
 سے اسے حاصل کیا جائے تو ہائے مطلوبہ مقصد کے حصول میں کس کس  
 طریقے سے مدد ہوتا ہے۔

گ: کیسے کیسے؟

میں: جیسا کہ کہہ رہا تھا علم الحساب نہایت عظیم الشان اور فوختش  
 اثر رکھتا ہے، یہ روح کو مجر و اعداؤ کے متعلق توجیہ و تنقل پر مجبور کرتا اور جہاں  
 کہیں دلیل میں مرنی یا محسوس چیزیں داخل ہوتیں بگڑ بیٹھتا ہے۔ تم جانتے ہو  
 کہ آں فن کے اساتذہ کس پامردی سے ہر اس شخص کو رو کرتے اور اس کا  
 مضحکہ اڑاتے ہیں جو حساب کرنے میں وحدت مطلق کو تقسیم کرنے کی کوشش  
 کرتا ہے، اگر تم ادھر تقسیم کرو وہ ادھر ضرب دیدیتے ہیں تاکہ وحدت وحدت



باقی رہے اور کسوریں گم نہ ہو جائے۔

گ: بالکل جیسا۔

میں: باب اگر ان سے کوئی شخص پوچھے کہ اے میرے دوستو! یہ جن عجیب و غریب اعداد کے متعلق تم بحث کر رہے ہو یہ ہیں کیا کہ ان میں بقول تمہارے تمہاری مطلوبہ وحدت بھی ہے اور ہر واحد مساوی، غیر متغیر اور غیر تقسیم پذیر ہے، تو یہ کیا جواب دیں گے؟

گ: میرے خیال کے مطابق تو وہ یہ جواب دیں گے کہ ہم ان اعداد کا ذکر کر رہے ہیں جو صرف فکر و خیال میں حاصل کئے جاسکتے ہیں۔  
میں: ہاں تو تہنہ دیکھا کہ ہم اس علم کو بچا طور پر لازمی کہہ سکتے ہیں۔  
اس لئے کہ اس میں خالص صداقت کے حصول کے لئے خالص فہم و عقل کا استعمال ضروری ہے۔

گ: جی ہاں۔ یہ سبکی ایک ممتاز خصوصیت ہے۔

میں: اور تہنہ کبھی یہ بھی مشاہدہ کیا ہے کہ جن لوگوں میں حساب و شمار کا فطری ملکہ ہوتا ہے وہ دوسری قسم کے علم میں بھی عام طور پر تیز ہوتے ہیں اور اگر غبی لوگوں کو بھی حساب کی تعلیم دیدی جائے تو چاہے اس سے وہ کوئی اور فائدہ نہ اٹھائیں لیکن اس سے زیادہ ذکی اور تیز ضرور ہو جاتے ہیں جتنا کہ بصورت دیگر ہوتے۔

گ: بہت درست۔

میں:۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس سے مشکل علم آسانی نہ ملے گا اور نہ بہت سے اس کے برابر دشوار۔

گ: ہاں۔ نہ ملے گا۔

میں:۔ چنانچہ بایں وجوہ حساب ایک ایسی نوع علم ہو جس کی تعلیم بہترین طبائع کو دینی چاہئے اور اسے ہرگز ترک نہ کرنا چاہئے۔

گ:۔ میں اتفاق کرتا ہوں۔

میں:۔ اچھا تو منجمد مضامین تعلیم کے ایک تو یہ ہوا۔ اب اس کے بعد کیا اس امر کی تحقیق کریں کہ آیا اس سے بہت قریب کا تعلق رکھنے والے علم سے بھی میں سروکار ہو گا یا نہیں۔

گ:۔ آپ کا مطلب ہندسہ ہے؟

میں:۔ بالکل۔

گ:۔ ظاہر ہے کہ ہندسہ کے اس حصہ سے تو ہمیں واسطہ ہو ہی جو جنگ سے متعلق ہے۔ کیونکہ پڑاؤ ڈالنے، کوئی موقع اختیار کرنے، اپنی فوج کی صفوں کو مجتمع کرنے یا وسعت دینے یا کسی دوسری فوجی حرکت میں خواہ اہلی معرکہ جنگ میں ہو یا فوجی نقل و حرکت میں، اس بات سے بہت بڑا فرق پڑے گا کہ آیا سپہ سالار ہندسہ ہی یا نہیں۔



میں :- ہاں لیکن اس غرض کے لئے تو بہت تھوڑا سا ہندسہ یا حساب کافی ہوگا۔ سوال تو دراصل ہندسہ کے بڑے اور زیادہ اعلیٰ حصہ کا ہے کہ آیا یہ عین خیر کے منظر کو کسی درجہ سہل تر بناتا ہے یا نہیں۔ اور جیسا کہ میں کہہ رہا تھا اس غرض کے لئے ہر وہ چیز مدد دیتی ہے جو روح کو اس جگہ کی طرف دیکھنے پر مجبور کرے جہاں وجود کا کمال اتم ہے اور جو اسے بہ صورت دیکھنا چاہئے۔

گ :- سچ ہے۔

میں :- چنانچہ اگر ہندسہ میں وجود کے دیکھنے پر مجبور کرتا ہے تو ہمیں اس سے واسطہ ہے، اور اگر صرف شہود کے دیکھنے پر مجبور کرے تو ہمیں اس سے کچھ سروکار نہیں۔

گ :- جی ہاں۔ یہ تو ہمارا دعویٰ ہی ہے۔

میں :- تاہم کوئی شخص جسے ہندسہ سے ذرا بھی واقفیت ہو وہ اس سے انکار نہ کرے گا کہ اس علم کا یہ تصور ہندسین کی معمولی گفتگو کے بالکل متضاد ہے۔

گ :- یہ کیسے؟

میں :- ان لوگوں کے پیش نظر محض اسکی علی حیثیت ہے، یہ ہمیشہ نہایت تنگ نظر اور مضحکہ خیز انداز سے مریع کرنے، وسعت دینے، وضع کرنے، یا اسی قسم کی اور باتوں کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ یہ ہندسہ کی ضروریات کو روزانہ زندگی کی ضرورتوں سے غلط ملط کر دیتے ہیں حالانکہ اس ساری حکمت کا مقصد اصلی

علم اور جانتا ہے۔

گ: بیشک۔

میں: تو پھر ایک مزید اقرار درکار ہے۔

گ: وہ کونسا اقرار؟

میں: یہ کہ جو علم ہندسہ کا مقصود ہے وہ انہی وابدی چیزوں کا علم

ہے کسی فانی اور عارضی شے کا نہیں۔

گ: یہ تو فوراً تسلیم کیا جاسکتا ہے اور سچ بھی ہے۔

میں: تو پھر میرے مکرم دوست، علم ہندسہ روح کو صداقت کی طرف

کھینچے گا، فلسفہ کا جذبہ پیدا کریگا، اور اس چیز کو رفعت بخشے گا جسے آج کل

بدبختی سے گرنے دیا جاتا ہے۔

گ: یہ اثر غالباً کوئی اور دوسری چیز اس طرح نہ پیدا کر سکے۔

میں: چنانچہ کوئی اور چیز اتنی سختی سے نافرمانہ کی جائے جتنی یہ کہ ہمارے

حسین شہر کے باشندے بہر صورت ہندسہ سیکھیں۔ علاوہ ہریں اس علم

کے اور بالواسطہ اثرات بھی ہیں جو کچھ کم نہیں۔

گ: وہ کس قسم کے اثرات ہیں؟

میں: مثلاً فوجی فوائد ہیں جنکا تم نے ذکر کیا اور اسکے علاوہ علم کی تمام شاخوں

میں تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ جس شخص نے ہندسہ کا مطالعہ کیا ہے وہ



ہیں کے مقابلہ میں بہت ذکی مفہم ہوتا ہے جس نے اسے نہیں سیکھا۔

گ: ہاں۔ بلاشبہ، ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

میں: تو پھر اپنے نوجوانوں کے مطالعہ کے لئے بطور علم کی دوسری

شاخ کے تجویز کریں؟

گ: ضرور۔

میں: اور فرض کرو مہیت کو ہم تیسری شاخ بناویں۔ تمھاری کیا رائے ہے؟

گ: میرا اس طرف بہت میلان ہے۔ موسموں اور ماہ و سال کا مشاہدہ

سپہ سالار کے لئے بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ کسان یا جہازران کے لئے۔

میں: میں تمھارے خوف و نیا پر بہت محظوظ ہوتا ہوں کہ تم کیسے اپنے

کوہن سے بچاتے ہو کہ کہیں یہ نہ ظاہر ہو کہ بیکار چیزوں کے مطالعہ پر اصرار کر

رہے ہو۔ اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس بات کا یقین بڑا دشوار ہے کہ ہر انسان میں

ایک روحانی آنکھ ہوتی ہے کہ جب یہ دوسرے مشاغل سے دہندلی یا ضائع

ہو جاتی ہے تو پھر یہ اسے منسوخ اور دوبارہ روشن کرتے ہیں۔ اور یہ آنکھ دس ہزار

جسمانی آنکھوں سے بیش قیمت ہے کہ میں اسی کے ذریعہ صداقت کا دیکھنا ممکن

ہوتا ہے۔ اب سنو انسانوں کے دو گروہ ہیں۔ ایک وہ جو تم سے اتفاق کریگا۔

اور تمھارے الفاظ کو جی و تنزیل جانے لگا۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جسے یہ محض لالچی باتیں

معلوم ہونگی اور وہ انہیں محض خوش گپیان تصور کرے گا کیونکہ انکی نظر میں

انہی کسی قسم کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ لہذا بہتر ہے کہ فوراً اس امر کا فیصلہ کر لو کہ ان دو طبقوں میں سے تم کس سے دلیل کرنا چاہتے ہو۔ ظن غالب یہ ہے کہ تم کہو گے کہ کسی سے نہیں، اور دلیل کے جاری رکھنے میں تمہارا اصلی مقصد خود اپنی بہتری ہی لیکن پھر بھی دوسروں کو اس ٹھوڑے بہت فائدہ سے کیوں محروم رکھو جو وہ حاصل کر سکتی ہیں۔

گ: میں تو خود اپنے ہی لئے دلیل کو جاری رکھنے کو ترجیح دیتا ہوں۔  
 میں: تو ایک قدم پیچھے ہٹاؤ، کیونکہ ہم علوم کی ترتیب میں غلط راستہ پر چلے گئے ہیں۔

گ: آخر کیا غلطی ہوئی؟

میں: یہ ہندسہ سطحی سے بجائے اس کے کہ ہم محض اجسام صلب کو لیتے ہم ایک دم متحرک اجسام پر پہنچ گئے۔ حالانکہ دوسری قدر مساحت کے بعد تیسری کو آنا چاہئے تھا جو کعبہ اور عمق سے متعلق ہے۔

گ: جناب سقراط یہ سچ ہے۔ لیکن ان مضامین کے متعلق فی الحال تو بظاہر بہت کم معلومات ہیں۔

میں: ہاں کیوں نہ ہو۔ اسکی دو وجوہ ہیں۔ اولاً تو یہ کہ کوئی حکومت انکی سرپرستی نہیں کرتی جس کی وجہ سے ان کے اوپر محنت کم صرف کی جاتی ہے، اور یہیں مشکل۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب تک کوئی راہ بتانے والا نہ ہو طلباء انہیں سیکھ نہیں



سکتے۔ اور رہنما شاذی دستیاب ہوتا ہے اور اگر ہو بھی سکے تو موجودہ صورت حال کچھ ایسی ہو اور طلباء کچھ ایسے۔ بر خود غلط ہیں کہ اس کی بات پر وہیلنٹین۔ یہ صورت بالکل بدل جائے اگر کل ریاست ان علوم کی رہنما بن جائے اور ان کو معزز کر کے پھر شاگرد آنا چاہیں گے، مسلسل اور مخلصانہ تلاش و جستجو ہوگی اور اکتشافات ہونگے۔ کیونکہ اب بھی کہ دنیا انکی طرف سے بے پروا ہے اور انکا حسن تناسب مجروح اور خود ان کے ولداؤں میں کوئی بھی ان کا استعمال اور افادہ نہیں بتلا سکتا۔ تاہم یہ اپنی فطری و لفریبی کے باعث گھس پیٹھ کر اپنی جگہ نکال ہی لیتی ہیں۔ اگر انہیں ریاست کی امداد ملے تو بہت ممکن ہو یہ کسی دن رتاریکی سے، روز روشن میں رونما ہوں۔

گ: جی ہاں۔ ان میں ایک عجیب و لفریبی ہے۔ لیکن میں اس تغیر کو نہیں سمجھا جو اپنے ترتیب میں کیا۔ پہلے اپنے مستوی سطحوں کے ہندسہ سے شروع فرمایا تھا نا؟

میں: جی ہاں۔

گ: پھر آپ نے ہیئت کو اسکے بعد رکھا اور بعد میں ایک قدم چھوڑا؟  
میں: ہاں۔ اپنی عجلت سے میں نے تاخیر پیدا کی۔ اجسام صلب کے ہندسہ کی مضحکہ خیز حالت نے مجھے اس شلخ پر سے گزار دیا حالانکہ تدریجی ترتیب سے باری ہی کی تھی اور میں ہیئت یعنی حرکت جسم پر جا پونچھا۔

گ:۔ درست۔

میں:۔ یہ فرض کر کے جس علم کو سمجھنے فی الحال حذف کر دیا ہو وہ ریاست  
کی ہمت افزائی سے وجود میں آجائے گا ہم ہنیت پر پونچتے ہیں جس کا نمبر  
چوتھا ہوگا۔

گ:۔ بہت صحیح ترتیب ہو۔

پہلے میں نے جس بھونڈے پن سے ہنیت کی مدح کی تھی اسپر چونکہ  
آپ نے جو بیچ فرمائی اس لئے ابلی مرتبہ میری مدح سزا ہی آپ کے خیال کے مطابق  
ہوگی۔ کیونکہ میرے خیال میں ہر شخص کو دیکھنا چاہئے کہ ہنیت روح کو اوپر دیکھنے  
پر مجبور کرتی ہو اور ہیں اس دنیا سے ایک دوسرے عالم کی طرف بجاتی ہو۔  
میں:۔ ہاں سوائے میرے ہر شخص اور ہر شخص کے لئے ممکن ہی یہ بات  
واضح ہو لیکن میرے لئے تو نہیں۔

گ:۔ اور آپ کیا فرماتے ہیں؟

میں:۔ تو یہ کہوں گا کہ جو لوگ ہنیت کو فلسفہ کا بلند درجہ دیتے ہیں وہ

ہم سے بلندی کی طرف نہیں دکھواتے بلکہ پستی کی طرف۔

گ:۔ آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں:۔ بالائی اشیاء کے متعلق آپ کا تصور (ماشارا لہ) واقعا بہت

بلند ہے۔ اور میں یہ کہنے کی جرات کر سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص اپنا سر نیچے



ڈال کر چھت کا مطالعہ کرے تو آپ کے نزدیک اس وقت بھی اسکی آنکھیں نہیں بلکہ اس کا دماغ ادراک کر رہا ہو۔ اور کیا عجب ہو کہ آپ ہی صحیح ہوں اور میں ٹھیک ہے کہ ایک سا وہ لوح ہو تو فہم ہوں لیکن میری رائے میں صرف وہی علم روح کو رخصت نظر عطا کرتا ہے جو وجود حقیقی اور غیر مرنی کا علم ہو۔ اور یوں چاہو انسان منہ پھاڑ کر آسمان کو گھورے یا زمین پر نظر ڈالے تاکہ کسی خاصہ حسی کا علم حاصل کرے تو میں تو ہر دو حال میں اس کا منکر ہوں کہ وہ کچھ سیکھ سکتا ہے کیونکہ اس قسم کی کوئی چیز حکمت کا موضوع نہیں اس کی روح کی نگاہ پستی کی جانب ہی بلندی کی طرف نہیں خواہ اسکی راہ علم کی کھٹکی کے ذریعہ ہو خواہ تری کے چاہے وہ پانی پر تیرا تیرا پھرے یا زمین پر اپنی پیٹھ کے سہاے لیٹے۔

گ: میں آپ کے طعن کو حق بجانب تسلیم کرتا ہوں لیکن پھر بھی میں یہ ضرور معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ہئیت کی تحصیل کا وہ کونسا دوسرا طریقہ ہے جس سے وہ اس علم میں مدد ہو جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔

میں: عرض کرتا ہوں۔ یہ تاروں بھر آسمان جو ہم دیکھتے ہیں ایک مرنی زمین (گروے) پر بنا ہوا ہے اور اسلئے اگرچہ مرنی چیزوں میں سب سے حسین اور کامل چیز ہے تاہم سرعت مطلق اور کسل مطلق کی ان حقیقی حرکتوں سے لازماً اسے ادنیٰ درجہ دینا پڑتا ہے جو ایک دوسرے سے نسبت رکھتی اور ہر عدد و شکل صحیح میں اپنے ساتھ اپنے مافیہ کو رکھتی ہیں۔ اور ان کا ادراک عقل اور فہم



سے ہوتا ہے لیکن باصرہ سے نہیں۔

گ :- درست

میں :- ان مرصع افلاک کو اس اعلیٰ علم کی غرض سے بطور نمونہ استعمال کرنا چاہئے۔ ان کا حسن ان نقوش اور تصاویر کا سا حسن ہے جنہیں ڈیڈا اس یا کسی دوسرے بڑے مصور کے ہاتھ نے نہایت خوبی سے بنایا ہے اور جو اب اتفاق سے ہمارے پیش نظر ہے، اگر کوئی مہندس انہیں دیکھے تو ضرور ہے کہ انکی کارگیری کی نفاست کی داد دے لیکن یہ خیال تو اس کے خواب میں بھی نہ گذریگا کہ ان میں اسے حقیقی مساوی ملیگا یا حقیقی دو چندان کسی اور نسبت کی حقیقت۔

گ :- جی ہرگز نہیں۔ یہ خیال تو مضحکہ خیز ہوگا۔

میں :- تو کیا تاروں کی حرکت دیکھ کر ایک حقیقی ہیئت دان کو بھی ایسا ہی احساس نہ ہوگا؟ وہ یہ ضرور سمجھیں گے کہ خالق نے افلاک اور اجرام فلکی کو نہایت کامل طریقہ سے مرتب کیا ہے لیکن وہ یہ بھی نہ خیال کرے گا کہ روز و شب کا تناسب، یا ان دونوں کی نسبت ماہ سے، یا مہینہ کی نسبت سال سے، اور اور کوئی چیز جو مادی اور مرئی ہو وہ ابدی اور ناقابل تغیر بھی ہو سکتی ہے۔ ایسا خیال ہل ہوگا اور ان کی صحیح حقیقت کی تحقیق بھی اتنی ہی ہل۔

گ :- میں بالکل اتفاق کرتا ہوں، اگرچہ میں نے کبھی پہلے اس کا خیال



نہ کیا تھا۔

میں بہ چٹنا پچہ اگر ہم اس مضمون تک صحیح راستے سے پہنچنا اور اس طرح عقل کی عطیہ فطری کا کوئی حقیقی استعمال کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ہندسہ کی طرح ہنیت میں بھی مسائل کا استعمال کرنا چاہئے۔ اور اسلاک و سماوات کو الگ رکھنا چاہئے۔

گ :- یہ کام ہمارے موجودہ ہنیت دانوں سے بید بعید ہے۔

میں :- ہاں۔ اور اگر ہمارے قوانین سے کچھ بھی فائدہ اٹھانا ہو تو اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جنہیں اسی قسم کی وسعت دینا ضروری ہے۔ کیا تم مجھے کوئی اور مناسب مضمون مطالعہ بتا سکتے ہو؟

گ جی نہیں۔ بے سوچے تو نہیں بتلا سکتا۔

میں :- حرکت کی ایک ہی نہیں بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ دو تو ہم ایسی عقلوں کے لئے بھی بین ہیں اور میں خیال کرتا ہوں اور بھی ہونگی انہیں زیادہ عقلمند لوگوں کے لئے چھوڑ دین۔

گ :- لیکن وہ دو کونسی ہیں؟

میں :- ایک کا تو ذکر ہو چکا اور دوسری اسی کا شقیقہ ہے۔

گ :- یعنی؟

میں :- اس دوسری قسم کو کانوں سے وہی نسبت ہے جو پہلی کو آنکھوں سے

کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ جیسے آنکھیں بستاروں کی طرف دیکھنے کے لئے  
بنائی گئی ہیں اسی طرح کان ہم آہنگ حرکتوں کے سننے کے لئے بنے  
ہیں بقول متبعین فیثاغورث یہ دونوں ہمیں نہیں ہیں۔ اور ہم بھی انکے  
قول سے اتفاق کرتے ہیں۔

گ: جی ہاں۔

میں :- لیکن اسکے مطالعہ میں بڑی محنت درکار ہے اس لئے بہتر  
ہے کہ ہم لوگ ان لوگوں کے پاس جا کر اسے سیکھیں یہ لوگ ہیں بتا سکتے  
کہ آیا ان علوم کے اور کوئی استعمال بھی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں اپنے مقصد  
اعلیٰ سے بھی چشم پوشی نہ کرنی چاہئے۔

گ :- وہ کیا؟

میں :- ایک درجہ کمال ہے جس تک ہر علم کو پہنچاؤ اور جو ہمارے شاگردوں  
کو بھی حاصل کرنا چاہئے۔ اس میں ناقص رہنا درست نہیں جیسے کہ میں نے  
کہا تھا کہ یہ لوگ سہیت میں ناقص رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ ایک آہنگی کے علم میں  
بھی یہی صورت پیش آتی ہے اور تم تو شاید اس سے واقف ہو۔ اس ہم آہنگی کے  
اساتذہ صرف ان صداؤں اور تعلق اصوات کا مقابلہ کرتے ہیں جو سنائی  
دیں چنانچہ ماہرین سہیت کی طرح انکی محنت بھی رائگاں جاتی ہے۔  
گ: ہاں، بخدا۔ یہ لوگ جب بچے نام نہاد بندے ہوتے مقامات کے



متعلق گفتگو کرتے ہیں تو ان کی باتیں ایسی ہی ہیں جیسے کھیل کود۔ یہ اپنے کان تار کے برابر لگا دیتے ہیں جیسے کوئی اپنے پڑوسی کی دیوار سے کان لگا کر اسکی باتیں چرانا چاہتا ہو ان میں سے ایک گروہ مدعی ہے کہ اس نے ایک درمیانی مقام دریافت کر لیا اور اس قلیل ترین وقفہ کا پتہ لگا لیا جو ہمیشہ کا معیار قرار دیا جاسکتا ہو۔ دوسرا گروہ اس پر مصر ہے کہ دونوں آوازیں ملکر ایک ہو گئی ہیں۔

بہر حال فریقین اپنی سمجھ پر اپنے کانوں کو فضیلت دیتے ہیں۔

ہیں:- آپ کا مطلب ان حضرات سے ہے جو تاروں کو چھیرتے اور زحمت

دیتے ہیں اور انہیں اپنے ساز کی کھوٹیوں پرکتے ہیں۔ میں اسی ستعار کو اور

بڑا کر ان ضربوں کا ذکر کر سکتا ہوں جو مضرب دیتا ہو اور اسی طرح تاروں پر

آواز سے آگے بڑھنے یا پیچھے رہنے کا الزام لگا سکتا ہوں۔ لیکن اس سب سے

طبیعت اکتا جائیگی لہذا میں صرف اس قدر عرض کرونگا کہ میرا مطلب ان لوگوں

سے نہ تھا بلکہ میں نے ابھی جو تجویز پیش کی تھی وہ مستبعین فیثا غورث کے

متعلق تھی کہ ان سے چلکر آہنگ کے بابت دریافت کیا جائے، کیونکہ ہمیت

دانوں کی طرح یہ لوگ بھی غلطی میں پڑے ہوتے ہیں۔ یہ مسموع نغمہ کی تعداد

کی تحقیق کرتے ہیں لیکن مسائل روبروہ تک کبھی نہیں پہنچتے۔ عدد کی فطری

یک آہنگی تک انکی رسائی نہیں ہوتی اور نہ ایسے پر غور کرتے ہیں کہ بعض اعداد

کیوں ہم آہنگ ہوتے ہیں اور بعض کیوں نہیں ہوتے۔

گ :- یہ تو علم فانی سے بالاتر چیز ہے۔

میں :- بلکہ ایسی چیز جسے میں مفید کے لفظ سے تعبیر کروں گا یعنی اس حالت میں مفید کہ حسن و خیر کی خاطر اس کی تلاش ہو لیکن اگر کسی اور نیت سے اس کی تحصیل کی جائے تو بے سود۔

گ :- بہت صحیح۔

میں :- چنانچہ جب یہ سب علوم باہمی ارتباط و اتصالات کے درجہ پر پہنچ جائیں اور پھر ان پر باعتبار ان کے باہمی تعلقات کے نظر کی جائے اس وقت (اور اس سے پہلے نہیں) انکی تحصیل ہمارے مقاصد کے لیے قابل قدر ثابت ہوگی۔ ورنہ ان سے کوئی فائدہ نہیں۔

گ :- میرا بھی ایسا ہی گمان ہے لیکن جناب سقراط! آپ ایک بڑے وسیع کام کا ذکر کر رہے ہیں۔

میں :- آپ کا کیا مطلب ہے؟ مقدمہ سے یا اور کچھ؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ یہ سب کچھ ..... اس صلی کام کا مقدمہ ہے جو ہمیں سیکھنا ہے؟ کیونکہ آپ یقیناً ایک ماہر ریاضی دان کو منطقی تو نہ مانیں گے؟

گ :- یقیناً نہیں۔ میں تو مشکل سے کسی ایسے ریاضی دان کو جانتا

ہوں جس میں تعقل یا استنباط کلیات کی صلاحیت ہو۔



میں: لیکن کیا تم سمجھتے ہو کہ جن لوگوں میں تقفل کے داد و مستدک

صلاحیت نہ ہو ان میں وہ علم ہو گا جو ہمیں ان سے مطلوب ہے؛

گ:۔ نہ یہ فرض کیا جاسکتا ہے۔

میں: چنانچہ، گلاکن، ہم بالآخر منطق کی ماح پر ان پہونچے۔ یہ وہ لے  
سے جو صرف ذہن سے متعلق ہے لیکن پھر بھی قوت باصرہ اس کی نقالی کرتی  
ہے۔ تمہیں یاد ہو گا کہ ہننے باصرہ کا تخیل یوں کیا تھا کہ وہ کچھ عرصہ کے بعد  
حقیقی جانوروں اور ستاروں کو اور بالآخر خود آفتاب کو دیکھ سکتی ہو یہی حال  
منطق کا ہے جب کوئی شخص صرف عقل کی روشنی میں بلا حواس کی مدد کے  
اکتشاف مطلق کے لئے نکلتا ہے اور اس وقت تک ثابت قدم رہتا ہے کہ خالص  
عقل کے ذریعہ خیر مطلق کا اور اک حاصل کر لے تو وہ آخر کار اپنے کو ذہنی دنیا  
کے خاتمہ پر پاتا ہے جیسے کہ باصرہ اپنے کو عالم مرنی کے ختم پر پاتی ہے۔

گ:۔ بالکل درست۔

میں:۔ تو کیا یہی وہ ترقی ہے جسے آپ منطق کہتے ہیں؟

گ:۔ جی

میں:۔ لیکن سلاسل سے قیدیوں کی رہائی، سلاسلوں سے صورتکسا اور  
روشنی میں انکا استعمال، مکانی، زیر زمین غار سے آفتاب تک ایسا ارتفاع جہاں  
یہ آفتاب کے حضور میں جانوروں اور رختوں، اور آفتاب کی روشنی کی طرف



دیکھنے کی سعی لا حاصل کر رہے ہیں البتہ اپنی ان کمزور آنکھوں تک سے پانی میں  
 عکس کو دیکھ سکتے ہیں جو ابھی ہیں اور وجود حقیقی کا سایہ ہیں نہ کہ عکس کا سایہ  
 جو آگ کی روشنی سے پڑتا ہے جو آفتاب کے مقابلہ میں خود بمنزلہ عکس کے ہے،  
 یہ روح کی اعلیٰ ترین اصل کو وجود کے بہترین حصہ کے تفکر تک ارتقا کرنے کی  
 قوت جس سے ہم عالم مادی مرنی کی روشن ترین حصوں تک اس صداقت  
 کے ارتقا کا مقابلہ کر سکتے ہیں جو جسم کا نور ہے۔ ہاں تو یہ قوت جیسا کہ میں کہہ  
 رہا تھا اس علم سے عطا ہوتی ہے اور ان فنون کی تحصیل سے جنکا بیان ہو چکا ہے۔  
 گ: میں آپ کے قول سے اتفاق کرتا ہوں اگرچہ اس پر یقین ذرا  
 دشوار ہے تاہم اگر ایک دوسرے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس سے انکار  
 اور بھی زیادہ دشوار ہے۔ بہر حال یہ ایسا مسئلہ نہیں کہ اس پر چلتے چلتے سرسری  
 نظر کی جائے، اس پر تو بار بار بحث کرنی ہوگی۔ لہذا خواہ ہمارا نتیجہ صحیح ہو یا غلط  
 اس وقت تو ہم اسے سب کو فرض کر لیں اور اس مقدمہ یا تمہید سے فوراً  
 اس خاص لے کی طرف بڑھیں اور اسے بھی اسی طرح بیان کریں۔ ہاں تو  
 فرمائیے کہ منطق کی ماہیت اور اس کی تقسیم کیا ہیں اور اس تک پہنچانے  
 والے راستے کون کون ہیں کیونکہ یہی راستے ہمیں اپنے آخری سکون تک بھی  
 پہنچائیں گے۔

میں: عزیز من گنگا کن! تم مجھے سمجھ نہ سکو گے اگرچہ میں اپنے بسا بھر



پوری کوشش کروں گا اور تم میرے تصور کے مطابق ایک عکس ہی نہ دیکھو گے  
بلکہ صداقت مطلق کا نظارہ کرو گے اسکے کہنے کی تو میں جرات نہیں کر سکتا  
کہ جو کچھ میں کہوں گا وہ حقیقت ہوگی یا نہیں، البتہ اس کا مجھے پورا اعتماد ہے  
کہ تم ایک ایسی چیز دیکھ لو گے جو حقیقت سے بہت مشابہ ہو۔  
گ :- بلاشبہ۔

میں :- لیکن میں یہ پھر یاد دلا دوں کہ صرف منطق ہی کی قوت اس کا  
انکشاف کر سکتی ہے اور وہ بھی صرف اس شخص پر جو علوم متذکرہ سابق کا  
تلمیذ ہو۔

گ :- اس دعویٰ پر آپ ہی قدر اعتماد کر سکتے ہیں جتنا کہ دعویٰ ماضی پر  
میں :- اور یقیناً کوئی شخص یہ نہ کہے گا کہ تمام وجود حقیقی کے تفحص اور  
ہر چیز کی ذاتی ماہیت کی دریافت کا کوئی اور باضابطہ طریقہ بھی ہے۔ کیونکہ  
فنون تو عموماً انسانوں کی خواہشات یا آرزو سے متعلق ہوتے ہیں، یا تخلیق  
و تعمیر کی خاطر نہیں ترقی دیا جاتی ہے، بے علوم ریاضیہ، مثلاً ہندسہ و مثلث  
جنہیں، جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، وجود حقیقی میں کچھ درک ہوتا ہے تو یہ وجود کے  
متعلق خواب سا دیکھتے ہیں لیکن کبھی چلتی پھرتی حقیقت کو اس وقت تک  
نہیں دیکھ سکتے جب تک کہ یہ ان مفروضات کو نہ ترک کر دیں جنہیں یہ  
بے جا بچے اور امتحان کے استعمال کرتے ہیں اور جنکی یہ کوئی تشریح نہیں کر سکتے



کیونکہ جب انسان اپنے اصول اولیہ سے ہی نہ واقف ہو اور جبکہ درمیانی منازل اور نتیجہ کے متعلق بھی وہ نہ جانتا ہو کہ یہ کاسے سے بنے ہیں تو وہ کیسے خیال کر سکتا ہے کہ مشروط و معتاد کا یہ جال کبھی بھی علم بن سکتا ہے۔  
گ: ناممکن۔

میں:۔ لہذا منطق اور فلسفہ منطق براہ راست اصل اولیہ تک جاتی ہے اور صرف یہی وہ علم ہے جو اپنی بنیاد کو محفوظ کرنے کے لئے مفروضات سے رگزر کرتا ہے۔ چشم روحانی جو واقعہً ایک خارجی دلدل میں مدفون ہے اس کی شفقتاً مدد سے اوپر اٹھتی ہے۔ تحویل و تبدیل کے اس کام میں یہ ان علوم کو اپنا مساوی بنا اور خام بناتی ہے جس پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ رواج عام انہیں علم کے نام سے پکارتا ہے لیکن دراصل ان کے لئے کوئی اور ایسا نام چاہئے جس سے رائے و (قیاس) سے زیادہ اور علم سے کم وضاحت مترشح ہوتی ہو۔ چنانچہ اپنے سابقہ خاکہ میں ہم نے اسے سمجھنے کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن جبکہ ہمیں ایسی اہم حقیقتوں پر غور کرنا ہے تو ناموں کے متعلق ہم کیوں جھگڑا کریں۔

گ: ہاں کیوں جھگڑا کریں، جبکہ ہر نام کافی ہے جو ذہن کے خیال کی بوضاحت ترجمانی کرے۔

میں:۔ بہر صورت پہلے کی طرح ہم مطمئن ہیں کہ چار تقسیمیں ہونی چاہئیں دو عقل کے لئے اور دو رائے و قیاس کے لئے۔ پہلی تقسیم کو علم ریاضی و حکمت،



کہنا چاہئے، دوسری کو سمجھ ریا ہم، تیسری کو یقین ریا عقیدہ، اور چوتھے کو  
سایوں کا اوراک۔ راتے و قیاس کا تعلق مشہود سے ہوگا اور عقل کا وجود  
سے چنانچہ ہم یہ نسبت قائم کر سکتے ہیں۔

وجود کو جو نسبت مشہود سے ہے، وہی نسبت عقل خالص کو راتے

و قیاس سے ہے۔

اور عقل کو راتے و قیاس سے جو نسبت ہے، وہی نسبت علم کو یقین اور

سمجھ کو سایوں کے اوراک سے ہے۔

لیکن راتے اور عقل کی مزید تقسیم اور انکے تعلقات باہمی کے مسئلہ کو

ملتوی کرنا چاہئے کیونکہ یہ بڑی لمبی تحقیق ہوگی، جو تحقیق ہو چکی ہے اس کئی درجہ طویل

گ: جہاں تک میں سمجھتا ہوں مجھے اتفاق ہے۔

میں: اور کیا تم اس سے بھی اتفاق کرتے ہو کہ ہم اس شخص کو منطقی کہیں

جسے ہر چیز کی صہیت کا تصور حاصل ہو؟ اور جو یہ تصور نہ رکھتا ہو اور لہذا

دوسرے تک اسے پہنچانے کی صلاحیت بھی اس میں نہ ہو تو

اس میں جس درجہ کا یہ نقص ہے اسی کے بقدر گویا وہ عقل میں بھی ناقص

مانا جائے؟ کیا تم تسلیم کرتے ہو؟

گ: جی ہاں آخر اس سے انکار کیسے کر سکتا ہوں؟

میں: اور کیا عین خیر کے متعلق بھی تم یہی کہو گے؟ جیتک کوئی شخص

عین خیر کی عقلی تجرید اور تعریف کرنے کے قابل نہیں اور جب تک وہ تمام اعتراضات کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور ان اعتراضات کو یہ نہیں کہہ سکتے و قیاس کی بلکہ صداقت مطلق کی مدد سے منازل بحث میں کہیں بھی لغزش کہے بغیر غلط ثابت کرنے پر آمادہ نہ ہوا ہاں تو جب تک وہ یہ سب کچھ نہ کر سکے تو تم کہو گے کہ وہ نہ عین خیر سے واقف ہو نہ کسی اور خیر سے۔ اگر کچھ ہو تو اسے صرف ایک سایہ کا اور اک ہو جو رائے و قیاس کا عطیہ ہو نہ کہ علم کا۔ وہ اس زندگی میں گویا سوتا ہو اور خواب دیکھتا ہو اور قبل اس کے کہ یہاں پوری طرح بیدار ہو عالم زبرین میں پہنچ جاتا اور اپنی آخری خلاصی پالیتا ہو۔

گ:۔ ان سب باتوں میں یقیناً آپ سے متفق ہوں۔

میں:۔ اور یقیناً تم اپنی خیالی ریاست کے بچوں کو جنکی تعلیم و تربیت تم کر رہے ہو۔ اگر کبھی یہ خیال تبدیل بہ حقیقت ہوا تو ان آئندہ حکمرانوں کو تم کندہ ناتراش نہ بننے دو گے کہ انہیں عقل کا توپتہ نہیں لیکن اعلیٰ سے اعلیٰ امور پر انہیں اختیار دیدیا جائے۔

گ:۔ یقیناً نہیں۔

میں:۔ تو پھر تم یہ قانون بناؤ گے کہ انہیں ایسی تعلیم دی جائے جو انہیں سوال کرنے اور جواب دینے میں اعلیٰ ترین مہارت بہم پہنچائے۔



گ:۔ جی ہاں ہم آپ ملکر ہی یہ قانون بنائیں گے۔

میں: چنانچہ تم اتفاق کرو گے کہ منطق تمام علوم و حکم کا سنگ شرف ہے اور انکا سرتاج۔ کوئی اور علم اس سے بلند تر نہیں ہو سکتا کہ ماہریت علم اس سے آگے جا ہی نہیں سکتی۔

گ: میں اتفاق کرتا ہوں۔

میں:۔ لیکن اب یہ سوال محتاج تحقیق رہے کہ ان علوم کو کس کے سپرد

کیا جائے اور کس طرح کیا جائے؟

گ: جی: ظاہر ہے۔

میں: تمہیں یاد ہو گا کہ ہنر پہلے حکمرانوں کا انتخاب کس طرح کیا جاتا؟

گ: جی ہاں۔

میں:۔ انہیں طبائع کو ایکے بھی منتخب کرنا چاہیے اور اب بھی ترجیح

انہیں کو دینی چاہئے جو سب سے زیادہ قابل اعتماد اور بہادر اور اگر ہو سکے

تو سب سے زیادہ حسین بھی ہوں۔ ان میں جہاں شرافت و ساحت مزاج ہو

وہاں وہ فطری صفات بھی ہونے چاہئے جو انکی تعلیم میں سہولت پیدا کریں

گ:۔ یہ کیا ہیں؟

میں:۔ ایسی صفات مثلاً ذکاوت اور کسی چیز کو جلدی سے حاصل

کر لینے کی قوت۔ کیونکہ دماغ ورزش کی دشواری سے اتنا نہیں تھکتا جتنا کہ

مطالعہ کی شدت سے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیتا ہے۔ اس لئے کہ دوسری صورت میں محنت زیادہ کامل طور پر خود دماغ ہی کی ہوتی ہے اور جسم اس میں شریک نہیں ہوتا۔

گ: بہت درست۔

میں: علاوہ ازیں ہمیں جس کی تلاش ہو اس کا مانتے بھی اچھا ہونا چاہئے اور ضروری ہے کہ وہ ایک آن تھک ٹھوس آدمی ہو جو ہر قسم کی محنت کا شائق ہو ورنہ اس کے لئے ورزش جسمانی کی برداشت یا ضبط ذہنی اور مطالعہ کے تمام مطلوبہ مراحل سے عہدہ برا ہونا کبھی ممکن نہ ہوگا۔

گ: بیشک، اس میں فطری صفات کی ضرورت ہے۔

میں: مئی زمانہ یہ غلطی کیجاتی ہے کہ جو لوگ فلسفہ کا مطالعہ کرتے ہیں انکا

کوئی پیشہ نہیں ہوتا اور جیسے کہ پہلے کہہ چکا ہوں فلسفہ کی بدنامی کی یہی وجہ ہے اب ناخلفوں کو نہیں بلکہ اس کے سچے فرزندوں کو دستگیری کرنی چاہئے

گ: آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں: پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کی دلدادوں کی محنت لنگڑی اور اعلیٰ

نہ ہو۔ یعنی یہ نہیں کہ وہ آدھے محنتی ہوں اور آدھے کاہل۔ مثلاً جب ایک

شخص ورزش اور دوسری جسمانی کھیلوں اور شکار کا بہت شائق ہو لیکن سننے، سیکھنے اور تحقیق کرنے کی محنت سے محبت رکھنا تو کجا واقفاً نفور ہو



یا ہو سکتا ہے کہ جن اشغال میں وہ مصروف ہوئے بالکل دوسری قسم کے ہوں  
اور اس کا لنگ بالکل دوسری قسم کا لنگ ہو  
گ :- بیشک۔

میں :- اور کیا بالکل اسی طرح ایک روح بہ اعتبار صداقت لنگر ہی نہ  
تصور کی جائے جو ارادی کذب سے تو نفرت کرتی اور جھوٹ بولنے پر خود اپنی  
ذات نیز دوسروں پر بجد برافروختہ بھی ہوتی ہو لیکن غیر ارادی جھوٹ کو گوارا  
کرے اور نہ جہالت کے دلدل میں ایک خنجر پر صفت جانور کی طرح لٹھڑے ہونے  
چلنے کا کچھ خیال کرے نہ اس طرح دیکھے جانے پر شرمندہ ہو۔

گ :- بالیقین۔

میں :- اور پھر اسی طرح عفت و اعتدال، اجرات، شوکت اور تمام دیگر  
محاسن کے اعتبار سے کیا ہمیں نہایت احتیاط کے ساتھ سچے فرزندوں اور  
ناخلفوں میں تفریق نہ کرنی چاہئے؛ کیونکہ جہاں ان صفات پر نظر نہ ہو تو  
ریاستیں اور افراد دونوں بے جانے غلطی میں پڑ جاتے ہیں اور ریاست  
ایسے شخص کو اپنا حاکم اور فرد اپنا دوست بنا لیتا ہے جو نیکی کے کسی جزو میں  
ناقص ہونے کے باعث ایک معنی کر لنگڑا اور ناخلف ہو۔

گ :- بہت صحیح۔

میں :- چنانچہ ان تمام چیزوں پر ہمیں نہایت احتیاط سے نظر رکھنی ہوگی

اور صرف اگر وہ لوگ جنہیں ہم تعلیم و تربیت کے اس وسیع نظام سے آشنا کرنا چاہتے ہیں تندرست و مریخ اور جسم رکھتے ہوں تو خود عدل تک کو ہماری مخالفت میں کہنے کو کچھ نہ ملیگا۔ اور ہم ریاست اور دستور کے نجات دہندہ ثابت ہونگے۔ لیکن اگر کہیں ہمارے شاگرد دوسری وضع کے لوگ ہوئے تو معاملہ بالکل برعکس ہوگا اور ہم فلسفہ پر اس سے کہیں بڑا طوفان تضحیک و تحقیر نازل کرانے کا باعث ہونگے جو اسے آجکل برداشت کرنا پڑتا ہو۔

گ:- یہ تو اچھی بات نہ ہوگی۔

میں:- ہرگز نہیں۔ لیکن شاید مزاح کو ایسی اہمیت دیکر میں خود ہی سیدھا مستحق مضحکہ ہوں۔

گ:- کس اعتبار سے؟

میں:- میں بھول گیا تھا کہ ہم لوگ ذرا متین نہ تھے اور بہت زیادہ شہتعال کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے۔ وجہ یہ کہ جب میں نے فلسفہ کو ناحق انسانی تدبیر سے پامال ہوتے دیکھا تو اسکی ذلت کے بانوں پر میری برا فروختگی مجھ سے روکنے نہ سکی اور غصہ نے مجھے ضرورت سے زیادہ شدید بنا دیا۔

گ:- واقعا! میں تو سن رہا تھا لیکن مجھے یہ خیال بھی نہ ہوا۔

میں:- لیکن میں نے، کہ خود گفتگو کر رہا تھا، یہ محسوس کیا کہ میں مشتعل تھا



اور اب میں تمہیں یاد دلاتا ہوں کہ اگرچہ سابقہ انتخاب میں ہمنے بڑھے آدمیوں کو چننا تھا لیکن اس مرتبہ ایسا نہ کریں گے سو کن مہتلائے تو ہم تھا جب اسے کہا کہ آدمی بڑھا ہو کر بہت سی چیزیں سیکھ جاتا ہو۔ حالانکہ جس طرح وہ بڑھا ہو کر زیادہ دوڑ نہیں سکتا ویسے ہی زیادہ سیکھ بھی نہیں سکتا۔ ہر غیر معمولی محنت کا وقت شباب ہی ہے۔

گ :- بیشک۔

میں :- لہذا شمار و ہندسہ اور تمام وہ دیگر عناصر تدریس جو منطق کی تیاری ہیں یہ سب بچپن ہی میں دماغ کو پیش کر دینے چاہئیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ اپنے نظام تعلیم کو بچہ عاید کر نیک خیال نہ پیدا ہو۔

گ :- کیوں نہیں؟

میں :- کیونکہ ایک حرکت کسی قسم کے علم کی تحصیل میں غلام نہ ہونا چاہئے ورزش جسمانی اگر لازمی بھی ہو تو جسم کو نقصان نہیں پہنچاتی لیکن جو علم بچہ حاصل کیا گیا ہو وہ دماغ پر تسلط نہیں حاصل کرتا۔

گ :- بہت صحیح۔

میں :- لہذا، محب من، جبر کا استعمال نہ کرو بلکہ ابتدائی تعلیم کو ایک قسم کی تفریح بناؤ۔ اس طرح تم فطری رجحان کو زیادہ بہتر طور پر معلوم کر سکو گے۔

گ :- نہایت معقول ہے۔

میں:۔ تمہیں یاد ہو گا کہ بچوں کو بھی گھوڑے پر بٹھا کر جنگ دکھانے کے لئے بجانا ہوتا تھا اور اگر کوئی خطرہ نہ ہو تو انہیں بالکل قریب تک بجاتے تھے تاکہ کم عمر شکاری کتوں کی طرح ان کے منہ کو بھی خون لگا دیا جاسے۔  
گ: جی، مجھے یاد ہے۔

میں:۔ چنانچہ ہم بھی محنتوں، سبقوں، اور خطرات، ان سب چیزوں میں اسی عمل کی اتباع کر سکتے ہیں۔

پھر جوان سب چیزوں میں سب سے زیادہ بے تکلف ہونے منتخب شدہ تعداد میں شامل کر لینا چاہئے۔

گ: کس عمر میں؟

میں:۔ جس عمر میں ضروری ورزش جسمانی ختم ہو جائے۔ دو یا تین سال کا زمانہ جو اس تربیت میں صرف ہوتا ہے۔ وہ کسی دوسری غرض کے لئے بالکل بے سود ہے۔ کیونکہ نیند اور ورزش حصول علم کے لئے نا مساعد ہیں۔ اور یہ جانچ کہ ورزش جسمانی میں کون سب سے اول ہے، نچلا ان اہم ترین امتحانوں کے ہے جو ہمارے نوجوانوں کو دینے پڑتے ہیں۔

گ:۔ یقیناً۔

میں:۔ اس مدت کے ختم ہونے پر بہت سالہ طبقہ میں سے جن لوگوں کا انتخاب ہو گا انہیں اعلیٰ اعزاز میں ترقی دیا جائے گی۔ جو علوم انہوں نے اپنی



ابتدائی تعلیم میں بلا کسی نظام کے سیکھے تھے وہ اب یکجا لائے جائیں گے اور  
یاد ان کی باہمی فطری مناسبتوں اور وجود حقیقی سے انکے تعلق کو دیکھ سکیں گے  
گ: جی ہاں۔ علم کی صرف یہی قسم پائیدار جڑ پکڑتی ہے۔

میں: ہاں۔ اور اس علم کی قابلیت منطقی صلاحیت کا بڑا معیار ہے۔ کہ  
فہم و مددک و مانع ہمیشہ منطقی ہوتا ہے۔  
گ: میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔

میں: الغرض ان سب باتوں پر تمہیں نظر کرنی چاہئے۔ اور پھر جنہیں  
یہ ادراک سب سے زیادہ ہو اور جو تحصیل علم اور اپنے فوجی و دیگر مفوضہ فراموش  
کی انجام دہی میں سب سے زیادہ ثابت قدم ہوں تو تیس سال کی عمر پر پہنچنے  
کے بعد انہیں اس منتخبہ طبقہ میں سے چننا اور اعلیٰ تر اعراد تک ترقی دینا چاہئے  
اور پھر تمہیں منطلق کی مدد سے ان لوگوں پر ثابت کرنا ہو گا تاکہ یہ معلوم کر سکو  
کہ ان میں سے کون باصرہ اور دیگر خواہ اس کے سہماں کو ترک کرنے اور صداقت  
کی معیت میں وجود مطلق تک پہنچنے کے لئے تیار ہے۔ اور میرے دوست  
اس جگہ بڑی احتیاط اور کار ہے۔

گ: کیوں، اتنی احتیاط کیوں؟

میں: تم کیا نہیں دیکھتے کہ منطلق نے ایک کیسی بری چیز پیدا کر دی ہے؟

گ: کونسی برائی؟

میں مہلکے فن میں تم دو بے راہ روی بھری۔

گ: بہت ٹھیک۔

میں: کیا تم سمجھتے ہو کہ ان کے لئے کوئی اور چیز اس قدر غیر فطری اور ناقابل معافی ہے؟ یا تم ان کو ساتھ کچھ رعایت کرو گے؟

گ: کس طرف کی رعایت؟

میں: میں چاہتا ہوں کہ آپ طوع و مقابل ایک سے بالکل لڑکے کا تصور کریں جس کی تربیت بڑی دولت و ثروت میں ہوئی ہو، وہ ایک بڑے اور کثیر التعداد خاندان کا رکن ہو، اور اس کے بہت سے خوشامدی ہیں۔ یہ جب بڑا ہو کر من بولتا کو پہنچتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اس کے والدین بتانے جاتے ہیں وہ اس کے اہلی و الدین نہیں۔ لیکن اہلی و الدین کون ہیں اس کا پتہ یہ نہیں لگا سکتا کیا تم ان خوشامدیوں اور اپنے مفروضہ والدین کے ساتھ اسکے رویہ پران و نون صورتوں میں قیاس کر سکتے ہو یعنی پہلی تو اس زمانہ میں جب وہ اپنے جھوٹے رشتہ سے بے خبر ہے اور پھر اس وقت جب اسے اس کا علم ہو گیا ہے؟ یا میں آپ کی طرف سے قیاس کروں؟

گ: بسم اللہ

میں: میں تو یہ کہوں گا کہ جب وہ صداقت سے بے خبر ہے تو یہ قرین قیاس ہے کہ وہ اپنے ماں، باپ اور دوسرے مفروضہ رشتہ داروں کی عزت و خیریت کو



سے زیادہ کرے گا۔ ضرورت کے وقت انہیں بھولنے، یا ان کے خلاف کچھ کہنے یا کرنے کا اس میں مقابلہ کم رہ جائے گا۔ اور کسی اہم معاملہ میں مقابلہ کم وہ ان کی نافرمانی پر آمادہ ہوگا۔

گ: جی۔

میں: لیکن انکشاف حقیقت کے بعد میرے خیال میں ان لوگوں کی عزت و توقیر اس کی نظر میں گھٹ جائے گی اور اب یہ خوشامدیوں کا زیادہ ولداؤ ہو جائے گا، اس پر ان کا اثر بہت بڑھ جائے گا، یہ اب انہیں کی وضع میں رہنا اور ان سے کھلے بندوں خلا ملنا کہنا شروع کرے گا اور اگر نہایت غیر معمولی طور پر اچھی طبیعت کا آدمی نہیں ہو تو اب اپنے مفروضہ والدین و اعزاء کی ذرا بھی پروا نہ کرے گا۔

گ: بہت خوب۔ یہ سب کچھ تو بہت قرین قیاس ہی لیکن آخر یہ صورت فلسفہ کے متقدمین پر کیسے عاید ہوتا ہے؟

میں: اس طرح آپ جانتے ہیں کہ عدل اور عزت کے متعلق بعض اصول ہیں جو بچپن میں ہیں سکھائے گئے تھے اور ان کے اختیار پداری کے ماتحت ہم پرورش پائی اور ہم ہمیشہ ان اصولوں کی عزت اور اطاعت کرتے رہے۔

گ: درست۔

میں: ان کے مخالف اور دوسرے اصول اور عادات انبساط بخش

بھی ہوتے ہیں جو روح کی چاپلوسی کرتے اور اسے بھانا چاہتے ہیں۔ لیکن ہم میں سے جن کا ذرا بھی احساس ہے ان پر ان کا اثر نہیں ہوتا اور یہ لوگ برابر اپنے آباؤ کے اقوال کی عزت اور اطاعت کرتے رہتے ہیں۔  
گ: صحیح۔

میں:۔ اچھا، ایک شخص اس حالت میں ہے اور فطرت سائلہ دریافت کرتی ہے کہ کیا جائز ہے اور کیا قابل عزت۔ اور وہ اسپر وہی جواب دیتا ہے جو وضع قانون نے اسے سکھایا ہے، اسپر بہت سی طرح طرح کی دلیلوں سے اس کے الفاظ رد ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ یہ اس یقین پر مجبور ہو جاتا ہے کہ نہ کوئی چیز قابل عزت ہے نہ ناقابل عزت نہ عادلانہ اور اچھی ہے اور نہ ان کی ضد الغرض ہی حال اسکے ان تمام تصورات کا ہوتا ہے۔ جن کی وہ اب تک بہت قدر کرتا تھا۔ تو ایسی حالت میں کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ اب بھی حسب سابق انکی عزت اور اطاعت کریگا؟  
گ:۔ کبھی نہیں سکتا۔

میں:۔ اور وہ قانون کو برقرار رکھنے کے بجائے اس کا توڑنے والا

ہو گیا نا؟

گ:۔ بلا شک۔

میں:۔ اور فلسفہ کے ان طلباء میں جنکا میں نے ذکر کیا ہے یہ سب کچھ

بہت ہی قدرتی امر ہے اور جیسا کہ میں ابھی کہہ رہا تھا قابل معافی ہے۔



گ: جی اور میں کہوں گا کہ قابل افسوس بھی۔

میں: لہذا اس خیال سے کہ آپ کے جذبات افسوس و ترحم کو اپنے ایسے شہریوں کے متعلق تحریک نہ ہو جو اب (ماشاء اللہ) تیس سال کی عمر کو پہنچ چکے ہیں انکو منطق سے روشناس کرنے میں بہت حسیا طبرتی چاہئے  
گ: ضرور۔

میں: خطرہ یہ ہے کہ ہمیں یہ لوگ اس مسرت گراں بہا کامزہ قبل از وقت نہ چکھ لیں۔ آپ نے مشاہدہ کیا ہو گا کہ جب پہلے پہل کم عمر لوگوں کے کام و دہن ذائقہ سے آشنا ہوتے ہیں تو یہ لگتے ہیں تفریح کے موافق ویلیں دینے اور جو لوگ ان کی ترویج کرتے ہیں ان کی نقالی میں خود ہر ایک کی ترویج و تغلیط کرنے کٹے کے پلوں کی طرح انہیں بھی اپنے پاس کی ہر چیز کو نوچنے کھسوٹنے اور چیرنے پھاڑنے میں لطف آتا ہے۔

گ: جی ہاں۔ اس سے بڑھکر اور کوئی چیز انہیں پسند نہیں ہوتی۔

میں: اس طرح جب بہت سی جگہوں پر انہیں فتح حاصل ہوتی ہے اور اکثر گاہکوں شکست کا منہ دیکھنا ہوتا ہے تو نہایت تیزی اور بڑی شدت کے ساتھ ہر اس چیز سے اپنا یقین ہٹا لینے کی راہ پیدا ہو جاتی ہے جو پہلے عقیدہ رکھتے تھے اور لہذا نہ صرف یہ بلکہ فلسفہ اور اس کے تمام متعلقات باقی دنیا میں بدنام ہوتے ہیں۔

گ: بالکل درست۔

میں، لیکن جب آدمی بڑھا ہونا شروع ہوتا ہے تو پھر اس ختم کی بے عقلی کامر تکب نہیں ہوتا۔ وہ حق کے متلافی منطقیوں کا تتبع کرتا ہے نہ کہ لٹ جتنوں کا جو صرف تفریح کی خاطر تردید کرتے ہیں۔ اور اس شخص کا اعتدال اسکے مشغل کی عزت میں تخفیف کے بجائے اضافہ کرتا ہے۔

گ: بہت صحیح

میں: بہتے جب یہ کہا تھا کہ فلسفہ کے تلامذہ باضالہ اور مستعمل ہوں اور آج کل کی طرح ہر اتفاق سے ذرا رغبت رکھنے والا یا ہر فضولی و خیل نہیں تو کیا اسی امر کے لئے خاص اہتمام نہ کیا تھا؟

گ: جی بیشک۔

میں: فرض کرو کہ فلسفہ کا مطالعہ و رزٹش جہانی کی جگہ لے اور جتنے سال و رزٹش میں صرف ہوتے انے و وچند زمانہ تک اس کا مطالعہ نہایت محنت خلوص اور دوسری چیزوں سے منہ موڑ کر کیا جائے تو کیا یہ کافی ہوگا؟

گ: آپ کی رائے چھ برس سے یا چار برس۔

میں: فرض کرو پانچ سال۔ اس مدت کے ختم پر انہیں پھر نیچے غار میں بھیجا جانا چاہئے اور فوجی یا اور کسی ایسے عہدہ پر جس پر نوجوان لوگ مامور ہو سکتے ہوں کام کرنے پر مجبور کرنا چاہئے۔ اس طرح ان لوگوں کو زندگی کا تجربہ حاصل ہوگا اور



یہ آزمانے کا موقع ملیگا کہ جب مختلف قسم کی لالچیں انہیں ہر طرف کھینچتی ہیں تو وہ ثابت قدم رہتے ہیں یا ان کے پاسے ثبات کو لغزش ہو جاتی ہے۔  
گ :- اور ان کی زندگی کی یہ منزل کتنے عرصہ تک جاری رہیگی ؟

میں :- پندرہ سال - اور جب یہ پچاس سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو اس وقت ان میں سے جو باقی ہوں اور جنہوں نے اپنی زندگی کے تمام اعمال میں اور علم کے ہر شعبہ میں اپنے کو ممتاز کیا ہو وہ بالآخر اپنے معراج کمال کو پہنچیں۔  
اب وقت ہے کہ وہ اپنی روح کی آنکھ کو اس عالمگیر روشنی کی طرف اٹھائیں جو ہر چیز کو منور کرتی ہے اور خیر مطلق کا نظارہ کریں۔ کیونکہ یہی وہ نمونہ ہے جس کے مطابق انہیں ریاست کو حیات افراد کو، اور خود اپنی بقیہ زندگی کو منضبط کرنا ہے۔ فلسفہ ان کا شغل خاص ہو، لیکن جب باری آتے تو یہ ریاست کی مشقت بھی گوارا کریں اور مفاد عام کی خاطر حکومت بھی کریں، اس طرح نہیں کہ گویا یہ کوئی بڑی بہادری کا کام ہے بلکہ محض ایک فرض کے طور پر۔ اور جب یہ ہسٹل میں اپنے جیسے لوگ پیدا کر دیں اور انہیں اپنی جگہ حکام ریاست کی جگہ پر چھوڑ جائیں تو اس وقت یہ "مبارکوں کے جزیرہ" کو سدھار جائیں گے اور وہیں مقیم رہیں گے۔ اہل شہر کی طرف سے انہیں عام یادگاریں قربانیاں اور اعزاز میں لگے، اگر پتھی کاہن نے اجازت دی تو تو نیم دیوتاؤں کی طرح ورنہ کم از کم متبرک اور الہی انسانوں کی حیثیت سے۔



گ: جناب سقراط، آپ تو واقعی سنگ تراش ہیں اور اپنے حکام کے  
مجھے باعتبار حسن آپ نے ایسے تراشے ہیں کہ انکی وہرنے کی گنجائش نہیں۔  
میں: ہاں گلاکن اور جاگنات کے بھی کیونکہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں جو  
کہہ رہا ہوں وہ صرف مردوں ہی پر عاید ہوتا ہے جہاں تک انکی فطرت اجازت  
دیتی ہے عورتوں پر نہیں۔

گ: آپ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں، کیونکہ ہم نے عورتوں کو تمام چیزوں  
میں مردوں کا سا حصہ لینے دیا ہے۔

میں: خوب۔ اور آپ مجھ سے اس امر میں بھی اتفاق کریں گے کہ  
کریں گے نا؟ کہ ہم نے ریاست اور حکومت کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ محض  
ایک خواب نہیں ہے۔ اور اگرچہ دشوار ضروری تاہم محال نہیں۔ ہاں البتہ یہ اسی صورت  
میں ممکن ہے جو ہم نے فرض کی ہے۔ یعنی ریاست میں حقیقی فلسفی بادشاہ پیدا ہوں  
اور ایک یا کئی ایسے بادشاہ اس موجودہ دنیا کے اعزازوں کو ذیل اور بے وقعت  
جانکر ٹھکراویں، حق اور حق سے پیدا ہونے والی عزت کو سب چیزوں سے  
بالا تر سمجھیں، اور عدل کو سب سے اعلیٰ اور سب سے ضروری چیز خیال کریں، اسی  
کے کار گزار ہوں اور اپنے شہر کو منظم کرنے میں اسکی صہلوں کو بلند کریں۔  
گ: یہ آخر کام شروع کیسے کریں گے؟  
میں: یہ شروع اس طرح کریں گے کہ باشندگان شہر میں سے سب



دس سال سے اوپر کی عمر والوں کو اطراف ملک میں بھیجان کے بچوں پر قبضہ کر لیں گے۔ انہیں اپنے عادات اور قوانین کی تعلیم دیں گے یعنی ان قوانین کی جوہم نے انہیں دینے ہیں اس طرح وہ ریاست اور دستور میں کامیاب ہو کر رہیں جلد سے جلد اور بہ سہولت تمام حصول سعادت کر لیں گے اور وہ قوم سب سے زیادہ فائدہ حاصل کرے گی جس کا یہ دستور ہو گا۔

گ: جی ہاں۔ یہ بہترین طریقہ ہو گا اور جناب سقراط میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے نہایت خوبی سے بیان فرما دیا ہے۔ کہ ایسا دستور اساسی اگر کبھی عالم وجود میں آیا تو کیسے آئے گا۔

میں :- اچھا تو بس، کامل ریاست اور اس کے تصویر کے حامل انسان کا بہت کافی ذکر ہو چکا۔ اب اس کے بیان کرنے میں کوئی وقت نہیں۔  
گ: جی کوئی دشواری نہیں اور میں آپ سے اس خیال میں متفق ہوں کہ اس کے متعلق اور کچھ اور زیادہ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔





# اکھون کتاب

میں :- اچھا تو گلا کن، ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ کامل ریاست میں بیویا  
عورتیں اور بچے مشترک ہوں، ہماری تعلیم اور صلح و جنگ کے تمام مشاغل  
بھی مشترک ہوں اور بہترین فلسفی اور شجاع ترین جنگ آزمائے بادشاہ ہوں  
گ: جی ہاں، یہ تسلیم کیا جا چکا ہو۔

میں: جی۔ اور اس کے علاوہ ہم یہ بھی تسلیم کر چکے ہیں کہ جب حکمرانوں  
کا اپنا تقرر ہو جائے گا تو یہ اپنے سپاہیوں کو لیکر ایسے مکانوں میں رکھیں گے  
جیسے ہم بیان کر رہے تھے، یعنی جو سب میں مشترک ہوں اور کوئی شخصی  
یا انفرادی چیز نہ رکھتے ہوں۔ تمہیں یاد ہو گا کہ ان لوگوں کی املاک کے متعلق  
ہمنے کیا تصفیہ کیا تھا؟

گ: جی یاد ہو کہ کسی کے پاس معمولی انسانی مقبوضات نہ ہوں گے  
یہ لوگ جنگ آزما، پہلوان اور محافظ ہوں گے اور دوسرے شہریوں سے  
بطور سالانہ معاوضہ کے انھیں صرف گزارہ مل جایا کریگا۔ اور یہ خود

اپنی اور سب ریاست کی نگہبانی کرتے رہیں گے۔

میں :- درست۔ اب کہ ہمارے کام کا یہ جزو ختم ہوا اور اس نقطہ کا پتہ چلا نہیں  
 جہاں سے ہم لوگ ادھر مڑے تھے تاکہ ہم پھر اسی پُرانے راستہ پر واپس جاسکیں۔  
 گ :- واپسی میں تو کوئی دشواری نہیں۔ جیسے اس وقت جیسے ہی اُس وقت،  
 آپ کی باتوں سے مترشح ہوتا تھا کہ آپ نے ریاست کا بیان ختم کر دیا ہے۔ آپ نے  
 فرمایا تھا کہ ایسی ریاست اچھی ہوتی ہے اور اچھا انسان وہ ہوتا ہے جو اس کے  
 مطابق ہو، حالانکہ جیسا اب پتہ چلا آپ کو ریاست اور فرد دونوں کے متعلق اور  
 زیادہ عمدہ باتیں کہنی تھیں۔ اس کے علاوہ آپ نے فرمایا تھا کہ حقیقی اور سچی شکل ہوا  
 باقی سب جھوٹی اور مجھے جہاں تک یاد ہے آپ نے کہا تھا کہ ان جھوٹی شکلوں کی چار  
 خاص قسمیں ہیں اور ان کے نیزان سے مطابقت رکھنے والے افراد کے نقائص قابل تحقیق ہیں۔  
 جب ہم سب افراد کو دیکھ چکیں اور اس امر پر متفق ہو جائیں کہ ان میں کون سب سے  
 اچھا ہے اور کون سب سے بُرا تو پھر ہم یہ دیکھیں کہ آیا بہترین ہی سب سے زیادہ خوش اور بدترین  
 ہی سب سے زیادہ مصیبت میں ہے یا نہیں۔ میں نے پوچھا تھا کہ حکومت کی یہ چار  
 جن کا آپ نے تذکرہ کیا، کیا ہیں کہ پالیسٹینس اور آئیڈیمینٹس پنج میں بول  
 اٹھے، اس پر آپ نے پھر سرے سے قصہ شروع کیا اور بالآخر اس مقام تک چلے آئے  
 جہاں ہم اس وقت پہنچے ہیں۔

میں :- تمہاری یاد بہت ہی صحیح ہے۔



گ۔ تو پھر پہلوانوں کی طرح آپ اپنے آپ کو پھر اسی پہلو پر لائے، میں پھر وہی حال کروں اور آپ ہی جواب میں جو آپ اس وقت دینے والے تھے۔  
میں :- ہاں، اگر دیکھا تو ضرور دوں گا۔

گ :- میں خاص طور پر یہ سننا چاہتا ہوں کہ وہ چار اساسی دستور کا اپنی ذکر کیا تھا کیا ہیں؟

میں :- اس سوال کا جواب تو باآسانی دیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک ان کے جدا جدا نام ممکن ہیں، حکومت کی وہ چار قسمیں جن کا میں نے تذکرہ کیا تھا یہ ہیں: اول تو کسٹیا اور اسپارٹا کی حکومتیں جن کی عام طور پر بہت تعریف ہوتی ہے؛ اسکے بعد غیر آتا ہے حکومت خواص کا، اسے اتنا پسند نہیں کیا جاتا اور حکومت کی یہ قسم برائیوں سے مملو ہے؛ تیسری حکومت جمہوری ہے جو اگرچہ حکومت خواص سے بہت مختلف ہے تاہم قدرتا اس کے بعد پیدا ہوتی ہے؛ اور سب سے آخر میں جبر و استبداد وہ بڑا اور مشہور استبداد جو ان سب سے مختلف اور رہایت کے اختلال کی چوتھی اور بدترین شکل ہے۔ ان کے علاوہ میں تو کوئی ایسا دستور اساسی نہیں جانتا جس کی کوئی ممتاز حیثیت ہو، کیا آپ کوئی جانتے ہیں؟ اس کے علاوہ زمینداریاں اور تعلقے ہوتے ہیں جن کی خرید و فروخت ہوتی ہے، اور حکومت کی بعض اور درمیانی شکلیں ہیں لیکن یہ سب بہت ہی معمولی سی ہیں اور یونانیوں اور رومیوں میں یکساں پائی جاتی ہیں؟  
گ :- جی ہنسیک؛ ان لوگوں میں تو حکومت کی عجیب عجیب شکلیں سننے

میں آئی ہیں۔

میں :- آپ یہ جانتے ہیں کہ جیسے انسانی طبائع متنوع ہوتی ہیں ویسی ہی حکومتیں مختلف ہوتی ہیں۔ اور ایک کی جتنی قسمیں ہونگی لازم ہے کہ دوسرے کی بھی اتنی ہی ہوں۔ ہم پندرہ فیصد نہیں کر سکتے کہ حکومتیں ”لکڑی پتھر“ سے بنتی ہیں اور ان انسانی طبائع سے نہیں جو اس میں موجود ہوتے اور ٹھیلڈا گویا پلڈ الٹ ڈیسے اور ہر دوسری شے کو اپنے ساتھ گھسیٹ لاتے ہیں۔

گ :- جی ہاں، جیسے آدمی ویسی ہی ریاستیں، ان کا نشوونما تو انسانی سیرت سے ہوتا ہے۔

میں :- تو اگر ریاستوں کے اساسی دستور پانچ ہیں، تو دماغ انفرادی کے خصائص و میلان بھی پنچگانہ ہونگے؟

گ :- یقیناً۔

میں :- حکومت موثری سے مطابقت رکھنے والے فرد کو جسے ہم بجا طور پر عادل اور اچھا کہتے ہیں، ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- تو اب ہم ادنیٰ درجہ کے طبائع کا بیان کریں، مثلاً وہ لاپچی اور بھگڑا لوتیر طبعیت جو سپارٹا کی نسق دولت سے مناسبت رکھتی ہیں، نیز خواصی، جمہوری، اور سبب طبائع کا۔ پھر ہم سب سے زیادہ عادل کو سب سے زیادہ غیر منصف کے ساتھ رکھیں اور انہیں دکھ کر



ہم خالص عدل کی زندگی گزارنے والے اور خالص نا انصافی کی زندگی والے کی نسبتی  
 مسرت یا عدم مسرت کا موازنہ کر سکیں گے اس وقت تحقیق پوری ہو جائیگی اور ہمیں  
 معلوم ہو جائیگا کہ آیا ہمیں قہر جیسی میکس کے مشورہ کے مطابق نا انصافی پر عمل کرنا  
 ہونا چاہیے یا اپنی دلیل کے نتائج کے مطابق عدل کو ترجیح دینی چاہیے۔

گ۔۔۔ بیشک، آپ جو فرماتے ہیں وہی تدبیر ٹھیک ہے۔

میں۔۔۔ کیا پھر وہی اپنی پُرانی تدبیر عمل کریں جو خیال و وضاحت ہم نے  
 اختیار کی تھی، یعنی پہلے ریاست کو لیں اور پھر فرد کو۔ تو کیا عزت کی حکومت سے  
 شروع کریں؛ میں اس حکومت کے لیے سوائے حکومت اختیار کے  
 اور کوئی نام نہیں جانتا۔ اس سے اس کے مماثل انفرادی سیرت کا مقابلہ  
 کریں گے، پھر اس کے بعد حکومت خواص اور خواصی انسان پر نظر ڈالیں گے بعد  
 جمہوریت اور جمہوری انسان کی طرف اپنی توجہ منعطف کریں گے اور بالآخر چکر استبداد  
 کا شہرہ دیکھیں گے اور مستبد کی روح میں ایک بار پھر جانکیں گے اور یوں ایک قابل  
 اطمینان فیصلہ پر پہنچنے کی کوشش کریں گے۔

گ۔۔۔ اس معاملہ پر غور اور فیصلہ کا یہ طریقہ نہایت مناسب ہوگا۔

میں۔۔۔ چنانچہ پہلے ہمیں یہ دریافت کرنا چاہیے کہ عزت کی حکومت، حکومت  
 مؤثری (بہترین اشخاص کی حکومت) سے کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ تمام سیاسی  
 تبدیلیاں واقعی حکمراں قوت میں مناقشہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ کیونکہ جو حکومت متحدہ



خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو اسے کوئی ہلا نہیں سکتا۔

گ۔ بہت صحیح۔

میں۔ تو ہمارے شہر میں خستہ کس طرح تعمیر پیدا ہوگا اور معادن میں و حکام کے دو طبقوں میں کیسے اختلاف رونما ہوگا، ایک طبقہ کے لوگوں میں آپس میں یا ایک طبقہ کا دوسرے طبقہ سے؟ کیا ہم بھی تھوہرا کی طرح نیات الادب سے پوچھیں کہ "اختلاف پہلے پہل کیسے پیدا ہوا؟ اور فرس کریں کہ یہ نہایت متاثر کن سوکھے منہ سے ہمارا مذاق اڑا رہی ہیں، اور ہم سے بچوں کی طرح کھیلتی اور ٹھٹھا کرتی ہیں اور پھر نہایت بلند المناک انداز سے ہمیں مخاطب کر کے باور کرانا چاہتی ہیں کہ نہایت متین ہیں۔

گ۔ ہاں تو کیسے، یہ ہمیں کیسے مخاطب کریں گی؟

میں۔ اس طرح، ایک شہر جو یوں مرتب ہو شکل ہی سے ہلایا جاسکتا ہے لیکن چونکہ ہر چیز جس کی ابتدا ہی اس کی ایک انتہا ہی ہے اس لیے ایک ایسا دستور ایسا ہی تک جیسا کہ تم نے بتایا ہے ہمیشہ باقی نہیں رہ سکتا اور امتداد زمانہ سے یہ بھی منتشر ہو جائے گا۔ اور اس کا انتشار یوں ہوگا، زمین پر اگنے والے درختوں اور سطح زمین پر چلنے والے جانوروں سب میں روح اور جسم کی بار آوری اور بے باری اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب ان کے دوائے چکر پورا ہو جاتا ہے۔ یہ چکر کم زندہ رہنے والی ہستیوں میں ہی ہوتی ہے اور زیادہ زندہ رہنے والوں میں بہت سی فضا پر گزرتا ہے۔ لیکن اس انسانی پیدائش



یا باہر پن کے علم تک تمہارے حکمرانوں کی دانش و تعلیم کبھی نہ پہنچ سکے گی۔ انکو منضبط  
 کر نیو اے قوانین کا اکتشاف ایسی عقل کے لیے ممکن نہیں جو حواس سے آلودہ ہو۔ یہ  
 قوانین اس سے بچکر نکل جائیں گے اور چنانچہ یہ حکام ایسی حالت میں دنیا میں پتے  
 پیدا کریں گے جس میں نہیں نہ کرنے چاہئیں..... لہ

اس کے بعد چند سطریں ترجمہ میں چھوڑ دی گئی ہیں اس لیے کہ انکا قابل فہم ترجمہ ہم سے ممکن نہ تھا۔  
 دوسری زبانوں میں بھی ریاست کے جو ترجمے ہیں ان میں ان سطور کے معنی واضح نہیں کیے جاسکے  
 ہیں۔ ڈبویس اور واگھن نے تو اپنے انگریزی ترجمہ میں ان کا ترجمہ ہی نہیں کیا ہے۔ دلیل و گفتگو کے  
 تسلسل پر ان سطروں کے چھوڑنے کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ (مترجم)

کیونکہ جب تمہارے محافظین قانون تو والد سے نا آشنا ہوں گے اور دیکھا وطن کو بے موسم لکھا کر دینگے تو بچے لازماً اچھے اور خوش نخت نہ ہوں گے اور اگر چہ ان بچوں کے پیشروان میں سے بہترین ہی کو اپنی جگہ متعین کریں پھر بھی یہ اپنے آبا کی جگہ پر کرنے کے اہل نہ ہونگے اور جب بحیثیت محافظ برسر اقتدار آئیں گے تو جلد ہی ہتھ چل جائیگا کہ یہ ہماری (بنات لادب کی) خبر گیری نہیں کرتے۔ پہلے یہ موسیقی کی بقدری کریں گے اور یہی عفت بڑھ کر ورزش جسمانی تک پہنچیں گی۔ چنانچہ ہماری ریاست کے نوجوان بہ نسبت سابق کم متدن ہوں گے۔ ایک پشت بعد ایسے حکمران مقرر ہوں گے جن میں محافظین کی یہ قوت نہ ہوگی کہ ہماری ان مختلف نسلوں کی کیفیت فلزائی کو پرکھ سکیں جو ہیس یاد کے مختلف طبقوں کی طرح سونے، چاندی، پتیل اور لوہے سے بنی ہیں۔ اس طرح چاندی میں لوہے اور سونے میں پتیل کی آمیزش ہو جائیگی، اس سے عدم مطابقت، عدم مساوات اور بے ضابطگی تراوش کرینگی اور یہی ہمیشہ اور ہر جگہ نفرت اور جنگ کا سبب ہی ہیں، بنات لادب کے خیال میں جہاں کہیں اختلاف پیدا ہوا ہی اسی اصل سے پیدا ہوا ہی اور (ہماری سوال پر) ان کا یہ جواب ہے۔

گ۔۔ جی، اور ہم فرض کر سکتے ہیں کہ ان کا جواب سچ ہے۔

میں۔۔ اور کیا! ظاہر ہے کہ صحیح ہے۔ بھلا بنات لادب کیسے جھوٹ بول سکتی ہیں؟

گ۔۔ اچھا تو یہ بنات اور آگے کیا فرماتی ہیں؟



ہیں۔ اختلاف پیدا ہونے پر دونوں گروہ مختلف راستوں پر پڑے۔ لہے اور ہٹیل ولے روپیہ زمین، مکانات اور سیم وزر کے حصول پر ٹوٹ پڑے، لیکن سونے چاندی والا گروہ جنھیں روپیہ پیسہ کی حاجت نہ تھی کہ حقیقی دولت خود انکی طبائع میں موجود تھی، وہ نیکی اور قدیم صورت حالات کی طرف جھکا رہا۔ انھیں ایک جنگ ہوئی اور بالآخر باہم طر پاپا کہ یہ اپنی زمین اور مکانات مختلف افراد میں تقسیم کر دیں اور اب اپنے ان دوستوں اور گزارہ فراہم کرنے والوں کو جن کی آزادی کو یہ پہلے بچانے تھے لگے یہ خود غلام بنانے انھیں اپنی رعایا اور چاکر بنا لیا اور خود ان کے خدائے پرہ چوکی رکھنے اور جنگ کرنے میں مشغول ہو گئے۔

گ۔ میں یقین کرتا ہوں کہ آپ نے اس تغیر کی ابتدا کا صحیح تصور قائم کیا ہے۔ میں۔ اس طرح جو نئی حکومت پیدا ہوگی وہ حکومت خواص اور موثری حکومت کی ایک درمیانی شکل ہوگی۔ گ۔ بہت درست۔

ہیں۔ اچھا تغیر تو یہ پیدا ہوگا، لیکن اس تغیر کے بعد یہ کس طرح عمل پیرا ہوگا ظاہر ہے کہ یہ نئی ریاست چونکہ حکومت خواص اور کامل ریاست کے بین بین ہے اس لیے بعض خزیات میں ایک کی اتباع کریگی اور بعض میں دوسری کی اور بعض خصوصیات خود اس کی ہونگی۔

گ۔ درست۔

میں یہ حکام کی تعظیم، فوجی طبقہ کی زراعت، دستکاری اور عام تجارت سے  
 علیحدگی دعام دسترخوان پر مشترک کھانے کی رسم اور ورزش سہانی اور تربیتی بنی  
 پر توجہ ان تمام امور میں تو یہ ریاست پہلی ریاست سے مشابہ ہوگی۔  
 گ۔۔۔ صحیح۔۔۔

میں۔۔۔ لیکن چونکہ سادہ اور خاص فلسفی ملتے نہیں بلکہ اب یہ مخلوط عناصر سے  
 بنے ہوئے ہیں اس لیے فلسفیوں کو اقتدار دیتے ڈرتے اور انھیں چھوڑ کر ایسی کم چمید  
 اور جذباتی سیرتوں کی طرف رخ کرتے ہیں جو بالطبع امن کے مقابلہ میں جنگ کے لیے  
 زیادہ موزوں ہیں، اور پھر فوجی مضارب اور تدا بیر کی قدر اور دائم جنگ آزمائی۔ یہ  
 چیزیں زیادہ تر اس ریاست ہی سے مخصوص ہونگی۔

گ۔۔۔ جی۔۔۔

میں۔۔۔ ہاں، اور اس قماش کے لوگ روپیہ کی بڑی ہوس رکھیں گے جیسے  
 حکومت خواص میں رہنے والے رکھتے ہیں؛ ان میں سیم وزر کی ایک محفنی اور خوفناک  
 خواہش ہوگی، یہ اس مال کو تاریک مقاموں میں جمع کریں گے، انکے اپنے خزانے  
 اور گودام ہوں گے جن میں انھیں چھپا کر رکھ سکیں۔ یہ محل بنائیں گے جو ان کے اندوں  
 کے لیے مناسب حال گھونسنے ہوں گے اور ان میں یہ اپنی بیویوں پر یا اور چہر پر پیگے  
 بڑی بڑی رقمیں صرف کریں گے۔

گ۔۔۔ بالکل سچ ہے۔



میں۔ یہ کنجوس ہوں گے کہ جس روپیہ کی یہ قدر کرتے ہیں اسے علانیہ حاصل کر لیا کوئی ذریعہ ان کے پاس نہیں؛ یہ اپنی خواہشات کے پورا کرنے کے لیے وہ مال صرف کرتے ہیں جو دراصل دوسرے کا ہے؛ یہ اپنی دسترس میں چوری سے حاصل کرتے ہیں اور پھر جس طرح بچے اپنے باپ سے بھاگتے ہیں یہ قانون سے فرار ہوتے ہیں۔ انکی تربیت نرم اثرات سے نہیں بلکہ جبر سے ہوئی ہے، کیونکہ انھوں نے اس سے پہلے ہی کی جو حقیقی ادب کی دیوی ہے اور عقل اور فلسفہ کے ہمراہ اور ورکش جمانی کی موسیقی سے زیادہ مغت کی۔

گ۔۔ بلاشبہ حکومت کی جس قسم کو آپ بیان کر رہے ہیں وہ خیر و شر کی ایک آمیزش ہے۔

میں۔۔ ہاں، آمیزش تو ہے، لیکن اس میں ایک چیز اور بس ایک ہی چیز ہیں طور پر نظر آتی ہے یعنی ہوس اور نزاع کا جذبہ، اور اس کی وجہ سے جذباتی یا تسخیر عناصر کا تسلط عام۔

گ۔۔ یقیناً۔

میں۔۔ تو اس بابت کی اصل اور اس کی حالت یہ ہے۔ میں نے صرف خاکہ بیان کیا ہے، زیادہ تفصیل کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ کامل طور پر اور کامل طور پر بے انصافی پر مبنی نمونوں کے اظہار کے لئے بس ایک خاکہ ہی کافی ہے۔ ورنہ یوں تو تمام ریاستوں اور تمام انسانی سیرتوں کا ایسا بیان کہ کوئی نہ چھوٹنے پائے ایک

سعی لامتناہی ہوگا۔

گ۔ بہت صحیح۔

میں :- اب دیکھیں کہ حکومت کی اس قسم کا جواب کون انسان ہو ایسے کیسے پیدا ہوتا ہے اور کس چیز سے مشابہ ہے؟

ایڈمنٹیس :- میرے خیال میں اس میں جذبہ نزاع کی جو خصوصیت امتیاز ہے اس کے اعتبار سے وہ ہمارے دوست گلاکون سے کچھ مختلف نہیں۔

میں :- ہاں، شاید اس ایک اعتبار سے وہ انکا مشابہ ہو، لیکن اور بہت اعتبارات سے وہ بہت مختلف ہوتا ہے۔

ایڈ :- یہ کونسے اعتبارات؟

میں :- اس میں اپنی مابت کی ذرا زیادہ پرح ہونی چاہیے۔ اسے ذرا کم تمدن ہونا چاہیے لیکن پھر بھی وہ تمدن کا دوست ضرور ہو۔ سامع اچھا ہو لیکن بولتا نہ ہو۔ برضلاف تعلیم یافتہ آدمیوں کے جو اپنے کو اس سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ یہ غلاموں کے ساتھ ذرا دشت ہوگا، احرار کے ساتھ متواضع اور حکومت کا خاص طور پر تابعدار۔ یہ اقتدار اور عزت کا عاشق ہوگا اور حاکم بننے کا مدعی، اس بنا پر نہیں کہ نہایت جاوید بیان ہی یا اور کسی ایسی وجہ کے بنا پر بلکہ اس لیے کہ یہ سپاہی ہے اور سپہ گری کے کارہائے نمایاں انجام دیکھا ہے۔ یہ ورزش جسمانی کا بھی بڑا شائق ہوگا اور نیز شکار کا۔

ایڈ :- جی ہاں۔ یہ سیرت کا وہ نمونہ ہے جو حکومت اختیار سے مطابق ہے۔



میں۔۔۔ ایسا شخص صرف اپنی جوانی میں دولت کو نظر تجارت سے دیکھتا ہے، لیکن  
 جوں جوں اس کی عمر بڑھتی جائیگی یہ روز بروز اس کی طرف زیادہ کھینچا جائیگا۔ کیونکہ  
 اس کی فطرت میں حرص اور لاپچی طبیعت کا ایک جزو موجود ہے اور چونکہ اپنے بہترین  
 محافظ کو کھو چکا ہے اس لیے نیکی کی طرف یکسوئی کے ساتھ مائل نہیں۔

ایڈ۔۔۔ یہ محافظ کون تھا؟

میں۔۔۔ موسیقی میں تپا ہوا فلسفہ۔ جو اگر انسان کے اندر اپنی جگہ کر لیتا ہے اور  
 ساری عمر اس کی نیکی کا تنہا محافظ رہتا ہے۔

ایڈ۔۔۔ خوب۔

میں۔۔۔ اچھا تو غنی نوجوان ایسا ہوتا ہے اور یہ غنیمت کی ریاست کا  
 مشابہ اور مماثل ہے۔

ایڈ۔۔۔ بالکل۔

میں۔۔۔ اس کا آغاز یوں ہوتا ہے۔ یہ عموماً کسی بیادرباب کا جوان لڑکا ہوتا ہے  
 یہ باب کسی بڑی طرح محکوم شہر کا باشندہ ہے، اس شہر کے اعزاز اور منصب سے انکار کرتا ہے،  
 اور نہ عدالتی چارہ جوئی کرتا ہے نہ اور کسی طرح اپنا اثر ڈالتا ہے بلکہ مصیبت سے بچنے کیلئے  
 اپنے حقوق سے دست بردار ہونے پر آمادہ ہے۔

ایڈ۔۔۔ اور بیٹا پھر کس طرح عالم وجود میں آتا ہے؟

میں۔۔۔ اس کی سیرت کی نشوونما اس وقت شروع ہوتی ہے جب یہ اپنی ماں کو شکوہ

کرتے سٹتا ہے کہ میرے شوہر کی حکومت میں کوئی حیثیت نہیں اور اس وجہ سے مجھے عورتوں میں کوئی تفوق حاصل نہیں ہوتا۔ پھر جب یہ اپنے شوہر کو دیکھتی ہے کہ اسے روپیہ پیسے سے زیادہ شغف نہیں اور بجائے اسکے کہ قانونی عدالتوں یا مجلسوں میں جا کر اس کے لیے رٹے جھگڑے اس کو جو بھی پیش آئے اسپر چپ ہو رہتا ہے، نیز حسب یہ دیکھتی کہ اسکے خیالات کامرکز خود اس کی اپنی ذات ہے اور وہ اس کے ساتھ بہت بے اعتنائی کا برتاؤ کرتا ہے تو یہ اسپر چڑتی بگڑتی ہے اور اپنے بیٹے سے کہتی ہے کہ تیرا باپ بس آدھا انسان ہے اور نہایت سہل انگارہ اور اسپر اپنے ساتھ بدسلوکی کی وہ تمام شکایتیں بھی اصرافہ کرتی ہے جن کی تکرار کی عورتیں بہت شائق ہوتی ہیں۔

ایڈ:۔۔۔ جی ہاں، شکایتوں کی انکے پاس کیا کمی ہے جیسی یہ ویسی انکی شکایتیں۔ میں۔ اور تم جانو بوڑھے بوڑھے نوکر چاکر جو خاندان کے ساتھ وابستہ سے ہوتے ہیں یہ بھی کبھی کبھی اپنے طور پر لڑکے سے اسی انداز کی بات چیت کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ہے جس پر اس کے باپ کا کچھ قرض آتا ہے یا کوئی کسی اور طرح اسے نقصان پہنچا رہا ہے اور یہ اس کے خلاف کوئی چارہ جوئی نہیں کرتا تو یہ اس نوجوان بیٹے سے کہتے ہیں کہ تم جب بڑے ہونا تو اس قسم کے لوگوں سے بدلہ لینا اور اپنے باپ سے زیادہ مرد ہونا۔ پھر یہ جہاں ذرا باہر نکلتا ہے تو اسی قسم کی باتیں دیکھتا اور سٹتا ہے۔ شہر میں جو لوگ بس اپنے کام سے کام رکھتے ہیں انھیں سادہ لوح سمجھا جاتا ہے اور ان کی کوئی عزت نہیں کرتا ہوا خواہ مخواہ دخل در معتولات دینے والوں کی تعریف بھی ہوتی ہے عزت بھی نتیجہ یہ ہوتا ہے



کہ جب یہ نوجوان ادھر یہ ساری باتیں سنتا اور دیکھتا ہے اور دھراپنے باپ کی باتیں سنتا اور اس کے طریقہ زندگی کو قریب سے دیکھتا ہے اور دوسروں کے حال سے اس کا مقابلہ کرتا ہے تو دو مخالف سمتوں میں کھینچتا ہے۔ باپ تو اس کی روح کے اصول عقلی کی پرورش اور آبیاری کر رہا ہے اور دوسرے جذباتی اور شہتہاری اصولوں کو اگسا رہتے ہیں، خود چونکہ اس کی فطرت تو خراب ہی نہیں صرف صحبت بُری ہی اس لیے ان مشترک اثرات سے یہ ایک درمیانی نقطہ پر آجاتا ہے اور مسابقت اور جذبہ کے اس درمیانی اصول کے بدلہ اس دولت کو کھو بیٹھتا ہے جو اس کے اندر موجود تھی اور متمدن و ترقی پزیر بن جاتا ہے۔

ایڈ: میری رلے میں تو اسکی اصل مسئلے نہایت کمال کیسا تھا بیان فرمائی۔  
 میں :- تو اب حکومت کی دوسری قسم اور سیرت کا دوسرا نمونہ آتا ہے؟  
 ایڈ: جی۔

میں :- آؤ اب ایک دوسرے شخص کو دیکھیں جو بقول ایسکلس "ایک دوسری ریاست کے مطابق ہے" یا پھر اپنی تدبیر کے موافق پہلے ریاست سے شروع کریں۔  
 ایڈ :- ضرور۔

میں :- میں سمجھتا ہوں کہ ترتیب سے اب حکومت خواص کا نمبر ہے۔

ایڈ :- آپ کس قسم کی حکومت کو حکومت خواص کہتے ہیں؟

میں :- ایسی حکومت کو جس کی بنیاد املاک کی قدر پر ہو جس میں مالدار با اقتدار

ہوں اور غریب اس سے محروم۔

ایڈ:۔ میں سمجھا۔

میں :- شروع میں مجھے یہ بیان کرنا چاہیے تاکہ حکومت انڈیا سے حکومت  
خواص میں تبدیلی کس طرح پیدا ہوئی؟

ایڈ:۔ جی ہاں۔

میں :- اس کے دیکھنے کے لیے تو کچھ ایسی نکھٹیں درکار ہیں کہ ایک قسم دوسری  
میں کس طرح آتی ہے۔

ایڈ:۔ کیسے؟

میں :- افراد کے خانگی خزانوں میں مال و زر کا جمع ہونا حکومت اغنیاء  
کی تباہی ہے۔ یہ لوگ پھر اس مال کے صرف کرنے کے ناجائز طریقے اختراع کرتے ہیں  
کیونکہ انہیں اور ان کی بیویوں کو پھلا قانون کا کیا کھٹکا؟

ایڈ:۔ جی، بیشک۔

میں :- پھر جب ایک دوسرے کو مالدار ہوتے دیکھتا ہے تو اس کا متبادل کرنا چاہتا  
ہے اور اس طرح شہریوں کی تعداد کثیر مال و زر کی دلدادہ ہو جاتی ہے۔

ایڈ:۔ بہت ممکن ہے۔

میں :- یوں یہ دن بدن مالدار ہوتے جاتے ہیں اور جوں جوں دولت کمانے  
کا خیال بڑھتا ہے نیکی کا دھیان کم ہوتا جاتا ہے۔ کیونکہ جب دولت اور نیکی ساتھ ساتھ ترقی



کے پتوں میں رکھی ہوں تو ہمیشہ جیسے جیسے ایک پلہ چھلکے گا دوسرا پلہ اٹھے گا۔

ایڈ۔ - سچ ہے۔

میں۔ - اور جس نسبت سے دولت اور دولت مند لوگوں کی رباہست میں عزت ہوگی

اسی نسبت سے نیکوں کی بے عزتی ہوگی۔

ایڈ۔ - ظاہر ہے۔

میں۔ - اور جس کی عزت ہوتی ہو اسی کی لوگ پرورش کرتے ہیں اور جس کی عزت

نہیں اس سے غفلت کرتے ہیں۔

ایڈ۔ - ظاہر ہے۔

میں۔ - اس طرح بالآخر مسابقت اور جاہ و جلال کے بجائے

لوگ تجارت اور روپیہ کے عاشق ہو جاتے ہیں۔ اب یہ مالدار کی عزت اور توقیر کرنے

لگتے اور اُسے اپنا حاکم بناتے ہیں اور غریب آدمی کی بے عزتی ہونے لگتی ہے۔

ایڈ۔ - جی، ایسا ہی ہوتا ہے۔

میں۔ - پھر یہ ایک قانون بناتے ہیں جس میں شہری بننے کے لیے ایک رقم بطور

شرط مسترد کر دی جاتی ہے اور حکومت خواص کے کم یا زیادہ محدود ہونے

کے اعتبار سے کہیں یہ رقم کم ہوتی ہے کہیں زیادہ۔ جس شخص کی املاک اس رقم مقررہ

کم ہوتی ہے اسے یہ حکومت میں کوئی حصہ نہیں لینے دیتے۔ اگر ڈرانے دھمکانے ہی سے

کام نہ چل گیا تو دستور اساسی میں یہ تغیر یہ لوگ بزور شمشیر عمل میں لاتے ہیں۔

ایڈ :- بہت درست۔

میں :- عام طور پر حکومت خواص کے قیام کا یہ طریقہ ہے۔

ایڈ :- جی درست۔ لیکن اس قسم حکومت کی خصوصیات کیا ہیں اور ہم جن

عیوب کا ذکر کرتے ہیں وہ کیا؟

میں :- سب سے پہلے تو شہریت کے لیے جو شرط ہے اس کی ماہیت پر نظر کرو۔ ذرا

سوچو کہ اگر ناخدا اور کشتی بانوں کا انتخاب ان کی املاک کے اعتبار سے ہونے لگے

اور ایک غیب آدمی کو چاہے وہ بہتر ناخدا ہو کشتی بان سے منع کر دیا جائے تو کیا پیش آئے

ایڈ :- آپ کا مطلب ہے کہ ہماز غرق ہو جائے؟

میں :- ہاں۔ اور کیا یہی بات اور ہر چیز کی حکومت کے بارہ میں صحیح نہیں؟

ایڈ :- میں تو یہی سمجھتا ہوں۔

میں :- لیکن شہر متشینی ہے؟ یا آپ شہر کو بھی شامل کرتے ہیں؟

ایڈ :- نہیں نہیں۔ شہر کا معاملہ تو سب سے زیادہ سنگین ہے۔ چونکہ شہر کی حکومت

سب سے بڑی جہی ہے اور سب سے مشکل بھی۔

میں :- اچھا تو حکومت خواص کا پہلا بڑا عیب تو یہ ہے۔

ایڈ :- ظاہر ہے۔

میں :- اور ایک عیب یہ ہے اور یہ بھی اتنا ہی برا ہے۔

ایڈ :- وہ کیا؟



میں :- اس کی ناگزیر تقسیم ایسی ریاست ایک نہیں بلکہ دو ریاستیں ہیں۔ ایک غریبوں کی ریاست اور ایک مسکینوں کی، یہ دونوں ایک جگہ پر رہتی اور ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف سازش کرتی رہتی ہیں۔

ایڈ :- یقیناً۔ یہ بھی کم از کم اتنی ہی خراب بات ہے۔

میں :- ایک اور بڑی بات یہ ہے کہ اسی گذشتہ بلاوجہ سے یہ کوئی جنگ نہیں کر سکتے۔ یا تو یہ جمہور کو مسلح کریں اور اس صورت میں یہ دشمن سے زیادہ خود اپنے خائف ہوتے ہیں یا پھر اگر جنگ کی وقت نہیں نہ نکالیں تو یہ خود تو پھر خواص ہی ہیں جیسے حکومت کرنے کے لیے تھوڑے سے ویسے ہی لڑنے کے لیے تھوڑے سے اور اسی کے ساتھ ساتھ چونکہ روپیہ سے نہیں محبت ہوتی ہے اس لیے محاصل ادا نہیں کرنا چاہتے۔

ایڈ :- کیسی عیب کی بات ہے!

میں :- اور جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اس قسم کے دستوں کے ماتحت ایک ہی شخص کے متعدد پیشے ہوتے ہیں۔ فلاح، تاجر، سپاہی سب کچھ ایک ذات میں جمع ہیں۔ یہ کیا کچھ اچھا معلوم ہوتا ہے؟

ایڈ :- اور سب کچھ سہی اچھا ہی نہیں۔

میں :- ایک عیب اور ہو گا لیکن سب سے بڑا ہے اور جو پہلے پہل اس ریاست سے

اپنا اثر کرتا ہے۔

ایڈ :- وہ کیا عیب ؟

میں :- ایک شخص کے پاس جو کچھ بھی ہو وہ اُسے سب کو بیچ سکتا اور دوسرا اُسے حاصل کر سکتا ہے۔ اور پھر اس بیع کے بعد بھی وہ اس شہر میں رہ سکتا ہے جس کا اب وہ جز نہیں۔ نہ وہ تاجر ہو نہ دستکار نہ شہسوار ہو نہ بانگاہیں ایک غریب اور بے پارہ و گارہی آئیڈ :- جی ہاں، یہ بھی ایک عیب ہے جو پہلے پہل اسی روایت میں شروع ہوتا ہے، میں :- یقیناً یہ عیب وہاں منع نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ حکومت خواص میں کشمیر دولت اور مطلق افلاس کے دونوں انتہائی سرے ہوتے ہیں۔

ایڈ :- درست۔

میں :- لیکن ذرا پھر غور کرو کہ اپنے ایام تمول میں جب یہ شخص اپنی دولت خرچ کرتا تھا کیا شہریت کے اغراض کے لیے اس حالت سے ذرہ بھر بھی زیادہ مفید تھا ؟ یا کہ محض طباطبائی حکمران جماعت کا ایک رکن معلوم ہوتا تھا، اگرچہ درحقیقت نہ یہ حاکم تھا نہ محکوم بس ایک فضول خرچ آدمی تھا۔

ایڈ :- جیسا آپ نے فرمایا یہ نظام ہر حاکم معلوم ہوتا تھا لیکن تھا محض فضول خرچ۔

میں :- کیا اس کی حالت گھر کے نکھٹوں کی سی نہیں جیسے شہد کے چھتے میں نکھٹو

ہوتا ہے۔ اور جس طرح وہ چھتے کے لیے وبال ہوتا ہے یہ شہر کے لیے عذاب ہے۔

ایڈ :- بالکل درست (جناب) سقراط۔

میں :- اور ایڈمنٹینس، خدا نے ان اڑنے والے نکھٹوں کو تو



سب کو بے ڈنک بنایا ہی لیکن ان چلنے والوں میں کچھ تو اُسے بے ڈنک بنائے ہیں لیکن بعض کے نہایت خوفناک ڈنک ہوتے ہیں۔ بے ڈنک طبقہ میں تو وہ ہیں جو بچپن میں پہنچ کر اپنی زندگی بطور نادار فقیر کے ختم کرتے ہیں اور ڈنک والے گروہ سے وہ سارا طبقہ نکلتا ہی جسے مجرم کہتے ہیں۔

ایڈ۔۔ نہایت بجا۔

میں۔۔ صاف بات ہے کہ جب کبھی تم کسی ریاست میں مفلس در یوزہ گرد لکھو تو سمجھو کہ یہیں کہیں پروسس میں چور، گروہ کٹ، معیدوں کے لوٹنے والے اور مجرم کے بد معاش بھی ضرور پوشیدہ ہونگے۔

ایڈ۔۔ ظاہر ہے۔

میں۔۔ اچھا تو کیا خواص کی ریاست میں تمہیں فقیر نہیں ملتے؟

ایڈ۔۔ ہاں، (کیوں نہیں) ہر شخص جو حاکم نہیں وہ فقیر ہے۔

میں۔۔ اور کیا ہم یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ ان میں بہت سے مجرم بھی ملتے

ہیں، یہی ڈنک دار بد معاش جنہر حکام با اختیار بجز روک تھام رکھتے ہیں۔

ایڈ۔۔ بیشک ہم یہ جرأت کر سکتے ہیں۔

میں۔۔ ایسے لوگوں کے وجود کی علت تعلیم کا فقدان، تربیت کی خرابی، اور

ریاست کا برا دستور اساسی ہے۔

ایڈ۔۔ درست۔

میں۔ تو حکومت خواص کی یہ شکل ہو اور یہ اس کی برائیاں۔ اور من

ہو اور بہت سی برائیاں ہوں۔

ایڈ۔ بہت ممکن ہو۔

میں۔ اب ہر قسم حکومت خواص یعنی حکومت انکی اس قسم کو ختم کر سکتے

ہیں جس میں حکام کا انتخاب ان کی دولت کی بنا پر ہوتا ہے۔ آؤ اب اس فرد کی ماہیت اور اس کی اصل پر نظر کریں جو اس ریاست کے مطابق ہو۔

ایڈ۔ ضرور۔

میں۔ کیا اغنیاء خاصان میں اس طرح نہیں بدلتے۔؟

ایڈ۔ کس طرح؟

میں۔ ایک وقت آتا ہے کہ طبقہ اغنیاء کے نمائندہ کے لڑکا ہوتا

ہو۔ یہ لڑکا پہلے اپنے باپ کی نقل کرتا اور اس کے قدم بقدم چلتا ہے۔ لیکن آگے چل کر یہ

دیکھتا ہے کہ اس کا باپ ریاست سے ٹکرا کر اس طرح برباد ہو گیا جیسے کسی تہ آب چٹان

سے۔ یہ خود بھی تباہ ہوا اور جو کچھ اس کے پاس تھا وہ بھی۔ مثلاً ممکن ہو کہ اس کا باپ کوئی

سپہ سالار یا اور کوئی اعلیٰ افسر ہو جسکے خلاف چغلیخوروں نے بدگمانی پھیلانی۔ اس کی

وجہ سے اسپر مقدمہ چلا اور خزانے موت دی گئی یا اسے جلا وطن کر دیا گیا یا شہری کے

تمام حقوق سے اسے محروم کر کے اس کی ساری املاک اس سے چھین لی گئی۔

ایڈ۔ بہت ہی قرین قیاس بات ہے۔



میں۔ اور اس کے بیٹے نے یہ سب کچھ دیکھا اور سب کچھ جانا۔ اب وہ ایک  
 تباہ شدہ آدمی ہے اور خوف نے اسے سکھایا کہ اپنے تختِ دل سے حوصلہ اور جذبہ کو  
 دھکے دیا رکال دے۔ جب فلاس نے اسے ذلیل کیا تو اسے روپیہ کمانے کی طرف توجہ  
 کی اور کمینہ پن اور کنجوسی سے پس انداز کر کے بڑی محنت سے دولت جمع کی۔ تو کیا  
 قرین قیاس نہیں کہ ایسا شخص اس خالی تخت پر اب اپنی فطرت کے شہوانی اور لاپچی  
 عنصر کو جگہ دے، اور اسے تاج، زریں توڑوں اور عصارہ شاہی سے آراستہ کر کے اپنے  
 اندر شہنشاہی کرنے کی اجازت دے

ایڈ۔ بہت صحیح۔

میں۔ اس شہنشاہ کے ہر دو جانب عقل اور فتنہ دوامہ کو بطور تابعدا  
 کے بٹھا کر ان کی ایک حیثیت بنائی گا اور ان میں سے ایک کو مجبور کرے گا کہ سوا  
 اسکے اور کچھ نہ سوچے کہ چھوٹی رئیس بڑی رقموں میں کیونکر تبدیل ہو سکتی ہیں اور دوسرے  
 کو دولت اور دولت مند لوگوں کے علاوہ کسی کی تعریف و تکریم نہ کرنے دیگا نہ کسی اور چیز کا  
 اتنا حوصلہ رکھنے دیگا جتنا کہ دولت اور ذریعہ حصول دولت کا۔

ایڈ۔ کوئی تغیر اس قدر سریع اور اس درجہ یقینی نہیں ہوتا جتنا کہ حوصلہ مند نوجوان  
 کا لاپچی نوجوان میں۔

میں۔ اور یہی لاپچی نوجوان رایستِ خاص کا نمائندہ ہے۔

ایڈ۔ جی۔ کم از کم جس سٹر میں سے یہ پیدا ہوا ہے وہ اس رایست کے مماثل

ضروری جس سے حکومت خواص پیدا ہوئی تھی۔

میں :- اچھا تو ذرا دیکھیں کہ ان میں کچھ مشابہت ہو یا نہیں؟

ایڈ :- بہت خوب۔

میں :- اولاً تو یہ دونوں دولت کی قدر کرنے میں مشابہ ہیں۔

ایڈ :- یقیناً۔

میں :- نیز اپنی مفلسانہ معنوی سیرت میں۔ یہ فرد صرف اپنی ضروری اشتهائوں

کو پورا کرتا ہے اور اپنا صرف انھیں تک محدود رکھتا ہے۔ اور دوسری خواہشوں کو اس

خیال سے دباتا ہے کہ بے سود ہیں۔

ایڈ :- درست۔

میں :- یہ بڑا ہی خسیس ہوتا ہے، ہر چیز میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کر کے اپنی

تھیلی بھرتا ہے اور اس قسم کے آدمی کی لغو اور دنی لوگ مدح و ستائش کرتے ہیں۔

کیا یہ شخص جس مایست کی نمائندگی کر رہا ہے اسکا صحیح عکس اور نمونہ نہیں؟

ایڈ :- مجھے تو معلوم ہوتا ہے۔ کم سے کم یہ بھی روپیہ پیسے کی بڑی قدر کرتا ہے اور یہ

مایست بھی۔

میں :- ہاں۔ اور یہ تربیت یافتہ آدمی بھی نہیں۔

ایڈ :- میرے خیال میں نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہ تعلیم یافتہ ہوتا تو ایک اندھے دیوتا

کو اپنی جمعیتہ مغنین کا ناظر و ہادی نہ بناتا نہ اسے کوئی مخصوص عزت دیتا۔



میں بہت خوب۔ لیکن ذرا اسپر غور کرو کہ آیا ہمیں اس شخص کے متعلق یہ بات اور نہ تسلیم کرنی چاہیے کہ عدم تربیت کے باعث اس میں ناوار اور بد معاشر کی کسی عفتلانہ خواہشیں پائی جائیں گی، جو اس کی زندگی کی عام عادت سے مجبوراً دلی رہتی ہیں۔

ایڈ۔۔۔ درست۔

میں۔۔۔ تم جانتے ہو کہ اس کی بد معاشریاں دیکھنی ہوں تو کہاں دیکھ سکتے ہو؟  
ایڈ۔۔۔ کہاں دیکھنا چاہیے؟

میں۔۔۔ تمہیں اسے ایسی جگہ دیکھنا چاہیے جہاں اسے بے ایمانی کا بہت بڑا موقع ہو، مثلاً یہ کسی تیسیم بچہ کا ولی و محافظ بنے۔

ایڈ۔۔۔ اچھا!

میں۔۔۔ ایسی صورت میں ظاہر ہو جائیگا کہ اپنے عام معاملات میں جن کے سبب سے اسے دیانتداری کی شہرت حاصل رہی ہے اپنے بڑے جذبات کو جبریہ کی سے دباتا ہے۔ یہ نہیں کہ ان پر ان کی غلطی ثابت کر دے یا عقل کے ذریعہ نہیں سدھالے بلکہ چونکہ اپنے مقبوضات کے لیے مارے ڈر کے کا پتا ہی لہذا ضرورت اور خوف سے ان جذبات کو روکے تھامے رہتا ہے۔

ایڈ۔۔۔ یقیناً۔

میں۔۔۔ ہاں، میرے عزیز دوست، تم فی الواقعہ یہ بات پاؤ گے کہ اسے کبھی

ایسی چیز صرف کرنی ہوتی ہے جو اس کی نہیں تو نکھٹو..... کی فطری خواہشیں عموماً اس میں موجود ہوتی ہیں۔

ایڈ:- ہاں، اور اسمیں بہ قوی بھی ہونگی۔

میں:- یہ آدمی گویا خود اپنے سے برس بڑھ چکا ہوگا، یہ دو آدمی ہونگے، ایک نہیں لیکن عام طور پر اس کی بہتر خواہشات ادنیٰ پر غالب ہیں گی۔

ایڈ:- درست۔

میں:- ان وجوہ سے ایسے آدمی کی اور بہتیروں سے زیادہ عزت ہوگی، مگر پھر بھی ایک ایک آواز وہم آہنگ روح کی سچی نیکی اس سے دور بھاگیگی اور کبھی اس کے قریب نہ پھٹکے گی۔

ایڈ:- میں تو یہی توقع کرتا ہوں۔

میں:- اور بالیقین انفرادی حیثیت سے یہ کنجوس بااست کے ہر انعام فحتمندی اور دوسری قابل عزت حوصلہ مند یوں کے لیے پڑے کم درجہ کا رذیل مقابل ہوگا۔ یہ ایسے مقابلوں میں عزت حاصل کرنے کے لیے روپیہ نہ صرف کرے گا، کیونکہ اپنی جھپٹی مصرفانہ خواہشوں کو بیدار کر کے اس کشمکش میں شامل کرنے اور اسے مدد لینے سے بہت ڈرتا ہے۔ خالص خواہی انداز سے یہ اس معرکہ میں اپنے وسائل کا ایک ٹھوڑا سا حصہ لگاتا ہے اور نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ انعام تو ہات سے جاتا ہے لیکن روپیہ بچ رہتا ہے۔

ایڈ:- بہت صحیح۔



میں :- کیا ابھی اور کوئی شبہ باقی ہے کہ کنجوس اور روپیہ کمانے والا آدمی جو وہی ریاست کے مطابق ہوتا ہے۔

ایڈ :- کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

میں :- اس کے بعد جمہوریت آتی ہے۔ اس کی اصل اور ماہیت پر ہمیں ابھی غور کرنا ہونی چاہیے اور اس پر اپنا فیصلہ عیاں کرنا ہے۔

ایڈ :- جی۔ یہ تو ہمارا قاعدہ ہی ہے۔

میں :- اچھا تو حکومت خواص سے جمہوریت میں تبدیلی کیسے پیدا ہوتی ہے؟ کیا اس طرح نہیں ہوتی کہ یہ ریاست جس خوبی کو اپنا مقصد بناتی ہے وہ یہ ہے کہ جس قدر ہو سکے مالدار بنے اور یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوتی؟

ایڈ :- اچھا تو پھر؟

میں :- حکمران چونکہ یہ جانتے ہیں کہ ان کی طاقت کا مدار ان کی دولت پر ہے اس لیے نوجوانوں کی فضول خرچیوں کو قانوناً روکنے سے انکار کرتے ہیں کہ ان کی تباہی میں ان کا فائدہ ہے۔ وہ اتنے سود لیتے ہیں ان کی جائدادیں خرید لیتے ہیں اور اس طرح اپنی دولت اور اہمیت میں اضافہ کرتے ہیں۔

ایڈ :- بالیقین۔

میں :- اس میں تو کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ دولت کی محبت اور جذبہ اعتدال ایک ہی ریاست کے شہریوں میں کسی قابل کا طحہ تک یکجا نہیں رہ سکتے۔ ایک کی

طرف سے غفلت ہوگی یا دوسری طرف سے۔

ایڈ۔۔ خاصی صاف بات ہے۔

میں۔۔ اور خواہی رہائستوں میں بے پروائی اور فضول خرچی کے رواج عام کے باعث اچھے اچھے خاندانوں کے لوگ اکثر بھیک کے ٹکڑوں سے لگ گئے ہیں۔

ایڈ۔۔ جی، اکثر۔

میں۔۔ لیکن پھر بھی یہ ہتے شہری میں ہیں۔ یہ سب بڑے مسلح اور آواز  
نیش زنی یہاں موجود ہیں۔ ان میں سے بعض قرضدار ہیں بعض کا حق شہریت غنیمت  
ہو چکا ہے، ایک تیسرا گروہ ہے جو دونوں وبالوں میں مبتلا ہے۔ یہ لوگ ان سے نفرت  
کرتے ہیں جنہوں نے ان کی املاک لے لی ہے اور انہیں سے کیا ہر دوسرے شخص سے  
بھران کے خلاف سازشیں کرتے اور انقلاب کے آرزو مند ہتے ہیں۔

ایڈ۔۔ سچ ہے۔

میں۔۔ دوسری طرف کاروباری لوگ ہیں جو سر جھکائے چلتے ہیں اور علوم  
بوتما ہی کہ جن لوگوں کو انہوں نے تباہ کیا ہے انہیں دیکھتے تک نہیں۔ یہ اپنا ڈنک  
(یعنی اپنا روپیہ)۔ اور کسی کے ماتے ہیں جو انہیں خبردار نہیں، اور جو اصل رقم یہ دیتے  
ہیں (اور جو بشرلہ والدین کے ہوتی ہے) اسکے بچے ہو کر ایک خاندان کی شکل میں کئی  
گوند ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح یہ ریاست میں کاہلوں اور مغلوں کی کثرت کا باعث  
ہوتے ہیں۔



ایڈ :- ہاں، یقیناً ان کی نوکثرت ہوگی۔

میں :- چنانچہ یہ خرابی اب آگ کی طرح بھڑک اٹھی ہے اور نیٹو استعمال اطلاق پر قبو د لگا کر اسے بچھلتے ہیں نہ دوسرے طریقے سے۔

ایڈ :- کون دوسرا طریقہ۔

میں :- وہ جو اسکے بعد بہترین طریقہ ہے اور جس میں یہ فائدہ ہے کہ وہ شہریوں کو اپنے اخلاق کی طرف توجہ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یعنی ایک عام قاعدہ ہو جائے کہ جو کوئی اپنی مرضی سے معاہدہ کرے وہ اپنی ذمہ داری پر کرے اس سے پشیمان نہ کرے بہت کم ہو جائے گی اور جن بُرائیوں کا ہم ذکر کر رہے تھے وہ رہائست میں گھٹ جائیگی۔

ایڈ :- جی، ان میں بہت کمی ہو جائیگی۔

میں :- فی الحال تو حکام ان محرکات کی وجہ سے جن کا مینے ذکر کیا اپنی رعایا سے بُرا بُرا کرتے ہیں۔ یہ خود اور ان کے محققین خصوصاً حکمراں طبقہ کے نوجوان تعیش اور جسمانی و دماغی کاہلی کی زندگی کے عادی ہو جاتے ہیں، یہ کچھ کرتے دھرتے تو ہیں نہیں اور مسرت الم دونوں کے مقابلہ کی صلاحیت ان میں نہیں رہتی۔

ایڈ :- بہت درست۔

میں :- انھیں تو بس وہ پیہ کھانے کی فکر ہوتی ہے اور نیکی کی پرورش کی طرف سے

یہ بھی اتنے ہی بے اعتنا ہوتے ہیں جتنا کہ نادار فقیر۔

ایڈ :- جی، بالکل یونہی بے نیاز۔

میں۔ اچھا ایسی صورت حالات ہو اور حکمراں اور رعایا اکثر ایک دوسرے سے ملتے ہی ہیں، کبھی سفر میں، کبھی کسی اور باہم ملنے کے موقع پر، کسی جا ترا پر یا تنگ کے کوچ میں ساتھ کے سپاہی یا ملاح کی حیثیت سے۔ اچھا اور خطرہ کے موقع پر ہی ایک دوسرے کا رویہ دیکھ لیتے ہیں، کیونکہ جہاں خطرہ ہو وہاں اس کا کوئی ڈر نہیں کہ مالدار غریبوں کی تحقیر کریں گے بہت ممکن ہے کہ دھوپ کا تپا ہوا مضبوط آدمی جنگ میں ایک ایسے مالدار آدمی کے دوش بدوش ہو جس نے کبھی اپنا رنگ نہیں ترا اب ہونے یا اور جس کے پاس گوشت کی بھی (ماشا اللہ) فراط ہے۔ اچھا جب یہ غریب اسے ہانپتا کا نپتا اور بدحواس دیکھتا تو بھلا کیسے اس نتیجہ پر نہ پہنچے گا کہ یہ لوگ مالدار محض اسوجہ سے ہیں کہ کسی دوسرے میں ان کے لوٹنے کی ہمت نہیں؟ پھر جب یہ اپنے طور پر باہم ملیں گے تو کیا ایک دوسرے سے یہ نہ کہیں گے کہ ”ہم اے جنگ آزماؤں کچھ یوں ہی سے ہیں“

ایڈ۔ جی، میں تو خوب واقف ہوں کہ یہ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔  
میں۔ اور جس طرح ایک کمزور جسم میں ایک معمولی سی خارجی بات واقعاً بیماری پیدا کر سکتی ہے اور بعض وقت تو بلا کسی خارجی تحریک کے خود اس میں ایک اندرونی کشمکش پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح ریاست میں جہاں کہیں کمزوری ہوتی ہے وہاں مرض کا ہونا بھی قرین قیاس ہے اور اس کے پیدا ہونے کی وجہ بہت خفیف سی ہو سکتی ہے۔  
پھر ایک جماعت اپنے خواہی اور دوسری اپنے جمہوی حلیفوں سے مدد لیتی ہے، ریاست



گویا بیمار پڑ جاتی اور خود اپنے سے برسریکا رہتی ہے۔ اور بعض وقت ممکن ہو کہ بلا کسی خارجی سبب کے اندرونی انتشار پیدا ہو جائے۔

ایڈ :- جی ہاں۔ یقیناً۔

میں :- اور جب غریب لوگ اپنے مخالفوں پر فتحیاب ہو جاتے ہیں، کچھ کو قتل اور کچھ کو جلا وطن کر چکے ہیں، اور رقیبہ کو آزادی اور اقتدار کا مساوی حصہ دیدیتے ہیں تو اس وقت جمہوریت وجود میں آتی ہے۔ یہ حکومت کی وہ قسم ہے جس میں حکام اور عہدہ دار عموماً قاعدہ اندازی سے منتخب کیے جاتے ہیں۔

ایڈ :- جی، جمہوریت کی ماہیت یہی ہے، چاہے انقلاب بڑا شمشیر ہوا ہو یا خون کی وجہ سے مخالف جماعت نے اپنے کو ہٹا لیا ہو۔

میں :- اچھا اب دیکھیں کہ انکا طرز زندگی کیا ہے، اور انکی حکومت کیسی ہے، کیونکہ جیسی حکومت ہوگی ویسے ہی آدمی ہوں گے۔

ایڈ :- ظاہر ہے

میں :- پہلی بات یہ کہ کیا یہ لوگ آزاد نہیں، کیا شہر آزادی اور صاف گوئی سے پر نہیں؟ آدمی جو چاہے کہہ سکتا ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔

ایڈ :- کہا تو ایسا ہی جاتا ہے۔

میں :- اور جہاں آزادی ہو وہاں ظاہر ہے کہ ہر فرد اس قابل ہوتا ہے کہ اپنی زندگی کو جیسے چاہے مرتب کرے۔

ایڈ :- ظاہر ہے۔

میں :- ایسی ریاست میں انسانی طبائع کا بڑے سے بڑا تنوع ہوگا۔

ایڈ :- جی، ہوگا۔

میں :- چنانچہ یہ سب سے خوشنما ریاست معلوم ہوتی ہے جس کی مثال ایک کڑھے ہوئے لباس کی سی ہے جس پر طرح طرح کے پھول بنے ہیں۔ اور جس طرح خواتین اور بچے رنگوں کے تنوع کو اور سب چیزوں سے زیادہ دلنفریب سمجھتی ہیں اس طرح بہت سے آدمی ہیں جنہیں یہ ریاست جو مختلف انسانی اطوار اور سیرے پیرا سترہ سب سے حسین اور خوشنما ریاست معلوم ہوگی۔

ایڈ :- جی۔

میں :- جی ہاں، جناب عالی، اور حکومت کی تلاش کر نیوالے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی ریاست نہ ہوگی۔

ایڈ :- یہ کیوں؟

میں :- اس ریاست میں جو حریت ہو اسکے سبب سے یہاں ہر طرح کے دستور اساسی کا ایک کامل مجموعہ ملیگا۔ اور جس کسی کو ہماری طرح ایک ریاست بنانے کا خیال ہو اسے جمہوریت میں ایسے چلا جانا چاہئے جیسے ایک بازار میں جہاں دستور لکھی ہیں اور جو اس کے مناسب حال ہو اسے چن لینا چاہیے۔ پھر اس انتخاب کے بعد وہ اپنی ریاست قائم کر سکتا ہے۔



ایڈیٹرز سے یقیناً کافی نمونے ملیں گے۔

میں :- اور اگر آپ خود ہی نہ چاہیں تو باوجود صلاحیت کے آپ کے لیے حکومت کرنا یا محکوم بننا لازمی نہیں، نہ یہ ضروری ہے کہ جب سب جنگ کریں تو آپ بھی جنگ کریں یا سب امن سے رہتے ہوں تو آپ بھی امن سے رہیں۔ ہاں آپ ہی کا جی چاہے تو اور بات ہے۔ نہ یہ ہی ضروری ہے کہ اگر کوئی قانون آپ کو کسی عہدے کے پر کرنے سے یا قاضی بننے سے منع کرتا ہے اور آپ کا جی اُسکو چاہتا ہے تو آپ اس عہدہ کو نہ حاصل کر سکیں یا قاضی نہ بن سکیں۔ کیا زندگی کا یہ طریقہ کم ہی کم ایک لمحہ کے لیے بغایت خوش آئند نہیں معلوم ہوتا ہے۔

ایڈیٹرز :- ہاں، فی الوقت تو معلوم ہوتا ہے۔

میں :- اور کیا بعض صورتوں میں مجرموں کے ساتھ ان کی انسانیت نہایت دلفریب نہیں ہوتی؟ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جمہوریت میں بہت سے لوگ جنہیں سزا موت یا جلا وطنی کا حکم مل چکا ہے وہ جہاں تھے وہیں رہتے ہیں اور ادھر ادھر ساری دنیا میں مٹ گشت مگاتے ہیں یہ بزرگ بڑے بطل بنے اکثر تھے پھرتے ہیں اور کوئی نہ دیکھتا ہے نہ خیال کرتا ہے۔

ایڈیٹرز :- جی، بہت سارے۔

میں :- اس کے علاوہ جمہوریت کے جذبہ عفو اور چھوٹی چھوٹی باتوں کے متعلق ”چیچم“ کا اندازہ بھی دیکھو اور ان تمام لطیف اصولوں کی طرف سے بے اعتنائی

جو ہم نے اپنے شہر کے قیام کے وقت نہایت اہتمام سے قائم کیے تھے، مثلاً یہ کہ سوائے نہایت ہی نادر طور پر فاضل طبائع کے اور کوئی اچھا آدمی ہرگز ایسا نہ ہوگا جو بچپن سے سین چیزوں کے ساتھ کھیلنے، ان سے لطف اندوز ہونے اور سبق حاصل کرنے کا عادی نہ ہو۔ یہ جمہوریت کس شان سے ہمارے اُن تمام لطیف تصورات کو پاؤں تلے روندتی ہے اور ان مشاغل کی طرف ایک اُن وہ بیان نہیں کرتی جسے مدبر بنا ہی بلکہ ہر اس شخص کو عزت بخش دیتی ہے جو جمہور کا دوست ہوئے گا مدعی ہو۔

ایڈ۔۔۔ یہ جمہوریت تو پھر نہایت ہی شریف الطبع چیز ہے!

میں۔۔۔ جمہوریت کی یہ اور ان ہی جیسی اور خصوصیات ہیں (بہر حال) ہر یہ حکومت کی نہایت دل فریب شکل، تنوع اور بد نظمی سے پر، اور مساوی اور غیر مساوی سب کو یکساں مساوات دینی والی۔

ایڈ۔۔۔ جی، ہم اس سے تو خوب واقف ہیں۔

میں۔۔۔ اب ذرا دیکھو کہ اس کا فرد کس قسم کا انسان ہے، بلکہ جیسے رہائش کے ساتھ کیا ہے یہ دیکھو کہ یہ فرد کس طرح وجود میں آتا ہے؟

ایڈ۔۔۔ بہت خوب۔

میں۔۔۔ کیا اس طرح نہیں؟۔۔۔ کہ یہ ایک کنجوس حکومت خواص سے تعلق

رکھنے والے باپ کا بیٹا ہے جسے اسے اپنی جیسی عادتوں ہی کی تربیت کی ہے؟

ایڈ۔۔۔ بالکل۔



میں :- اور باپ کی طرح یہ بھی اپنی ان تمام خواہشوں کو بھیر دیا تاہی جو کمانے سے نہیں بلکہ خرچ کرنے سے متعلق ہیں کہ یہ وہ حالتیں ہیں جنہیں غیر ضروری کہا جاتا ہے۔  
ایڈ :- ظاہر ہے۔

میں :- کیا وضاحت کی خاطر تم ضروری اور غیر ضروری خواہشوں میں امتیاز کرنا چاہتے ہو؟  
ایڈ :- ضرور۔

میں :- ضروری خواہشیں کیا وہ نہیں جسے ہمیں کوئی مفر نہیں اور جن کے پورا کرنے سے ہمیں فائدہ ہوتا ہے؟ انہیں بجا طور پر ضروری کہا جاتا ہے، کیونکہ ہمیں فطرت نے بنایا ہی اس طرح ہے کہ ہم ان چیزوں کی خواہش کریں جو مفید بھی ہوں اور لازمی بھی اور ان کے خلاف ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں۔  
ایڈ :- درست۔

میں :- لہذا انہیں ضروری بتلانے میں ہم غلطی پر نہیں ہیں؟  
ایڈ :- جی، نہیں۔

میں :- لیکن وہ خواہشیں جسے آدمی اگر بچپن سے برابر سہی کرے تو بچ سکتا ہے اور علاوہ بریں جن کی موجودگی سے کوئی نفع نہیں ہوتا بلکہ بعض صورتوں میں اسکے برعکس ہے۔ تو کیا ایسی خواہشوں کو غیر ضروری کہنے میں ہم حق بجانب نہ ہونگے؟  
ایڈ :- ہاں، یقیناً۔

میں۔ اچھا تو دو نو قسموں کی ایک ایک مثال لیں تاکہ ان کا ایک عام تصور قائم ہو جائے۔

ایڈ۔ بہت خوب۔

میں۔ کیا کھانے کی خواہش ضروری قسم میں شامل نہ ہوگی، یعنی ایسی وہ غذا اور مسالہ کی خواہش جو ندرستی اور جہانی قوت کے لیے درکار ہو۔؟

ایڈ۔ میں تو سمجھتا ہوں۔

میں۔ کھانے کی خواہش دو طرح ضروری ہے، ایک تو اس سے ہمیں فائدہ ہوتا، اور دوسرے زندگی کے بقا کے لیے لازمی ہے۔

ایڈ۔ جی۔

میں۔ لیکن چاٹ اور مسالے تو بس وہیں تک ضروری ہیں جہاں تک صحت کو فائدہ پہنچائیں؟

ایڈ۔ یقیناً

میں۔ لیکن وہ خواہشیں جو اس کے آگے بڑھتی ہیں، مثلاً زیادہ نفیس غذا اور دیگر تعیشات کی خواہش کہ جسے اگر لڑکپن سے سادھا اور قابو میں لایا جائے تو عموماً اس سے بچاؤ ہو سکتا ہے اور جو (ادھر) جسم کے لیے مضر اور (ادھر) خیر و حکمت کی تلاش میں روح کے لیے مضر، تو انھیں تو بجا طور پر غیر ضروری کہا جاسکتا ہے؟

ایڈ۔ بہت بجا۔



میں کیا شہوانی اور دیگر خواہشات کا بھی یہی حال ہے؟

ایڈ :- جی ہاں ۔

میں :- وہ لکھنؤ جس کا ہم نے ذکر کیا تھا وہ شخص ہے جو اس قسم کی خواہشات اور شہوات سے پُر اور غیر ضروری خواہشوں کا غلام ہو، برخلاف اس کے جو صرف فوری خواہشات کے اثر میں ہو وہ کنجوس اور حکومتِ خواص سے تعلق رکھنے والا ہے۔

ایڈ :- بہت درست ۔

میں :- اچھا تو پھر یہ دیکھیں کہ خواص سے جمہومی آدمی کیسے پیدا ہوتا ہے؟ میرا گمان ہے کہ عام طور پر یہ صورت ہوتی ہے۔

ایڈ :- وہ کیا؟

میں :- ایک نوجوان شخص جس کی تربیت نہایت گندے اور کنجوس طریقہ سے ایسی ہوئی ہے جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا جب ایسے لکھنؤ کو شہد کا چسکا لگتا ہے اور ایسی خوشخوار اور مکار طبائع کی صحبت میں رہتا ہے جو اسکے لیے ہر قسم کے نفائس، اور نت نئی مستزین مہیا کر سکتے ہیں تو تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اسکے اندر جو خواصی اصول ہو وہ جمہومی اصول میں تبدیل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

ایڈ :- لازماً۔

میں :- اور جیسے شہر میں مماثل نے مماثل کی مدد کی تھی اور انقلاب اس طرح ہوا تھا کہ باہر سے ایک حلیف نے شہریوں کی ایک جماعت کی ملک کی اسی طرح

اس نوجوان میں بھی تبدیلی یونہی رونما ہوتی ہو کہ اس کی اندرونی خواہشوں کی مدد کے لیے باہر سے خواہشوں کا ایک گروہ آتا ہو اور یہاں بھی مشابہہ و مماثل مشابہہ و مماثل کی مدد کرتے ہیں۔

ایڈ۔۔ یقیناً۔

میں۔۔ اور اگر کوئی حلیف اس کے خواہشی اصول کی مدد کرتا ہے یہ باہر باہر شہدایوں کی نصیحت ہو یا بلا مست تو اس کی روح میں ایک فرقہ پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے مخالف ایک اور فرقہ۔ اور یہ خود اپنے سے برسرِ پیکار ہو جاتا ہے۔

ایڈ۔۔ ایسا ہونا لازمی ہے۔

میں۔۔ چنانچہ بعض وقت جمہوری اصول خواہشی اصول سے بے لگتا ہو سکی بعض خواہشیں مر جاتی ہیں بعض منسرد ہو جاتی ہیں، اس نوجوان کی روح میں جذبہ تکرم داخل ہو جاتا ہے اور اس طرح (اس کی روح کا) نظم راپس آجاتا ہے۔

ایڈ۔۔ جی، کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔

میں۔۔ پھر جب پرانی خواہشیں نکل جاتی ہیں تو ان جیسی اور نئی اٹھ کھڑی ہوتی ہیں اور چونکہ یہ انکا پیدا کرنا والا انھیں تعلیم دینا نہیں جانتا اس لیے یہ تعداد میں بڑھتی اور زور پکڑتی ہیں۔

ایڈ۔۔ جی، اکثر ایسا ہوتا ہے۔

میں۔۔ یہ پھر اسے اپنے پرانے ہنشتیوں کی طرف کھینچتی اور ان سے خفیہ رابطہ



پیدا کر کے خوب نپتے دیتی ہیں اور بڑھتی ہیں۔

ایڈ۔ بہت صحیح۔

میں :- بالآخر یہ اس نوجوان کی روح کے قلعہ پر قابض ہو جاتی ہیں اور اسے تمام مکارم، مشاغل حسہ اور کلمات صادقہ سے خالی باپتی ہیں کہ یہ چیزیں تو ان انسانوں کے دماغوں کو اپنا مسکن بناتی ہیں جو دیوتاؤں کے چہیتے اور اُنکے بہترین محافظ و پاسبان ہیں۔

ایڈ :- ان سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے۔

میں :- چنانچہ جھوٹے اور شیخی خورے عقائد و اقوال اور پرچہ کران کی جگہ لے لیتے ہیں۔

ایڈ :- ایسا ہونا تو یقینی ہے۔

میں :- اب یہ نوجوان پھر اس ایونیوں کے ملک میں لوٹتا ہے اور وہیں اپنا اختیار کرتا ہے۔ پھر اگر اس کے دوست اس کے خواصی حصہ کو کوئی مدد بھیجیں تو یہ متفاخرانہ عقائد جن کا ذکر ہوا قلعہ شاہی کے دروازے بند کر دیتے ہیں اور نہ اسے سفارت کو داخل ہونے دیتے ہیں نہ بزرگوں کی اس پدرانہ پسند ہی کو سنتے یا مانتر ہیں جو خانگی طور پر کوئی پیش کرے۔ پھر ایک جنگ ہوتی ہے اور معرکہ انھیں کے ہاتھ رہتا ہے۔ اب یہ انگسار کو جسے یہ حماقت کہتے ہیں نہایت شرمناک طریقہ سے نکال باہر کرتے ہیں اور عفت و اعتدال کو جس کا عرف انھوں نے نامردی رکھا ہے وہ دل میں

روند کرا لگ پھینک دیتے ہیں۔ یہ لوگوں کو باور کراتے ہیں کہ اعتدال اور باضابطہ  
 خراج ذناب اور کم ظرفی ہی۔ چنانچہ بڑی خواہشات کے ایک ابوہ کی مدد سے یہ شخصیں  
 سرحد پار بھگا دیتے ہیں۔

ایڈ۔ جی، دیدہ و دستہ۔

میں۔ جب اس شخص کی روح پر تسلط حاصل ہو گیا اور انھوں نے اسے  
 بالکل خالی اور صاف کر کے اسے بڑے بڑے اسماء کا محرم بنا لیا تو اب دوسرا قدم  
 یہ ہوتا ہے کہ یہ اپنے مسکن میں گستاخی اور بے راہ روی، تعیش اور بیجانی کو اس انداز  
 سے واپس لاتے ہیں کہ یہ ایک شاندار جلوس میں سرور پر بارہننے آتے ہیں، انکی  
 معیت میں ایک کثیر مجمع ہوتا ہے جو انکی مدح کے گیت گاتا اور انھیں پیارے پیارے  
 ناموں سے مخاطب کرتا ہے۔ گستاخی کو یہ تہمت کہتے ہیں اور بے راہ روی کو آزاد  
 تعیش کا نام ان کے ہاں شان و شوکت ہے اور بیجانی کا جرأت۔ اور اس طرح یہ نوجوان  
 اپنی اصلی فطرت سے جس کی تربیت ضرورت کے مدرسہ میں ہوئی تھی بیکار اور غیر ضروری  
 مسرتوں کی آزادی اور فسق و فجور میں پونج جاتا ہے۔

ایڈ۔ جی ہاں۔ اسکی یہ تبدیلی تو نہایت واضح ہے۔

میں۔ پھر اس کے بعد یہ اپنی زندگی کے دن یوں گزارتا ہے کہ غیر ضروری مسرتوں  
 پر بھی اسے طبع اپنا مال اپنی محنت اور اپنا وقت صرف کرتا ہے جیسے ضروری پر لیکن اگر یہ  
 قسمت کا اچھا ہے اور اس کے حواس بہت زیادہ منتشر نہیں ہوئے ہیں تو کچھ عمر کے جب



جذبات کا شباب ڈھل جائیگا تو ممکن ہے یہ شہر بدبکی ہوئی خوبوں میں سے بعض کو بھرا دے  
 ہونے دے اور اپنے کو بالکل اُن کے جانشینوں کے ہاتھ میں نہ ہنسنے دے۔ یہی صورت  
 میں یہ اپنی مسرتوں میں باہم ایک قسم کا توازن پیدا کر لیتا ہے یعنی اپنی حکومت اسکے  
 سپرد کرتا ہے جو سب سے پہلے آئے اور باہمی جیت لے، پھر جب اس سے سیری ہو جاتی  
 ہے تو دوسرے کے ہاتھ میں دیدیتا ہے۔ یہ کسی کی تحقیر نہیں کرتا اور سب کی یکساں  
 ہمت افزائی کرتا رہتا ہے۔

ایڈا۔ بہت صحیح۔

میں ۱۔ یہ اب اس قلعہ میں پند و نصیحت کے کسی کلمہ کا کوئی قبول کرتا ہے  
 نہ آنے کی اجازت دیتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی اس سے کہے کہ بعض مسرتیں اچھی اور شریف  
 خواہشات کی تسکین سے عبارت ہیں اور بعض بُری خواہشوں سے، اور تمہیں چاہیے  
 کہ بعض کو استعمال کرو اور اُن کی عزت کرو، اور بعض کو سزا دیکر ان پر غالب آؤ۔ غرض  
 جب کبھی اس قسم کی کوئی بات اس کے سامنے کہی جائے تو اپنا سر ہلاتا ہے اور کہہ دیتا  
 ہے کہ یہ تو سب کی سب یکساں ہیں اور ان میں ہر ایک اتنی ہی اچھی ہے جتنی کوئی دوسری  
 ایڈا۔ جی۔ اس کا تو یہی رویہ ہوگا۔

میں ۲۔ جی ہاں۔ اسی طرح اُنی خواہشات کی تسکین میں صبح ہوتی ہے شام ہوتی  
 ہے۔ یہ کبھی نشہ شراب میں مست اور نعمتوں سے سرشار ہوتا ہے، کبھی خالص مانی پر اتر  
 آتا ہے اور دُبلتا ہونے کی فکر کرتا ہے۔ کبھی ورزش جسمانی کی طرف توجہ ہو جاتی ہے اور کبھی

سہلکاری پر آتا ہے تو ہر چیز کو بالاسے طاق رکھ دیتا ہے، اور کبھی فلسفیانہ زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ اکثر آپ سیاسیات سے مشغول رکھتے ہیں کہ کھڑے ہو کر جو سر میں سمبا باکہہ ڈالا اور کر ڈالا۔ اگر کہیں کسی فوجی آدمی پر رشک آگیا تو اس طرف چل کھڑے ہوئے اور کسی رباری شخص پر آگیا تو اس طرف۔ اس کی زندگی میں نہ کوئی آئین ہو نہ کوئی نظام۔ اور سچ آگندہ وجود کو یہ خوشی، برکت اور آزادی کے ناموں سے موسوم کرتا ہے اور اس اسی طرح گزرتی ہے۔

ایڈ۔ جی۔ ہاں۔ یہ تو سراپا حریت اور مساوات ہے۔

ہیں۔۔ ہاں۔ اس کی زندگی نہایت متنوع اور رنگارنگ ہوتی ہے۔ یعنی بہت سی زندگیوں کا خلاصہ۔ یہ اس ریاست کا جواب ہے جسے ہم نے حسین اور مرصع بتایا تھا۔ بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں اسے اپنا نمونہ بنائیں گی اور اس کے وجود میں بہت سے دستور اساسی اور چال چلن کی بہت سی مثالیں ملینگی۔

ایڈ۔ بیشک۔

میں۔۔ اچھا تو اسے جمہوریت کے مقابل رکھیں کہ اسے بجا طور پر جمہوری انسان کہا جاسکتا ہے۔

ایڈ۔ جی۔ اسکی ہی جگہ ہونی چاہیے۔

میں۔۔ آخر میں سب سے خوبصورت انسان اور ریاست آتی ہے یعنی جبر و استبداد اور جابر مستبد۔ اب ہمیں اپنے نظر کرنی ہے۔

ایڈ۔۔ بالکل درست۔



میں۔ اچھا تو فرمائیے کہ استبداد کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ یہ تو واضح ہے کہ اس کی اول

جمہوری ہے۔

ایڈ۔ ظاہر ہے۔

میں۔ کیا جمہوریت سے استبداد اسی طرح پیدا نہیں ہوتا جیسے حکومت خواہ

سے جمہوریت؟ یعنی ایک معنی کر۔

ایڈ۔ کیسے؟

میں۔ حکومت خواہ نے اپنے لیے جو خیر اور اس کے قیام کا جو ذریعہ تجویز کیا تھا

کثرت دولت تھا۔ کیوں میں صحیح کہتا ہوں نا؟

ایڈ۔ جی ہاں۔

میں۔ اور دولت کی غیر تسکین پذیر آرزو اور روپیہ حاصل کرنے کے لیے ہر چیز

سے غفلت ہی حکومت خواہ کی تباہی کا باعث ہوئی؟

ایڈ۔ درست۔

میں۔ چنانچہ جمہوریت کا بھی ایک اپنا خیر ہے جس کی غیر تسکین پذیر آرزو سے ہتھ

کامٹہ دکھاتی ہے؟

ایڈ۔ وہ کیا؟

میں۔ آزاد دی۔ جس کے متعلق جمہوریت میں تم سے لوگ کہیں گے کہ یہ ریاست

کا فخر ہے۔ اور اسی وجہ سے احرار صرف جمہوریت ہی میں رہنا پسند کریں گے۔

ایڈ۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ یہ مقولہ تو ہر ایک کی زبان پر ہے۔

میں۔۔۔ ہاں تو میں یہ کہنے والا تھا کہ اس کی غیرت کیمن پذیرا زوا اور دوسری چیزوں سے غفلت جمہوریت میں وہ تبدیلی پیدا کر دیتی ہے جس سے استبداد کا مطالبہ پیدا ہوتا ہے۔

ایڈ۔۔۔ یہ کیسے؟

میں۔۔۔ جب آزادی کی پیاسی جمہوریت میں بڑے سائی صدر محض ہوں اور جمہوریت نے حریت کی یہ مگر تضرورت سے زیادہ پی لی ہو تو اب اگر اسکے حکم اس کی بات مان کر لے ایک اور بڑا جرحہ نہ دیں تو یہ لٹے جواب طلب کرنی نہ دیتی اور منحوس خواص بتاتی ہے۔

ایڈ۔۔۔ ہاں۔۔۔ یہ تو عام واقعہ ہے۔

میں۔۔۔ ہاں۔۔۔ اور جو وفا دار شہری ہیں انھیں یہ جمہوریت ہیج بتاتی اور تحقیر سے انھیں غلام کہتی ہے جو اپنی زنجیروں کو سینہ سے لگاتے ہیں۔ یہ تو ایسی رعایا جانتی ہے جو حاکموں کی طرح ہو اور ایسے حاکم جو رعایا کی طرح ہوں۔ اسکے جی کے سے تو بقی لوگ ہوتے ہیں اور یہ انھیں کی مداحی کرتی اور انفرادی و اجتماعی دونوں طرح سے انھیں کی عزت کرتی ہے۔ تو بھلا ایسی ریاست میں حریت کی کوئی حد ہو سکتی ہے؟

ایڈ۔۔۔ یقیناً نہیں۔

میں۔۔۔ رفتہ رفتہ یہ مزاج گھروں میں راہ پالیتا ہے اور بالآخر جانوروں تک پہنچ کر



ان میں بھی یہ وبا پھیلاتا ہے۔

ایڈ :- آپ کا کیا مطلب ہے، کیسے؟

میں :- میرا مطلب ہے کہ باپ بیٹوں کی سطح پر اترنے اور اُن سے ڈرنیکا عادی ہو جاتا ہے اور بیٹا باپ کی برابری کرتا ہے، اس میں اپنے والدین کی نہ عزت ہوتی ہے نہ حرمت اور بس یہی اس کی آزادی ہے۔ یہاں مقیم پردیسی شہری کے برابر اور شہری مقیم پردیسی کے اور بالکل اجنبی بھی ایسا ہی جیسے یہ دونوں۔

ایڈ :- جی ہاں، یہ تو ہوتا ہے۔

میں :- اور بس یہی خرابیاں تھوڑی ہی ہیں اور بھی بہت سی اس سے کم درجہ کی ہیں۔ مثلاً اس صورت حال میں اُستاد اپنے شاگردوں سے ڈرتا اور اُنکی خوشامد کرتا ہے، شاگرد اپنے اُستادوں اور تالیقوں کی تحقیر کرتے ہیں، جوان بڑھے سب یکساں ہیں، جوان بڑھے کی برابری کرتا ہے اور قول و فعل میں اُسکا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتا ہے، بڑھے جوانوں کی سطح پر جھبک کر ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ یہ اسے پسند نہیں کرتے کہ لوگ انھیں مستبد اور تلخ مزاج خیال کریں، لہذا جوانوں کے انداز اختیار کرتے ہیں۔

ایڈ :- بہت درست۔

میں :- حریت عامہ کی آخری حدود یہ ہیں جب نہ خرید غلام مرد ہو کہ عورت اتنا ہی آزاد ہوتا ہے جتنا اس کا خریدار، نیز اس سلسلہ میں ذکور و اناث کی باہمگر

آزادی اور مساوات کا ذکر بھی نہ فراموش کرنا چاہیے۔

ایڈ۔۔ کیوں، بقول ایسکیلس منہ پرانی بات کہہ کیوں نہ ڈالیں؟

میں۔۔ میں یہی تو کر رہا ہوں۔ ہاں یہ اور کہدوں کہ کوئی انجان آدمی بسے یقین

بہ کر جگا کرائی اقتدار میں جو جانور ہیں انھیں جمہوریت میں جس قدر آزادی حاصل ہو کسی اور

ریاست میں نصیب نہیں۔ کیونکہ یہ کہاوت سچ ہے کہ کتیاں بھی وہی حیثیت رکھتی ہیں جو انکی

مالکہ عورتیں۔ اور گھوڑے اور گدھے احرار کے تمام حقوق و اعزاز کے ساتھ چلنے کا انداز

رکھتے ہیں، اگر کوئی ان کے رستہ میں آجائے اور ان کے لیے شرک صاف نہ چھوڑے

تو یہ اسکے اوپر سے گذر جائیں۔ الغرض تمام چیزیں کثرت آزادی سے ہیں کھٹی پڑتی ہیں

ایڈ۔۔ جی ہاں، میں جب کبھی دیہات میں ٹہننے چلا جاتا ہوں تو یہی دیکھنے میں

آتا ہے جو آپ نے بیان فرمایا۔ میں نے آپ نے معلوم ہوتا ہے ایک ہی خواب دیکھا ہے۔

نہیں۔۔ ان سب کے بالاتر یہ کہ ان تمام چیزوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شہری نہایت

ذکی افس ہو جاتے ہیں، انھیں کہیں ذرا حکم چھو نہیں گیا کہ یہ لگے بے صبری سے پیچ و تاب

کھانے اور آپ جانتے ہی ہیں آخر کار تو یہ تمام تحریری اور غیر تحریری قوانین کا خیال کرنا

چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ اب کسی کو اپنے اوپر نہیں دیکھنا چاہتے۔

ایڈ۔۔ جی ہاں۔ میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔

میں۔۔ تو عزیز من یہ ہے وہ حسین اور شاندار آغاز جس سے استبداد پیدا ہوتا ہے۔

ایڈ۔۔ واقعی نہایت شاندار ہے۔ لیکن یہ فرمائیے کہ اب اس کے بعد کونسا قدم



اٹھتا ہے؟

میں :- جو حکومت خواص کی تباہی کا باعث تھا وہی جمہوریت کی تباہی کا باعث  
وہی مرض حریت زیادہ پھیل گیا اور شدید ہو کر جمہوریت کو آن دباتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ  
ہر چیز کی حد سے زیادتی اکثر بالکل مخالف سمت میں ایک رد عمل پیدا کرتی ہے اور یہ بات  
صرف موسم یا بنا تی و حیوانی زندگی تک ہی محدود نہیں بلکہ سب سے زیادہ یہ قسم  
حکومت پر اپنا اثر رکھتی ہے۔

ایڈ :- درست۔

میں :- آزادی کی زیادتی سے خواہ ریاست میں ہو یا افراد میں غلامی کی زیادتی  
ہی پیدا ہوتی ہے۔

ایڈ :- جی۔ قدرتا۔

میں :- چنانچہ جمہوریت سے استبداد قدرتا تراوش کرتا ہے، اور جس سبب استبداد  
قسم کی آزادی ہوتی ہے اس سے اسی درجہ شدید استبداد اور غلامی پیدا ہوتی ہے۔  
ایڈ :- یہی توقع کرنی چاہیے تھی۔

میں :- لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا سوال تو یہ نہ تھا۔ آپ تو شاید یہ معلوم  
کرنا چاہتے تھے کہ وہ کونسی بد نظمی ہے جو جمہوریت اور حکومت خواص میں یکساں پیدا  
ہوتی اور دونوں کی تباہی کا باعث ہے۔

ایڈ :- درست۔

میں :- اچھا تو میں اس سلسلہ میں اس کا ہل اور مسرت طبقہ کا حوالہ دے رہا تھا جس میں جو ذرا باہمت ہوں وہ قائد اور جو دبو ہوں وہ مہتمم ہوتے ہیں۔ ہم نے انہیں کی نکھوڑوں سے نیشنل دی تھی جن میں بعض ڈنک دار ہوتے ہیں اور بعض بلا ڈنک۔ ایڈ :- نہایت بجا مقابلہ تھا۔

میں :- اور یہ دونوں گروہ جس شہر میں پیدا ہو جائیں اسکے لیے وبال جان ہوتے ہیں، ان کی مثال جسم میں بلغم و صفرا کی سی ہے۔ چنانچہ اچھے طبیب اور ریاست کے وضع قوانین کا فرض ہے کہ عقلمند زنبور گیری کی طرح انہیں دور ہی دور رکھے۔ اور ہو سکے تو کبھی اندرانے ہی نہ دے۔ اور بالفرض اگر یہ کسی طرح آن پہنچیں تو انہیں اور ان کے خانوں کو جلد سے جلد کاٹ پھینکے۔

ایڈ :- جی ضرور۔

میں :- آؤ اپنے اس عمل کو واضح طور پر دیکھنے کے لیے فرض کریں کہ جمہوریت تین طبقوں میں منقسم ہے۔ اور واقعاً ہی ایسا ہی۔ کیونکہ اولاً تو آزادی کی وجہ سے جمہوریت میں حکومت خواص سے بھی زیادہ نکھو پیدا ہوتے ہیں۔

ایڈ :- بجا ہے۔

میں :- اور جمہوریت میں یہ یقیناً زیادہ شدید بھی ہوتے ہیں۔

ایڈ :- یہ کیونکر؟

میں :- اس لیے کہ حکومت خواص میں ان کی عزت نہیں ہوتی اور یہ اپنے



عہدوں سے علیحدہ کر دیے جاتے ہیں لہذا یہ نہ اپنی تربیت کر سکتے ہیں نہ اپنی قوت بڑھا سکتے ہیں، لیکن جمہوریت میں حکومت کی تقریباً ساری قوت انہیں کے ہاتھ میں ہوتی ہے، ان میں جو ذرا تیز اور ذہین ہوتے ہیں وہ تقریریں اور کام کرتے ہیں اور باقی دوسرے منبر کے ارد گرد بھنبھناتے پھرتے ہیں اور کسی کو مخالفت میں ایک لفظ نہیں کہنے دیتے۔ چنانچہ جمہوریت میں کم و بیش ہر چیز کا انتظام و انصرام کھٹوؤں کے ہاتھ ہی میں ہوتا ہے۔

ایڈ۔ بہت درست۔

میں :- اس انہوہ میں ایک اور طبقہ بھی تمیز کیا جا سکتا ہے۔

ایڈ :- وہ کون؟

میں :- یہ باامن لوگوں کا طبقہ ہے جو تاجروں کی قوم میں تقریباً سب سے مالدار ہوتا ہے۔

ایڈ :- قدرتا۔

میں :- یہ سب سے زیادہ بننے والے لوگ ہوتے ہیں اور کھٹوؤں کو انہیں سے سب سے

زیادہ شہد ملتا ہے۔

ایڈ :- اور کیا جن بیچاروں کے پاس ہو ہی کم انکے دبانے سے ٹکیگا بھی کم۔

میں :- یہ طبقہ امر اور کہلاتا ہے اور کھٹو انہیں سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔

ایڈ :- اور کیا، یہی بات ہے۔

میں :- عوام کا ایک تیسرا طبقہ ہے۔ اس میں وہ لوگ شامل ہیں جو اپنے ہاتھ سے

کام کرتے ہیں، یہ نہ سیاست داں ہیں نہ کھانے کو ان کے پاس بہت ہی۔ جب مجمع ہو تو یہی طبقہ جمہوریت میں سب سے بڑا اور سب سے طاقتور ہوتا ہے۔

ایڈ:- یہ سچ ہی۔ لیکن یہ انبوہ مشکل ہی سے اجتماع پر آمادہ ہوتا ہے، ہاں سوا اس کے کہ اسے بھی کچھ شہدے۔

ہیں :- اور کیا انھیں حصہ ملتا نہیں؟ کیا انکے قائد بالداروں سے ان کی جائدادیں چھین کر عوام میں تقسیم نہیں کرتے؟ البتہ یہ خیال ضرور رکھتے ہیں کہ اس کا بڑا حصہ خود اپنے لیے محفوظ رکھیں۔

ایڈ:- ہاں، کیوں نہیں، اس حد تک تو عوام ضرور حصہ دار ہوتے ہیں۔  
میں :- اور جن لوگوں کی املاک ضبط کی جاتی ہے وہ مجبور ہوتے ہیں کہ انھیں عوام کے سامنے جیسے بن پڑے جو ابدھی کریں!  
ایڈ:- اور یہ کر ہی کیا سکتے ہیں؟

میں :- اور پھر (لطف یہ) کہ چاہتے ان غریبوں میں انقلاب کی کوئی خواہش بھی نہ ہو لیکن دوسرے ان پر یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ انھوں نے عوام کے خلاف سازش کی ہے اور حکومت خواص کے دوست ہیں۔

ایڈ:- درست۔

میں :- اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب یہ لوگ عوام کو اپنی مرضی سے نہ سہی بلکہ جہالت اور مخبروں کی فریب دہی سے ہی اپنے نقصان کے درپے دیکھتے ہیں تو یہ مجبوراً واقعی حکومت



خواص کے حامی بنجاتے ہیں۔ یہ جی سے چلتے نہیں لیکن نیکھٹوؤں کی نیش زنی نہیں  
اذیت پہنچاتی اور ان میں انقلاب کی خواہش پیدا کرتی ہے۔

ایڈ۔۔۔ بالکل صحیح

میں :- پھر ایک دوسرے پر ملامت مقدمہ اور فیصلوں کی نوبت آتی ہے۔

ایڈ۔۔۔ درست۔

میں :- عوام کا ہمیشہ کوئی نہ کوئی حمایتی ہوتا ہے، جسے یہ اپنا سردار بناتے اور  
بڑھا بڑھا کر عظمت کرتے ہیں۔

ایڈ۔۔۔ جی ہاں، انکا یہی طریقہ ہے۔

میں :- یہی وہ جڑ ہے (اور اسکے علاوہ کوئی اور نہیں) جس سے مستبد پیدا

ہوتا ہے، یہ جب پہلے پہل زمین سے اپنا سر نکالتا ہے تو بطور محافظ (حقوق عوام)

ایڈ۔۔۔ ہاں، ظاہر ہے۔

میں :- پھر آخر یہ محافظ مستبد میں کیسے تبدیل ہونا شروع ہوتا ہے؟ ظاہر ہے کہ

جب یہ اس آدمی کی سی حرکت کرنے لگتا ہے جس کا ذکر ذہین لائیسٹی کے آرکیڈیا

ولے معبد کے قصہ میں ہے۔

ایڈ۔۔۔ کونسا قصہ؟

میں :- قصہ یہ کہ جو کوئی ایک قربان شدہ انسان کی آنتوں کو دوسری

قربانیوں کی آنتوں کے ساتھ قمیمہ کر کے چکولے وہ بھیر یا بنچا بیگا۔ آپ نے کبھی یہ قصہ

نہیں سُناتا تھا؟

ایڈ۔ ہاں، ہاں سُناتا تھا۔

میں :- چنانچہ جمہور کے مخالفوں کی مثال بھی اسی آدمی کی سی ہی ہے۔ اس کے بس میں چونکہ ایک ابنوہ ہوتا ہے اس لیے اپنے اعضاء کا خون بہانے سے کوئی چیز اسے مانع نہیں ہوتی۔ اسی عام طریقہ سے یعنی جھوٹے الزام لگا لگا کر یہ انہیں عدالت میں پیش کرانا اور قتل کرانا ہے، اصل انسانی زندگی کی فنا کا باعث ہوتا ہے اور پھر اپنی ناپاک زبان اور لبوں سے اپنے ساتھی شہریوں کا خون چکھتا ہے۔ بعض کو تو یہ مڑوا ہی ڈالتا ہے اور بعض کو جلا وطن کر دیتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ قرضوں کی معافی اور تقسیم اراضی کے اشکے بھی دیتا رہتا ہے۔ تو آخر ان سب باتوں کے بعد اسکا کیا حشر ہوگا؟ یا تو اپنے دشمنوں کے ہاتھوں مارا جائیگا یا پھر آدمی سے بھیر یا یعنی مستبد ہو جائے گا۔

ایڈ۔ :- لازماً۔

میں :- یہ وہی شخص تو ہے جس نے مالداروں کے خلاف ایک جماعت بنانی شروع کی تھی؟

ایڈ۔ :- وہی۔

میں :- کچھ عرصہ بعد یہ نکال باہر کیا جاتا ہے، لیکن پھر باوجود اپنے دشمنوں کے واپس آتا ہے اور اب کی اچھا پورا مستبد بن کر؟

ایڈ۔ :- صاف بات ہے۔



میں۔ اب اگر یہ اسے خارج نہ کر سکے یا استغاثہ عام سے اسے سزا سے موت نہ دلا سکے تو اس کے قتل کی خفیہ سازشیں کرتے ہیں۔

ایڈ۔ جی ہاں۔ یہی ان لوگوں کا عام طریقہ ہے۔

میں۔ اسپر حامی جمہور کے شخص کی حفاظت کے لیے ایک دستہ فوج کا مطالبہ

ہوتا ہے۔ ہر شخص جو اپنی مستبدانہ زندگی میں اس حد تک پہنچ چکا ہے اس چال کا استعمال

کرتا ہے۔ یعنی بقول عوام ”محب جمہور ایسا نہ ہو کہ جمہور کے ہاتھ سے جاتا ہے!“

ایڈ۔ بالکل۔

میں۔ جمہور آسانی سے اسے تسلیم کر لیتے ہیں، اب نہیں جو کچھ خوف و خطر

ہو سب اسی کے لیے ہی اپنی ذات کے لیے کوئی نہیں۔

ایڈ۔ بہت صحیح۔

میں۔ اب اگر کوئی مالدار شخص جس پر عوام کے دشمن ہونیکا الزام بھی ہے۔ یہ

خبر سنتا ہے تو عزیز من اس کی حالت پر وہ الفاظ صادق آتے ہیں جو کاہن نے

کراہیس سے کہے تھے یعنی ”وہ ہر موز کے پتھر یلے ساحل پر سرٹ بھاگا جاتا

ہو اور ذرا نہیں ٹھٹھاتا اپنی بزدلی پر شرماتا ہے۔“

ایڈ۔ اور ٹھیک بھی ہے، اگر اس وقت شرماے تو آئندہ کبھی شرمانے کا موقع

نہی نہ ملے۔

میں۔ پکڑا گیا کہ مارا گیا۔

ایڈ۔ اور کیا۔

میں۔ اور یہ محافظ جنکا ہم نے ذکر کیا انہیں کوئی نہ دیکھیگا کہ جناب کا جسم ضخیم خود زمین کے لیے فراہمی روغن کا کام انجام دے رہا ہے۔ بلکہ یہ بہت سوں کو لگا کر اب ریاست کی بجلی پر ہاتھوں میں باگ تھا سے کھڑا ہوگا، اب یہ محافظ نہیں بلکہ مستبد مطلق ہے۔

ایڈ۔ بلاشبہ

میں۔ اب ہم اس شخص نیر اس ریاست کی خوشی پر غور کریں جس میں ایسی ہستی وجود میں آئی۔

ایڈ۔ ضرور، اب اس پر نظر کرنی چاہیے۔

میں۔۔۔ پہلے پہل اپنے اقتدار کے ابتدائی ایام میں تو یہ سراسر پاتسم ہوتا ہے جس سے ملتا ہے اسے سلام کرتا ہے۔ بھلا اسے اور مستبد کہا جائے، یہ جو برابر عام اور خاص سے ہر طرح وعدہ وعید کر رہا ہے! جو قرضداروں کے قرض معاف کر رہا اور عوام اور اپنے متبعین میں زمین بانٹ رہا ہے اور ہر شخص کے ساتھ نیکی اور مہربانی کرنا چاہتا ہے! یہ اور مستبد!!

ایڈ۔ واقعی

میں۔۔۔ لیکن جب یہ اپنے خارجی دشمنوں سے فحشانی یا معاہدہ کے ذریعہ نبٹ چکے اور اب انکا کوئی ڈر باقی نہ رہ گیا تب بھی یہ برابر کوئی نہ کوئی جنگ چھیڑتا



رہیگا تاکہ عوام کو قائد کی ضرورت رہے۔

ایڈ۔۔ یقیناً۔

میں :- اور کیا اس کے علاوہ اسکا ایک اور مقصد یہ بھی نہیں کہ یہ لوگ محض ادا کر کے مفلس ہو جائیں اور اس طرح اپنی تمام تر توجہ روزانہ ضروریات کی فراہمی کی طرف رکھیں اور اس کے خلاف سازش کر نیکاکم احتمال ہو۔

ایڈ۔۔ ظاہر ہے۔

میں :- اور اگر اسے کسی پر شبہ ہے کہ اسکے دماغ میں آزادی کے خیالات ہیں، اور اس کے اقتدار کے خلاف مقاومت کا گمان تو اسے تو ان کی تباہی کا ہتھیار اچھا بہانہ یوں ملیگا کہ انھیں دشمن کے رحم پر چھوڑے۔ چنانچہ ان وجوہ کی بنا پر مستبد ہمیشہ ایک نہ ایک جنگ برپا کرتا رہیگا۔

ایڈ۔۔ لازماً۔

میں :- اب (رفتہ رفتہ) یہ غیر ہر دل عزیز ہونا شروع ہوتا ہے۔

ایڈ۔۔ لازمی نتیجہ ہے۔

میں :- بعض وہ لوگ جنہوں نے اسکے اقتدار کے قیام میں شرکت کی تھی اور جو اب بھی برسر اقتدار ہیں اسپر نیز باہم ایک دوسرے پر اپنے خیالات ظاہر کرنے لگتے ہیں، اور ان میں جو ذرا باہمت ہیں وہ ساری کارروائی کو لاس کے منہ پر مارتے ہیں۔

ایڈ :- جی، ایسا ممکن ہے۔

میں :- اب اگر یہ سب حکمراں رہنا چاہتا ہے تو اسے ان سب سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا، یہ اس وقت تک نہیں کر سکتا کہ کوئی ایک کارآمد آدمی بھی خواہ اس کا دوست ہو خواہ دشمن باقی ہے۔

ایڈ :- نہیں کر سکتا۔

میں :- چنانچہ یہ اپنے چاروں طرف نظر دوڑاتا ہے کہ کون بہادر ہے، کون عالی دماغ کون عقلمند ہے اور کون مالدار۔ کیا خوش نصیبی ہے کہ یہ ان سب کا دشمن ہے۔ اور چاہے اس کا دل کسے یا نہ کسے اسپر اب لازم ہے کہ ان کے خلاف کوئی نہ کوئی موقع ڈھونڈے اور بالآخر تمام ریاست کا تنقیہ ہو جائے۔

ایڈ :- جی، اور نہایت ہی نا در تنقیہ!

میں :- ہاں، یہ تنقیہ ویسا نہیں جیسا کہ طبیب جسم کا کرتے ہیں اس لیے کہ وہ تو برے کو نکالتے اور اچھے کو چھوڑ دیتے ہیں اور یہ اس کا بالکل الٹا کرتا ہے۔

ایڈ :- اگر اسے حکومت کرنی ہے تو اس سے کوئی منفر نہیں۔

میں :- کیسا مبارک انتخاب ہے۔ کہ یا تو بڑوں کی اکثریت کے ساتھ رہنے اور انکی

نفرت برداشت کرنے پر مجبور ہو یا پھر جینے ہی سے ہاتھ دھو۔

ایڈ :- ہاں، بس یہی ایک صورت ہے۔

میں :- اور شہروں کی نگاہ میں اس کے اعمال جتنے قابل نفرت ہوتے جائیں گے



پہلے ہی زیادہ وابستگان پیدا کر چکا اور ان سے اتنی ہی زیادہ وفا شعاری کا طالب ہوتا جائے گا۔

ایڈ۔ یقیناً۔

میں :- یہ وفادار گروہ کون ہے اور یہ اسے کہاں سے حاصل کر گیا؟

ایڈ :- اگر یہ نہیں دام دیگا تو یہ تو خود بخود اسکے گرد جمع ہو جائیں گے۔

میں :- قسم پر کلب مصری کی۔ یہ کتنے بہت سے ٹکھٹو بہاں ہیں، طرح طرح کے

اور تمام ملکوں کے۔

ایڈ :- جی، بیشک۔

میں :- لیکن کیا یہ نہیں وہیں جگہ کی جگہ حاصل کرنا نہ چاہیگا؟

ایڈ :- آپ کا کیا مطلب ہے، کیسے؟

میں :- یہ شہروں سے انکے غلام چھین لیگا اور انہیں آزاد کر کے اپنے محافظ

دستہ میں بھرتی کر لیگا۔

ایڈ :- یقیناً، اور ان پر وہ سب زیادہ اعتماد کر سکیگا۔

میں :- یہ سب تب بھی کیسی مبارک ہستی ہے، اور سبھوں کو تو قتل کر دیا اب

یہ اس کے معتد دوست رہ گئے ہیں۔

ایڈ :- جی۔ اور یہ ہیں با بکل اسی کی طرح۔

میں :- ہاں، یہ وہ نئے شہری ہیں جنہیں یہ عالم وجود میں لایا ہے۔ وہ اس کی سر

کرتے اور یہی اس کے ساتھی ہیں، کیونکہ آپھے لوگ تو اس سے نفرت کرتے اور الگ بچتے  
بہتے ہیں۔

ایڈ۔ بشیک۔

میں۔۔۔ سچ ہے، المناک ڈراما بڑی ہی دانشمندی کی چیز ہے اور یورپ میں

بہت بڑا ڈراما نویس!۔

ایڈ۔۔۔ یہ کیوں؟

میں۔۔۔ کیوں، اس لیے کہ وہی تو اس پر مغز مشورہ کا مصنف ہے کہ مستبد

عقلندوں کے ساتھ رہ کر عقلمند ہوتے ہیں اور اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ عقلمندوں  
کو مستبد اپنا ہمیشہ بنا تا ہے۔

ایڈ۔۔۔ جی، وہ استبداد کی یوں بھی مدح کرتا ہے کہ یہ الہی ہے اور اسی قسم کی اور

بہت سی باتیں لسنے اور دوسرے شاعروں نے کہی ہیں۔

میں۔۔۔ لہذا یہ المناک شعرا جو خود سمجھدار لوگ ہیں، ہمیں اور ہماری طرح رہنے

والے اور لوگوں کو معاف کریں اگر ہم انھیں اپنی ریاست میں نہ لائے دیں، کیونکہ یہ

ٹھہرے استبداد کے قصیدہ خواں۔

ایڈ۔۔۔ جی، بشیک، جنہیں عقل ہوگی وہ تو ضرور معاف کریں گے۔

میں۔۔۔ لیکن یہ دوسرے شہروں میں جا جا کر برا بر عوام کو اپنی طرف کھینچتے رہیں گے

اور عمدہ، بلند و موثر آواز والوں کو کرایہ پر رکھ رکھ کر یہ شہروں کو استبداد اور جہورت



کی جانب مائل کرتے رہیں گے۔

ایڈ۔ بہت صحیح۔

میں :- عداوہ بریں نہیں دام بھی ملے ہیں اور عزت بھی سب سے بڑی عزت تو  
مستبدین سے ملتی ہے اور اسکے بعد جمہوریوں سے لیکن ہمارے ہیں دستور پر یہ جوں  
جوں اوپر چڑھتے ہیں ان کی شہرت ساتھ چھوڑتی جاتی ہے انکا سانس بھول جاتا ہے اور  
اور یہ آگے نہیں چل سکتے۔

ایڈ۔ - سچ ہے۔

میں :- مگر دیکھا ہم اپنے مضمون سے بھٹک گئے۔ اچھا پھر اسی طرف لوٹیں اور  
دریافت کریں کہ مستبد اپنی اس حسین اور کثیر التعداد، متنوع اور ہر دم متغیر فوج کو  
کیسے قائم رکھتا ہے۔

ایڈ۔ - اگر شہر میں مقدس خزانے ہیں تو یہ نہیں ضبط کر کے خرچ کر ڈالیں گے۔ جہاں  
ان لوگوں کا مال کفایت کر گیا جن پر فدااری کا الزام ہے، اس حد تک یہ عوام کے محال  
کو کم کر سکیں گے۔

میں :- اور جب ان سے کام نہ چلے؟

ایڈ۔ - تو ظاہر ہے کہ یہ خود اور اسکے سب گہرے ساتھی مرد ہوں کہ عورتیں اسکے  
باپ کی ریاست پر گذراوقات کریں گے۔

میں :- آپ کا مطلب شاید یہ ہے کہ عوام جن کی وجہ سے یہ عالم وجود میں آیا ہے

اور اسکے ساتھیوں کو گزارا دینگے۔

ایڈ۔ ہاں، سوکے اس کے انکے پاس اور چارہ ہی کیا ہے؟  
 میں۔ لیکن اگر عوام کو غصہ آجائے اور وہ لگیں کہنے کہ ایک بڑے پالے پستے  
 لڑکے کو حق نہیں کہ اپنے باپ سے گزارا لے بلکہ حق تو یہ ہے کہ اب بیٹا باپ کی پرورش کرے  
 اگر یہ صورت پیش آئی تو پھر کیسی ہوگی؟ باپ نے کچھ اس لیے سے پیدا تھوڑے ہی کیا  
 تھا اور کاروبار زندگی میں اس لیے تو نہیں جایا تھا کہ جب یہ صاحبزادے بڑھ کر جوان ہو  
 تو یہ اپنے غلاموں کا غلام بنے اور پھر ان فرزندوں اور ان کے ساتھیوں اور غلاموں کی  
 پرورش بھی کرے۔ اس کی عرض تو یہ تھی کہ بیٹا میری حفاظت کرے اور اس کی جیسے  
 مجھے مالداروں اور اُمراء کی حکومت سے نجات نصیب ہو۔ چنانچہ یہ ان صاحبزادہ اور  
 ان کے ہمنشینوں کو اپنے گھر سے رخصت کرتا ہے جیسے کوئی دوسرا باپ ایک مسرف بیٹے  
 اور اسکے احباب کو اپنے ہاں سے نکال باہر کرے۔

ایڈ۔۔۔ واللہ۔ باپ کو اب پتہ چلیگا کہ وہ اب تک کس بلا کو سینہ سے لگائے تھا۔  
 اب جو اسے نکالنے کی ضرورت پڑی تو معلوم ہوا کہ حضرت خود تو کمزور ہیں اور بیٹا طاقتور  
 میں۔۔۔ کیوں، آپ کا یہ تو کبھی مطلب نہ ہوگا کہ مستبد شدہ سے کام لیگا؟ کیا اگر  
 باپ مخالفت کرے تو یہ اسے ماریگا؟

ایڈ۔۔۔ ہاں، ضرور ماریگا، نہتا تو اسے پہلے ہی کر چکا ہے۔

میں۔۔۔ تو یہ تو پھر بد پرکش ہے، بوڑھے باپ کا بیرحم محافظ۔ اصلی استبداد یہ ہے،



جس کے متعلق کوئی غلط فہمی ممکن نہیں۔ مثل ہرگز عوام دھوئیں یعنی احرار کی غلامی سے بچنے کے لیے آگ یعنی غلاموں کے استبداد میں جا پڑے۔ اس طرح گویا آزاد ہی تسلیم و عقل کی حدود سے تجاوز کر کے غلامی کی سب سے سخت اور تلخ شکل اختیار کر لیتی ہے۔

ایڈ۔۔۔ پر صحیح ہے۔

میں۔۔۔ بہت خوب، اب تو ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے استبداد کی ناپائیداری اور جمہوریت سے اسکے تدریجی طور پر پیدا ہونے کے طریقہ پر کافی بحث کر لی ہے۔

ایڈ۔۔۔ جی ہاں۔ بہت کافی۔

---

# نوین کتاب

میں ۔۔ سب سے آخر میں استبدادی آدمی کی باری آتی ہے۔ اسکے متعلق بھی ہمیں دریافت کرنا ہے کہ یہ جمہوری آدمی میں سے کس طرح پیدا ہوتا ہے، اور پھر اپنی زندگی کیسے کاٹتا ہے، خوشی میں یا مصیبت سے؟

ایڈ ۔۔ ہاں، اب تو ایک ہی باقی رہ گیا ہے۔

میں ۔۔ لیکن ابھی ایک پہلے کا سوال بھی باقی ہے، جس کا جواب ابھی تک

نہیں ہوا۔

ایڈ ۔۔ وہ کیا؟

میں ۔۔ میرے خیال میں ہم نے ابھی شہماؤں کی ماہیت اور تعداد

کا ابھی طرح تعین نہیں کیا۔ اور جب تک یہ نہ ہو لے تحقیق ہمیشہ گنگناہنگ رہے گی۔

ایڈ ۔۔ ابھی کچھ ایسی بہت دیر تو ہونی نہیں، یہ فروگزاشت اب ٹوری

کی جا سکتی ہے۔



میں بہت صبح۔ اچھا تو میں جو نکتہ سمجھنا چاہتا ہوں اسے دیکھو۔ بعض غرضی  
 مسترتوں اور شہتاؤں کو میں ناجائز تصور کرتا ہوں۔ ظاہر یہ ہر شخص میں ہوتی  
 ہیں، لیکن بعض میں یہ آئین و عقل کے ذریعہ قابو میں ہوتی ہیں اور ابھی  
 خواہشات کا غلبہ ہوتا ہے اور اس طرح یا تو یہ بالکل خارج ہو جاتی ہیں یا انکی تعداد  
 گھٹ جاتی اور یہ بہت کمزور ہو جاتی ہیں۔ لیکن دوسرے لوگوں میں یہ قوی بھی  
 ہوتی ہیں اور تعداد میں بھی زیادہ۔

ایڈ۔ آپ کا مطلب کن شہتاؤں سے ہے؟

میں :- میرا مطلب اسے ہے جو اس وقت چونکتی ہیں جب روح کی عقلی شریف  
 اور حکمراں طاقت مصروف خواب ہوتی ہے۔ اس وقت ہمارے اندر کا وحشی دماغ  
 خوب گوشت کھا اور شراب پی نیند توڑ کر اچلنا کودنا شروع کرتا اور اپنی خواہشات  
 کو پورا کرنے کے لیے نکلتا ہے۔ پھر کوئی قابل تصور حماقت یا جرم ایسا نہیں جس کا ایسے  
 وقت کہ اسے جو اس اور شرم و حیا کا ساتھ چھوڑ ہی دیا ہے انسان مرتکب ہونے پر  
 آمادہ نہ ہو۔ حتیٰ کہ محرمات سے ہم بستری اور اور دوسرے غیر فطری تعلقات والی  
 کا قتل یا جرم غذا کا کھانا تک بھی کئے متھے انہیں۔

ایڈ :- نہایت درست۔

میں :- لیکن جس شخص کی نبض صحت اور اعتدال پر ہے وہ سونے سے پہلے  
 اپنے قوی عقلیہ کو بیدار کر لیتا اور شریف خیالات اور مسائل سے انکی سیری کر کے



لپٹنے و چوڑ کو دھیان میں مجتمع کر لیتا ہے۔ یہ اپنی اشتہاؤں کو بھوکا نہیں مارتا بلکہ انھیں تسکین دیتا ہے لیکن نہ بہت زیادہ نہ بہت کم یعنی اتنی کہ یہ چیکے سو جاتا اور یہ یا انکا حظ و کرب اس کے اُصول اعلیٰ کے کام میں مغل نہ ہو۔ اس اُصول کو یہ خالص تجرید کے میدان میں تنہا چھوڑ دیتا ہے تاکہ یہ نامعلوم کے علم پر فکراور اس کی آرزو کرے، خواہ یہ علم ماضی سے متعلق ہو یا حال و استقبال سے۔ اسی طرح جب کسی سے اسکا جھگڑا ٹٹا ہو جائے تو یہ اپنے جذباتی عنصر کا التیام کر دیتا ہے۔ اگر میرا مطلب یہ ہے کہ یہ اپنے دونوں غیر عقلی اُصولوں کو مطمئن کرنے کے بعد آرام کرنے سے قبل تیسری اہل یعنی عقل کو بیدار کر دیتا ہے اسوقت تم جانتے ہو کہ یہ حقیقت کے نہایت قریب ہو جاتا ہے اور کبھی پریشان اور ناجائز خوابوں کا کھیل نہیں بنتا۔

ایڈ :- میں بالکل اتفاق کرتا ہوں۔

میں :- یہ بات کرتے کرتے میں اہل مطلب سے بھٹک چلا تھا اس سب میں جو اہل نکتہ میں دکھانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اچھے آدمیوں تک میں ایک جائز وحشی درندوں کی سی فطرت ہوتی ہے جو سوتے میں رونما ہوتی ہے۔ ذرا دیکھئے کہ میں صحیح عرض کرتا ہوں اور آپ مجھ سے متفق ہیں کہ نہیں؟

ایڈ :- جی۔ میں متفق ہوں۔

میں :- اب ذرا اس سیرت کو یاد کرو جو ہم نے جمہوی آدمی کے ساتھ منسوب کی تھی۔ اس کے متعلق ہی تو فرض کیا تھا کہ بچپن سے لیکر اس کی تربیت نہایت



کنجوس باپ کے ماتحت ہوئی تھی جس نے انکے تمام بچاپنے اور پس انداز کرنے والی خواہشات کو تو ایک یا اور دوسری غیر ضروری اشتہاؤں کو جن کا مقصد صرف تفریح و تزیین ہی دیا۔

ایڈ :- درست۔

میں :- پھر یہ ذرا زیادہ لطافت پسند اور عیش پرست قسم کے لوگوں کی صحبت میں پڑ گیا، ان کے سارے عیث طریقے اختیار کر لیے اور اپنے باپ کی کم ظرفی سے نفور ہو کر بالکل دوسرے مخالف سرے پر جا پڑا۔ لیکن تھا چونکہ یہ اپنے بگاڑنے والوں سے بہتر آدمی اس لیے یہ دونوں طرف کھنچا اور بالآخر بیچ میں رُک کر اپنی زندگی بسر کرنے لگا جو اسکے نزدیک بہودہ جذبات کی پوری غلامی نہیں بلکہ مختلف مشروطن میں حداعتِ اَل تاں تک مصروفیت سے عبارت ہے۔ چنانچہ خواص سے جمہوری انسان یوں پیدا ہوا۔

ایڈ :- جی ہاں۔ اسکے متعلق اپنا یہی خیال تھا اور اب تک ہے۔

میں :- اب فرض کرو کہ بہت سے سال گذر گئے اور اس شخص کے (یہ جیسا

کچھ بھی ہے) ایک لڑکا ہوا جس کی تربیت اپنے باپ کے اصولوں کے مطابق ہوئی۔

ایڈ :- میں اس کا تصور کر سکتا ہوں۔

میں :- اچھا تو آگے فرض کرو کہ لڑکے پر بھی وہی گزری جو باپ پر گذر چکی ہے

یہ اس بالکل بے ضابطہ اور بے قاعدہ زندگی میں آن پڑا جسے اس کے بہکانے والے



کامل آزادی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کا باپ اور اسکے احباب معتدل خواہشات کی طرف داری کرتے ہیں، لیکن دوسری مخالف جماعت ان کے مخالف خواہشوں کو مدد دیتی ہے۔ جہاں ان خطرناک ساحروں ان مستبدگروں نے دیکھا کہ اب ہمارا اثر اسپر سے ہٹ چلا یہ فوراً ایسی تدبیر کرتے ہیں کہ اسپر ایک ہمہ گیر جذبہ کو مسلط کر دیتے ہیں، جو اس کی بیکار اور معتدعانہ شہوات پر قابو پاتا ہے، یہ ایک طرح کا مہیب پردہ انکھٹو ہے کہ میرے خیال میں یہی شکل اس کی صہیت کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔

ایڈ :- جی ہاں۔ اس کی یہی ایک معقول شکل ہے۔

میں :- اب خوشبو تجارت کے بادل چھلے ہوتے ہیں، عطر، پھولوں کے پائے اور شراب ہوتی ہے، ایسی حالت میں اس کی دوسری شہوات اور اس کی بدکردار زندگی کی تمام مسرتیں اپنے بندھن تڑا کر اس کے گرد بھینھنا شروع کرتی ہیں، اور خواہش کے اس ڈنگ کو جو انھوں نے اس کی نکھٹو فطرت میں پیوستہ کیا ہے خوب نشوونما دیتی ہیں۔ بالآخر اس کی روح کا یہ بادشاہ جنون کو اپنے محافظین کا سردار بناتا ہے، اور لگتا ہے کھل کھیلنے۔ جہاں کسی اچھے خیال یا خواہش کو اپنے اندر پیدا ہونے دیکھا، یا جب ذرا شرم و حیا کا کوئی ثمنہ اپنے میں باقی پایا تو ان سب کو ختم کر دیتا اور انھیں نکال پھینکتا ہے حتیٰ کہ عفت و اعتدال کو مائل خارج کر کے انکے بجائے جنون کو مائل طور پر مسلط نہ کرے۔

ایڈ :- جی۔ استبدادی آدمی اسی طرح پیدا ہوتا ہے۔



میں :- کیا یہی وجہ نہیں کہ عشق کو زمانہ قدیم سے مستبد کہتے آئے ہیں؟  
ایڈ :- کچھ عجیب نہیں۔

میں :- اسی طرح کیا جو آدمی نشہ میں مست ہو اس میں بھی مستبد کی روح  
نہیں ہوتی۔

ایڈ :- ہوتی ہی۔

میں :- تم جانتے ہو کہ جس آدمی کا دماغ صحیح نہ رہے اور چل نکلے وہ اپنے  
کو صرف آدمیوں پر ہی نہیں بلکہ دیوتاؤں تک پر حکومت کرنے کے قابل سمجھتا ہے۔  
ایڈ :- ضرور وہ تو ضرور یہ سمجھیکا۔

میں :- اور صحیح معنوں میں استبداد ہی آدمی اسی وقت عالم وجود میں آتا ہے،  
جب فطرتاً، عادتاً، یا دونوں کے اثر سے وہ مخمور شہوت پرست اور جذبات کا  
بندہ ہو جائے۔ کیوں میرے دوست، کیا یہ بات نہیں؟

ایڈ :- بالیقین۔

میں :- یہ تو ہے اس شخص کی حالت اور یہ ہے اس کی اصل۔ اب دیکھنا یہ ہے  
کہ یہ رہتا کس طرح ہے؟

ایڈ :- جیسے لوگ سہنسی میں کہتے ہیں، فرض کیجئے کہ یہ بات آپ کو مجھ سے کہنی  
ہو تو کیسے کہیں؟

میں :- میرے خیال میں تو اس کی ترقی کی دوسری منزل میں دعوتیں

ہونگی اور شراب نوشیاں، بزمہائے خروش اور دربارِ داربانِ الغرض اسی نوع  
کی تمام باتیں۔ اب اس کے سائے وجود پر محبت (عشق) کی حکمرانی ہوگی، اور اس کی  
روح کے تمام معاملات میں اسی کا فرمان جاری۔  
ایڈ۔ یقیناً۔

میں :- ہاں اور پھر شبِ روزنت نئی اور بہت قوی قوی خواہشات پیدا  
ہوتی جائیں گی اور ان کے مطالبات، الامان !  
ایڈ۔ بیشک۔

میں :- مال و متاع اگر ان حضرت کے پاس کچھ تھا تو سب ختم ہو چکا ہوگا۔ او  
اب قرض اور اطلاق کی قطع و برید کا لکھا لگیگا۔  
ایڈ۔ لازمی بات ہے۔

میں :- پھر جب اس کے پلے کچھ نہیں رہتا تو اس کی خواہشیں کسی اُمنڈ اُمنڈ  
کہجوم کرتی ہیں اور اس طرح شور و غوغا کرتی ہیں جیسے گھونسلے میں اپنے چونگے کیلئے  
کوئے کے بچے۔ اور یہ ان سب کے اکسائے سے اور علی الخصوص خود جناب عشق کے  
بڑھاوے سے جو ایک طرح اس سائے لشکر کے سردار ہیں، جنوں کے سے عالم میں ہو  
جانا ہی اور اسی کا پتہ لگانا رہتا ہے کہ کسے دھوکا دوں اور کسے لوٹوں تاکہ کسی طرح ہکا  
پیٹ بھرے۔

ایڈ۔ ہاں، ایسا تو یقیناً ہوگا۔



میں۔۔۔ اب تو اسکے لیے کرب و الم سے بچنے کی بس ایک ہی تدبیر ہے یعنی جس طرح بن پڑے روپیہ ملے۔

ایڈ۔۔۔ لازماً۔

میں۔۔۔ جیسے اسکے اندر مختلف دستروں کی آرزو کی بعد دیگرے پیدا ہوتی تھی اور نئی خواہشیں پرانیوں سے بڑھ چڑھ کر رہتی تھیں اور ان کے حقوق تلف کر لیتی تھیں، اسی طرح چونکہ یہ ابھی نوجوان ہی اس لیے اپنے ماں باپ سے زیادہ کا دعویٰ کرتا تھا، اور اگر املاک میں خود اپنا حصہ کھا اڑا چکا تو اب ان کے حصوں کی کتر بیونت کی فکر کرتا ہی۔

ایڈ۔۔۔ بلاشبہ۔

میں۔۔۔ اگر والدین نہ مانیں تو سب سے پہلے تو انھیں دہوکا اور زریب دینے کی کوشش کریگا۔

ایڈ۔۔۔ بالکل سچ ہی

میں۔۔۔ اگر اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی تو یہ جبر کر کے انھیں لوٹ لیگا۔

ایڈ۔۔۔ ہاں۔ غالباً۔

میں۔۔۔ اور اگر ماں باپ اپنے حق کے لیے لڑے تو پھر کیا ان پر ظلم و ستم کرنے کا دل کچھ پیچھا گیا؟

ایڈ۔۔۔ نہیں، غریب والدین کا تو جو حشر ہو گا وہ میرے نزدیک کچھ اچھا نہیں۔

میں۔ لیکن۔ ایڈمنٹس، بخدا ذرا دیکھو کیا تم باور کر سکتے ہو کہ کسی ایک وزو  
محبوبہ کی خاطر جس کا اسپر کوئی حق نہیں یہ اپنی اس ماں پر ہاتھ اٹھائیگا جو ساری عمر  
اس کی مونس و ہمدم اور خود اسکے وجود کے لیے ایک ضروری ہستی رہی ہو یا اس  
نئی آشنا کو اپنے گھر لاکر اپنی ماں کو اس کے زیرِ ہمتی رکھیگا۔ یا اسی طرح کسی نوجوان  
جو ان رعنا کی خاطر جو اسکے لیے بالکل ضروری نہیں یہ اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ جو اسکا  
سب سے پہلا اور سب سے ضروری رفیق ہے اسی قسم کا سلوک روا رکھیگا۔ ؟  
ایڈ۔۔ ہاں، میں تو سمجھتا ہوں کہ بیشک رکھیگا۔

میں۔۔۔ سچ ہے۔ ایک جابر و مستبد مٹیا اپنے ماں باپ کے لیے بڑی ہی بگڑتی  
ایڈ۔۔۔ جی، کیا کہنا !!

میں۔۔۔ اب یہ سب سے پہلے تو انکی املاک ضبط کرتا ہے۔ اور جب اس سے بھی  
کام نہیں چلتا اور جب اس کی روح پر مختلف خواہشوں کا نزعہ یوں جاری رہتا ہے جیسے  
چھتہ پر شہد کی مکھیوں کا تو پھر کسی کے گھر میں ڈاکہ ڈالتا ہے یا رات میں کسی راہ چلتے کر  
کپڑے اٹا لیتا ہے۔ اسکے بعد عبادت گاہوں پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔ اسی دوران میں  
بچپن کے جو پرانے خیالات اسکے ذہن میں تھے اور جن کے اعتبار سے یہ نیک و بد میں  
تمیز کرتا تھا ان سب کو وہ نئے خیالات خارج کر دینگے جو ابھی ابھی رہا ہوئے ہیں اور  
اس کے عشق کے محافظ اور اس کی سلطنت کے شرکاء ہیں۔ ایام جمہوری میں کہ ابھی  
اپنے باپ نیز قوانین کا پابند تھا۔ یہ خیالات صرف عالم خواب میں آزادی پاتے تھے



لیکن اب کہ یہ سلطان عشق میں ہی سپر جیتے جاگتے واقعا وہ کیفیت ہمیشہ طاری ہوتی ہے جو پہلے گاہے گاہے اور وہ بھی خواب میں طاری ہوتی تھی۔ اب یہ حرام خدا کا لگا اور ناپاک قتل اور سنگین سے سنگین جرم کا مرتکب ہو جائیگا۔ عشق گویا اسکا مستبد ہے اور اس کے اندر بے آئین و قوانین فرمانروائی کرتا ہے۔ پھر جسے مستبدیت کو جدھر چاہتا ہے لیجاتا ہے، اسی طرح یہ عشق بھی کہ بادشاہ مختار ہوا سے ہر اس بڑے کام پر آمادہ کر لیتا ہے جو اسکے اور اس کے ساتھیوں کے انبوه کے بقا و قیام کا باعث ہو پھر چاہے یہ ساتھی کسی بڑے سلسلہ سے باہر سے آئے ہوں یا جنھیں خود اس کی بد اطواری نے ہمیں پیدا کیا ہو۔ کیوں، کیا یہ اسکے طرز زندگی کی تصویر نہیں؟۔

ایڈ۔ ہاں، بیشک۔

میں۔ اگر ایسے لوگ رمایست میں تھوڑے سے ہی ہیں اور باقی دوسرے صحیح طبع ہیں تو پھر یہ یہاں سے چل دیتے ہیں اور جا کر کسی ایسے مستبد کے محافظ خاص یا جوائے کے سپاہی بن جاتے ہیں جنھیں شاید جنگ کے لیے ان کی ضرورت ہے۔ اور اگر جنگ نہیں تو یہ گھری پر ٹھہرتے ہیں اور شہر میں اکثر چھوٹی چھوٹی شرارتیں برپا کرتے رہتے ہیں۔

ایڈ۔ کیسی شرارتیں؟

میں۔ مثلاً یہ کہ یہی لوگ چور، قزاق، گرہ کٹ، اُچکے ہوتے ہیں، یہی معبودوں میں ڈاکہ ڈالتے اور یہی آدمیوں کو دبوکہ سے بھگائے جاتے ہیں، یا اگر زبان فدا چلتی ہوئی ہے تو منجر بن جاتے ہیں، جھوٹی شہادتیں دیتے ہیں اور خوب شوٹیں اڑاتے ہیں۔



ایڈ۔ بڑائیوں کی بہت چھوٹی سی فہرست ہے، اگرچہ انکے تکب قورے سے  
ہی تھی!

میں۔ جی ہاں۔ مگر چھوٹا، اور بڑا، یہ تو اضافی انفاظ ہیں۔ اور اگر اس خرمی  
اور تباہی کا خیال کیجئے جو انہی نے ریاست پر نازل ہوتی ہے تو یہ چیزیں تو مستبد کو ہزاروں  
کوس نہیں پہنچتیں۔ کیونکہ جب اس مضر طبقہ اور اسکے متبعین کی تعداد بڑھتی ہے اور جمہور  
کی سادہ دلی کی مدد سے ان میں اپنی قوت کا احساس پیدا ہوتا ہے، تو پھر یہ اپنے میں  
سے اس ایک کو منتخب کرتے ہیں جس کی روح میں سب سے زیادہ مستبد کی صفات موجود  
ہوں اور اسے یہ اپنا مستبد بناتے ہیں۔

ایڈ۔ ہاں، اور مستبد بننے کے لیے ہر بھی سب میں موزوں۔

میں۔ اب اگر لوگ دب گئے تو بجا و درست۔ لیکن اگر انہوں نے مخالفت کی  
تو انہی جیسے اپنے ماں باپ کو ٹھوک کر ابتدا کی تھی ویسے ہی اب اگر اس میں قوت ہوئی  
تو انہیں ٹھوکے اور بقول اہل کرمٹ اپنے عزیز و معتمد پر یا ماں و وطن کو ان کم عمر ملحقین  
کی ماتحتی میں رکھیں انہیں اسے ان کا حکمراں اور آقا بنایا ہے۔ اس کے سائے جذبات  
اور خواہشات کا یہ نتیجہ ہوگا۔

ایڈ۔۔ بالکل درست۔

میں۔ جب تک ان لوگوں کو طاقت حاصل نہیں ہوتی تو خانگی زندگی میں انکی  
سیرت یہ ہوتی ہے کہ یہ تمام تر اپنے خوشامدیوں سے یا ایسے لوگوں سے ملتے جلتے ہیں جو



ان کے ہاتھ میں ہر دم ایک آلہ بنے رہیں۔ اور اگر خود انہیں کسی سے کچھ ضرورت پڑے تو اس کے سامنے سر جھکانے کو بھی اسی طرح تیار رہیں۔ اللہ نے ہر قسم کی محبت و تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن جہاں مطلب نکل گیا تو گویا جانے سے بھی نہ تھے۔

ایڈ :- جی - صحیح ہے۔

میں :- یہ ہمیشہ یا تو آقا رہتے ہیں یا غلام، کبھی کسی کے دوست نہیں ہوتے۔ سچ ہی مستبد کبھی حقیقی آزادی اور دوستی کا مزا نہیں چکھتا۔

ایڈ :- ہرگز نہیں۔

میں :- کیا ہم بجا طور پر ایسے لوگوں کو دغا باز نہیں کہہ سکتے؟  
ایڈ :- اس میں کیا کلام ہے۔

میں :- اور اگر انصاف کے متعلق ہمارا تصور صحیح تھا تو یہ لوگ مطلقاً غیر منصف بھی ہوتے ہیں۔

ایڈ :- جی ہاں، ہم لوگ بالکل صحیح تھے۔

میں :- اچھا تو اب اس بدترین انسان کی سیرت کو ایک لفظ میں بیان کریں کہ ہم نے جو خواب دیکھا تھا یہ اسکی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

ایڈ :- بالکل صحیح۔

میں :- اور یہ چونکہ بالطبع مستبد ہے اس لیے حکمرانی کرتا ہے اور جتنا زیادہ زندہ رہتا ہے اتنا ہی اس کا استبداد بڑھتا جاتا ہے۔ اب جو اب کی بڑی گلازن کی تھی چنانچہ وہ بولے

”یہ تو یقینی امر ہے۔“

میں :- اور یہ انسان جس کو ہم نے سب سے زیادہ شریظاً ہر کیا ہے کیا سب سے زیادہ تباہ حال بھی نہ ہوگا۔ اور جس نے سب سے شدید اور سب سے زیادہ جب و استبداد سے کام لیا ہے وہ گویا متواتر اور حقیقی معنوں میں تباہ حال۔ اگرچہ ممکن ہے کہ عوام انکس کی یہ رٹے نہ ہو۔

گ :- جی ہاں، لازماً۔

میں :- اور کیا استبدادی آدمی کو استبدادی ریاست کی طرح اور جمہوری آدمی کو جمہوری ریاست کی طرح نہ ہونا چاہیے اور علیٰ ہذا النقیاس۔

گ :- یقیناً۔

میں :- اور نیکی اور خوشحالی میں جو تعلق ریاست کو ریاست سے ہو وہی ایک انسان کو دوسرے انسان سے ہے۔

گ :- بالیقین۔

میں :- پھر لگر ہم اپنے اصلی شہر کا جو ایک بادشاہ کے ماتحت تھا اس شہر سے مقابلہ کریں جو ایک مستبد کے تحت میں ہے تو باعتبار نیکی ان کی کیا نسبت ہوگی؟

گ :- یہ تو ایک دوسرے کی انتہائی ضد ہیں کیونکہ ایک اگر بہترین ہے تو دوسرا

بدترین۔

میں :- اس میں تو کوئی غلطی ہو ہی نہیں سکتی کہ کون بدترین ہے اور کون بہترین



لہذا اب فوراً یہ دریافت کرنا چاہیے کہ آیا انکی اضافی خوشحالی و بد حالی کے متعلق بھی ہم اسی نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں، البتہ اس معاملہ میں ہمیں مستبد کے جوت کو دیکھ کر بہت سراسیمانہ ہونا چاہیے کہ یہ تو ایک فرد ہی اور اسکے ارد گرد شاید چند ہی محققین۔ بلکہ ہمیں چاہیے کہ ہم شہر کے گوشے گوشے میں جا کر دیکھ بھال کریں اور پھر اپنی رائے دیں۔

گ :- نہایت معقول بات ہے اور میں تو صاف دیکھتا ہوں (جیسا کہ ہر شخص دیکھنا چاہیے) کہ استبداد حکومت کی سب سے منحوس اور بادشاہ کی حکومت سب سے خوشحال قسم ہے۔

میں :- اسی طرح انسانوں کے متعلق ریلے قائم کرنے میں بھی کیا میں بجا طور پر یہی درخواست نہیں کر سکتا کہ مجھے ایک ایسا حکم چاہیے جس کا دماغ فطرت انسانی میں داخل ہو کر اسے دیکھ سکتا ہو؟ وہ بچہ کی طرح نہ ہو جو صرف ظاہر کو دیکھتا ہے اور اس شاندار و پر شوکت ادا کے مشاہدہ سے خیرہ ہو جاتا ہے جو اس ابتدائی فطرت اپنے ناظر کے سامنے اختیار کرتی ہے بلکہ مجھے تو ایسا آدمی چاہیے جو واضح بصیرت رکھتا ہو۔ کیا میں فرض کروں کہ یہ حکم ایک ایسا شخص تم سب لوگوں کی موجودگی میں سناتا ہے جو اس پر حکم لگانے کا اہل ہے، اس شخص کے ساتھ ایک ہی مقام پر رہ چکا ہے، اس کی روزانہ زندگی کو بھی دیکھا ہے اور اسے اس ناک کے سے ظاہر الباس سے معراخانی توجہ میں بھی جانتا ہے اور عام خطرہ کے وقت بھی اس کا مشاہدہ کر چکا ہے۔ یہ شخص تلاش کر



کہ مستبد کی خوشحالی یا بدحالی کی بمقارہ دوسرے انسانوں کے کیا کیفیت ہے؟

گ۔ جی ہاں، یہ بھی نہایت معقول تجویز ہے۔

میں۔ تو کیا میں یہ سمجھ لوں کہ ہم خود ہی اسکے اہل اور تجربہ کار حکم ہیں اور اس سے قبل ایسے انسان سے مل چکے ہیں؟ تاکہ کوئی تو ہو جو ہمارے سوالات کا جواب دے سکے۔

گ۔ ضرور۔

میں۔ لیکن فرد اور ریاست کی مماثلت نہ بھولانی جائے، یہ ہر وقت پیش نظر رہے باری باری سے کبھی اس پر نظر ڈال کر کبھی اسپرن کی جداگانہ کیفیات بتلائے۔

گ۔ آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں۔ ریاست سے شروع کیجئے اور دیکھئے کہ جس شہر پر مستبد کی حکومت ہے اسے آپ آزاد کہیں گے یا غلام؟

گ۔ کوئی شہر اس سے زیادہ کامل طور پر غلام نہیں ہو سکتا۔

میں۔ لیکن پھر بھی آپ دیکھتے ہیں ایسی ریاست میں احرار بھی ہیں اور قابض

گ۔ جی ہاں، میں دیکھتا ہوں۔ لیکن معدوٹے چند۔ عام طور پر جمہور اور انہیں

سے بھی بہترین نہایت درجہ ذلت اور غلامی میں ہیں۔

میں۔ پھر اگر فرد ریاست کی طرح ہوتا ہی تو یہی حال یہاں ہوگا۔ اس کی روح



کمینہ پن اور بیہودگی سے پُر ہوگی، اس کی طبیعت کے بہترین عناصر غلامی کی حالت میں ہوں گے۔ ایک چھوٹا سا جزو حکمراں ہوگا اور یہی سب سے بڑا اور سب سے پُراں ہوگا۔  
گ :- لازماً۔

میں :- اچھا پھر آپ کیا کہیں گے کہ ایسے آدمی کی روح ایک آزاد انسان کی روح ہی یا ایک غلام کی ہے؟

گ :- میری رائے میں ہمیں غلام کی روح ہے۔

میں :- اور جو ریاست مستبد کی غلامی میں ہو وہ خود کسی آزادی فعل کے قابل نہیں ہوتی؟

گ :- مطلقاً ناقابل ہو جاتی ہے۔

میں :- اسی طرح جو روح ایک مستبد کے ماتحت ہو (میں روح کا ذکر بہ حیثیت گل کے کر رہا ہوں) ہمیں اپنے من مانے کام کے کرنے کی سب سے کم صلاحیت ہوتی ہے۔ ایک ڈانس ہوتی ہے جو اسے برابر کساتی ہے اور یہ غریب بچ و تکلیف پُر رہتی ہے۔  
گ :- یقیناً۔

میں :- اور مستبد کے تحت والا شہر مالدار ہوتا ہے یا مفلس؟

گ :- مفلس۔

میں :- تو استبدادی روح کو بھی ہمیشہ مفلس ناقابل تسکین ہونا چاہیے۔  
گ :- درست۔

میں :- پھر کیا یہ ضروری نہیں کہ ایسی ریاست اور ایسا انسان ہمیشہ پراز  
خوف رہے۔

گ :- جی ہاں، یقیناً۔

میں :- کیا اور کسی ریاست میں اس سے زیادہ نالہ ڈراری آہ و بکا، رنج و  
الم تمہیں مل سکیگا؟

گ :- ہرگز نہیں۔

میں :- اور کیا کسی اور انسان میں تمہیں مستبد سے زیادہ اس قسم کی مصیبت  
ملیگی۔ یہ مستبد جس پر جذبات اور خواہشات کی ایک بدحواسی ہی طاری ہو؟

گ :- ناممکن۔

میں :- ان اور ان جیسی دوسری برائیوں کا خیال کر کے ہی تو آپ نے مستبد کی  
ریاست کو سب سے بد حال ریاست قرار دیا تھا؟

گ :- جی ہاں، اور ٹھیک قرار دیا تھا۔

میں :- بیشک، اور جب ہی سب خرابیاں آپ مستبد کی آدمی میں دیکھیں  
تو اسکے متعلق کیا کہیں گے؟

گ :- یہ کہ وہ ساری دنیا میں سب سے زیادہ بد حال و گرفتار مصیبت انسان ہو۔

میں :- میرا خیال ہو کہ بس یہی آپ نے غلطی شروع کی۔

گ :- کیا مطلب؟



میں :- میری رلے میں یہ ابھی بد حالی و مصیبت کی حد آخر تک نہیں پہنچا ہوا  
گ :- کیوں؟ اور اس سے زیادہ بد حال و مصیبت نہ وہ کون ہے؟  
میں :- وہ جسکا ذکر میں ابھی کرتا ہوں۔

گ :- وہ کون؟

میں :- وہ شخص جو بالطبع استبدادی ہے، اور بجائے اسکے کہ اپنی شخصی زندگی  
اپنے طور پر گزارے اسپر شومی قسمت سے جبر و استبداد عام کا عذاب نازل ہوا ہے۔  
گ :- ہم لوگ پہلے جو کچھ کہہ چکے ہیں اسکی رو سے تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا  
خیال صحیح ہے۔

میں :- ہاں، لیکن اس اعلیٰ بحث میں آپ کو صرف قیاس پر قناعت نہ کرنی  
چاہئے بلکہ اچھا ہے کہ آپ کو ذرا زیادہ متیقن ہو، کیونکہ سائے سوالوں میں یہ خیر و شر والا  
سوال سب سے بڑا ہے اور سب سے اہم۔  
گ :- بہت درست۔

میں :- اچھا تو میں ایک مثال دوں جو میں سمجھتا ہوں اس مضمون پر روشنی  
ڈالے گی۔

گ :- فرمائیے۔ کیا مثال ہے؟

میں :- شہروں میں بہت سے غلام رکھنے والے مالدار افراد کا جو حال ہوتا ہے  
اس سے آپ مستبد کی کیفیت کا ایک تصور قائم کر سکتے ہیں۔ کیونکہ غلام تو دونوں

کے پاس ہوتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ مؤخر الذکر کے پاس زیادہ ہوتے ہیں۔

گ :- جی، بس یہی فرق ہے۔

میں :- آپ جانتے ہونگے کہ یہ لوگ نہایت اطمینان سے رہتے ہیں اور اپنے نوکروں سے کسی قسم کا اندیشہ نہیں رکھتے؟

گ :- کیوں، اندیشہ پاؤں کا ہیکا؟

میں :- کسی کا نہیں۔ لیکن آپ نے اس کی وجہ بھی ملاحظہ کی؟

گ :- ہاں، وجہ یہ ہے سارا کا سارا شہر ہر فرد واحد کی حفاظت کیلئے متحرک ہے۔

میں :- بہت صحیح۔ لیکن ذرا فرض کیجئے کہ ان میں سے ایک مالک کو جو کئے

پچاس غلاموں کا آقا ہے کوئی دیوتا مع اس کے خاندان، املاک اور غلاموں کے اڑا کر

جنگل میں لے گیا جہاں اسکی مدد کے لیے ایک بھی آزاد انسان نہیں تو ایسی حالتیں

کیا اسے نہایت شدت سے یہ خوف نہ ہوگا کہ کہیں اس کے غلام اسکے بیوی بچوں کو

مار نہ ڈالیں؟ -

گ :- جی ہاں، بیشک، یہ نہایت درجہ خائف ہوگا۔

میں :- اب وہ وقت آن پہونچا ہے کہ یہ اپنے غلاموں کی خوشامد کرنے پر مجبور ہوگا

اور اپنے آزادی اور دوسری چیزوں کے بہت سے وعدے کرے گا، اور اپنی مرضی کے خلاف

اپنے غلاموں کی ناز برداری کرنی ہوگی۔

گ :- جی ہاں، اس کے پاس اپنے بچاؤ کے لیے اب بس یہی تو ایک طریقہ ہے۔



میں :- پھر فرض کرو یہی دیوتا جو اسے لے گیا ہے اس کے چاروں طرف ایسے  
ہمسایے پیدا کر دے جنہیں یہ بات گوارا نہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کا  
آقا ہو، اور اگر کوئی اس حرم کا مرتکب ہو اور یہ اُسے پکڑ پائیں تو جان ہی لے لیں۔  
گ :- اب تو اس کی حالت اور بھی خراب ہو جائیگی، کیونکہ اب فرض کرتے  
ہیں کہ یہ ہر طرف دشمنوں سے محصور ہے اور یہ اسپر مردم پرہ چوکی رکھتے ہیں۔  
میں :- تو کیا یہی وہ زندان نہیں جس میں مستبد مقید ہوگا۔ کیونکہ اس کی  
طبیعت کا حال تو وہ ہے جو ہم بیان کر چکے یعنی طرح طرح کے اندیشوں اور خواہشوں سے  
لبریز۔ اس کی روح بہت نازک اور نہایت عریض ہے، لیکن سائے شہر میں بس ہی  
ایک شخص ہی جو نہ کبھی سفر کر سکتا ہے نہ وہ چیزیں دیکھ سکتا ہے جو آزاد انسان دیکھنا  
چاہتے ہیں، یہ اپنے بل میں ایسے رہتا ہے جیسے عورتیں اپنے مکانوں میں چھپی رہتی ہیں  
اور ہر اس شہری سے جلتا ہے جو خارجی مالک میں جا کر کوئی دلچسپ چیز دیکھے۔  
گ :- بہت صحیح۔

میں :- یہ آدمی جس کی اپنی ذات بہت بڑی طرح محکوم ہے، یہ استبداد ہی ہے  
آپ نے ابھی سب سے بد حال انسان کہنے کا فیصلہ کیا ہے کیا اس وقت اور بھی زیادہ  
بد حال نہ ہوگا جب بجائے اسکے کہ یہ اپنی شخصی زندگی گزارے قسمت سے اسپر مجبور ہوتا  
ہے کہ ایک مستبدہ ام بنے؟ اسے دوسروں کا آقا بننا پڑتا ہے جب کہ یہ خود اپنا آقا نہیں  
اس کی مثال ایک سرریض یا مفلوج انسان کی سی ہے جو بجائے گوشہ عزلت میں اپنی



زندگی کے دن کاٹنے کے اسپر مجبور کیا جاتا ہے کہ اسے دوسرے انسانوں سے لڑائی اور معرکہ آرائی میں گزارے۔

گ۔ جی ہاں، یہ تیشیل نہایت صحیح ہے۔

میں۔ کیا اس کی حالت حد درجہ مصیبت ناک نہیں؟ کیا یہ اصلی مستبد اس شخص سے بھی بدتر زندگی نہیں گزارتا جس کی زندگی کو آپ نے بدترین قرار دیا تھا؟

گ۔ بیشک۔

میں۔ لوگ جو چاہیں سمجھیں سچ یہ ہے کہ جو حقیقی مستبد ہو وہی حقیقی غلام ہو اسی کو سب سے زیادہ بجا جت اور غلامانہ باتیں کرنی پڑتی ہیں اور اسی کو بڑے سے بڑے انسانوں کی خوشامد کرنا پڑتی ہے۔ اسکے دل میں آرزوئیں ہیں جنہیں کبھی پورا نہیں کر سکتا، اسکے احتیاجات اور سبھوں سے زیادہ ہیں، چنانچہ اگر آپ اس کی ساری روح کو دیکھ سکیں تو یہ حقیقی معنوں میں نادار ہے۔ اپنی مثال ریاست کی طرح یہ ساری عمر خوف زدہ رہتا ہے اور اس کی زندگی درد و الم، تشنج و انتشار کا ایک مجموعہ ہے۔ سچ ہی ایک ریاست اور زندگی یہ مماثلت بالکل پوری اترتی ہے۔

گ۔ نہایت سچ۔

میں۔ اسپر طرہ یہ کہ جیسا ہم ابھی کہہ رہے تھے قوت و اقتدار کے باعث یہ اور بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ یہ لازماً پہلے سے زیادہ حاسد، زیادہ بے وفاء، زیادہ غیر منصف،



زیادہ بے یار اور زیادہ بددیانت ہو جاتا ہے۔ یہ ہر قسم کا عیب پالتا ہے اور ہر نوع کی بُرائی کا حامل ہے۔ نتیجہ یہ کہ خود غایت درجہ بد حال ہے اور ہر ایک کو اپنی طرح بد حال بناتا ہے۔

گ۔ کوئی معقول آدمی آپ کے الفاظ کی صحت سے انکار نہیں کر سکتا۔ میں :- اچھا تو آئیے جس طرح نائکوں کے مقابلہ میں ایک عام حکم نتیجہ کا اعلان کرتا ہے اسی طرح آپ بھی فیصلہ کیجئے کہ آپ کی رائے میں خوشحالی کے اعتبار سے کون سے اول ہے، کون دوم، اور پھر اسکے بعد دوسرے کس ترتیب سے آتے ہیں۔ یہ سب کل پانچ ہیں یعنی حکومت شاہی، حکومت اختیار، حکومت خواص، حکومت جمہوری، اور حکومت استبدادی۔

گ۔ اس کا فیصلہ تو نہایت سہل ہے۔ یہ گویا میرے سامنے اس طرح آئینگی جیسے باہم ملکر گانے والے اسٹیج پر آتے ہیں اور پھر جیسے جیسے آتے جائیں، میں خیر و شر، نیکی و بدی، خوشحالی و بدحالی کے معیار سے ان پر حکم لگاتا جاؤں۔

میں :- کیا اس کی ضرورت ہے کہ کوئی نقیب کرایہ پر بلائیں، یا میں ہی اعلان کر دوں کہ ابنِ اسطین (بہترین) نے فیصلہ کر دیا ہے کہ جو سب سے اچھا اور سب سے عادل ہے وہی سب سے زیادہ خوشحال بھی ہے اور یہ وہ سب سے زیادہ شاہی انسان ہے جو خود اپنی ذات کا بادشاہ ہے۔ اور جو سب سے بُرا اور سب سے غیر منصف ہے وہی سب سے زیادہ بُرے حال میں ہے اور یہ وہ ہے جو اپنی ذات کا سب سے بُرا جابر و مستبد ہے اور ایسے ریاست کا

سب سے بڑا جابر و مستبد۔

گ۔ ہاں، آپ ہی اعلان کر دیجئے۔

میں۔۔۔ اس میں ان الفاظ کا اور اضافہ کر دوں کہ ”چاہے دیوتا اور انسان  
لے دکھیں یا نہ دکھیں“؟

گ۔۔۔ جی ہاں، کر دیجئے۔

میں۔۔۔ اچھا تو یہ تو ہمارا پہلا ثبوت ہے، اسکے علاوہ ایک اور بھی ہے، ممکن  
ہی یہ کچھ وزن رکھے۔

گ۔۔۔ وہ کیا؟

میں۔۔۔ دوسرا ثبوت ماہیت روح سے مستنبط ہوتا ہے۔ یاد ہو گا کہ ریاست  
کی طرح ہم نے انفرادی روح کو بھی تین اصولوں میں تقسیم کیا ہے، اور میں سمجھتا ہوں  
کہ اس تقسیم سے بھی اس بارہ میں ایک مظاہرہ فراہم ہو سکتا ہے۔

گ۔۔۔ کس قسم کا مظاہرہ؟

میں۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان تین اصولوں کے مطابق تین مستریں ہوتی ہیں  
نیز تین خواہشیں اور تین حکمراں طاقتیں۔

گ۔۔۔ کیسے؟ کیا مطلب؟

میں۔۔۔ ایک اصول تو وہ ہے جس سے بقول خود ہمارے انسان سیکھتا ہے  
دوسرا وہ ہے جس سے وہ غصہ کرتا ہے، تیسرے کی چونکہ بہت سی شکلیں ہیں اس لئے



اس کا کوئی خاص نام نہیں البتہ اسے اشتہائیہ کی عام اصطلاح سے اس لیے ظاہر کرتے ہیں کہ کھانے پینے کی خواہشوں نیز دیگر شہوات نفسانی کو نہایت غیر معمولی قوت و شدت حاصل ہو اور یہی اس کے خاص عناصر ہیں۔ حُتّ زربھی اس میں شامل ہے، کیونکہ ایسی خواہشیں عموماً روپیہ کی مدد ہی سے پوری ہوتی ہیں۔

گ :- بجا ہے۔

میں :- اگر ہم یہ کہیں کہ اس تیسری قسم کی محبتیں اور مستریں تمام تر نفع سے وابستہ ہیں تو ہم ان سب کو ایک واحد تصور کے تحت میں لے آئیں گے اور بجا طور پر کہہ سکیں گے کہ روح کا یہ جزو طالب نفع اور عاشق زربھی اور یہ بات قابل فہم بھی ہوگی۔

گ :- میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔

میں :- اسی طرح جذباتی عنصر کیا تا متر حکمرانی، و فتنہ دہی، اور حصول شہرت

میں مشغول نہیں رہتا؟

گ :- بجا۔

میں :- فرض کرو ہم اسے مسابقی یا حوصلہ مند اصول کہیں، تو کیا یہ مناسب

نام نہ ہوگا؟

گ :- نہایت مناسب۔

میں :- برخلاف اس کے ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اصول علم نامہ حقیقت

صداقت کی طرف متوجہ رہتا ہے اور نفع یا شہرت کے لیے ہر دوسرا طبقہ اصولوں سے کم

خیال رکھتا ہے۔

گ :- بہت کم۔

میں :- روح کے اس حصہ کو ہم بجا طور پر "عاشقِ علم" و "محبتِ دانش" کا لقب

دے سکتے ہیں۔

گ :- بیشک۔

میں :- ایک طبقہ کے لوگوں کی روح میں ایک اصول ساری ہوتا ہے اور

دوسرے طبقہ میں دوسرا اور سمجھیں۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- اچھا تو ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ انسانوں کے تین گروہ ہوتے ہیں:

عقل و دانش کے عاشق، عزت کے عاشق اور نفع کے عاشق۔

گ :- صحیح۔

میں :- اور تین ہی قسم کی مسرتیں ہوتی ہیں جو ان میں سے ایک ایک کا

مقصود خارجی ہوتی ہیں۔

گ :- بہت بجا

میں :- اب اگر آپ ان تینوں طبقوں کے آدمیوں سے ملیں اور پوچھیں کہ

کس کی زندگی سب سے زیادہ پر مسرت ہے، تو ہر ایک اپنی زندگی کی تعریف اور خوشی



تفقیص کرے گا۔ محبت زر سونے چاندی کے ٹھوس فائدہ سے عزت و علم کا مفت ابلہ  
 کر کے کہے گا کہ اگر ان سے روپیہ نہ حاصل ہو تو یہ بالکل بیسج ہیں۔  
 گ۔ بہ سچ ہے۔

میں :- اور جو عزت کا دلدادہ ہے بھلا اس کی کیا رائے ہوگی؟ کیا یہ مال  
 و دولت کی محبت کو نہایت رکیک نہ تصور کرے گا اور جب علم کو اگر اس کے ہر کا  
 عزت امتیاز نہ ہو تو اپنے لیے محض ایک غبار اور بے معنی چیز ہے؟  
 گ۔ بہت درست۔

میں :- اب رہا فلسفی تو کیا یہ علم حقیقت کی مسرت کے مقابلہ میں دوسری  
 مسرتوں کی کچھ قدر کرے گا۔ یہ تو ہر دم اسی دھن میں مشغول اور ہر آن کچھ نہ کچھ  
 مصروف رہے گا اور پھر بھی آسمان مسرت سے کیا کچھ بہت دور ہوگا؟ یہ شاید دوسری  
 مسرتوں کو ضروری خیال کرے گا کیونکہ اگر یہ ضروری نہ ہو تو میں تو پھر یہ ان سے سروکار  
 ہی کیوں رکھتا؟

گ۔ :- آہیں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

میں :- اب چونکہ ماہہ النزاع معاملہ مختلف طبقوں کی مسرتیں اور انکی زندگیاں  
 ہیں۔ اور سوال یہ ہے کہ کون زندگی زیادہ قابل عزت ہے اور کون کم، نہ سوال یہ ہے  
 کہ کون بہتر ہے اور کون بدتر، بلکہ چونکہ سوال یہ ہے کہ کونسی زندگی خط و مسرت سے زیادہ ہے؟  
 اور کرب الم سے زیادہ بری ہے، اس لیے ہم کیسے جان سکتے ہیں کہ ان میں سے کونسا

گروہ سچ کہہ رہا ہے؟

گ۔۔ میں تو خود نہیں بتا سکتا۔

میں۔۔ لیکن جس کوئی معیار تو ہونا چاہیے اور وہ کیا ہو؟ کیا تجربہ دانش

و عقل سے بھی بہتر کوئی معیار ہے؟

گ۔۔ اس سے بہتر کچھ اور کون معیار ہو سکتا ہے؟

میں۔۔ اچھا تو ذرا غور کرو۔ ہم نے جو مسرتیں گنوائی تھیں ان سب کا سب سے

زیادہ تجربہ ان تین افراد میں سے کس کو حاصل ہے؟ کیا نفع کے دلدادہ کو صداقت حقیقی

کی ماہیت کے سیکھنے میں مسرت علم کا اس سے زیادہ تجربہ ہے جتنا کہ فلسفی کو مسرت

نفع کا؟

گ۔۔ اس معاملہ میں تو فلسفی بڑے فائدہ میں ہے۔ کیونکہ یہ تو لازمی طور پر

بچپن سے تمام دوسری مسرتوں کے مزے سے واقف ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ طالب

نفع کی زبان اپنے سارے تجربہ میں کبھی صداقت کا علم اور سیکھنے کی حلاوت سے لڑ

آشنا ہوئی ہو۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ اگر چاہتا بھی تو مشکل ہی سے اسے چکھ سکتا۔

میں۔۔ لہذا محبت دانش کو طالب نفع پر بڑی فضیلت ہے، کیونکہ اسے وہ چند

تجربہ حاصل ہے۔

گ۔۔ بیشک یہ بڑی فضیلت ہے۔

میں۔۔ پھر کیا اسے مسرت عزت کا زیادہ تجربہ ہے یا عزت کے دلدادہ کو مسرت



علم و دانش کا؟

گ :- نہیں۔ عزت تو تینوں کی ہا سی نسبت سے ہوتی ہے جس نسبت سے یہ اپنا اپنا مقصد حاصل کر لیں۔ مالدار، بہادر، اور عقلمند تینوں کے لیے مداحوں کا ایک مجمع ہوتا ہے، اور چوں کہ سب کی عزت ہوتی ہے اسی لیے سب کو عزت کی مسرت کا تجربہ ہوتا ہے۔ لیکن جو حقیقی کے علم میں جو مسرت ہے اس سے صرف فلسفی ہی آشنا ہوتا ہے۔

میں :- اپنے اس تجربہ کے باعث ہمیں سب سے بہتر فیصلہ کی قابلیت ہوگی  
گ :- کہیں بہتر۔

میں :- اور یہی تو ایک بڑی چیز ہے علم و دانش بھی ہے اور تجربہ بھی۔  
گ :- بیشک۔

میں :- مزید براں وہ قوت اور صلاحیت جو فیصلہ کا آلہ ہے، لاپچی اور حوصلہ مند آدمی میں تو وہ نہیں ہوتی، یہ تو صرف فلسفی میں ہوتی ہے۔  
گ :- کون صلاحیت؟

میں :- عقل، کیونکہ جیسے کہ ہم کہہ چکے ہیں فیصلہ اسی کے ہاتھ رہنا چاہیے۔  
گ :- جی ہاں۔

میں :- اور عقل اسکا مخصوص آلہ ہے۔  
گ :- بیشک۔

میں ۔ اگر دولت اور نفع معیار ہوتے تو بیشک طالب نفع کی تعریف یا

تنقیص سب سے زیادہ قابل اعتماد مانی جاتی؟

گ ۔ یقیناً

میں ۔ اور اگر عزت، جرات، یا فحتمندی معیار ہوتے تو حوصلہ مند اور فاتح

کا فیصلہ سب سے سچا ہوتا۔

گ ۔ ظاہر ہے۔

میں ۔ لیکن چونکہ حکم تجربہ، عقل و دانش ہیں۔۔۔۔۔

گ ۔ اس لیے ہی ایک استنباط ممکن ہے کہ جن مسرتوں کو عقل و دانش

کا عاشق پسند کرے وہی سچی مسرتیں ہیں۔

میں ۔ چنانچہ ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ روح کے جزو فیہم و دانا کی خوشی تینوں

میں سب سے زیادہ پر مسرت ہے اور ہم میں سے جس میں یہ اصول حکمراں ہو اسی کی زندگی

سب سے پر خط و خوش آئند۔

گ ۔ اس میں کیا کلام ہے۔ دانشمند انسان جب اپنی زندگی کو پسند کرتا ہے تو

اسے نہایت اعتماد سے کتابھی ہے۔

میں ۔ پھر اس کے بعد کوشی زندگی اچھی ہے اور کوشی مسرت؟ اسکے متعلق

ہمارے حکم صاحب کیا کہتے ہیں؟

گ ۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد سپاہی اور دلدادہ عزت کی زندگی ہے کہ یہ مقابلہ



طالب نفع کے اس سے قریب تر ہے۔

میں :- اور سب سے آخر میں طالب نفع؛

گ :- ہاں، اور کیا۔

میں :- اچھا تو تم نے دیکھا عادل آدمی نے غیر منصف کو پیسہ دو مرتبہ پچھاڑا  
اب تیسرا امتحان آتا ہے اور یہ اولپیا کے دیوتا نکلیں شائع کے نام سے منسوب ہے  
کوئی مرد وانا آہستہ سے میرے کان میں کہتا ہے کہ سوائے عقلمندی مسرت کے اور  
کوئی مسرت بالکل سچی اور خالص نہیں، اور باقی سب صرف سایہ ہیں مجھے یقین ہے  
کہ ابلی شکست سے بڑی اور فیصلہ کن ثابت ہوگی۔

گ :- ہاں سب سے بڑی تو ہوگی، لیکن ذرا اپنا مفہوم تو واضح کیجئے؟

میں :- میں اس مسئلہ کو حل کرتا ہوں، تم میرے سوالوں کا جواب دیتے جاؤ۔

گ :- اچھا، چلیے۔

میں :- کہئے مسرتِ الم کی مخالف ہے یا نہیں؟

گ :- ہے۔

میں :- اور ایک سکون کی کیفیت ہوتی ہے جو مسرتِ ہر نہ الم۔

گ :- جی ہوتی ہے۔

میں :- گو یاد درمیانی حالت ہوتی ہے، اور ان دونوں کے قریب روح کا آرا

اور سہارا، کیوں تمہارا ہی مطلب تو ہے؟

گ۔۔۔ جی ہاں۔

میں۔۔۔ تمہیں خیال ہے کہ لوگ بیماری میں کسی باتیں کہتے ہیں؟

گ۔۔۔ کیوں، کیا کہتے ہیں؟

میں۔۔۔ کہ کچھ ہو صحت و تندرستی سے زیادہ اور کوئی چیز مسرت بخش نہیں۔

لیکن بیمار ہوئے تک انھیں کبھی یہ خبر نہ تھی کہ صحت سب سے بڑی مسرت ہے۔

گ۔۔۔ جی ہاں۔ یہ تو میں جانتا ہوں۔

میں۔۔۔ اور جب لوگ کسی شدید کرب میں مبتلا ہوتے ہیں تو تم نے انھیں

کہتے سنا ہو گا کہ کرب سے بچنے سے بڑھ کر کوئی خط نہیں؟

گ۔۔۔ جی، سنا ہے۔

میں۔۔۔ اسی طرح تکلیف کی بہت سی قسمیں ہیں جنہیں یہ لوگ کسی مثبت تفریح

کو نہیں بلکہ محض کرب کے بندھنوں کو سب سے بڑا خط بتلاتے ہیں۔؟

گ۔۔۔ جی ہاں۔ فی الوقت تو یہ اس رہائی اور آرام ہی پر قانع ہو جاتے ہیں۔

میں۔۔۔ پھر جب مسرت و حظ تک جائے تو یہ رکاوٹ کرب دہ ہوگی۔

گ۔۔۔ بلاشبہ۔

میں۔۔۔ چنانچہ سکون کی درمیانی حالت خط و مسرت بھی ہوگی اور کرب الم بھی

گ۔۔۔ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

میں۔۔۔ لیکن کیا یہ ہو سکتا ہے کہ جو دونوں میں سے کچھ نہیں (یعنی نہ خط نہ



نہ کرب) وہ دونوں ہو جائے۔

گ :- میں تو کہوں گا کہ نہیں ہو سکتا۔

میں :- اور خط و کرب مسرت و اطم دونوں روح کی حرکتیں ہیں۔ کیوں نہیں؟

گ :- جی ہاں۔

میں :- اور چونکہ خط ہر نہ کرب اسے ابھی ابھی ہم نے سکون قرار دیا تھا کہ

حرکت اور ہم نے کہا تھا کہ یہ دونوں کے درمیانی ایک کیفیت ہے۔

گ :- جی۔

میں :- تو پھر یہ کیسے ٹھیک ہو سکتا ہے کہ ہم عدم کرب کو خط اور عدم خط کو

کرب سمجھیں۔

گ :- ناممکن۔

میں :- لہذا یہ سب کچھ محض ظاہر ہی حقیقت نہیں یعنی سکون ایک لمحہ کے

لیے کرب کے مقابلہ میں خط اور خط کے مقابلہ میں کرب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب ان

تمام مظاہر کو مسرت حقیقی کی کسوٹی پر جانچو تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ حقیقت نہیں، بس

ایک طرح کا دھوکا ہے۔

گ :- نتیجہ تو یہی نکلتا معلوم ہوتا ہے۔

میں :- اب ذرا دوسری قسم کی مسرتوں کو دیکھو جن سے قبل کوئی کرب نہیں

ہوتا۔ اب آپ یہ فرض نہیں کر سکتے کہ خط کرب کے رک جانے اور کرب خط کے بند

ہو جانے کا نام ہے۔

گ :- یہ کونسی مسرتیں ہیں اور کہاں ملتی ہیں؟

میں :- ایسی تو بہت سی مسرتیں ہیں مثال کے طور پر شامہ کے حطے لو کہ یہ نہایت عمدہ ہوتے ہیں اور ان سے قبل کوئی کرب نہیں ہوتا۔ یہ آن کی آن میں آتے ہیں اور جب جاتے ہیں تو کوئی کرب چھوڑ کر نہیں جاتے۔

گ :- بہت درست۔

میں :- چنانچہ ہمیں یہ یاد دہانہ کرنا چاہیے کہ خالص خطا کرب کا بند ہو جانا اور خالص کرب مسرت کا بند ہو جانا ہے۔

گ :- نہیں۔

میں :- مگر پھر بھی اکثر اور عموماً شدید مسرتیں جو روح کو جسم کی وساطت سے پہنچتی ہیں وہ اسی تسبیل کی ہوتی ہیں، یعنی کرب سے رستگاری۔

گ :- یہ تو سچ ہے۔

میں :- اور آنے والے خطا کرب کی توقع کی بھی یہی کیفیت ہوگی؟

گ :- جی ہاں۔

میں :- کیا ان کی کچھ مثالیں دوں؟

گ :- فرمائیے۔

میں :- یہ تو آپ مانیں گے کہ فطرت میں ایک اعلیٰ ایک ادنیٰ اور ایک درمیانی



طبقہ ہوتا ہے؟

گ :- جی، ماننا ہوں۔

میں :- ایک شخص اگر اُدنی سے درمیانی طبقہ کی طرف جاے تو کیا وہ یہ خیال نہ کرے گا کہ وہ اوپر جا رہا ہے، اسی طرح جو شخص درمیانی طبقہ میں کھڑا ہے نیچے سے آتا دیکھتا ہے اور اسے حقیقی طبقہ اعلیٰ کو کبھی دیکھا نہیں تو وہ اپنے متعلق سمجھتا ہے کہ پہلے سے ہی طبقہ اعلیٰ میں ہے۔

گ :- یقیناً۔ اسکے سوا اور سمجھ ہی کیسے سکتا ہے؟

میں :- لیکن اس کو پھر واپس لیجائیں تو یہ خیال کرے گا اور بجاطور پر خیال کرے گا کہ اب یہ نیچے اتر رہا ہے۔

گ :- بلاشبہ۔

میں :- یہ سب کچھ غلط فہمی حقیقی اعلیٰ، ادنیٰ اور متوسط درجہ سے ناواقفیت کے

باعث پیدا ہوتی ہے۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- تو پھر اس میں بھی کون سے بڑے تعجب کی بات ہے کہ جن لوگوں کو صدا

کا تجربہ نہیں ہوتا وہ جہاں اور بہت سی چیزوں کے متعلق غلط خیالات رکھتے ہیں وہاں خط و کرب اور ان کے درمیانی کیفیت کے متعلق بھی غلط تصورات کو ذہن نشین کریں۔ چنانچہ جیسا کہ کرب کی طرف محض کھینچ ہی رہے ہوں تو انہیں کرب محسوس ہونے

لگے اور یہ اسے حقیقی کرب تصور کریں، اسی طرح جب کرب سے دیہانی کیفیت کی طرف جا رہے ہوں تو یقین و اثنی ہو جائے کہ بس اب مسرت و تسکین کے منہا کو پہنچ گئے یہ عزیز چونکہ مسرت و حظ سے واقف نہیں لہذا غلطی سے کرب کا عدم کر کے موازنہ کرتے ہیں اور اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ سیاہ کا موازنہ سفید سے کرنے کے بجائے آبی بھوٹے سے کرنے لگیں۔ کیوں، فرمائیے اگر ایسا ہو تو کونسی ایسی تعجب کی بات ہے؟ گ۔ ذرا تعجب کی بات نہیں، میں تو اس وقت زیادہ منہجیب ہوتا کہ صورت حال اس کے مخالف ہوتی۔

میں :- اس معاملہ پر یوں نظر ڈالو۔ بھوک، پیاس و غیرہ جسم کی تکان پر مردگی

سے عبارت ہیں؟

گ :- جی۔

میں :- اور تھل و حماقت و وح کی پر مردگی سے؟

گ :- درست۔

میں :- اور ان کے مقابل وجہ تسکین، کھانا پینا اور عقل و دانش ہیں۔

گ :- یقیناً۔

میں :- اور کونسی تسکین زیادہ سچی ہے، وہ جو ایسی چیز سے پیدا ہو جسکی ہستی

کم ہو یا اس سے جس کی ہستی زیادہ ہو؟

گ :- ظاہر ہے، اس سے جس کی ہستی زیادہ ہو۔



میں۔ تمہارے خیال میں جو حقیقی کا زیادہ حصہ کن چیزوں کو ملتا ہے، کھانے پینے، مصالحو، اور دوسری کتابیے کی چیزوں کو یا ان کو جنہیں اسے صادقہ، علم، ذہن اور ہر قسم کی نیکیاں شامل ہیں؟ بلکہ اس سوال کو یوں پیش کرو، کہ کس کا جو زیادہ خالص ہے، اس کا جو غیر مستبد، غیر فانی اور صداقت سے متعلق ہے اور بالطبع ایسا ہے اور ایسی طبائع میں پایا جاتا ہے یا اس کا جسے متغیر و فانی سے تعلق ہے اور اسی میں پایا بھی جاتا ہے اور پھر خود بھی متغیر اور فانی ہے؟

گ۔۔ اس کا جو دکھیں زیادہ خالص ہے جسے غیر متغیر سے تعلق ہو۔  
میں۔۔ اور غیر متغیر جس درجہ اصلیت و حقیقت اپنے اندر رکھتا ہے اسی تک علم سے حصہ پاتا ہے؟

گ۔۔ جی ہاں، اسی درجہ کا علم رکھتا ہے۔

میں۔۔ اور اسی درجہ کی صداقت؟

گ۔۔ جی۔

میں۔۔ یا اس کے برعکس یوں کہو کہ جس چیز میں صداقت کم ہوگی اس میں اصلیت اور حقیقت بھی کم ہوگی؟

گ۔۔ لازماً

میں۔۔ گو باعام طور پر یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو چیزیں جسم کی خدمت گزار ہوتی ہیں ان میں صداقت و اصلیت کم ہوتی ہے اور ان میں زیادہ ہوتی ہے جو روح

کی خادم ہیں۔

گ۔۔۔ جی ہاں۔

میں۔۔۔ اور کیا خود جسم میں روح سے کم صداقت اور صہیت نہیں ہوتی؟

گ۔۔۔ بیشک۔

میں۔۔۔ جو چیز زیادہ حقیقی وجود سے پُر ہو اور واقعاً زیادہ حقیقی ہستی رکھتی ہو

وہ اس سے زیادہ حقیقی معنوں میں پُر ہی جو کم حقیقی وجود سے بھری ہو اور خود بھی کم حقیقی ہو۔

گ۔۔۔ بلاشبہ۔

میں۔۔۔ اور اگر اس چیز سے پُر ہونے میں واقعی کوئی مسرت ہی جو مطابق فطرت

ہو تو پھر جو زیادہ حقیقی وجود سے زیادہ حقیقی طور پر لبریز ہوگا وہی زیادہ حقیقی اور پُر

معنی میں مسرت صادقہ سے لطف اندوز بھی ہوگا، اور اس کے برخلاف جسے کم

حقیقی وجود سے حصہ ملا ہوگا وہ سچی اور یقینی معنوں میں مطمئن بھی کم ہی ہوگا، اور

ایک کم حقیقی اور فریب دہ مسرت کا حصہ دار۔

گ۔۔۔ اس میں کیا کلام ہے۔

میں۔۔۔ چنانچہ جو لوگ عقل اور نیکی سے نا آشنا ہیں اور بہ وقت زبان کے

چٹخارے اور شہوات نفسانی کی تسکین میں مشغول، وہ بس درمیانی درجہ تک ہی

اوپر نیچے آتے جاتے رہتے ہیں اور ساری عمر اسی علاقہ میں ادھر ادھر مٹ گشت



کیا کرتے ہیں اور حقیقی عالم بالا میں بیچاروں کا گزربھی نہیں ہوتا۔ نہ تو خود یہ ادھر  
 آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہیں نہ وہاں کی راہ کا انھیں پتہ چلتا ہے نہ یہ واقعا جو حقیقی سبب  
 ہوتے ہیں اور نہ خالص اور دائمی مسرت سے انکے کام و دہن لذت یا بٹان کی  
 مثال بس مویشیوں کے ایک گلہ کی سی ہے کہ انکھیں نیچی کیئے اور سر زمین کی طرف  
 یعنی اپنے دسترخوان کی طرف جھکائے ہیں کہ کھا کھا کر بھول رہی ہیں اور اپنی پود  
 بڑھا رہے ہیں۔ پھر ان مسترتوں سے انتہائی عشق کے باعث اپنے آہنی سینکوں  
 اور گھروں سے ایک دوسرے کو ٹکریں اور لائیں مارتے ہیں اور غیر تسکین پذیر خواہش  
 کی خاطر ایک دوسرے کی ہلاکت کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ اپنے کو ایک غیر حقیقی  
 شے سے پڑ کر لیتے ہیں۔ لہذا انکا وہ حصہ بھی جسے یہ پڑ کرتے ہیں غیر حقیقی بے قابو او  
 بے لگام ہو جاتا ہے۔

گ۔ جناب سقراط، سچ تو یہ ہے کہ آپ نے ان عوام کی زندگی کا نقشہ ایسا  
 اُتارا جیسے کوئی کاہن بول رہا ہو۔

ہیں۔ ان کی مسترتیں آلام سے مملو ہوتی ہیں اور بھلا ایسا نہ ہو تو کیا ہو  
 کیونکہ یہ تو صداقت کی محض تصویریں اور اس کا سایہ ہیں؛ پھر اپر رنگ کیا گیا ہے  
 تضاد سے جو روشنی اور سایہ دونوں میں مبالغہ پیدا کرتا ہے اور اس طرح یہ ان جموں  
 کے دماغ میں اپنی مجنونا نہ آرزو پیوستہ کر دیتی ہیں۔ اور پھر ان کے لیے یہ لوگ تو  
 لڑتے جھگڑتے ہیں جیسے بقول اسٹیسسی کورس یونانی فلاسفے میں صداقت سے بچنے



ہیلن کے سایہ کے لیے جنگ آزمائی کر رہے تھے۔

گ۔ ایسی کوئی نہ کوئی بات تو لازمی ہونی چاہیے؟

میں۔ اور کیا یہی معاملہ روح کے جذباتی عنصر کے ساتھ بھی پیش نہ آئیگا  
کیا ایک جذباتی آدمی کی بھی کیفیت نہ ہوگی، جب وہ اپنے جذبہ کو مبدل بہ عمل  
کرنا چاہیگا، پھر اس میں چاہے وہ حاسد اور لالچی ہو، یا متشدد اور جھگڑالو، غصہ  
اور غضب سے پُر ہو یا اپنے حال سے بیزار، صرف اتنا کافی ہو کہ وہ بلا عقل و ہوش  
عزت و فخر مندی کے حصول اور اپنا غصہ اتارنے کی فکر میں ہو۔

گ۔ جی ہاں۔ جذباتی عنصر کو بھی یہی پیش آئیگا۔

میں۔ تو کیا ہم بہ اعتماد یہ نہیں کہہ سکتے کہ دولت و عزت کے چاہنے والے  
جب اپنی مسرتوں کو عقل و علم کی رہنمائی میں اور ان کے دوش بدوش حاصل کرتے  
ہیں اور انہیں مسرتوں کے طلب و حصول میں کوشاں ہوتے ہیں جو عقل نہیں سببانی  
ہی تو انہیں اس حقیقی مسرت کے اعلیٰ ترین مدارج نصیب ہوتے ہیں جو ان کے لیے  
قابل حصول ہو و جب یہ کہ یہ حقیقت و صداقت کی پیروی کرتے ہیں۔ اور اگر ہر انسان  
کے لیے جو کچھ بہترین ہو وہی سب سے زیادہ مطابق فطرت بھی ہو تو انہیں وہ مسرتیں  
نصیب ہوں گی جو انکی فطرت کے عین مطابق ہیں۔

گ۔ جی، یقیناً۔ جو بہترین ہو وہ مطابق ترین فطرت بھی ہو۔

میں۔ اور جب ساری کی ساری روح فلسفیانہ اصول کی تابع ہو، اس میں



کوئی تقسیم و مناقشہ نہو، اسکے اجزاء ترکیبی سب پابند عدل اور اپنے اپنے کام میں مشغول ہوں، ہر ایک اپنی جگہ پر بہترین و صادق ترین مہستروں سے شاد کام ہو جسکی ہمیں صلاحیت ہے؟

گ۔۔ جی بجا۔

میں۔۔ لیکن جہاں دوسرے دو اصولوں میں سے کسی کا غلبہ ہوا تو یہ اول تو خود اپنی مہسترت کے حصول میں ناکام رہتا ہے اور پھر دوسرے حصص کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی مہسترت کی طلب کریں جو ایک سایہ ہے اور انہیں مخصوص نہیں؟

گ۔۔ درست۔

میں۔۔ اور فلسفہ عقل سے جس قدر انکا بعد زیادہ ہوگا اسی قدر یہ مہسترت انکے لیے اجنبی اور فریب دہ ہوگی۔

گ۔۔ جی۔

میں۔۔ اور کیا وہی شے عقل سے بعید ترین نہیں جن آئین و نظام سے بعید تر ہو؟

گ۔۔ ظاہر ہے۔

میں۔۔ اور جسے ہم دیکھ چکے ہیں شہوانی اور ظالمانہ خواہشیں ان سے سب سے زیادہ بعید ہیں؟

گ۔۔ جی۔

میں۔۔ اور شاہی اور منظم خواہشیں قریب ترین؟

گ۔۔۔ جی ہاں۔

میں۔۔۔ لہذا ظالم مستبد حقیقی اور فطری مسترت سے سب سے زیادہ اور بادشاہ سب سے کم بعد پر رہیں گے؟  
گ۔۔۔ یقیناً۔

میں۔۔۔ لیکن اگر ایسا ہی تو ظالم مستبد سب سے زیادہ بد حال اور بادشاہ سب سے زیادہ خوش حال زندگی بسر کرے گا۔  
گ۔۔۔ لازمی بات ہے۔

میں۔۔۔ کیا تم اس بعد و فرق کا پیمانہ معلوم کرنا چاہتے ہو؟  
گ۔۔۔ جی، فرمائیے۔

میں۔۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسرتیں تین قسم کی ہوتی ہیں، ایک اصلی اور دوسری نقلی ظالم کی بد عنوانی نقلی مسرتوں سے بھی پرے پہنچتی ہے، یہ عقل و آئین کی حدود سے بھاگ کر بعض غلامانہ مسرتوں کے ساتھ دوباہش اختیار کرتا ہے، یہ مسرتیں اس کی تابع ہوتی ہیں، اور اس کی کم حیثیتی کا اندازہ ہیں ایک مثال ہی سے ہو سکتا ہے۔  
گ۔۔۔ کیسے؟

میں۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ ظالم مستبد خواص سے تیسرے نمبر پر ہے اور جمہوریت پسند بیچ میں؟  
گ۔۔۔ جی۔



میں۔ اگر جو کچھ گذر چکا وہ صحیح ہے تو ظالم مستبد کا مسرت کے ایک ایسے  
عکس سے تعلق ہو گا جو خواص کی مسرت کے مقابلہ میں حقیقت سے سہ چند دور ہے؟  
گ۔ ضرور۔

میں۔ اور خواص بادشاہ سے تیسرے درجہ پر ہیں، کیونکہ ہمارے نزدیک شاہی  
اور موٹری تو ایک ہی ہیں؟  
گ۔ بیشک تیسرے درجہ پر۔

میں۔ گویا ظالم مستبد کا حقیقی مسرت سے جو بعد ہے وہ تین کا سہ چند ہے؟  
گ۔ ظاہر ہے۔

میں۔ اچھا تو ظالمانہ مسرت کا سایہ اگر اس کے طول کے حد سے نکالا  
جائے تو وہ ایک مسطح شکل ہوگی۔  
گ۔ یقیناً۔

میں۔ اب اگر اسے اس کی ذات میں ضرب دیں اور اس سطح کو صلیب بنائیں  
تو ہم بلا دشواری دیکھ سکتے ہیں کہ بادشاہ اور ظالم مستبد کا درمیانی فصل کس  
وسیع ہے۔

گ۔ جی ہاں، کوئی حساب اس سوال کو باسانی حل کر سکتا ہے۔  
میں۔ یا اگر کوئی شخص دوسرے سرے سے ابتدا کرے اور یہ اندازہ کرنا چاہے  
کہ بادشاہ باعتبار سچی مسرت کے ظالم مستبد سے کتنے فصل پر ہے تو ضرب وغیرہ

دیکھنے کے بعد اُسے معلوم ہو گا کہ بادشاہ ۲۹ گنا خوشحال اور ظالم مستبدی قدر  
بد حال زندگی بسر کر رہے ہیں۔

گ۔۔ کیسا عجیب شمارا عدا ہے! اور باعتبار مسرت و الم عادل اور غیر منصف  
کو جو فاصلہ جدا کرتا ہے وہ کس قدر وسیع!

میں۔۔ اور پھر لطف یہ کہ صحیح شمار ہے، اور یہ عدد ایسا ہے کہ اگر انسانوں کو  
روز و شب اور ماہ و سال سے سروکار ہے تو ایسے عدد سے بھی انسانی زندگی کو بہت  
قریبی واسطہ ہے۔

گ۔۔ جی ہاں۔ انسانی زندگی کو اس سے یقیناً واسطہ ہے۔

میں۔۔ اچھا تو اگر باعتبار مسرت کے اچھا اور عادل انسان بڑے اور  
غیر منصف سے اس قدر افضل ہے تو بہ کاٹھ عدد کی حیات اور حسن و خوبی تو اس کی  
فضیلت بچہ زیادہ ہوگی؟

گ۔۔ بے حساب و بیشتر۔

میں۔۔ اب کہ ہم دلیل کی اس منزل پر آن پہنچے ہیں مناسب معلوم ہوتا  
ہے کہ ان الفاظ کی طرف رجوع کریں جنہوں نے ہمیں یہاں پہنچایا۔ کیوں، کوئی حنا  
یہی تو کہہ رہے تھے نا کہ ایسے کامل غیر منصف انسان کے لیے جسے عادل ہونے کی  
شہرت حاصل ہونا انصافی سود مند ہے؟



گ۔۔ جی ہاں، یہ کہا گیا تھا۔

میں :- اچھا تو اب کہ ہم نے عدل و نفاذ انصافی کی کیفیت اور قوت کا تعین کر لیا ان صاحب سے دو دو باتیں ہو جائیں۔

گ :- اچھا، ہم ان سے کہیں گے کیا؟

میں :- ہم روح کی ایک شکل بنائیں گے تاکہ اس کے الفاظ خود اس کی کچھوں کے سامنے آجائیں۔

گ :- کیسی شکل؟

میں :- روح کا ایک خیالی مجسمہ جیسے قدیم اساطیر کے مرکب مجھے مثلاً شمشیر، سگلا یا سرسبزوں میں بہت سے ایسے بھی ہیں جن میں دو چند مختلف طبائع کی یکجا نمود بتاتے ہیں۔

گ :- جی ہاں، کہتے تو ہیں کہ اس قسم کے میل ہوئے ہیں۔

میں :- اچھا تو پھر تم بھی میرے لیے ایک عظیم الشان بہت سے سروں والے رکشش کا مجسمہ تیار کرو جس کے شانوں پر طرح طرح کے جانوروں کے سروں کا حلقہ ہو اس میں پالتو جانور بھی ہوں، جنگلی بھی اور یہ انھیں جب چاہے پیدا کر لے اور جب چاہے بالکل بدل دے۔

گ :- آپ سمجھتے ہیں کہ بت کریں بڑی قوتیں ہیں، لیکن چونکہ زبان موم یا کسی اور مادی چیز سے زیادہ لوچدار ہے اس لیے اس مجسمہ کو تو آپ ہی تیار کریں۔

میں :- تو پھر ایک اور دوسری شکل شیر کی سی اور ایک تیسری انسان کی تیار کرو، دوسری شکل پہلی سے اور تیسری دوسری سے چھوٹی ہو۔

گ :- یہ تو آسان کام ہے، اچھا بنائیے؟

میں :- اب ان تینوں کو باہم یوں جوڑ دو کہ تپسیوں ایک ہو جائیں۔

گ :- یہ بھی ہو گیا۔

میں :- اب اس کے ارد گرد ایک آدمی کی شکل بنا دو تاکہ جو اندر نہ دیکھ

اور صرف خارجی خول کو دیکھے وہ یہ سمجھے کہ یہ ایک انفرادی انسانی ہستی ہے۔

گ :- جی ہنشد۔

میں :- اور اب ہم اس شخص کو جواب دیں جو انسان کے لیے ظالم و ستم

ہونا سو مند اور عادل و با انصاف ہونا ضرور سناں بتلاتا ہے کہ بھائی اگر تم سچ کہتے

ہو تو اس مخلوق کے لیے فائدہ سہیں ہے کہ اپنے سوسرے رکھشس کو کھلا کھلا کر

خوب پالے، اپنے شیر اور دوسری شیرانہ صفات کو تقویت پہنچائے لیکن اپنے

انسان کو بھوکوں مار کر بالکل کمزور کر دے، تاکہ پھر دو سکر دو اسے جدھر چاہیں

گھیسے پھریں۔ نیز یہ کبھی ان میں باہمی جگانگت و ہم سنگی پیدا کرنے کی کوشش نہ کیے

بلکہ آپس میں ہمیشہ لڑنے جھگڑنے کاٹنے کھسوٹنے اور ایک دوسرے کو کھا جانے

کی سعی میں مشغول رہنے لے۔

گ :- سچ ہے، ظلم و نا انصافی کا حامی ہی کتا ہے۔



میں :- عدل کا جانبدار اسپر یہ جواب دیتا ہے کہ لے لینے قول اور فعل سے ہمیشہ یہ کوشش کرنی چاہیے کہ کسی طرح اس کے اندر کے انسان کو پوسے انسان بنا دو اور تسلط حاصل ہو جائے۔ اسے چاہیے کہ اپنے سوسرے رکھشیں پر ایسی نگاہ رکھے جیسے باغبان اپنے پودوں پر یعنی اس میں جو اچھی اور نرم صفات ہیں انہیں نشوونما دے اور جو وحشی اور جنگلی عناصر ہیں انہیں نہ بڑھنے دے، پھر اسے چاہیے کہ اس کے اندر جو شیریں اُسے اپنا معاون بنالے اور ان سب کی نگہبانی یوں کرے کہ پہلے تو مختلف اجزاء کو باہم ایک دوسرے سے اور پھر خود اپنی ذات سے متحد کر لے۔ گ :- جی ہاں، عدل کا حامی بالکل ہی کہیگا۔

میں :- تو کیا ہر لحاظ سے یعنی مسرت و خطا، عورت یا فائدہ ہر اعتبار سے عدل کا حامی صحیح ہے اور سچ کہتا ہے اور نا انصافی کا طرفدار چھوٹ بولتا ہے اور جان بولتا ہے؟ گ :- جی ہاں، ہر لحاظ سے۔

میں :- اچھا آؤ اب ذرا غیر منصف کو نرمی سے سمجھائیں اس لیے کہ یہ ارادہ تو غلطی پر اڑا ہوا ہے نہیں کہ ”بھائی صاحب! آپ کے نزدیک شریف اور رذیل پیروں کا معیار کیا ہے؟ کیا وہ شریف نہیں جو درندے کو انسان کے یا یوں کہو کہ انسان میں جو اہمیت ہے اس کے ماتحت لائے اور کیا رذیل وہ نہیں جو انسان کو درندے کا زبردست کرے؟“ تو سوائے ہاں کے اس کے لیے اور کوئی جواب مشکل ہی ہے، کیوں نہ؟

گ۔ اگر وہ میری رسلے کا کچھ بھی باپس کرے تو تو اسکے لیے اور کوئی چارہ نہیں  
 میں۔ لیکن اگر اس نے یہ مان لیا تو پھر تم اس سے یہ سوال اور کریں گے، اچھا  
 تو پھر کوئی آدمی اگر اس شرط پر سیم و زر وصول کرے کہ اپنے شریف ترین حصہ کو  
 رذیل ترین کا غلام بنائے تو وہ بھلا اس سیم و زر سے کیسے کوئی نفع حاصل کر سکیگا؟  
 کوئی شخص اگر اپنی اولاد کو روپیہ کی خاطر غلام بنا کر بیچنے اور پھروشی اور بد آدمیوں  
 کے ہاتھ تو کون ہی جو اس کو نفع میں خیال کرے، چاہے پھر اس میں اسے کتنی ہی  
 کثیر رقم ملی ہو۔ اور پھر جب کوئی اپنے وجود کے جزو الہی کو اس کی خاطر بیچ دے جو  
 الہیت سے سب سے زیادہ بعید اور قابل نفرت ہے تو کون ہی جو اسے کمبخت و تقصیب  
 نہ بتائے۔ اریقلی نے اپنے شوہر کی جان کی قیمت میں ہار لیا تھا لیکن تو اس سے  
 کہیں بڑی تباہی کے لیے رشوت لیتا ہے!“

گ۔۔ ہاں ہاں، میں اس کی طرف سے جواب دیتا ہوں، بیشک یہ اس سے  
 کہیں بڑی تباہی ہے۔

میں۔۔ بے اعتدال و بے عفت آدمی پر ہمیشہ سے اسی لیے تو لعنت  
 طامت ہی ہے کہ اس میں اس سو سرے رکھش کو بڑی آزادی ہوتی ہے۔

گ۔۔ ظاہر ہے۔

میں۔۔ اور جب انسانوں میں شیر اور سانپ والا عنصر خلاف تناسب بڑھ کر  
 قوت پکڑ لیتا ہے تو اپنی غرور اور بد مزاجی کا الزام لگاتے ہیں؟



گ۔ ا۔ جی۔

میں۔ اسی طرح عیاشی اور بیجا نرمی اس لیے بڑی سمجھی جاتی ہیں کہ انسان کو کمزور اور ڈھیلا کر کے بزدل بنا دیتی ہیں۔

گ۔ بہت درست۔

میں۔ اور جب کوئی اپنے اندر کے جبری جانور کو اس بے لگام رکھش کا مطلع بنا دیتا ہے اور دولت کی خاطر جس سے اس کا پیٹ کبھی بھرتا ہی نہیں مین عالم شباب میں اپنے کو قدموں تلے کھندلے جانے کا عادی بناتا اور بجائے شہر کے بوزینہ کی حیثیت اختیار کرتا ہے تو اسپر خوشامد اور کمیونہ پن کا الزام لگاتے ہیں

گ۔ درست۔

میں۔ اور ذلیل نوکریاں اور دستی کام یہ کیوں قابل ملامت سمجھے جاتے ہیں؟ صرف اس لیے کہ ان میں اصول اعلیٰ کی قدرتا تضعیف ہوتی ہے اور اپنی اندرونی حیثیتوں پر قابو پاتا نہیں اس لیے ان کی مصاحبت کرتا ہے اور اس کا سارا علم و مطالعہ اسپر محدود ہے کہ ان کی چاپوسی کس طرح کرے۔

گ۔ بظاہر تو یہی وجہ معلوم ہوتی ہے۔

میں۔ اور چونکہ ہم ان لوگوں کو بھی ایسی ہی حکومت میں رکھنا چاہتے ہیں جیسی کہ بہترین انسانوں کی، لہذا ہماری رائے ہے کہ ان بہترین انسانوں کا خادم ہونا چاہیے جنہیں الٹیٹ حکمراں ہے، یہ نہیں کہ تھریسی میکس کی رائے کو

مطابق خادم پر سے نقصان پہنچانے کے لیے حکومت کیجائے بلکہ اس وجہ سے کہ بہترین صورت یہ ہے کہ ہر شخص پر حکمرانی ہو، اس قسم و عرفان الہی کی جو خود الہی ذات میں موجود ہے اور جب یہ ممکن نہ ہو تو پھر کسی خارجی حاکم کی تاکہ حتی الامکان ہم سب کے سب ایک ہی حکومت کے زیر سایہ برابروں اور دوستوں کی طرح رہ سکیں۔

گ۔ سچ ہے

میں۔ اسی قسم کا ارادہ آئین میں بھی بن طور پر ظاہر ہے کہ آئین سارے شہر کے محافظ و مددگار ہوتے ہیں۔ یہی خیال اس ختم پیار میں دکھائی دیتا ہے جو ہم بچوں کے اوپر عمل میں لاتے ہیں۔ ہم انہیں اس وقت تک آزاد نہیں ہونے دیتے جب تک ان میں ایسا اصول قائم نہ کر دیں جو ریاست کے دستور اساسی کا مرادف ہو اور جب تک اس عنصر اعلیٰ کی نشوونما سے ان کے دلوں میں اپنے جیسے ایک محافظ اور حاکم کو نصب کر دیں۔ ہاں جب یہ ہو گیا تو وہ اپنی من مانی راہ چل سکتے ہیں۔

گ۔ جی ہاں، آئین کا مقصد تو ظاہر ہے۔

میں۔ تو پھر کس نقطہ نظر سے اور کن وجوہ کی بنا پر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ کسی کو نا انصافی، بے اعتدالی، بے اعفیتی، یا دوسری صفات زویلہ سے کوئی نفع پہنچ سکتا ہے کہ یہ تو اسے بہر حال بُرائی بانی ہیں چاہے وہ اپنی شرارت اور بدی کے باعث مال و دولت یا قوت و اقتدار ہی کیوں نہ حاصل کر لے۔



گ۔۔ جی، کسی نقطہ نظر سے نہیں۔

میں :- اور اس سے بھی اسے بھلا کیا نفع ہوگا کہ اس کی نا انصافی پکڑی جائے  
اور وہ اس کی سزا سے بچا رہے؟ جو پکڑا نہیں جاتا وہ تو اور بھی بدتر ہوتا جاتا ہے اور  
جو سزا پلٹتا ہے اس کی طبیعت کا وحشی حصہ خاموش ہو کر مائل بہ انسانیت ہو جاتا ہے  
اس کی ذات کے شریف عناصر آزاد ہو جاتے ہیں اور عدل، عفت اور حکمت کے  
حصول سے اسکی ساری روح مشرف و مکمل ہو جاتی ہے، اور یہ شرف و کمال اس شرف  
سے جو جسم انسانی حسن، قوت اور ندرستی کے عطیہ سے حاصل کرتا ہے اسی درجہ برتر  
ہوتا ہے جس درجہ روح جسم سے زیادہ قابل عزت ہے۔

گ۔۔ یقیناً۔

میں :- یہ ہر وہ مقصد اعلیٰ جس کے حصول کے لیے سمجھدار آدمی اپنی زندگی  
کی ساری قوتیں وقف کر دیگا۔ اولاً تو وہ ان علوم کی تکریم کرے گا جو اس کی روح پر ان  
صفات کا سکھ جائیں اور دیگر علوم کو نظر انداز کر دیگا؟  
گ۔۔ ظاہر ہے۔

میں :- دوسرے، وہ اپنی جسمانی عادات و کیفیات کو منظم کرے گا۔ حیوانی اور  
خلاف عقل مسترتوں پر اپنے جسم کو لگنے دینے کا سوال ہی نہیں کہ یہ تو صحت تک کو  
ایک ثانوی چیز تصور کرے گا، اسکا مقصد اولین حسین یا قوی، یا تندرست ہونا نہ ہوگا  
جب تک کہ ان صفات سے اعتدال کا حصول قرین قیاس نہ ہو۔ یہ تو جسم کو ہمیشہ

اس طرح ٹھیک کرے گا کہ اس سے روح کی ہم آہنگی کو قائم رکھ سکے۔

گ۔۔ اگر اس میں سچی موسیقی ہو تو یقیناً اس کا عمل ہی ہوگا۔

میں۔۔ پھر حصول دولت میں نظم و تناسب کا ایک اصول ہی جسے ہمیشہ پیش نظر رکھیں گے۔ دنیا کی ابلہانہ مدح سمرانی سے اس کی آنکھیں خیرہ نہ ہوں گی اور یہ اپنے لیے بے تعداد بُرائیوں کے اس جز یعنی دولت کے انبار نہ جمع کریگا۔

گ۔۔ یقیناً نہیں،

میں۔۔ یہ تو اس مدینہ داخلی کانگراں ہوگا جو خوراس میں موجود ہے اور ہمیشہ خیال رکھیں گے کہ اس میں بد نظمی پیدا ہو، اور یہ بد نظمیاں پیدا ہوتی ہیں یا تو دولت کے بے حساب فراوانی سے یا پھر اسکے مطلق فقدان سے۔ وہ اپنی ملک و آمدنی کو اسی اصول کے مطابق منضبط کرے اور اپنے وسائل کے اعتبار سے خرچ کریگا۔

گ۔۔ نہایت درست۔

میں اور اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر یہ ان تمام اعزازوں کو بخوشی قبول کریگا جنکی بابت وہ سمجھتا ہے کہ یہ اسے ایک بہتر انسان بنانے میں مدد دینگے، لیکن جن سے اس کی زندگی کا نظام بگڑتا ہوگا خواہ وہ شخصی ہوں یا ملکی اسے گریز کریگا۔

گ۔۔ اگر اس کا محرک عمل یہ اصول ہی تو پھر یہ بدبر تو بنیگا نہیں۔

میں۔۔ کلب مصری کی قسم، ضرور بنیگا، اور جو اس کا اپنا شہر ہوگا اس میں تو لازمی بنیگا۔ ہاں ممکن ہے کہ اپنے مولد میں نہ بنے سوائے اس صورت کے کہ اسے کوئی



الٹی ضرورت ہی مجبور نہ کرے۔

گ۔ جی، میں سمجھا۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس شہر میں حاکم بنیگا جسکی بنیاد ہم ڈال رہے ہیں اور جو صرف تصور میں اپنا وجود رکھتا ہے کیونکہ مجھے یقین نہیں کہ اور کہیں سے زمین پر اسکا وجود ہو۔

میں :- ہاں، میں سمجھتا ہوں کہ آسمان پر اس کا نمونہ مرتب ہوا ہے۔ اسے جو چاہے دیکھ سکتا ہے اور دیکھ کر اپنا گھر ٹھیک کر سکتا ہے۔ لیکن یہ بات کہ یہاں اس کا وجود ہے یا کبھی بھی ہو سکتا ہے یا نہیں اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ دیکھنے والا تو ہمیشہ اسی شہر کے نمونہ کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے گا اور دوسروں سے اسے کچھ سروکار نہ ہوگا۔

گ۔ میں بھی یہی خیال کرتا ہوں۔



# دسویں کتاب

میں :- ہماری روایت میں یوں تو بہت سی خوبیاں ہیں، لیکن جب میں غور کرتا ہوں تو مجھے کوئی خوبی اتنی پسند نہیں آتی جتنا کہ وہ قاعدہ جو ہم نے شاعری کے متعلق بنایا ہے۔

گ :- آپ کا مطلب کاہے سے ہے؟

میں :- محاکاتی شاعری کے روستے، کہ یقیناً اسے قبول نہ کرنا چاہیے۔ اور اب کہ روح کے اجزا الگ الگ میز ہو گئے ہیں مجھ پر یہ بات اور بھی زیادہ روشن ہو رہی ہے۔

گ :- یعنی ۹ :-

میں :- راز کی بات ہے، آپس ہی میں کہتے ہیں یہ نہیں چاہتا کہ میرے الفاظ المناک ناٹک نویسوں اور نقالوں کے بقیۂ قبیلہ کے ساتھ دہرائے جائیں ہاں تم سے کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تمام شاعرانہ نقالی سامعین کی سمجھ کیلئے



تباد کن ہو اور اس زہر کے پے بس ایک تریاق ہی۔ یعنی انکی اصل ماہیت کا علم۔  
گ :- ذرا اپنے قول کا مفہوم مجھے اچھی طرح سمجھائیے۔

میں :- اچھا میں کتابوں سنو۔ یہ سچ ہے کہ ابتداء شباب ہی سے میرے  
دل میں ہوس کی بڑی عظمت اور محبت ہو اور یہی وجہ ہے کہ میرے الفاظ زبان  
سے نکلنے ٹھکتے ہیں اس لیے کہ لمبین کی اس ساری کی ساری دلفریب جماعت کا  
استاد اور سردار ہی شخص ہے۔ لیکن صداقت کے مقابلہ میں کسی شخص کی زیادہ عزت  
نہیں ہو سکتی چنانچہ میں کتابوں :-

گ :- بہت خوب فرمائیے؟

میں :- اچھا تو سنو، بلکہ جواب دو۔

گ :- پوچھیے۔

میں :- کیا تم بتا سکتے ہو کہ تقالی ہو کیا؟ کیونکہ وہ اصل مجھے تو معلوم نہیں

گ :- جی ہاں، تو تو نہایت قرین قیاس بات ہے کہ مجھے معلوم ہو!

میں :- کیوں نہیں؟ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کمزور آنکھ ایک چیز کو تیرا آنکھ سے

پہلے دیکھ لیتی ہے۔

گ :- بجا و درست، لیکن مجھے کچھ دھندلا سا دکھائی پڑا بھی تو آپ کی

موجودگی میں اس کے بیان کی ہمت کہاں سے لاؤنگا۔ لہذا براہِ کرم آپ خود ہی

تحقیق فرمائیے۔

میں :- اچھا تو اسی اپنے معمولی طریقہ سے اس تحقیق کو شروع کریں دیکھئے  
جب کبھی چند افراد کا ایک مشترک نام ہو تو ہم فرض کرتے ہیں ان میں کوئی تصویر یا  
شکل بھی مشترک ہے، سمجھے؟

گ :- جی ہاں۔

میں :- کوئی عام مثال لے لو۔ دنیا میں پلنگ ہوتے ہیں میزیں ہوتی  
ہیں۔ بکثرت، کیوں نا؟

گ :- جی۔

میں :- لیکن ان کی صرف دو شکلیں یا دو تصویروں ہیں، ایک پلنگ کا تصوّر  
اور ایک میز کا تصوّر۔

گ :- درست۔

میں :- اور انہیں سے کسی کا پناہیوا لاجب پلنگ یا میز بنانا ہے تو اس تصوّر  
کے مطابق بنانا ہے۔ ان صورتوں میں ہمارا طریقہ بیان یہی ہے۔ لیکن کوئی کاریگر  
تصویرات (اعیان) کو نہیں بناتا، اور بنا سکتا بھی کیسے ہے؟

گ :- ناممکن۔

میں :- لیکن ایک کاریگر اور ہے، میں سُننا چاہتا ہوں کہ تم اسکے متعلق

کیا کہتے ہو؟

گ :- وہ کون؟



میں :- وہ جو تمام دوسرے کاریگروں کے سارے کاموں کا بنائو والا ہے۔

گ :- کیسا غیر معمولی اور نرالا آدمی ہوگا !

میں :- ذرا ٹھہرو تو اس اظہارِ تعجب کے اور بھی وجوہ پیدا ہونگے۔ کیونکہ یہ کاریگری جو صرف ہر قسم کے ظرف ہی نہیں بناتا، بلکہ درخت اور جانور، خود اپنی ذات اور تمام دیگر اشیاء، ارض و سما، اور وہ ساری کائنات جو زمین اور پورا آسمان کے نیچے ہی ان سب کا پیدا کر نیوالا ہے یہی دیوتاؤں کو بھی پیدا کرتا ہے۔

گ :- یہ تو کوئی جادو گر ہوگا ؟

میں :- اہا، تم باور نہیں کرتے، اس نا؟ کیا تمہارا خیال ہے کہ کوئی ایسا بنائو والا یا خالق نہیں؟ یا یہ کہ ایک معنی کران سب چیزوں کا کوئی بنائو والا ہو سکتا ہے لیکن دوسرے معنوں میں نہیں؟ کیا تم جانتے ہو کہ ایک طریقہ ایسا بھی ہے کہ تم خود ان سب چیزوں کو بنا سکتے ہو؟

گ :- وہ کون طریقہ ہے؟

میں :- بہت سہل طریقہ ہے۔ یاہوں کہیے کہ اس کرتب کو نہایت آسانی اور تیزی سے کرنے کے بہت سے طریقے ہیں، سب سے سیرج یہ طریقہ ہے کہ ایک آئینہ کو نہایت تیزی سے گھماتے جاؤ۔ تو تم بڑی جلدی سے سورج، آسمان، زمین کو خود اپنے کو اور دوسرے جانوروں اور درختوں کو نیز تمام دوسری اشیاء کو جن کا ابھی ابھی ذکر تھا اس آئینہ میں پیدا کر سکو گے۔

گ۔۔ ہاں، لیکن یہ محض ظاہری شکلیں ہوں گی۔

میں۔۔ بہت ٹھیک، اب آپ پتہ پر آرہے ہیں، چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ نقاش و مصوّر بھی اسی نوع سے تعلق رکھتا ہے، یعنی محض ظاہری اشکال کا بننا ہی، کیوں ہونا؟

گ۔۔ بیشک۔

میں۔۔ لیکن شاید تم یہ کہو کہ یہ جو کچھ پیدا کرتا ہے، وہ جھوٹ ہے، تاہم ایک اعتبار سے مصوّر بھی پلنگ کا خالق ہو سکتا ہے؟

گ۔۔ ہاں، لیکن اصلی اور حقیقی پلنگ کا نہیں۔

میں۔۔ اور پھر پلنگ کے بنانے والے کے متعلق کیا کہو گے؟ تمہیں کہہ رہے تھے کہ یہ بھی وہ تصور (عین) تو پیدا کر نہیں سکتا جو ہمارے نزدیک پلنگ کی اصل ہے بلکہ صرف ایک مخصوص پلنگ بنا سکتا ہے۔

گ۔۔ جی ہاں، میں نے کہا تھا۔

میں۔۔ جب یہ وہ چیز نہیں بنا تا جس کا وجود ہے تو یہ گویا حقیقی وجود نہیں بنا سکتا بلکہ صرف وجود سے مشابہ کوئی چیز بنا تا ہے۔ اور اگر کوئی کہے کہ پلنگ ساز یا کسی دوسرے کاریگر کا کام حقیقی وجود رکھتا ہے تو مشکل سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ سچ کہہ رہا ہے۔

گ۔۔ بہر صورت فلسفی تو یہی کہیں گے کہ یہ سچ نہیں۔

میں۔۔ پھر کوئی تعجب بھی نہیں کہ اس کا کام حقیقت کا ایک غیر واضح اظہار ہے۔



گ :- کوئی تعجب نہیں۔

میں :- آؤ اب گذشتہ مثالوں کی روشنی میں یہ تحقیق کریں کہ یہ تعالٰیٰ ہر کون ؟

گ :- مناسب ہے۔

میں :- اچھا تو اب تین پلنگ ہیں ؛ ایک تو قدرت میں موجود ہے جس کا بنا ہوا  
خدا ہے ؛ میں سمجھتا ہوں یہی کہنا چاہیے اس لیے کہ اور کوئی تو اس کا بنا ہوا ہو نہیں  
سکتا۔

گ :- جی۔

میں :- پھر دوسرا ہے جو بڑھئی کی کارگزاری ہے۔

گ :- جی۔

میں :- تیسرا پلنگ مصوّر کا بنا ہوا ہے۔

گ :- جی۔

میں :- گویا پلنگ تین قسم کے ہوتے ہیں اور تین صناعات ان کے نکلاں ہیں ؛ خدا

پلنگ ساز ، اور مصوّر ؛

گ :- جی ہاں ، تین ہیں۔

میں :- خدا نے مجبوراً یا باختیار قدرت میں بس ایک ہی پلنگ بنایا۔ دو یا

دو سے زیادہ ایسے تصویری پلنگ نہ خدا نے بنائے ہیں نہ کبھی بنائے۔

گ :- یہ کیوں ؟

میں :- اس لیے کہ اگر وہ دو ہی بناتا تب بھی ایک تیسرا ضرور ظاہر ہوتا جو

دونوں کے لیے بمنزلہ عین کے ہوتا، چنانچہ یہ تیسرا تصور ہی پلنگ (عین) ہو جاتا اور یہ دونوں رہتے۔

گ :- بہت ٹھیک۔

میں :- خدا یہ جانتا تھا اور ایک حقیقی پلنگ کا حقیقی خالق بنا چاہتا تھا کسی مخصوص پلنگ کا مخصوص خالق نہیں، چنانچہ ایسا پلنگ بنا یا جو قدرتا اور اصلاً بس ایک ہی۔

گ :- جی، یہ ہمارا عقیدہ ہی۔

میں :- تو پھر اسی کو پلنگ کا قدرتی خالق و صانع کہنا چاہیے۔

گ :- جی ہاں، کیونکہ قدرتی عمل تحقیق میں ہی اس کا اور نیز تمام دوسری چیزوں کا موجد ہی۔

میں :- اور بڑھئی کے لیے کیا کہیں؟ کیا یہ بھی پلنگ کا بنا نیوالا ہی؟

گ :- جی ہاں۔

میں :- لیکن کیا نقاش و مصور کو بھی خالق یا صانع کہو گے؟

گ :- ہرگز نہیں۔

میں :- لیکن اگر یہ خالق نہیں تو پھر پلنگ سے اسے اور کون علاقہ و نسبت ہو؟

گ :- میرے خیال میں اسے دوسروں کی بنائی ہوئی چیزوں کا نقال کہہ سکتے ہیں۔

میں :- خوب۔ گویا آپ اس شخص کو نقال کہتے ہیں جو فطرت سے تیسری منزل



میں ہو ۹۔

گ۔ جی، بیشک۔

میں، اور المناک شاعر بھی چونکہ نقال ہے اس لیے دوسرے نقالوں کی طرح یہ بھی بادشاہ اور صداقت سے بہ سہ مراتب دُور ہے ۹

گ۔ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

میں،۔ اچھا تو نقال کے متعلق تو ہم متفق ہیں۔ اب رہا مصوّر، میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ آیا اسے ان اشیاء کا نقال خیال کریں جو اصلاً فطرت میں موجود ہیں، یا محض کاریگروں کی مصنوعات کا؟

گ۔ میرے خیال میں تو مؤخر الذکر صوت صحیح ہے۔

میں،۔ لیکن ابھی یہ اور متعین کرنا ہے کہ ان چیزوں کی اس حالت میں نقل جیسی یہ واقعا ہیں یا جیسی کہ یہ ظاہر معلوم ہوتی ہیں؟

گ۔ آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں،۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ ایک پلنگ کو مختلف نقطہاتے نظر سے دیکھ سکتے ہیں، مثلاً سامنے سے، ترچھے، یا کسی اور زاویہ نگاہ سے اور ہر دفعہ پلنگ مختلف معلوم ہوگا لیکن اس کی حقیقت میں کوئی فرق نہیں اور یہی حال سب اور چیزوں کا ہے۔

گ۔ جی ہاں، یہ جو فرق معلوم ہوتا ہے صرف ظاہری ہے۔

میں،۔ اب ایک سوال میں اور کروں۔ فن مصوّر کی مقصد کیا ہے، چیزوں کی

نقل جیسی کہ وہ دراصل ہیں یا جیسی کہ وہ نظر سے معلوم ہوتی ہیں عجز کی نقل  
یا حقیقت کی؛

گ۔۔ شہود کی۔

میں۔۔ گویا انتقال صداقت سے بہت دور ہے اور سب کچھ کہہ سکتا ہے کیونکہ  
یہ ہر چیز کے ایک چھوٹے ٹسے حصہ کو مس کرتا ہے اور وہ حصہ بھی عکس۔ مثلاً ایک مصوٰء  
ایک چمار کی، ایک بڑھی کی، یا کسی اور کاریگری کی تصویر بنا دے گا، حالانکہ یہ ان کے  
فن کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا، اور اگر اچھا مصوٰء تو بچوں اور بھولے بھالے لوگوں  
کو دھوکا دے لے گا، یعنی جب دُور سے یہ بڑھی کی تصویر اٹھیں دکھائیگا تو یہ سمجھیں گے  
کہ یہ ایک سچ سچ مچ کا بڑھئی دیکھ رہے ہیں،

گ۔۔ بیشک۔

میں۔۔ چنانچہ جب کبھی کوئی شخص ہم سے آکر کہے کہ مجھے ایک ایسا آدمی ملا  
جو تمام فن جانتا ہے، اور ان ساری چیزوں سے واقف ہے جو کسی اور کو معلوم ہیں  
پھر یہ کہ ان میں سے ہر چیز کو باعتبار صحت ہر دوسرے سے بہتر جانتا ہے تو ہم بس  
یہ تصور کر سکتے ہیں کہ یہ غریب ایک بھولا بھالا آدمی ہے جو کسی جادو گر یا ہروپیے  
سے جا ملا ہے اور اس کے فریب میں آکر اسے عالم کل سمجھنے لگا ہے۔ اور اس کی وجہ  
یہ ہے کہ یہ خود علم و جہل و فتنل کی ماہیت کی تجزی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

گ۔۔ بہت درست۔



میں۔ چنانچہ تب ہم لوگوں کو کہتے سنیں کہ شعراء امین اور ان کا سٹرا  
 ہو سب کے سب تمام فنون سے واقف تھے اور ساری انسانی چیزوں کا ہمیں  
 نیکی ہو کہ بدی اور نیر الہی چیزوں کا نہیں علم تھا، کیونکہ شاعر اس وقت تک اچھا شعر  
 نہیں کہہ سکتا جب تک اسے اپنے مضمون کا علم نہ ہو اور جو یہ علم نہ رکھتا ہو وہ کہہ شاعر  
 ہو ہی نہیں سکتا، ہاں تو جب ہم لوگوں کو یہ کہتے سنیں تو ہمیں خیال رکھنا چاہیے  
 کہ کہیں یہاں بھی اسی قسم کا فریب نظر نہ ہو۔ شاید ان لوگوں کو بھی نقالوں سے سابقہ پڑا ہو  
 اور یہ بھی ان کے فریب میں آگئے ہیں۔ ان لوگوں نے جب ان کی تصنیفیں دیکھیں  
 تو شاید یہ یاد نہیں رکھا کہ یہ تو محض نقلیں ہیں اور پھر صداقت سے سہ گانہ بعد پر ان کا  
 بنانا بلا علم حقیقت باسانی ممکن ہی کیونکہ یہ تو صرف ظاہری شکلیں ہیں حقیقت نہیں؛  
 یا بھئی ممکن ہے کہ یہ لوگ ٹھیک کہتے ہوں اور شعراء دراصل ان چیزوں کو جانتے ہوں  
 جن کے متعلق عوام کے خیال میں وہ اس خوبی سے بیان کرتے ہیں؛

گ :- بہر صورت یہ سوال ہی غور طلب۔

میں :- اچھا اگر ایک شخص اصل بھی بنا سکتا ہو اور نقل بھی تو کیا تم سمجھتے ہو  
 کہ وہ نقل سازی کی شاخ پر اپنی مساعی صرف کرے گا؛ کیا تمہارے خیال میں نقالی اسکی  
 زندگی کا اصول حاکم ہوگا گو یا اس کے اندر اس سے بلند تر اور کوئی چیز ہی نہیں؛  
 گ :- میں تو سمجھتا ہوں کہ نہیں۔

میں :- حقیقی صنّاع جسے شیا منقولہ کا علم ہو وہ تو بجائے نقلوں کے اصل میں



دکھپی لگیا اور بہت سے نفیس کاموں میں اپنی یادگار چھوڑ گیا اور بجائے اس کے کہ  
 مدعیہ قصائد کا مصنف ہوا کتنا موضوع بننا زیادہ پسند کرے گا۔

گ۔۔۔ جی ہاں یہ اسکے لئے زیادہ عزت و نفع کی بات ہوگی۔

میں۔۔۔ اچھا تو اب ہو ہر سے ایک سوال کریں اطلب کسی اور ایسے فن  
 کے متعلق نہیں جس کا حوالہ اس کی نظموں میں یونہی بسجیل تک نہ کرہ گیا ہو۔ اس سے  
 کسی اور شاعر سے ہم یہ تو پوچھنے جائیں گے نہیں کہ آپ نے اسکلیپس کی طرح  
 مریضوں کو اچھا کیا ہے یا ان اسکلیپسوں کی طرح طب کا کوئی مدرسہ اپنے بعد چھوڑا  
 یا نہیں یا یہ کہ آپ طب اور دیگر فنون کے متعلق یونہی سنی سنائی باتیں کہنا کرتے  
 ہیں۔ ہاں تو یہ تو ہم پوچھنے نہیں گے۔ البتہ فوجی نقل و حرکت سیاست اور تعلیم  
 کے متعلق اس سے سوال کرنے کا ہمیں حق ہے کہ یہ چیزیں اس کی نظموں کے مخصوص  
 اور بلند ترین مضامین ہیں۔ اور ہم بجا طور پر ان کے متعلق اس سے پوچھ سکتے ہیں۔  
 اچھا تو اب ہم اس سے کہیں کہ ”دوست ہو صرا! اگر آپ نیکی کے متعلق اپنے  
 اقوال میں حقیقت سے صرف دو درجہ ہٹے ہوئے ہیں تین نہیں، یعنی اگر آپ اس  
 بنانے والے اور نقال نہیں، اگر آپ یہ معلوم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ کون  
 اشغال انسان کی خانگی اور سیاسی زندگی کو اچھا اور کون برا بنا سکتے ہیں تو ذرا  
 فرمائیے کہ وہ کون رہا ہے جس پر آپ کی مدد سے بہتر حکومت ہوئی ہو، کسی  
 ڈیمون کا عمدہ نظام لاشکر گس کارہن منت ہے، اسی طرح بہترے چھوٹے بڑے



شہر ہیں جنہیں اوروں سے فیض پہنچا ہی، لیکن کون ہی جو یہ کہتا ہو کہ آپ نے ان کے لیے اچھے قوانین نافذ کیے ہوں اور انہیں کچھ فائدہ پہنچایا ہو، اٹلی اور سسلی کو اپنے چرن داس پرنازی اور ہم میں سولن کے نام کا ڈنکان بج رہا ہی، لیکن کون شہر ہے جسے آپ کے متعلق کچھ کہنا ہو؟ "کیا کوئی شہر ہی جس کا یہ نام لے سکے؟ گ۔۔ میرے خیال میں تو نہیں۔ خود ہومر کے مقلد اور معتقد اسکے مدعی نہیں کہ وہ وضع قوانین تھا۔

میں۔۔ اچھا تو کیا کوئی ایسی جنگ ہے جو اس کی زندگی میں ہوئی ہو اور اسے اسے کامیابی سے انجام کو پہنچایا یا اپنی صلاح و مشورہ سے اس میں مدد دی ہو؟ گ۔۔ کوئی نہیں۔

میں۔۔ پھر کیا کوئی ایجاد و اختراع اسکے نام سے ایسی مستوب ہے جو مختلف فنون یا حیات انسانی کے لیے قابل استعمال ہوئے جیسی کہ مثلاً ملیسیا کے تھیس اور سیٹھیا کے اناکریس یا دوسرے ذہین اشخاص نے سوچ کر نکالیں؟ گ۔۔ ایسی بھی کوئی چیز نام کو نہیں۔

میں۔۔ خیر، اگر ہومر نے کبھی کوئی عام خدمت انجام نہیں دی تو کیا یہ خانگی طور پر کسی کارہنما یا استاد تھا؟ کیا زندگی میں اس کے ایسے دوست تھے جو اس کی صحبت کے دلدادہ ہوں اور جنہوں نے آنے والی نسلوں تک ہومر کا طریق زندگی پہنچایا ہو، مثلاً ایسا حلقہ جیسا فیتا غورث نے قائم کیا تھا کہ لوگ



اس کے عرفان کے باعث اسے محبوب کہتے تھے اور آج کے دن تک اسکے متبعین اس سلسلے سے معروف ہیں جو اسکے نام سے منسوب کیا گیا تھا۔

گ۔۔۔ ایسی کوئی بات بھی اس کے متعلق مرقوم نہیں اور واقعی ہو مگر کا وہ ہنشین کرپونلس جس کا نام سنکر ہمیں ہمیشہ ہنسی آجاتی ہے اس وقت اپنی حماقت کی وجہ سے اور بھی زیادہ مضحکہ انگیز ہو جاتا ہے، جب ہم خیال کرتے ہیں کہ یہ اور یہی کیا اور سب لوگ بھی، زندگی میں ہو مگر کا ذرا بھی خیال نہ کرتے تھے۔

میں۔۔۔ ہاں، روایت تو یہی ہے۔ لیکن گلاکن! کیا تم تصور کر سکتے ہو کہ اگر ہو مگر واقعا آدمیوں کی تحسین و تعلیم کا اہل ہوتا، یعنی اگر بجائے محض نقال ہونے کے اس کے پاس علم ہوتا تو اسکے بہت سے معتقد اور متبع نہ ہوتے جو اس کی عزت اور اس سے محبت کرتے؟ آبدرا والے پروٹاگورس اور سیوس کے

پروڈیکس اور ہتیروں نے بس اپنے معاصرین کے کان میں یہ بات آہستہ سے ڈال دی تھی کہ تم اُس وقت تک نہ اپنا گھر سنبھال سکو گے نہ اپنی ریاست جب تک ہمیں اپنا وزیر تعلیم نہ بنا دو اور ان کی یہ چالاک ترکیب ایسی کارگر ہوئی کہ لوگ لسنے محبت کرنے اور انھیں کندھوں پر چڑھائے پڑھائے پھرنے لگے۔ تو کیا یہ دھیان میں آتی ہے کہ اگر ان میں نوع انسانی کو نیک اور صالح بنانے کی صلاحیت ہوتی تو ہو مگر یا ہیسپاد کے معاصرین انھیں بھاٹوں کی طرح مارے مارے پھرنے دیتے،۔۔۔ لسنے جہانی تو ان لوگوں کے لیے اتنی ہی ناگوار ہوتی جتنی سولنے سے اور یہ انھیں اپنے ساتھ



سہنے پر مجبور کرتے۔ اور اگر ہستا دھرنے پر آمادہ نہ ہوتا تو شاگرد اس کے ساتھ ساتھ اس وقت تک ہر جگہ جاتے جب تک ان کی کافی تعلیم نہ ہو جائے۔

گ۔ ۱۔ جی ہاں، میں سمجھتا ہوں کہ یہ بالکل درست ہے۔

میں ۱۔ پھر ہم یہ نتیجہ کیوں نہ نکالیں کہ یہ سائے کے سائے شعرا ہوتے ہیں پکڑا ب تک محض نقال ہیں، یہ نیکی اور دوسری چیزوں کے عکس کی نقل کرتے ہیں لیکن حقیقت تک کبھی نہیں پہنچتے؛ شاعر کی مثال اس مصوٰر کی سی ہے جو چار کی تصویر بنا داتا ہے، حالانکہ اس کے فن کو ذرا نہیں سمجھتا۔ اس کی تصویر بس ان کے لیے ٹھیک ہے جو خود اس سے زیادہ نہیں جانتے اور صرف رنگ اور صوت کو دیکھ کر فیصلہ کر لیتے ہیں۔

گ۔ ۱۔ بالکل بجا۔

میں ۱۔ اسی طرح شاعر اپنے الفاظ اور ترکیبوں سے مختلف فنون کا رنگ جاتا ہے اور ان کی ماہیت سے بس اسی حد تک واقفیت رکھتا ہے جتنی کہ نقالی کے لیے کافی ہو، دوسرے لوگ جو خود اسی کی طرح جاہل ہیں اور صرف اس کے الفاظ پر فیصلہ کر لیتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ جب یہ وزن اور بحر و ایقاع کے ساتھ موجی کے کام کا، فوجی نقل و حرکت کا یا اور کسی بات کا ذکر کرتا ہے تو نہایت اچھی طرح انہیں بیان کرتا ہے۔ ہاں کیوں نہ ہو، نغمہ و ایقاع میں قدرتا یہ شیریں اثر ہے۔ میں سمجھتا ہوں آپ نے بھی دیکھا ہو گا کہ اگر ان شاعروں کے قصوں کو اس رنگ آمیزی سے معری کر دیجیے جو موسیقی سے اپنے چڑھایا جاتا ہے اور معمولی سیدی سادی نثر میں انہیں بیان کیجئے تو ان کی کیسی حقیر شکل نکل آتی ہے۔

گ۔۔۔ جی ہاں۔

میں۔۔۔ ان کی مثال ان چہروں کی سی ہے جو کبھی حسین نہ تھے ان میں صرف اوپری چمک دمک تھی اور اب شباب کی یہ آب و تاب پیر سے اتر گئی؟  
گ۔۔۔ بالکل۔

میں۔۔۔ ایک نکتہ اور ہی، نقال یا عکسوں کا بنایا والا وجود حقیقی کے متعلق کچھ علم نہیں رکھتا، یہ صرف ظاہری شکل کو جانتا ہے۔ کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں یا نہیں؟  
گ۔۔۔ جی ہاں۔

میں۔۔۔ اچھا تو معاملہ کو صاف طور پر سمجھ لیں، ادھی تو ضیح سے مطمئن نہ ہو جانا چاہیے۔

گ۔۔۔ فرمائیے۔

میں۔۔۔ مصوّر کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ یہ لگام کی تصویر بنائیگا، اور وہ بھی اُس کے صرف ایک ٹکڑے کی؟  
گ۔۔۔ جی۔

میں۔۔۔ اور زین سارا، اور پتیل کا کام کر نیوالا لگام میں بنائیگا؟  
گ۔۔۔ بیشک۔

میں۔۔۔ لیکن کیا مصوّر یہ جانتا ہے کہ لگام اور وہاں کیسیا ہونا چاہئے؟ نہیں، یہ تو زین سارا اور لوہار کو بھی جو انہیں بتاتے ہیں شکل سے معلوم ہوتا ہے۔ صرف شہسوار جو



انکا استعمال جانتا ہو وہی انکی صحیح شکل بھی جانتا ہو۔  
گ۔ بہت درست۔

میں :- اور کیا یہی حال اور سب چیزوں کا نہیں؟

گ :- یعنی کیا۔؟

میں :- یہ کہ تین فن ہیں جن کا ہر چیز سے واسطہ ہے، ایک وہ جو استعمال کرتا ہے  
دوسرا وہ جو بناتا ہے اور تیسرا وہ جو انکی نقل کرتا ہے  
گ :- جی ہاں۔

میں :- اور ہر جی یا غیر جی جسم نیز ہر عمل انسانی کی خوبی، حسن، صداقت اس  
استعمال کے اعتبار سے ہوتی ہے جس کے لیے قدرت یا صنائع نے نہیں مقصود کیا ہو۔  
گ :- درست۔

میں :- چنانچہ ان کے استعمال کرنے والے کو ہی ان کا سب سے زیادہ تجربہ ہونا چاہیے  
اور یہی بتا نیوال کو بتا بھی سکتا ہے کہ دوران استعمال میں کون کون سی اچھی یا بری صفات  
اس میں رونما ہوتی ہیں۔ مثلاً بانسری بجانے والا بنا نیوالے کو بتا سکتا ہے کہ اسکی کونسی  
بانسری بجانے میں اچھی ہے اور اسے کس طرح بانسری بنانی چاہیے اور بنانے والے کا فرض  
ہے کہ اس کی ہدایتوں کی پابندی کرے؟  
گ :- لازماً۔

میں :- ایک چونکہ جانتا ہے اس لیے بانسریوں کی اچھائی یا بُرائی کے متعلق بہت

گفتگو کر سکتا ہے اور دوسرا اُتپر اعتماد کر کے جو کچھ کہا جاتا ہے وہ کرتا ہے۔

گ۔۔۔ درست۔

میں مابنسری تو وہی ایک ہی ہے، لیکن اس کے بدلے بڑے کی بابت بنائے والے کو تو محض ایک صحیح یقین یا عقیدہ حاصل ہو سکتا ہے اور یہ یوں کہ جاننے والے سے اس کے متعلق گفتگو کرے اور پھر جو کچھ وہ کہے اس کے سننے پر مجبور ہو۔ رہا استعمال کرنے والا تو اُسے ہوتا ہی علم۔

گ۔۔۔ بیشک۔

میں۔۔۔ مگر نقال کو کیا ان میں سے کوئی بات بھی نصیب ہوگی؟ کیا اسے خود استعمال سے پتہ چل سکیگا کہ اس کی نقاشی صحیح اور خوشنما ہے یا نہیں؟ یا کیا یہ ممکن ہے کہ یہ کسی جاننے والے سے ملنے اور اس کی ہدایت سننے پر مجبور ہو کہ اسے کس طرح نقش اتارنا چاہیے اور اس طرح یہ صحیح ریلے قائم کر سکے؟

گ۔۔۔ دونوں میں کوئی صوت ممکن نہیں۔

میں۔۔۔ گویا اپنی تفلوں کی اچھائی یا بُرائی کی بابت نہ تو اسے صحیح ریلے ہی حاصل

ہوگی نہ علم؟

گ۔۔۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ نہیں۔

میں۔۔۔ تو تو ماشاء اللہ یہ نقال صنّاع اپنی مصنوعات کے متعلق نہایت روشن

کیفیت عرفان رکھتا ہوگا!



گ۔۔ جی، نہ کہیں۔

میں۔۔ لیکن جناب نقل ضرور کیے جائینگے، چاہتے علم ہو یا نہ ہو کہ ایک چیز کیونکر اچھی ہوتی ہے اور کیسے بُری، چنانچہ یہی توقع کرنی چاہیے کہ یہ انہیں چیزوں کی نقل کریں گے جو جاہل انبواہ کو اچھی معلوم ہوتی ہیں؟

گ۔۔ بالکل بجا۔

میں۔۔ اچھا، یہاں تک تو ہم خاصے متفق ہیں کہ نقال کو شیاء منقولہ کے متعلق کوئی قابل ذکر علم نہیں ہوتا۔ نقالی بس ایک طرح کا کھیل ہے یا تفریح اور یہ سب کے سب المناک شعر کہنے والے چاہتے رجز لکھتے ہوں چاہے ہمیں بدرجہ اولیٰ نقال ہیں؟

گ۔۔ بہت درست۔

میں۔۔ ہاں تو آپ کو قسم ہے فرمائیے کہ ہم کیا یہ نہیں ظاہر کر چکے ہیں کہ نقالی کو اس چیز سے واسطہ ہے جو حقیقت سے بدارج سہ گانہ بعید ہے؟

گ۔۔ جی، بیشک۔

میں۔۔ اور وہ کونسی انسانی صلاحیت ہے جس پر یہ نقالی اپنا اثر رکھتی ہے؟

گ۔۔ آپ کا کیا مطلب ہے۔

میں۔۔ بتانا ہوں: ایک جسم جو قریب سے دیکھنے میں بڑا معلوم ہوتا ہے، دُور سے

چھوٹا معلوم ہوتا ہے؟

گ۔ جی۔

میں :- وہی چیز پانی کے باہر سیدھی دکھائی دیتی ہے اور پانی کے اندر ٹیڑھی  
 نگاہ کو رنگوں میں ہودھو کا ہوجاتا ہے اس کی وجہ سے اجدب اہوف دکھائی دیتا ہے  
 بغرض ہمارے اندر اس قسم کے تمام فریب موجود ہیں، اور انسانی دماغ  
 کی اسی کمزوری پر روشنی اور سایہ سے نظر بند ہی کرنے اور فریب دینے کا فن  
 اور دوسری چالاکی کی تدبیریں اپنا اثر دکھاتی ہیں اور ہم پر جادو کا سا  
 اثر کرتی ہیں۔

گ۔ سچ ہے۔

میں :- اب ماننے، گمنے اور تولنے کے فن عقل انسانی کی مدد کو آتے ہیں۔  
 یہی ہیران کا اصلی حُسن۔ اور وہ جو ظاہر بڑا یا چھوٹا، ہلکا یا بھاری معلوم ہوتا تھا  
 اب ہم پر غالب نہیں رہ سکتا، بلکہ حساب پیمانہ اور وزن کے سامنے غائب ہو جاتا،  
 گ۔ حق ہے۔

میں :- اور یہ یقیناً روح کے حساب اس اور عاقل اصول کا کام ہونا چاہیے؟  
 گ۔ یقیناً۔

میں :- جب یہ اصول ناپک تصدیق کرتا ہے کہ یہ چیزیں پرہیز میں فلاں فلاں  
 بڑی ہیں اور فلاں فلاں چھوٹی تو اس وقت بظاہر ایک تضاد پیدا ہوتا ہے :-  
 گ۔ درست۔



میں :- لیکن مسم کہہ چکے ہیں کہ یہ تضاد محال ہے، وہی صلاحیت ایک ہی وقت میں ایک ہی چیز کے متعلق دو متضاد رائیں نہیں رکھ سکتی۔  
گ :- بہت صحیح۔

میں :- تو گویا روح کا وہ حصہ جس کی رائے پیمانہ کے خلاف ہے اس حصہ سے مختلف ہو گا جسکی رائے پیمانہ کے مطابق ہے؟  
گ :- ٹھیک۔

میں :- اور روح کا بہتر حصہ شاید وہی ہو گا جو پیمانہ اور حساب پر بھروسہ کرے۔  
گ :- یقیناً۔

میں :- اور جو انکا مخالف ہے وہ اصول ادنیٰ درجہ کا ہو گا۔  
گ :- بلاشبہ۔

میں :- میرا مقصد دراصل اسی نتیجہ پر پہنچنا تھا جیسا میں نے کہا تھا کہ مصوری نقاشی اور نقالی فی الجملہ جہاں اصلی کام کرتے ہوں تو حقیقت سے بہت بعید ہوتے ہیں اور ہماری روح کے ایسے اصول کے ہمنشین دوست اور ساتھی ہیں جو خود عقلیت سے اسی درجہ بعید ہی اور سچ پوچھ تو ان کا کوئی سچا اور اچھا مقصد نہیں؛  
گ :- بالکل ٹھیک۔

میں :- نقالی کا فن ایک پنج ذات ہے جو پنج ذات سے عقد کرتا ہے، لہذا اولاد بھی پنج ذات ہوتی ہے۔

گ :- بہت صحیح۔

میں :- اچھا تو کیا یہ معاملہ صرف باصرہ پر محدود ہو یا یہاں سے بھی اور خصوصاً آج جسے ہم شاعری کہتے ہیں اسکا اطلاق ہو سکتا ہے؟

گ :- ظن غالب ہے کہ شاعری کے متعلق بھی یہی بات صحیح ہوگی۔

میں :- نہیں بھائی مصوری کی تمثیل سے جو غلبہ ظن حاصل ہوا ہے اس پر بھروسہ کرنا ٹھیک نہیں؛ آؤ آگے تحقیق کریں اور دیکھیں کہ آیا جس صلاحیت سے شاعری کو سروکار ہے وہ اچھی ہو یا بری۔

گ :- ضرور۔

میں :- اچھا تو مسئلہ یوں پیش ہوتا ہے: تقالی ان اعمال انسانی کی (خواہ ارادی ہوں یا غیر ارادی) نقل کرتی ہے جسے اسکے خیال میں کوئی اچھا تجربہ مترتب ہوا ہو یا کیا کوئی بُرا نتیجہ، اور پھر یہی نتیجہ کی نوعیت کے موافق اس پر خوشی منائی، ہی یا رنج کرتی ہے۔ کیوں کیا اس کے علاوہ اور کچھ بھی ہے؟

گ :- نہیں اور کیا ہے۔

میں :- لیکن کیا حالات و سبب کے اس نوع میں انسان خود اپنے سے متحد ہے؟ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ جیسے نگاہ کے معاملہ میں اسی چیز کے متعلق اس کی رائے میں تضاد تھا اور عدم وضاحت سیطرہ میں بھی اس کی زندگی میں کشاکش اور عدم مطابقت ہو؟

اگرچہ سچ پوچھو تو اب سوال کو دوبارہ اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں، مجھے یاد ہے کہ ہم سب یہ



تسلیم کر چکے ہیں اور ہم نے مان لیا ہے کہ روح ہر نخطہ ان اور ان جیسی اور ہزاروں نجاتوں  
سے پڑھتی ہے؟

گ :- جی، اور ہم ٹھیک بھی تھے۔

میں :- ہاں، یہاں تک تو ہم ٹھیک تھے، لیکن ایک بات البتہ رہ گئی تھی جو  
اب پورا کرنا چاہیے۔

گ :- کیوں، وہ کیا رہ گیا تھا؟

میں :- تمہیں یاد ہو گا کہ ہم نے کہا تھا کہ اگر کسی نیک آدمی پر اس کے بیٹے کی موت  
کی بلا ٹوٹ پڑے اور اس سے کوئی ایسی چیز چھین جائے جو اسے نہایت عزیز تھی تو وہ اور  
کے مقابلہ میں اس کو زیادہ سکون کے ساتھ برداشت کریگا؟

گ :- جی۔

میں :- لیکن کیا اسے رنج ہی نہ ہو گا، یا یہ کہ رنج ہونا تو لازمی ہے البتہ یہ اپنے غم کو  
جیسے تیسے دور کرنے کی کوشش کریگا؟

گ :- دوسری صورت زیادہ صحیح ہے۔

میں :- اچھا بتاؤ کہ یہ اپنے غم کو دبانے اور دور کرنے کی کوشش اپنے ہچیموں کی مہنگی  
میں زیادہ کریگا یا تنہائی میں؟

گ :- جی ہاں، اس سے بڑا فرق پڑیگا کہ کوئی اسے دیکھتا ہو یا نہیں۔

میں :- یہ جب اکیلا ہو گا تو بہت سی ایسی باتیں ہیں جو یہ کہہ یا کر سکتا ہے لیکن اگر

کہیں دوسرے نہیں دیکھ یا سُن لیں تو یہ شرم سے پانی پانی ہو جائے۔  
گ۔ درست۔

میں :- ہم کہہ چکے ہیں کہ جب ایک شخص پر دو مخالف قوتیں عامل ہوں ایک  
کسی چیز کی طرف کھینچے اور ایک اُس سے دُور مٹائے تو اس سے لازماً یہ نتیجہ نکلتا ہے  
کہ اس میں دو جدا اصول موجود ہیں۔  
گ۔ بیشک۔

میں :- ان میں سے ایک قانون کی رہنمائی میں چلنے پر آمادہ ہے۔  
گ۔ یہ کیسے؟

میں :- قانون کہتا ہے کہ مصیبت میں صبر کرنا بہترین صوت ہے، ہمیں بے صبری  
نہ کرنا چاہیے اس لیے کہ کون جانتا ہے کہ یہ چیزیں اچھی ہیں یا بُری اور پھر بے صبری سے  
فائدہ کیا؟ نیز اس لیے کہ کوئی انسانی معاملہ اسی خاص اہمیت نہیں رکھتا اور ہم  
اس چیز کی راہ میں حائل ہوتا ہے جسکی اس وقت سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔  
گ۔ کاہنکی سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

میں :- اس کی کہ جو کچھ پیش آچکا اس پر غور کریں اور جب پانسہ پڑچکا تو اب جو  
بہترین صورت ہو اسکے مطابق معاملات کا انصرام کریں، یہ نہیں کہ بچوں کی طرح بجا  
جو جہاں ذرا گر پڑے تو چوٹ کو پکڑے بیٹھے رہتے ہیں اور جینے چلانے میں ہی سارا وقت  
ضائع کرتے ہیں؛ بلکہ ہمیں تو چاہیے کہ روح کو فوراً ہی اس کا علاج کرنے کی عادت ڈالیں



تاکہ جو مریض اور افتادہ ہو اُسے پھر اٹھا کر کھڑا کرے اور دکھ سہرا ہٹنے کو طب سے دور کرتے  
گ۔۔ بیشک، بد بختی کے عملوں کا مقابلہ یونہی کرنا چاہیے۔

میں۔۔ اور ہماری روح کا اعلیٰ اصول عقل کے اس مشورہ پر عمل پیرا ہونے کو  
آما وہ ہے۔

گ۔۔ ظاہر ہے۔

میں۔۔ اور دوسرا اصول جو ہمیشہ غم کی یاد تازہ رکھنے اور اسپر نوہ و زاری کی نظر  
مائل ہوتا ہے اور ان سے کبھی سیر نہیں ہوتا اسے ہم خلاف عقل بے سود اور بزدل  
کہہ سکتے ہیں۔

گ۔۔ بیشک، کیوں نہیں۔

میں۔۔ اور کیا یہی مؤخر الذکر یعنی مائل بہ بغاوت اصول تقالی کیلئے رنگارنگ  
مواد نہیں مندرجہ کرتا؟ کیونکہ کسی فہیم و متین طبیعت کی نقل اول تو اتارنی آسان  
نہیں کہ اس میں ہمیشہ ایک توازن و یکسانیت ہوتی ہے اور اگر اس کی نقل کی بھی جائے  
تو کوئی اسے پسند نہ کرے خصوصاً تہواروں کے موقع پر جب ایک عامیانا انہوہ کسی  
منڈپ میں ان نقلوں کے دیکھنے کے لیے جمع ہوتا ہے۔ اور وجہ صاف ہے کہ جس جذبہ  
کی نقل اس حالت میں کی جائیگی یہ اس سے یک قلم نا آشنا ہیں۔

گ۔۔ بیشک۔

میں۔۔ چنانچہ تقالی شاعر جب کا مقصد قبول عام ہے تو قدرتا اس غرض کے لئے

خلق ہوا ہونہ اسکے ہنر کی نمانیت ہی یہ ہے کہ روح کے عقلی اصول کو خوش کرے یا اور کسی طرح اسپر اثر ڈالے؛ بلکہ یہ تو ترجیح دیگا جذباتی اور مستلون طبیعت کو کہ اسکی نقل اتارنی آسان ہے۔

گ۔ ظاہر ہے۔

میں۔ اب ہم بجا طور پر اسے نیکر مصور کے پہلو بہ پہلو بٹھا سکتے ہیں کہ یہ طرح اس کا مثل ہے؛ اول تو یہ کہ اس کی مخلوقات اپنے اندر صداقت کا ایک ادنیٰ درجہ رکھتی ہیں؛ تو ہاں ایک تو اس بات میں یہ مصور کا مثل ہوا؛ دوسری بات یہ ہے کہ اسے بھی روح کے ایک ادنیٰ جزو سے سروکار ہے۔ لہذا ہم بالکل حق بجانب ہونگے اگر اسے ایک منظم ریاست میں داخل کرنے سے انکار کریں کیونکہ یہ جذبات کو تو بیدار کرتا؛ انکی آبیاری کرتا اور انھیں قوت بخشتا ہے لیکن عقل کو مضرت پہنچاتا ہے۔ جیسے کبھی کسی شہر میں بد کرداروں کو سارا اختیار مل جائے اور نیک مار کے الگ کر دیئے جائیں تو کیا حال ہو۔ اسی طرح روح انسانی میں یہ نقال شاعر ایک دستور باطل کو لا کر نصب کرتا ہے اس لیے کہ یہ روح کے اس غیر عاقل عنصر کی پیچ کرتا ہے جسے بڑے چھوٹے کی تمیز نہیں؛ جو اسی چیز کو کبھی بڑا اور کبھی چھوٹا خیال کرتا ہے۔ یہ شاعر صوت گرتے اور حقیقت سے کوسوں دور۔

گ۔ بالکل درست۔

میں۔ لیکن ہم نے ابھی سب سے بھاری الزام تو پیش ہی نہیں کیا؛ یعنی شیوہ



کو نقصان پہنچانے کی جو قوت شاعری اپنے اندر رکھتی ہو (اور بہت ہی چند لوگ ہیں جنہیں اس سے ضرر نہ پہنچا ہو) وہ واقعاً نہایت ہی خوفناک ہے۔

گ۔ بلاشبہ، اگر اس کا اثر وہی ہوتا ہی جو آپ فرماتے ہیں۔

میں۔ اچھا تو سنو اور فیصلہ کرو۔ ہم میں سے بہترین شخص جب ہو گا کسی اور المناک شاعر کا کلام سنتا ہی جس میں مشاہیر میں سے کوئی اپنے دکھ درد کی داستان طولانی دوہرا رہا ہو، رُو دھور رہا ہو، یا آہ وزاری و سینہ کو بی میں مصروف ہو تو تم جانو اچھے سے اچھے کا دل پیچ جاتا ہے اور ہم اس شاعری کی خوبی پر سے زیادہ غش غش کرنے لگتے ہیں جو ہمارے جذبات کو سب سے زیادہ متحرک کر دے۔

گ۔ جی، میں اس سے واقف ہوں۔

میں۔ لیکن جب کوئی ذاتی مصیبت آن پڑے تو تم دیکھ سکتے ہو کہ ہم اسکے بالکل مخالف صفت پر فخر کرتے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ چپے ہیں اور صبر کریں، کیونکہ مردانہ شعاری ہی، اور وہ دوسری چیز جسے سنکر ہم متاثر ہوئے تھے اسے ہم اب نسائیت پر محمول کرتے ہیں۔

گ۔ بہت صحیح۔

میں۔ اچھا تو بھلا تمہیں بتاؤ کہ جس کام کو ہم اپنی ذات کے لیے قابلِ نظر اور باعثِ شرم سمجھیں تو کیا جبے و سرا سے کرے تو اس کی تعریف لوح میں ہم حق بنجا ہو سکتے ہیں؟

گ۔ نہیں، واقعی یہ تو معقول بات نہیں۔

میں۔ کیوں نہیں، ایک نقطہ نظر سے تو بالکل معقول ہے۔

گ۔ کونسے نقطہ نظر سے؟

میں۔ دیکھو، ہم اپنی ذاتی پستتائیں رو دھو کر اپنا غم غلط کرنے کی جس قدرتی خواہش کو دبائے اور قابو میں رکھتے ہیں اسی خواہش کو یہ مشاعرہ نوپرا کرتے ہیں۔ ہماری اعلیٰ فطرت جب عقل یا عادت کی تربیت سے کافی بہرہ یاب نہیں ہوتی تو ہمدردی کے عنصر کو اس لیے آزا و چھوڑ دیتی ہے کہ یہ غم تو دوسرے کا ہے۔ ناظر سمجھتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے پاس نیکی کا دعویٰ کرتا اور ساتھ ساتھ اپنے مصائب کا دکھاروتا ہے تو اس کی تعریف اور سپر افسوس کرنے میں اس کی کیا توہین اور اس اظہار سے جو حظ حاصل ہوتا ہے وہ الگ ایک فائدہ۔ پھر یہ کیوں خواہ مخواہ اس درجہ محتاط ہو اور اس حظ کو نیز لطف شعر کو کیوں ہاتھ سے جانے دے۔ اور جہاں تک میں جانتا ہوں بہت ہی کم لوگ ہسبات پر دھیان کرتے ہیں کہ دوسروں کی بُرائی سے خود ان میں بھی کچھ بُرائی منتقل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ دوسروں کی مصیبت دیکھ کر جس جذبہ رنج و افسوس نے قوت پکڑ لی ہے پھر اس کا خود اپنی پستتائیں دبانا بھی بہت دشوار ہو جاتا ہے۔

گ۔ نہایت درست۔

میں۔ اور کیا ظرافت کا بھی یہی حال نہیں؟ بہت سے مزاح ہیں کہ تم خود کو شرمناک کہے، لیکن جب طربناک ناٹک میں یا حلقہ احباب میں انھیں سُنتے ہو تو بوجہ محفوظ



ہوتے ہو اور ان کی بہبودگی سے ذرا متنفر نہیں ہوتے، یعنی وہی افسوس والا معاملہ !  
 انسانی روح میں ایک اصولی ہی جو ہمیشگی کی طرف مائل ہے، اسے تم نے اس ڈر سے روک  
 رکھا تھا کہ لوگ تمہیں مسخرہ نہ خیال کرنے لگیں سو اب یہ آزاد ہو جاتا ہے اور چونکہ ناکت میں  
 تم اسے متحرک دیکھتے ہو تو گھر پر تم خود بھی بلا ارادہ و بلا شعور ظریف شاعر کا روپ اختیار  
 کر لیتے ہو۔

گ۔ بہت صحیح۔

میں :- پھر ہی حال شہوت و غضب اور دیگر جذبات کا ہے، نیز خواہش کا اور  
 خط و کرب کا جو افعال انسانی سے کبھی جدا نہیں ہو سکتے، ان سب میں شاعری بجائے  
 اسکے کہ جذبات کے سوتھ سکھائے ان کی پرورش و آبیاری کرتی ہے، اور انسانی سر  
 و خوبی کے لیے جن چیزوں کو قابو میں رکھنا ضروری ہو یہ ان کے ہاتھ میں عنان حکومت  
 دیدیتی ہے۔

گ :- میں اس سے تو انکار نہیں کر سکتا۔

میں :- چنانچہ، گلاکن جب کبھی ہومر کے کسی مداح سے ملاقات ہو جس کا  
 دعویٰ ہو کہ ہومر یونان کا معلم تھا، تعلیم و معاملات انسانی کی تنظیم کے لیے اس کا کلام  
 نہایت مفید ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اسے بار بار پڑھیں اور اسے سمجھیں اس کی تعلیم کے مطابق  
 اپنی ساری زندگی کو ترتیب دیں، تو بھائی ہم ان لوگوں کی تعظیم و تکریم تو سب کچھ کریں گے  
 کہ جہاں تک ان کی روشنی کام دیتی ہے وہ غریب اچھے لوگ ہیں اور ساتھ ہی ہم ہومر کو



سب سے بڑا شاعر اور اولین المناک مصنف بھی تسلیم کر لیں گے لیکن اس عقیدہ پر خوشگی سے قائم رہیں گے کہ دیوتاؤں کی تسبیح اور شاہ میر کی بیح ہی صرف شاعری کی وہ قسمیں ہیں جنہیں اپنی ریاست میں داخل ہونے دینا چاہیے۔ اس لیے کہ جہاں اس کے آگے قدم بڑھایا اور روانی یا عنانی کی شکل میں شعر کی شکریں دیوی کو آنے دیا کہ جس بجائے قانون و عقل کی دمانروائی کے جنہیں اجماع عام نے بہترین حکم اس تسلیم کیا ہے خط و کرب اور سرت و الم کا دور دورہ ہوگا۔

گ۔ - نہایت درست۔

میں :- اب کہ ہم دوبارہ شاعری کے موضوع پر لوٹے ہیں ہمیں چاہیے کہ اپنے پہلے فیصلہ کی معقولیت اس عذر سے ثابت کریں جس کی رو سے ہم نے اس فن کو ہمیں مذکورہ رجحانات ہوں اپنی ریاست سے خارج کیا تھا۔ لیکن اس لیے کہ یہ ہم پر شد و عدم رواداری کا الزام نہ لگا سکے، آؤ ہم اس سے یہ بھی کہیں کہ فلسفہ اور شاعری میں تو بڑی قدیم عداوت ہے اور اسکے بہتیرے ثبوت ہیں "وکتیا جو اپنے آقا پر ہونکتی ہے" والا مقولہ یا احمقوں کی بیکار صحبت میں سرلینڈ، یا وہ "ابنہ عقلا" والا حوالہ "جو نریا کی دربارداری کیا کرتے ہیں" یا "وہ باریک میں نازک خیال، ساسے کے سارے درپوزہ" کے الغرض اس نے تمام کی ان جیسی اور بے گنتی نشانیوں ہیں۔ لیکن باوجود اس کے آؤ ہم اپنی محبت شیریں اور اس کی دیگر بہنوں کو یقین دلائیں کہ بس اگر یہ ایک منظم ریاست میں اپنے وجود کا حق ثابت کر دیں تو ہم نہایت خوشی سے ان کا خیر مقدم کریں گے۔



ہیں تو خود اس کی دلاویزی کا احساس ہی۔ لیکن ہم کچھ اس وجہ سے حق کا ساتھ تو چھوڑ نہیں سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی اس کی دلفریبی سے اسی قدر متاثر ہوتے ہو گے جتنا کہ میں اور خصوصاً جب یہ حوصلہ کے پیکر میں رونما ہوتی ہے؛

گ :- ہاں، سچ ہے، میں بھی بہت متاثر ہوں۔

میں :- تو میں تجویز کروں کہ اسے جلا وطنی سے واپسی کی اجازت مل جائے لیکن بس اس شرط پر کہ یہ غنائی بلا کسی اور بھر میں اپنی صفائی پیش کرے؟

گ :- ضرور

میں :- اسکے علاوہ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ ان عاشقانِ شعر اور ہمدرد خواہانِ شاعری کو جو خود شاعر نہیں اس امر کی اجازت دیں کہ یہ اس کی طرف سے نثر میں گفتگو کر سکیں یہ لوگ ہمیں بتائیں کہ شاعری محض مسترتِ بخش ہی نہیں بلکہ رہائستوں اور انسانی زندگی کے لیے مفید بھی ہے، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ نہایت ہمدردانہ طریق سے ان کا ہمدردی کے اس لیے کہ اگر یہ ثابت ہو جائے تو ہمارا بھی تو فائدہ ہے، یعنی میں نے کہا اگر شاعری میں مسترت کے علاوہ افادہ بھی ہو۔

گ :- بیشک ہمارا فائدہ ہے۔

میں :- اگر اس کا عذرنا کام رہا تو پھر محبتِ عزیز ہر اس شخص کی طرح جو ایک چیز کا دلدادہ ہے لیکن چونکہ اس کی آرزو اسکے اغراض کے منافی ہے لہذا اپنے اوپر جبر کرنا ہی ہم بھی کہ دلداگانِ شعر ہیں اسے چھوڑ دیں گے اگرچہ بلا شمسکش تو نہیں۔ ہم میں بھی تو آخر



محبت شعر کی وہ روح موجود ہے جو شریف ریاستوں کی تعلیم نے ہمارے اندر چھونکی ہے  
چنانچہ ہماری خود بھی خواہش ہے کہ یہ اپنی سچی اور بہترین شکل میں ہمارے سامنے آئے  
لیکن جب تک وہ یہ صفائی نہ پیش کر سکے تو ہماری گذشتہ دلیل ہمارے لئے  
ایک منتر کا کام دیگی، ہم جب اس کے نغموں کو سنیں گے تو اپنا یہ منتر بھی برابر سننے  
جائیں گے، تاکہ ہم بھی اس کے اس طفلانہ عشق کا شکار نہ ہو جائیں، جو عوام کو پانچیر  
کیسے ہو۔ نہ ہی۔ ہر حال ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ چونکہ شاعری کی حقیقت وہی ہے جو  
ہم نے بیان کی لہذا اس سے حصول حق کی کچھ سنگین توقع نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ  
جو بھی اسے سُنے اور اپنے اندر والے شہر کی حفاظت کا کھٹکا بھی رکھتا ہو اسے چاہیے کہ  
ہمارے الفاظ کو اپنا آئین بنائے اور اسکے بہکاوے سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی  
کوشش کرے۔

گ۔۔۔ جی ہاں، میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔

میں۔۔۔ ہاں، عزیز من گلا کن، امر فیصلہ طلب نہایت عظیم الشان ہے جتنا  
نظام معلوم ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ، یعنی یہ کہ انسان نیک بنے یا بد، اور جلا  
اس سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے کہ عزت دولت، یا قوت کی خاطر یا ہاں شعر کے ہیجان  
سے کوئی نیکی اور عدل کو بھول بیٹھے؟۔

گ۔۔۔ جی، میں تو اس دلیل سے پورا قائل ہو گیا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ  
ہر ایک قائل ہو جاتا۔



میں :- اور پھر بھی ابھی ان انعام اکراموں کا ذکر ہی نہیں ہوا جو نیکی کے لیے محفوظ ہیں۔

گ :- کیا؟ کیا ابھی اور بھی بڑے انعام ہیں؟ اور اگر ہیں تو ناقابل فہم عظمت کے انعام ہونگے؟

میں :- کیوں، تھوڑے سے وقت بھلا کون چیز بہت بڑی ہو سکتی ہے؟ یہ تین مہینے اور دس سال کا زمانہ ازل کے مقابلہ میں تو نہایت ہی چھوٹی چیز ہے۔  
گ :- بلکہ کہئے کہ کچھ نہیں۔

میں :- تو کیا ایک غیر فانی وجود کو اس کل کے مقابلہ میں اس قلیل زمانہ کا خیال کرنا چاہیے۔

گ :- ظاہر ہے، کل کا خیال کرنا چاہیے۔ لیکن خستہ آپ یہ پوچھتے کیوں ہیں؟  
میں :- کیوں، کیا تم نہیں جانتے کہ روح انسانی غیر فانی ہے اور کبھی نہیں مکتی۔  
گ :- (میری طرف تخیرو استعجاب سے دیکھ کر) نہیں، بخدا۔ اور کیا آپ واقعی اسے ماننے کو تیار ہیں؟

میں :- ہاں، مجھے ماننا چاہیے اور تمہیں بھی۔ اس کے ثابت کرنے میں کوئی دشواری نہیں۔

گ :- مجھے تو بڑی دشواری معلوم ہوتی ہے۔ لیکن بہر حال میں آپ کی دلیل ضرور سنوں گا جسے آپ ایسا سہل بتاتے ہیں۔

میں ۔ تو سُنئے؟

گ :- میں متوجہ ہوں ۔

میں :- ایک چیز ہے جسے ہم خیر یا اچھائی کہتے ہیں اور ایک دوسری چیز ہے

شر یا بُرائی؟

گ :- جی ۔

میں :- کیا آپ مجھ سے متفق ہیں کہ مخرّب اور تباہ کن عنصر شر ہے اور بچانے والا

اور ترقی دینے والا عنصر خیر؟

گ :- جی ہاں ۔

میں :- اور آپ تسلیم کرتے ہیں کہ ہر چیز کی ایک اچھائی ہوتی ہے اور ایک بُرائی

مثلاً قصر بصارت ، آنکھوں کی بُرائی ہے اور مرض سانسے جسم کی عفت

غذ کی بُرائی ہے، گھن بکڑی کی، رنگ لوہے تانبے کی۔ ہر چیز میں یا یوں کہو کہ تقریباً ہر

چیز میں ایک قدرتی بُرائی اور مرض ہوتا ہے؟

گ :- جی ۔

میں :- اور جہاں میں سے کوئی بُرائی کسی چیز میں پیدا ہو جائے تو یہ چیز بھی بُری

ہو جاتی ہے اور بالآخر بالکل تحلیل ہو کر فنا ہو جاتی ہے۔

گ :- درست ۔

میں :- جو شر اور عیب ہر ایک کی فطرت میں مضمر ہے وہی اُس کی تباہی ہے، اور



اگر یہ نہ تباہ کر سکے تو پھر اسے کوئی تباہ نہیں کر سکتا، کیونکہ خیر و نیکی تو تباہ کر لیتی ہی نہیں اور نہ وہ جو نہ شر ہو نہ خیر۔

گ۔۔ یقیناً نہیں۔

میں۔۔ چنانچہ اگر کوئی ایسی طبیعت ملے جس میں یہ قدرتی خرابی تو ہو لیکن اسے تحلیل و تباہ نہ کر سکے تو ہم یقین کہہ سکتے ہیں کہ اسکے لیے کوئی تباہی نہیں۔

گ۔۔ جی، یہ تو فرض کیا جاسکتا ہے۔

میں۔۔ اچھا، اور کیا ایسی کوئی بُرائی نہیں جو روح کی تخریب کر سکے؟

گ۔۔ کیوں نہیں، وہ ساری کی ساری بُرائیاں ہیں جن پر ہم ابھی ابھی نظر

ڈال رہے تھے، بدی، بے عفتی، بُزدلی، جہالت۔

میں۔۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی کیا اسے تحلیل یا تباہ کر دیتی ہے؟ اس سوال

کا جواب دیتے ہوئے اس دھوکہ میں نہ پڑنا چاہیے کہ جب ہو قوت غیر منصف انسان

پکڑا جاتا ہے تو وہ اپنی نا انصافی کے باعث تباہ ہوتا ہے جو روح کا عیب ہے جسم کی تشیل

لو، جسم کی بُرائی ایک مرض ہے جو اسے گھلا گھلا کر گھٹاتی اور بالآخر بالکل برباد کر دیتی

ہے۔ اور وہ ساری چیزیں جن کا ہم ابھی ذکر کر رہے تھے ان خرابیوں اور عیبوں سے

تباہ ہوتی ہیں جو ان سے وابستہ اور ان میں مضمر ہیں۔ کیوں، سچ ہے نہ؟

گ۔۔ جی ہاں۔

میں۔۔ اسی طرح روح پر دھیان کرو۔ کیا نا انصافی یا اور کوئی بُرائی جو روح

میں موجود ہوا سے تحلیل کر سکتی ہو؛ کیا بُرائیاں روح سے وابستہ رہ کر باختر  
اس کی موت کا باعث ہوتیں اور اس طرح اسے جسم سے جدا کرتی ہیں؟  
گ۔ ہرگز نہیں۔

میں۔ اور تاہم یہ فرض کرنا خلاف عقل ہوگا کہ جس چیز کو اس کی اپنی  
برائی تباہ نہ کر سکے وہ کسی خارجی بُرائی کے اثر سے تباہ ہو جائے۔  
گ۔ جی۔

میں۔ گلاکن! ذرا سوچو کہ غذا تک کی بُرائی مثلاً بد مزگی، سٹرن یا  
کوئی اور بُری صفت اگر غذا ہی تک محدود ہو تو یہ نہیں سمجھ سکتے کہ اس سے جسم کی  
تباہی رونما ہوئی۔ ہاں جب غذا کی خرابی جسم میں خرابی ڈالے تو اس وقت یہ کہنا  
چاہیے کہ جسم خود اپنے عیب سے تباہ ہوا یعنی مرض سے جسے غذا نے پیدا کیا لیکن  
یہ ہم کبھی تسلیم نہ کریں گے کہ جسم ایک الگ چیز ہے اور غذا ایک الگ چیز جس سے کوئی  
قدرتی تعدی نہیں ہوتی اور یہ کہ پھر بھی غذا نے جسم کو تباہ کر دیا۔  
گ۔ بہت درست۔

میں۔ اور اسی اصول پر جب تک ایک جسمانی بُرائی روحانی بُرائی پیدا  
نہ کر سکے ہیں کبھی یہ فرض نہ کرنا چاہیے کہ روح جو بالکل جدا چیز ہے کسی ایسی خارجی بُرائی  
سے تباہ ہو سکتی ہے جو کسی دوسری چیز سے تعلق رکھتی ہو۔  
گ۔ بیشک، اس خیال میں تو کوئی معقولیت نہیں۔



میں۔ لہذا یا تو اس نتیجہ کا رد ہو، یا پھر جب تک بے رویہ ہم کبھی یہ نہ کہیں کہ بخاری یا کوئی دوسرا مرض گلے پر خنجر کا چلنا، یا جسم کا چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹا جانا روح کو تباہ کر سکتا ہے۔ جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ جب جسم کے ساتھ یہ اعمال ظہور میں آئیں تو وہ (روح) بھی اس وجہ سے ناپاک یا بد ہو جاتی ہے لیکن جب روح یا کوئی اور شے اپنی داخلی برائی سے تباہ نہ ہو تو پھر یہ تو کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی خارجی عیب سے تباہ ہو سکتی ہے۔

گ۔ اور یقیناً یہ تو کوئی بھی ثابت نہ کر سکیگا کہ موت کے باعث انسانوں کی روہیں بد یا غیر منصف ہو جاتی ہیں۔

میں۔ لیکن اگر کوئی شخص روح کے غیر فانی ہونے کو تسلیم نہ کرے اور اسکا صاف منکر ہو اور یہ کہے کہ مرنے والے واقعاً بد اور غیر منصف ہو جاتے ہیں تو اگر اسکا قول صحیح ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں نا انصافی کو بھی مرض کی طرح غیر منصف کے لیے مہلک تصور کرنا چاہیے یعنی جنہیں یہ روگ لگ گیا وہ برائی کی اس ذاتی تباہ کن قوت سے مر جاتے ہیں جو برائی کی فطرت میں مضمر ہے اور جو جلد یا بہ دیر مہلکی کا باعث ہوتی ہے۔ لیکن یہ صورت اس سے بالکل جدا گانہ ہے جس میں آج کل بد لوگ دوسرے کے ہاتھوں اپنے اعمال بد کی پاداش میں موت کا منہ دیکھتے ہیں۔

گ۔ نہیں۔ اگر نا انصافی غیر منصف کے لیے مہلک ہو تو اس صورت میں تو یہ اس کے لیے اس قدر ہیبتناک نہ ہوگی، اس لیے کہ وہ اپنی برائی سے نجات پا جائیگا



میں تو سمجھتا ہوں کہ حقیقت اسکے بالکل خلاف ہے۔ یعنی اگر ناصحائی میں طاقت ہو تو دوسروں کو تو قتل کرے لیکن خود قاتل کو سلامت رکھے اور خوب جھٹایا جاگتا۔ اس کا مسکن اور دار اہل باہم بہت بعید ہیں !

میں :- سچ ہے۔ اگر روح کی فطری بُرائی اور اسکا ذاتی تعیب سے ہلاک و برباد کرنے سے معذور ہے تو پھر جو چیز کسی دوسرے جسم کی تباہی کے لیے متعین کی گئی ہے وہ اس روح کو یا سولے اس چیز کے جس کی بربادی اسکا مقصود ہے کسی اور کو کیونکر تباہ کر سکیگی۔ گ :- جی ہاں، یہ تو مشکل ہی سے ممکن ہے۔

میں :- لیکن جو روح کسی بُرائی سے تباہ نہ ہو نہ خارجی سے نہ داخلی سے وہ تو ہمیشہ موجود رہے گی اور چونکہ ہمیشہ موجود رہے گی اس لیے غیر فانی ہوگی ؟ گ :- یقیناً

میں :- تو یہ نتیجہ نکلا۔ اور اگر یہ نتیجہ صحیح ہے تو روحیں ہمیشہ وہی رہنی چاہئیں کیونکہ جب انہیں سے کوئی ہلاک نہ ہوگی تو ان کی تعداد بھی نہ گھٹے گی۔ اور نہ ان کی تعداد بڑھے گی، کیونکہ غیر فانی طبائع کی تکثیر کہیں کسی فانی چیز سے آئی چاہئے اور اس طرح سب چیزوں کا انجام جا کر بقا میں ہوگا۔ گ :- بہت بجا۔

میں :- لیکن یہ تو ہم یقین کر نہیں کر سکتے عقل اسکی اجازت نہیں دیتی۔ جس طرح ہم یہ بات باور نہیں کر سکتے کہ روح اپنی صادق ترین ماہیت میں عدم



یکسانیت، تنوع اور اختلاف سے پرہیز۔

گ۔ یعنی کیا؟

میں۔ جیسا کہ ثابت ہو چکا روح کی ترکیب حسین ترین ہونی چاہیے! اور پھر یہ بہت سے عناصر سے کس طرح مرکب ہو سکتی ہے؟

گ۔ جی، ہرگز نہیں۔

میں۔ اس کا غیر فانی ہونا تو سابقہ دلیل سے ثابت ہو گیا اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے ثبوت ہیں۔ لیکن اگر اسے اس کی حقیقی شکل میں دیکھنا ہو، ایسے نہیں جس طرح ہم اب دیکھتے ہیں، یعنی جسم اور دیگر معائب کے تعلق سے آلودہ، تو ہمیں اسے صہلی و خالص حالت میں عقل کی آنکھ سے دیکھنا چاہیے تب اس کا حسن بے نقاب ہوگا اور اس وقت جا کر کہیں عدل و نفاذ انصافی اور وہ ساری چیزیں جنکا ہم نے ذکر کیا ہے نہایت واضح طور پر ظاہر ہونگی۔ اب تک تو ہم نے اس کے متعلق جو حقائق بیان کیے ہیں وہ اس حالت کی بابت ہیں جس میں وہ اس وقت ظاہر ہوتی ہے؛ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہم نے اسے جس حال میں دیکھا ہے اس کی مثال بھری دیوتا گلاکس کی سی ہے جس کی اصلی شکل مشکل دکھائی دیتی ہے کہ اسکے عناصر جسم کو سمند کی موجوں نے طرح طرح سے توڑا مڑا اور مجروح کیا ہے؛ بھری نباتات، گھونگھوں اور پتھروں کے کھپٹ کے کھپٹ پر جم گئے ہیں اور اپنی فطری شکل سے مشابہ ہونیکے بجائے یہ ایک وحشت خیز و ہیبتناک درندہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح جو روح ہم دیکھتے ہیں اسکی



شکل بھی ہزار ہا عیوب سے یونہی مسخ ہوتی ہے۔ اس لیے گلا کھن بس اور دیکھو ہی نہیں۔  
گ۔ پھر آخر کہہ دو!

میں۔ اسی کے حسب عرفان کی طرف، اس کی طرف ہے یہ متاثر کرتی ہے اور  
غیر فانی، ازلی و الہی سے اپنے تعلق قریبی کے باعث جس کی صحبت و منشین کی یہ متمنی  
ہوتی ہے۔ نیز اس طرف کہ اگر اس اعلیٰ اصول کی اتباع اور ایک ہیجان الہی سے یہ  
اس بجز ایک ہی شکل آتے ہیں یہ اب ہے اور ان کنکر پتھروں، ارضی چیزوں اور چٹانوں  
سے جو اس لیے اسکے گرد جنگلی چیزوں کی طرح پھوٹی پڑتی ہیں کہ یہ ارضی غذا رکھتی  
ہے اور اس زندگی کی نام نہاد پسندیدہ چیزوں سے بڑی بڑی ہوں اگر یہ ان سب سے پاک  
ہو جائے تو پھر یہ کس درجہ مختلف ہو جائیگی۔ ہاں تو جب اس طرف نظر کرو گے اس وقت  
سے اہلی حالت میں دیکھو گے اور معلوم کر سکو گے کہ اس کی ایک ہی شکل ہے ماہیت  
شکلیں اور اس کی ماہیت کیا ہے۔ موجودہ زندگی اسکے عوارض اور جو اشکال یہ اختیار  
کرتی ہے ان کی بابت میں سمجھتا ہوں کہ اب ہم کافی کہہ چکے۔  
گ۔۔۔ درست۔

میں۔ اور اس طرح ہم نے دلیل کے شرائط کو پورا کر دیا۔ ہم نے انصاف کے  
ان انعامات اور اعزاز کو بیچ میں آنے ہی نہ دیا جو بقول تمہارے ہومر اور ہیسایا  
میں مذکور ہیں بلکہ ہم نے تو نفس انصاف کو نفس روح کے لیے بہترین شے ثابت کر دیا۔ چاہے  
کسی کے پاس گائیگیس کی انگشتری ہو یا نول سے انصاف کرنا چاہیے، اور اگر صرف



گائیگیس کی انگٹری ہی نہیں اُسکے ساتھ ظلمات کا خود بھی ہوتب بھی انصاف ہی کرنا چاہیے۔

گ۔ نہایت درست۔

میں۔ تو اب چنداں مضائقہ نہیں اگر ہم، یہ بھی گنوا دیں کہ انصاف اور دوسرے محاسن روح کے لیے حیات میں اور بعد مائت دیوتاؤں اور انسانوں سے کتنے اور کیسے کیسے انعامات حاصل کرتے ہیں۔

گ۔ جی، مطلق نہیں۔

میں۔ اچھا تو بھائی تم نے دوران دلیل میں جو فرض لیا تھا وہ اب واپس کرو؛ گ۔ کیا، فرض کیا لیا تھا؟

میں۔ یہ مفروضہ کہ منصف نا انصاف اور غیر منصف عادل معلوم ہو۔ تمہارا خیال تھا کہ ہر چند کہ معاملہ کی اصلی نوعیت دیوتاؤں اور انسانوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تاہم خالص انصاف کا خالص نا انصافی سے تقابل کرنے کے لیے یہ فرض کرنا ضروری تھا۔ کیوں! یاد ہو نا؟

گ۔ اگر قبول جاؤں تو نہایت قابل الزام بات ہوگی۔

میں۔ اب کہ معاملہ فیصل ہو چکا میں انصاف کی طرف سے مطالبہ کرتا ہوں کہ ہم انصاف کو وہ منزلت و شہرت واپس دیں جو یہ دیوتاؤں اور انسانوں کی نظر میں رکھتا ہے اور ہم تسلیم کر چکے ہیں کہ یہ اس کا حق ہے۔ اور چونکہ یہ بھی ظاہر ہو چکا کہ یہ اپنے

پتھے حالتوں کو دھوکہ نہیں دیتا بلکہ ان میں واقعی حقیقت پیدا کرتا ہے لہذا وہ جو اس سے  
بھینا گیا تھا آپ اسے واپس ملنا چاہیے تاکہ یہ ظاہریت کا نشان فتح بھی حاصل کرے  
جو دراصل اس کا حق ہے اور جو یہ نپٹے حالتوں کو عطا بھی کرتا ہے۔

گ۔ مطالبہ تو نہایت حق بجانب ہے۔

میں :- پہلی بات تو یہ :- اور یہ اول چیز ہے جو آپ کو واپس کرنی ہے۔ کہ منصف  
اور غیر منصف دونوں کی ماہیت یوتاؤں کو اچھی طرح معلوم ہوتی ہے۔

گ۔ تسلیم۔

میں :- اور جب یہ دونوں ان کے علم میں ہیں تو ان میں سے ایک انکا دوست  
اور دوسرا ان کا دشمن ہونا چاہیے، یہ تو ہم شروع ہی سے تسلیم کرتے آئے ہیں؛  
گ۔ بجا ہے۔

میں :- اور سمجھنا چاہیے کہ دیوتاؤں کے دوستوں کو تو ہمیشہ سب چیزیں اچھی  
ہی اچھی ملیں گی، سوائے ان بری چیزوں کے جو سابقہ معصیت کا لازمی نتیجہ ہوں۔  
گ۔ بیشک۔

میں :- چنانچہ باانصاف انسان کے متعلق ہمارا تصور یہ ہونا چاہیے کہ خواہ یہ فلاح  
میں مبتلا ہو یا مرض میں یا اور کسی فحالت و مصیبت میں آخر میں چکر ساری باتیں  
زندگی و موت میں اس کی بھلائی کا باعث ہونگی۔ کیونکہ دیوتا ہمیشہ اس کی فکر رکھتے ہیں  
جو عادل بننے اور جہان تک عمل صالح سے تمثال الہی کا حصول ممکن ہو خدا کی طرح ہونیکا



آرزو مند ہوتا ہے۔

گ۔ جی ہاں، جو خود اس کا سا ہونے سے تو خدا یقیناً نہ بھولے گا۔

میں۔ اور غیر منصف کے معاملہ میں اس کا اٹنا؟

گ۔ یقیناً۔

میں۔ تو یہ ہیں وہ انعامات فتح جو عادل انسان کو دیوتاؤں سے ملتے ہیں؟

گ۔ جی، میرا تو یہی عقیدہ ہے۔

میں۔ اور انسانوں سے لے کیا ملتا ہے؟ ذرا واقعات کو انکی پہلی نوعیت

میں دیکھو تو معلوم ہوگا کہ چالاک نا انصاف لوگوں کی مثال ان دوڑنے والوں کی سی

ہے جو دوڑ کے شروع والے سر سے سے دوسرے سر سے تک تو خوب اچھی طرح دوڑ جاتے

ہیں لیکن پھر وہاں سے واپس نہیں ہو سکتے پہلے پہل تو خوب سر پٹ بھاگ جاتے ہیں لیکن

آخر میں احمق بنتے ہیں اور بلا فتح کے تاج کے کندھوں پر کان ڈالے شتم پشتہ چلے آتے

ہیں۔ جو واقعی اچھا دوڑنے والا ہوتا ہے وہ آخر تک پہنچتا ہے، چنانچہ اسے انعام بھی ملتا

ہے اور سر پر شمع کا تاج بھی رکھا جاتا ہے، یہی حال با انصاف آدمی کا ہے، یہ اپنے تمام اعمال

و معاملات کو بہ جبر تا اختتام پہنچاتا اور ختم حیات پر سب کی زبان پر اس کی بھلائی ہوتی

ہے اور یہ وہ انعام پالیتا ہے جو انسان عطا کر سکتے ہیں۔

گ۔ درست۔

میں۔ اور اب مجھے اجازت دو کہ میں با انصاف آدمی کے ساتھ ان تمام برکتوں

کو منسوب کروں جو تم خوش نصیب کے انصاف کے لیے بیان کر رہے تھے۔ تم جو اوروں کے لیے کہتے تھے میں اب ان کے لیے کہتا ہوں یعنی جب ان کا سن ترقی کرتا ہے تو یہ اگر چاہیں تو اپنے شہر میں حاکم بن سکتے ہیں، جس سے چاہتے ہیں شادی کرتے اور رہنے چاہتے ہیں اپنی بیسیٹیاں بیاہتے ہیں؛ غرض جو جو بھی تم نے اوروں کی بابت کہا وہ اب میں سب کا سب ان کے لیے کہتا ہوں۔ اور برخلاف اس کے اب بے انصافوں کی بات میں کہتا ہوں کہ ان میں سے اکثر چاہے جوانی میں بیچ نکلیں یا آخر کپڑے ہی جاتے ہیں اور اپنے دور کے ختم پر احمق ہی بنتے ہیں۔ پھر جب بڑھا پاتا ہے تو اپنے پرلے، شہری اور اجنبی سب ان کی توہین کرتے ہیں؛ مار کھاتے ہیں اور وہ وہ درگت بنتی ہے کہ ان کا ذکر بقول تمہارے کانوں پر گراں ہے، طرح طرح کے عذاب ہوتے ہیں، انکھیں جلا کر نکالی جاتی ہیں بس فرض کر لو کہ میں نے تمہارا والا سارا قصہ مصائب ڈھرا دیا۔ انھیں بلا بیان

کیے میں فرض کر سکتا ہوں ناکہ یہ ساری باتیں صحیح ہیں؟

گ۔۔ بیشک، آپ جو فرماتے ہیں بالکل درست ہے۔

میں۔۔ تو یہ ہیں وہ انعام، اکرام اور تحفے جو عادل انسانوں کو موجودہ زندگی میں

آدمیوں اور دیوتاؤں سے حاصل ہوتے ہیں اور یہ سب ان اچھی چیزوں کے علاوہ ہیں

جو عدل و انصاف سے بذات خود پیدا ہوتی ہیں۔

گ۔۔ جی ہاں، اور یہ انعام خوب ہیں اور پائدار بھی۔

میں۔۔ اور پھر بھی یہ سب کچھ اس معاوضہ کے مقابلہ میں بہ اعتبار نفع داد اور



باعتبار عظمت کوئی اہلیت نہیں رکھتے جو بعد موت منصف اور غیر منصف دونوں کے لیے مشنظر ہو۔ اب انہیں سنو، تب جا کر کہیں وہ فرض ادا ہوگا جسکا منصف اور غیر منصف دونوں کو ہماری دلیل برحق پہنچتا ہو۔

گ۔۔ فرمائیے، فرمائیے۔ کم ہی چیزیں ہونگی جنہیں میں اس شوق سے سنونگا۔

میں۔۔ اچھا تو میں ایک قصہ سناؤں، ان قصوں میں سے نہیں جو آؤدیسس

نے بطل الہی دوس کو سنائے ہیں، لیکن ہاں یہ بھی ایک تپیل کا قصہ ہے یعنی ایدین

آرمینیس کا جو پیدائشاً پامفلی تھا۔ یہ لڑائی میں مارا گیا، اور دس دن بعد جب

لوگوں نے لاشیں اٹھائیں تو اور سب جسم تو سر چلے تھے لیکن اس کے جسم پر کوئی آٹھ

نہ تھا، چنانچہ اس کی نعش کو دفن کرنے کے لیے گھر لے گئے۔ بارہویں دن کہ نعش پر

رکھی تھی یہ دوبارہ زندہ ہو گیا اور دو سکر عالم میں جو کچھ دیکھا تھا وہ لوگوں کو سنایا

اس نے کہا کہ جب میری روح نے جسم کو چھوڑا تو میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ

سفر پر چلا، چلتے چلتے ہم ایک خفیہ مقام پر پہنچے جہاں زمین میں دو دروازے تھے،

یہ دونوں دروازے پاس ہی پاس تھے اور ان کے مقابل اوپر آسمان میں بھی دو دروازے

تھے۔ درمیانی فضا میں حاکم اجلاس کر رہے تھے۔ جب عادل انسانوں کا معاملہ فیصل

ہو چکنا اور حکم ان کے سامنے باندھ دیا جاتا تو انہیں حکم ملتا تھا کہ آسمانی رہستہ سے

سیدھے ہاتھ کی طرف چڑھ جاؤ، اسی طرح نا انصافوں کو اٹلے ہاتھ کی طرف نیچے اترنیکا

حکم ہوتا تھا، انکے اعمال کی نشانیاں بھی ساتھ ہوتی تھیں لیکن بجائے سامنے کے،



پشت پر آویزاں۔ میں جو قریب بڑھا تو مجھ سے کہا کہ تو وہ پیامبر ہے جو اس عالم کی  
اطلاع انسانوں تک پہنچانے کا اور مجھے حکم ہوا کہ یہاں جو کچھ دیکھنے سننے کی باتیں ہیں  
سب دیکھ سن لوں۔ میں نے جو نظر کی تو دیکھا کہ جب انکا فیصلہ سنا دیا جاتا تھا تو  
زمین اور آسمان کے ایک ایک دروازے سے نور و حیں رخصت ہو رہی تھیں اور  
دوسرے دونوں دروازوں سے رو حیں کچھ تو گرد آلود اور سفر سے ماندہ زمین سے  
اوپر آتیں اور کچھ نہایت صاف جگ جگ آسمان سے نیچے آتیں۔ معلوم ہوتا تھا  
کہ سب کی سب کسی لمبے سفر سے ابھی ابھی آرہی ہیں۔ یہ سب خوشی خوشی سبز زار  
جاتیں اور وہاں جا کر یوں پڑاؤ ہوتا گویا کوئی تھوڑا رہا۔ جو رو حیں ایک دوسرے سے  
واقف تھیں وہ گلے ملتیں اور خوب باتیں کرتیں، زمین سے آئی والی رو حیں نہایت  
اشتیاق سے حالات بالائی کے متعلق دریافت کرتیں اور آسمان سے آئی والی رو حیں  
کو اُف زیریں کی بابت، سب ایک دوسرے سے رستہ کے واقعات بیان کرتیں،  
نیچے سے آنے والی رو حیں اپنی جو کچھ زیر زمین سفر میں گزری تھی (اور یہ سفر ہزار سال کا  
تھا) اس کی یاد پر دہیں اور افسوس کرتیں، اوپر سے آئی والیاں آسمانی مسرتوں اور  
ناقابل تصور مظاہر حسن کا بیان کرتیں۔ سارا قصہ تو گلا کن بڑا وقت لیکھا خلاصہ یہی  
اس نے بیان کیا کہ انہوں نے کسی کے ساتھ جو برائی کی تھی اس کا وہ چند عذاب بھگتتا  
پڑا یعنی اگر سو سال میں ایک دفعہ برائی کی تھی۔ (اور انسانی عمر کا یہی اندازہ کیا گیا ہے)  
تو سزا دس گنی ایک ہزار سال میں پوری ہوتی۔ مثلاً اگر کوئی بہت موتوں کا باعث



ہوا ہو، اگر کسی نے شہروں لشکروں کو غلام بنایا یا انہیں دغا دی ہو یا کسی اور بدکردار  
 کا مرتکب ہوا ہو تو ان تمام گناہوں کے لیے اور ایک ایک کر کے دس گنی سزا ملتی ہے  
 اسی طرح احسان، عدل اور تقویٰ کا انعام بھی اسی نسبت سے ملتا ہے۔ اس کے دہرا  
 کی چنداں ضرورت نہیں جو اسنے ان چھوٹے بچوں کی بابت کہا جو پیدا ہوتے ہی مر جاتے  
 ہیں۔ دیوتاؤں اور والدین کے ساتھ سعادت مندگی یا غیر سعادت مندگی کی باتہ نیز قاتلوں  
 کے متعلق اس نے اور بہت بڑی بڑی جزاؤں سزاؤں کا بیان کیا۔ یہ کہتا تھا کہ جب  
 ایک روح نے دوسری سے دریافت کیا کہ ”اور یائیس عظیم کہاں ہے؟“ تو یہ خود وہاں  
 موجود تھا۔ اور یہ اور یائیس، ایر کے زمانہ سے کوئی ہزار سال قبل تھا، یہ پامفیلیا کے  
 کسی شہر کا مستبد عالم تھا اپنے بوڑھے باپ اور بڑے بھائی کو اس نے قتل کر ڈالا  
 تھا اور کہتے ہیں کہ ایسے ہی اور بہت سے نفرت انگیز گناہوں کا مرتکب تھا، دوسری  
 روح نے جواب دیا کہ ”وہ یہاں نہیں آیا اور نہ کبھی آئے۔ اور یہ منجھان ہیستناک  
 مناظر کے تھاجن کا ہم نے خود مشاہدہ کیا۔ ہم غار کے دہانہ پر تھے اور چونکہ اپنا سارا تجربہ  
 حاصل کر چکے تھے اس لیے اب اوپر چڑھنے والے تھے کہ یکایک اور یائیس اور اور کی  
 لوگ نمودار ہوئے، ان میں سے اکثر جا برسے تھے۔ اور ان ظالموں کے علاوہ اور  
 افراد بھی تھے جو دنیا میں بڑے بڑے مجرم رہ چکے تھے۔ انکا خیال تھا کہ یہ بس ابھی عالم  
 بالا کو واپس جاتے ہیں لیکن بجائے اسکے کہ دہانہ میں یہ داخل ہو سکیں، جہان میں سے  
 کوئی جس کی کافی سزا نہ ہو چکی تھی چڑھنے کی کوشش کرتا اس سے ایک سختیج نکلتی



اسپر کچھ ہمیشہ آتشیں و انسان جو پاس کھڑے اس آواز کو سنتے تھے انھیں بکہر سنا تھ  
 بجاتے اور مائیس اور بعض دوسروں کو تو انھوں نے سر پر ہاتھ سبب بندھ کر نیچے  
 پھینک دیا پھر آہستہ بھرا نہیں خوب گھسیٹا، انھیں کانٹوں پر ادن کی طرح دھنکا۔ اور  
 راہ چلتوں سے برابر کہتے جاتے تھے کہ انھوں نے یہ یہ جسم کیسے تھے اور اب ہم پھر اپنی  
 جہنم میں ڈالنے لئے جاتے ہیں۔ ہم نے جو بہت سی صعوبتیں اٹھائی ہیں ان میں کوئی  
 مصیبت اس گھڑی سے کٹھن نہ تھی جب ہم یہ سوچتے تھے کہ کہیں ہمارے لیے بھی یہ آواز  
 نہ نکلے، لیکن جب خاموشی رہی تو ہم ایک ایک کر کے خوشی خوشی اور پرچہ آئے بقول  
 ایڑ یہ تو تھے وہاں کے بدلے اور سزا میں اور پھر انعام اور برکتیں بھی ایسی ہی تھیں۔

یہ روحیں سات دن تک اسی میدان میں مقیم رہیں، انھوں دن نہیں حکم ملا  
 کہ پھر سفر شروع کریں۔ چوتھے دن یہ ایک جگہ پہنچیں وہاں سے روشنی کی شعاع دکھائی  
 دیتی تھی، سیدھی جیسے ستون، آسمان و زمین کے آر پار رنگ میں دھنک سی مشابہ  
 لیکن پاکیزہ اور روشن تر۔ ایک دن بھرا اور چلکے اس جگہ پہنچ گئے۔ یہاں اس روشنی  
 میں انھوں نے آسمانی زنجیروں کے سرے دیکھے جو اوپر سے لٹکی ہوئی تھیں۔ یہ روشنی  
 آسمان کی مٹی ہی اور سارے کرہ عالم کو اس طرح یکجا کیے ہوئے ہی جیسے تینکے پہاڑ کی چوٹی  
 کو پائیزخیر کے ان سروں میں جبر و لزوم کا نکلا لٹکا ہے اور اسی پر سائے چکر ہوتے ہیں۔ اس  
 تھلے کے سہم اور کلا بہ فولاد کے ہیں اور پھر کی کچھ فولاد کی اور کچھ اور دو سے مسالہ کی  
 پھر کی کی شکل وہی ہے جیسی یہاں دنیا میں عام رواج ہے، آیر نے اسکا جو بیان دیا اس



پتہ چلتا تھا کہ ایک بڑی سی پھر کی ہو جسے اندر سے باہر کھوکھلا کر دیا ہو اس کے اندر اس سے ایک ذرا چھوٹی پھر کی بٹھادی ہو، اس کے اندر ایک اور پھر ایک اور اسی طرح چار اور الغرض کل آٹھ پھر کیاں ہیں ایسے جیسے ایک برتن کے اندر دوسرا برتن رکھ دیا ہو۔ اوپر کی طرف تو ان پھر کیوں کے سرے دکھائی دیتے ہیں لیکن نیچے سب کے سب ملکر ایک پھر کی بناتے ہیں۔ اس کے اندر سے نکلا گذرنا ہی اور آٹھویں پھر کی کو بیچ میں سے چھیدنا ہی، پہلی پھر کی جو سب سے باہر ہو اس کا کنارہ بھی سب میں بڑا ہی دوسرے کے کنارے اس ترتیب سے چھوٹے ہیں، بڑائی میں چھٹی کا نمبر پہلے کے بعد ہی، چھٹی کے بعد چوتھی کا، اس کے بعد آٹھویں، پانچواں نمبر ساتویں کا اور چھٹا نمبر پانچویں کا ہی، تیسری ساتویں نمبر چہرہ اور دوسری سب سے آخر یعنی آٹھویں نمبر پر سب سے بڑی پھر کی (یعنی ثوابت) نہایت مرصع ہے؛ ساتویں (سوسج) روشن ترین ہے؛ آٹھویں (چاند) ساتویں کی روشنی کے عکس سے حصول رنگ کرتی ہے؛ دوسری اور پانچویں (زر محل اور عطار د) رنگ میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، ہاں اوروں کے مقابلہ میں ذرا پیلے ہیں؛ تیسرے کی (زھرہ) روشنی سب میں سپید ہو؛ چوتھی (دیرخ) کچھ سرخی مائل، اور چھٹی (مشرقی) سپیدی میں دوسرے نمبر پر ہے۔ اچھا سارے ٹکٹے کی تو ایک ہی حرکت ہو لیکن جب یہ کل ایک طرف حرکت کرتا ہو تو اندر کے ساتھ چکر سمت مخالف میں آہستہ آہستہ چلنے لگتے ہیں، ان میں آٹھواں سب سے تیز چلتا ہے اس کے بعد بہشت بار تیزی ساتویں، چھٹے اور پانچویں کا نمبر ہے اور سب کے سب



ساتھ ساتھ حرکت کرتے ہیں، پھر حرکت قہری کے اس قانون کے ماتحت باعتبار تیزی  
 تیسرے نمبر پر چوتھا چکرایا تھا، چوتھے نمبر پر تیسرا اور پانچویں پر دوسرا۔ کلاجر و لزوم  
 کے گھنٹوں پر گھومنا ہی ہر چکر کے اوپر ایک (جنیہ) مغنیہ ہے جو ساتھ چکر کھاتی اور ایک  
 ہی انداز سے ایک سرگائے جاتی ہے۔ آٹھوں چکر ایک متناسب نغمہ مرتب کر لیتے ہیں  
 انکے چار نظرف ابر برابر فصل سے ایک اور تین کا گروہ ہے، یہ اپنے اپنے تخت پر بیٹھی ہیں  
 یہ ہیں جس و لزوم کی بیٹیاں، قضا و قدر کی دیویاں۔ یہ سفید لباس زیب تن کئے  
 ہیں، سر پر ہر ایک کے ایک ایک ہار ہے۔ چچیس، کلو تھو اور اتر و پوس  
 ان کے نام ہیں۔ یہ اپنی آواز سے مغنیہ (جنیہ) کی موسیقی کا ساتھ دیتی ہیں چچیس  
 ماضی کا ترانہ گاتی ہے، کلو تھو حال کا اور اتر و پوس استقبال کا کلو تھو اپنے سید  
 ہاتھ سے کبھی کبھی تنکے کے باہر ولے چکر کو ذرا گھا دیتی ہے اتر و پوس لٹے ہاتھ سے  
 اندرونی چکروں کو چھو کر ان کی رفتار سادھتی ہے، اور چچیس باری باری دونوں  
 کو چھوتی رہتی ہے، کبھی ایک ہاتھ سے کبھی دوسرے سے۔

آبر اور دوسری روحیں جب یہاں پہنچیں تو ان کا فرض تھا کہ سب سے پہلے  
 چچیس کے پاس جائیں۔ لیکن اس سے پہلے ایک پیغمبر نمودار ہوا جس نے ان سب کو  
 ایک نظام سے مرتب کیا، پھر چچیس کے قدموں سے قسمتیں اور زندگی کے مختلف نمونے  
 لیکر یہ ایک مرتفع منبر پر چڑھ گیا اور انہیں یوں مخاطب کیا، "سنو! جبر و لزوم کی بیٹی  
 چچیس کا پیغام سنو! فانی روح! حیات و فنا کا ایک اور دور دیکھو۔ تمہارا ورثہ



تمہیں دیا نہ جائے گا بلکہ تم خود اپنے ذمہ کا انتخاب کرو گے۔ جو پہلی چٹھی اٹھائے گا  
 اسی کو پہلا حق انتخاب ہوگا، پھر یہ جو زندگی چُنے گا وہی اس کی قسمت ہو جائیگی۔ نیکی  
 آزاد ہو اور بے آقا، جو اس کی جتنی عورت یا جتنی ذلت کرے گا اتنی ہی زیادہ یا کم اُسے  
 ملیگی؛ ذمہ داری انتخاب کرنے والے پر ہے اور خدا بری الذمہ "ترجمان نے یہ کہہ کر  
 بلا ہتھیاز ان میں چٹھیاں منتشر کر دیں جو چٹھی جس کے قریب تھی وہ اُس نے اٹھالی،  
 اس طرح سولے آیر کے سب نے اٹھائیں (اسے اجازت نہ تھی) اور ہر ایک نے دکھا  
 کہ اسے کون سا عدد ملا ہے۔ اب ترجمان نے نئے سامنے زمین پر زندگی کے نمونے رکھ دیے۔  
 جتنی روئیں وہاں موجود تھیں ان سے کہیں زیادہ زندگیوں کے نمونے تھے، اور پھر  
 طرح طرح کے۔ سب جانوروں کی زندگیاں تھیں اور ہر حالت کے انسانوں کی۔ ظالم  
 استبدادی زندگیاں بھی تھیں، بعض ایسی کہ ظالم کی عمر بھر بلکہ اس سے زیادہ باقی رہیں  
 بعض ایسی کہ بیچ ہی میں منقطع ہو جائیں اور خاتمہ افلاس در پوزہ گرمی اور جلا وطنی  
 میں ہو۔ پھر شاہ میر کی زندگیاں تھیں، ایسوں کی جو اپنی شکل صورت اور حسن و حسن  
 طاقت اور کھیلوں میں کامیابی کے لیے مشہور تھے، بعض ایسوں کی جو حسب و نسب  
 اور اجداد کی خوبیوں کے باعث ممتاز تھے، کچھ زندگیاں ایسوں کی بھی تھیں جو انکی  
 بالکل الٹی صفات کے باعث بدنام تھیں۔ عورتوں کی زندگیاں بھی تھیں، لیکن ان  
 روجوں کی سیرت متعین نہ تھی، کیونکہ جب روح نئی زندگی اختیار کرتی ہے تو لازم ہے  
 وہ بالکل بدل جائے۔ لیکن اور ساری صفات موجود تھیں؛ سب کی سب ایک دوسرے



سے گڈ، دولت و افلاس، صحت و مرض کے عناصر کی بھی آمیزش تھی، علاوہ بریں دوسری ذیل کیفیتیں بھی موجود تھیں۔ میرے عزیز گلاکسن! یہاں ہر حیات انسانی کا خطرہ عظیم اور ہمیں حد درجہ احتیاط درکار ہے۔ ہر ایک کو چاہیے کہ اور تمام علم کو بلا سے طاق رکھ کر اس میں ایک چیز کی طلب جستجو میں لگ جائے۔ کیا عجب کہ ہم نیک و بد میں تمیز کرنا سیکھ جائیں یا ہمیں کوئی شخص مل جائے جو یہ چیز سکھائے، تاکہ جب کبھی اور جہاں ہمیں موقع ملے ہم بہتر زندگی منتخب کر سکیں اس کے اسباب پر دھیان رکھنا چاہیے کہ یہ جو چیزیں ہم نے اوپر بیان کیں انہیں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ اور پھر سب ملکر نیکی پر کیا اثر ڈالتی ہیں، اسے جاننا ہوگا کہ کسی خاص روح میں اگر حسن صورت کو دولت یا افلاس سے ملا دیں تو اس کا کیا اثر ہوگا، اچھے یا بُرے حسبِ نسب، خانگی یا سرکاری عہدہ، قوت یا کمزوری، چالاکی و کندہی، روح کے سارے فطری اور کسبی صفات اور ان کے باہمی عمل، ان سب کے اچھے بُرے نتائج سے اسے آگاہ ہونا چاہیے۔ تب کہیں یہ روح کی ماہیت کو دیکھ کر، اور ان تمام باتوں پر نظر کر کے بتلا سکیگا کہ کون زندگی بہتر ہو کون نہیں۔ اور اس طرح انتخاب کرے گا کہ جو زندگی روح کو زیادہ نا انصاف بنائے وہ بری اور جو اسے زیادہ منصف بنائے وہ اچھی۔ باقی دوسری باتوں کو یہ بالکل نظر انداز کر دے گا۔ ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ زندگی اور موت دونوں میں یہی بہترین انتخاب ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اپنے ساتھ عالم زیریں میں بھی حق و صداقت پر ایک غیر متزلزل ایمان ساتھ لیجائے، تاکہ وہاں بھی دولت کی آرزو اور باطل کے فریب اسکی نگاہ کو خیر نہ کر سکیں،



اور یہ نہ ہو کہ ظلم و استبداد اور دوسری بد معاشی کی زندگیوں کو دیکھ کر یہ دوسروں کو ناقابل  
تلافی اذیت پہنچائے اور خود اپنی ذات کو اس سے بھی بڑی مضرت دینے کا باعث ہو  
اسے جاننا چاہیے کہ اسی زندگی میں نہیں بلکہ اس کے بعد کے تمام مراحل میں بھی عیب  
حتی الوسع دونوں طرف کے انتہائی سروں کو چھوڑ کر درمیانی راہ کس طرح اپنے لیے  
منتخب کرے کہ یہی مسرت و شادمانی کی راہ ہے۔

دوسرے عالم کے اس خبر دینے والے نے پھر بیان کیا کہ اس موقع پر اس نے پیر نے  
یہ اور کہا: ”بالکل آخر میں آنے والے کے لیے بھی اگر وہ سمجھ بوجھ کر انتخاب کرے اور  
محنت سے زندگی گزارے تو ایک مسرت بخش اور خاصی پسندیدہ حیات مقرر ہے۔ جو  
سب سے پہلے انتخاب کرتا ہے یہ نہ ہو کہ وہ بے پروا ہو جائے اور جو سب سے آخر میں ہے  
اسے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔“ یہ جب کہ چکا تو جسے سب سے پہلا حق انتخاب ملا  
تھا وہ لگے بڑھا اور دیکھتے دیکھتے اس نے سب سے بڑے ظلم و استبداد کو اپنے لیے چن لیا  
اس کا دماغ چونکہ حماقت اور حرص سے تاریک ہو چکا تھا اس نے انتخاب کرنے سے  
پہلے سارے معاملہ پر غور نہیں کیا اور پہلی نظر میں یہ بات اسے نہ سمجھائی دی کہ منجھدیگی  
برائیوں کے اس کی قسمت میں یہ بھی رقم تھا کہ یہ اپنی اولاد کو خود نکل جائیگا۔ لیکن جب  
ذرا غور کر لیا تو موقع ملا اور اس نے دیکھا کہ اس کی قسمت میں کیا کیا آیا تو لگا چھاتی  
پہننے اور اپنے انتخاب پر رونے دہونے اور پیغمبر کے سابقہ اعلان کو بھول گیا۔ اور بجائے  
اس کے کہ اپنی بد نصیبی کا الزام خود اپنے کو دے لگا اتفاق اور دیوتاؤں کو ذمہ دار



قرار دینے، غرض ہر ایک ملزم تھا، بس یہی بے تصور سنو! یہ ان لوگوں میں سے تھا جو آسمان سے آئے تھے، سابقہ زندگی میں یہ ایک نہایت عمدہ منتظر ریاست میں رہ چکا تھا، لیکن اسکی نیکی محض عادت پر مبنی تھی، اس کے پاس کوئی فلسفہ نہ تھا۔ یہی حال اوروں کا تھا جنہر اسی قسم کی افسانہ پوری یعنی ان میں سے اکثر آسمان سے آئے تھے، امتحان آزمائش سے ان کی تعلیم نہ ہوئی تھی۔ ہاں زمین سے آنوالے چونکہ خود تکلیفیں جھیل چکے تھے، اور دوسروں کو تکلیفیں اٹھانے بھی دیکھ چکے تھے اس لیے انھیں انتخاب کرنے میں عجلت نہ تھی۔ کچھ تو اس نا تجربہ کاری کے باعث کچھ اس سبب سے کہ چٹھیوں کا نکلنا کچھ اتفاق پر منحصر تھا، بہت سی روجوں نے بری کے بدلے اچھی اور بہتوں نے اچھی کے بجائے بری قسمت پائی۔ ہمارے قاصد کا بیان ہے کہ اگر اس دنیا میں آنے کے بعد انسان اپنے کو تا متر سچے فلسفہ کے لیے وقت کرے اور پھر چٹھی نکلنے کے معاملہ میں بھی معمولی سا خوش قسمت ہو تو وہ یہاں خوش ہے اور دوسری زندگی میں اس کا سفر اور پھر وہاں سے دوبارہ وہی دشوار گزار اور زیر زمین راستوں سے نہ ہو بلکہ نہایت ہموار آسمانی راہوں سے۔ یہ کہتا تھا کہ یہ منتظر بھی نہایت حیرت خیز اور عجیب تھا، ایک ہنسی تھی ایک دکھ۔ اکثر روجوں کا انتخاب سابقہ زندگی کے تجربوں پر مبنی تھا۔ مثلاً اسنے یہاں وہ روح دیکھی جو کبھی ابرفیس تھی، اسے چونکہ عورتوں نے قتل کیا تھا اس لیے یہ عورت کے چہرے سے پیدا ہونیکے خیال پر بھی نفرت کرتا تھا اور عورتوں کی سارے نسل سے اس صداوت کے باعث اسنے ہنس کی زندگی انتخاب کی، اسنے تھلمیرا



کی روح کو بھی بلبل کی زندگی منتخب کرتے دیکھا؛ برخلاف اس کے پڑیاں مثلاً ہمیں  
 اور دوسرے گمانے والے پرند انسان بننا چاہتے تھے؛ جس روح کو میواں عدو ملا تھا  
 اسے شیر کی زندگی پسند کی؛ یہ اجاکس بن تیلامون کی روح تھی جو اس لیے انسان بننا  
 نہیں چاہتی تھی کہ آسمان کے معاملہ میں اس کے ساتھ انصافی کی گئی تھی۔ اسکے بعد  
 اگمنان کی باری تھی؛ اس نے عقاب کی زندگی اختیار کی، کیونکہ اجاکس کی  
 طرح اپنے مصائب کا خیال کر کے یہ بھی انسانی فطرت سے نفور تھا۔ تھیسیس میں  
 اٹلانٹا کا نمبر آیا؛ اس نے ایک کھلاڑی ہیلوان کی شہرت جو دیکھی تو اس لالچ  
 کا مقابلہ کر سکی؛ اس کے بعد پنوپیس کے بیٹے آیبیس نے ایک مگا  
 حرافہ عورت کی زندگی اختیار کی؛ آخر میں انتخاب کرنے والوں میں کہیں درکو مسٹر  
 تھراسیبیس بھی تھا، اسے بندر کی شکل تبول کی۔ اب اوڈیبیس کی روح  
 آئی کہ اس کا نمبر آخری تھا اور اسے ابھی اپنے لیے انتخاب کرنا تھا۔ سابقہ مشقتوں  
 کی یاد نے اسکے حوصلہ کو پست کر دیا تھا، یہ بڑی دیر تک ادھر ادھر ایک خانگی  
 آدمی کی زندگی ڈھونڈتا پھرا جسے کوئی غم و فکر نہ ہو۔ اسکے ملنے میں ذرا دشواری  
 ہوئی، یہ کہیں ایک طرف کو پڑی تھی اور سبھوں نے اس کا ذرا خیال نہ کیا تھا۔  
 یہ جو اس زندگی کو دیکھ پایا تو بولا کہ اگر مجھے بجائے آخری کے اول حق انتخاب ملتا  
 تو بھی میں اسی زندگی کو منتخب کرتا، اور اسے پا کر واقعی بڑا خوش تھا۔ یہی نہیں کہ آدمی ہی  
 جانوروں کی زندگیاں اختیار کرتے تھے، میں یہ بھی ضرور کہدوں کہ جنگلی اور پالتو



جانور آپس میں بھی اپنی زندگیاں بدل رہے تھے اور اپنی طبیعت کے مطابق انسانی  
زندگیاں بھی خستہ کر رہے تھے، مثلاً اچھے نرم مزاج بھلے مانسوں کی زندگی، اور  
برے وحشیوں کی، غرض طرح طرح اور ہر ممکن طریقہ سے۔ اب جب سب وحشی اپنی  
اپنی زندگی منتخب کر چکے تو بہ ترتیب انتخاب پچیس کے سامنے پہنچیں، سامنے  
ان کے ساتھ، فرشتہ کر دیا جو ہر ایک نے منتخب کیا تھا، تاکہ یہ ان کی زندگی کا  
نگہبان ہے اور ان کے انتخاب کو پورا کرے۔ یہ فرشتہ پہلے تو انہیں کلو تھوکے روپ  
لے گیا اور یہ اپنے ہاتھ سے جس تکلے کو چلا رہی تھی اس میں رکھ کر انہیں چکر دیا اور  
اس طرح گویا ہر ایک کی قسمت کی تصدیق ہو گئی۔ پھر خود تکلے کو چھو کر یہ اسی  
انروپوس کے پاس لے گیا جو قسمت کے ڈوے کاٹ ہی تھی تاکہ یہ ناقابل تغیر  
ہو جائے۔ یہاں سے یہ بے منہ پھرے جبر و لزوم کے تخت کے تلے سے گزرنے جب  
سب اسکے نیچے سے نکل لیے تو خود فراموشی کے جلتے تپتے میدان میں پہنچے، یہ ایک  
پھیل میدان تھا جس میں نہ درخت کا پتہ نہ سبزہ کا۔ شام ہوتے ہوئے درمیانے تغافل کے  
کناسے پڑاؤ کیا۔ اس دریا کا پانی کسی برتن میں نہ سماتا تھا، ہر ایک کو مجبور کیا گیا کہ  
اس میں سے تھوڑا تھوڑا پانی پیں، جنہیں عقل نے نہیں سنبھالا وہ ضرورت سے زیادہ  
پی گئے۔ اسکے پیتے ہی سب کے ساری باتیں بھول گئے۔ سب کے سب مصروف  
خواب تھے کہ ادھی رات کو برق و باد کا طوفان اور زلزلہ شروع ہوا اور جیسے ٹوٹے  
ہوتے تارے ادھر ادھر ہو جاتے ہیں یہ بھی دیکھتے دیکھتے مختلف سمتوں سے اپنی



جائے ولادت تک پہنچا دئے گئے۔ ہمارے قاصد کو یہ پانی البتہ نہیں پینے دیا۔ لیکن یہ کیونکر اور کس طرح ہجر جسم میں واپس آیا اس کا خود اسے پتہ نہیں، صبح جو ایک بیک آنکھ کھلی تو دیکھا کہ مابوت پر لیٹا ہو۔

غرض گلا کن (لاج رہ گئی) اور قصہ بیچ گیا فنا نہیں ہوا۔ اب اگر ہم بھی قول کے تابع رہیں تو یہ ہمیں بھی بچا لے اور ہم اطمینان سے بلا اپنی روح کو اودھ کئے دریائے تغافل پر سے گذر جائیں۔ لہذا میرا مشورہ ہے کہ ہم ہمیشہ اس آسمانی راہ پر ثابت قدم رہیں، ہمیشہ عدل اور خیر کا تتبع کریں، اور یقین رکھیں کہ روح غیر فنا ہو اور ہر طرح کی اچھائی نیز ہر طرح کی برائی برداشت کر سکتی ہو۔ یوں ہم ایک ٹوکے کی نظر میں بھی عزیز رہیں گے اور دیوتاؤں کی نگاہ میں بھی، جب تک یہاں ہیں تو یہاں اور اس وقت بھی جب انعام لینے کے لیے ہم ان کھیل میں بازی جیتنے والوں کی طرح جائیں گے جو تحائف جمع کرنے کے لیے چکر لگاتے ہیں۔ اس سے اس زندگی میں بھی ہمارا بھلا ہوگا اور اس ہزار سالہ سفر میں بھی جسے ہم ابھی بیان کر رہے تھے۔

تمام شد

# سائنس

## انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جوئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوں گے، ان کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کے سائنس دانوں کے علاوہ یورپ کے فضلاء نے بھی اس رسالہ میں مضمون لکھنا منظور فرمایا ہے۔ اس رسالہ میں متعدد بلاک بھی شائع ہوا کرتے ہیں۔

سالانہ چندہ آٹھ روپیہ سکے انگریزی (نور و پیمہ چارٹکے سکے عثمانیہ) امید ہے کہ اردو زبان کے بھی خواہ اور علم کے شائق اس کی سرپرستی فرمائیں گے۔

انجمن ترقی اردو اور ناک آباد دکن



# اُردو

انجمن ترقی اردو اور ننگ آباد دکن کا سہ ماہی رسالہ جو جس میں  
ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے۔ اس کے تنقیدی اور محققانہ  
مضامین خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اردو میں جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر  
تبصرے اس رسالہ کی ایک خصوصیت ہے۔

یہ رسالہ سہ ماہی ہے اور ہر سال جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر  
میں شائع ہوتا ہے رسالہ کا حجم ڈیڑھ سو صفحے ہوتا ہے اور اکثر اس سے زیادہ  
قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات وپیکہ انگریزی (اٹھارہ وپیکہ عثمانیہ)  
لشتر انجمن ترقی اردو اور ننگ آباد دکن

